دلکش خوشبوؤں سے بسا مارچ 2015ء کا پُربہار پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے دلنشیں ناول
زاہدہ پروین کا خوب صورت منی ناول...... جنگل کا پھول
زمر نعیم تشریف لائی ہیں متاثر کُن مکمل ناول اسیرِ وفا کے ساتھ
نبیلہ ابر راجا کا نیا ناولٹ متاعِ دل صرف آپ کے لیے
شیریں حیدر کی پُرسوچ تحریر...... آئینہ
رضوانہ پرنس کی حاضری
فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کے ہمراہ
پڑھیے اداکارہ سنبل اقبال کی دلچسپ باتیں
صحرائے تھر کی کٹھنائیوں سے متعلق سیما رضا ردا کا پُرفکر افسانہ
اس کے ساتھ ساتھ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے ماہر قلمکاروں کی فکرانگیز مگر دلآویز تحریریں
جن میں سیما بنت عاصم ' ام ثمامہ ' روشانے عبد القیوم '
فرزانہ نگہت ' بشریٰ باجوہ ' نظیر فاطمہ ' سلمیٰ غزل '
سحرش فاطمہ ' نادیہ جہانگیر ' فرحت احمد اور قراۃ العین شکیل شامل ہیں
حسب معمول منتخب دلچسپ و دلکش مستقل سلسلوں کا پُرمسرت دلفریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

کون کہتا ہے کہ خدا انسانوں سے غافل ہے

اپنی تشنگی مٹانے کے لیے اس نے سہیلی کا گھر تباہ کرنا چاہا تھا

سانحہ پشاور کی کوکھ سے ابھری سچ بیانی

اس نے ایک ناقابلِ فراموش غلطی کر دی تھی

کہیں کوئی آپ کو بھی تو تحفہ نہیں دے رہا ہے

وہ لڑکی تھی اور بار بار موٹر نے اسے لڑکا بنا دیا

سو سنار کی تو ایک لوہار کی یہی اس نے کیا

پولیس تھانے میں گزارنے والا ایک عام سا واقعہ

اندرون سندھ کے ایک عجیب مخلوق کی کہانی

جلد 25 ❖ شمارہ 03 ❖ مارچ 2015ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد سفیان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی ہاشمی 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زر سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

عرصہ دراز سے ہم ایک نعرہ سنتے آئے ہیں کہ اس ملک کو سب سے زیادہ خطرہ یہود و ہنود سے ہے۔ وہ سازشیں کر کے ہمارے ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔ اس بات میں صداقت کتنی ہے یہ اہل دانش جانیں، ہم تو اپنے اطراف میں کچھ اور دیکھتے ہیں۔ سڑک پر نکلیں تو بے ہنگم ٹریفک، ایک دوسرے کو کچل دینے کی طرح اوورٹیکنگ، پولیس کی کھلے عام رشوت ستانی، کیا یہ یہود و ہنود کی کارستانی ہے؟ پرائیویٹ اسپتالوں میں منہ مانگی فیس، اسپتال کے چارجز دگنا کرنے کے لیے خواہ مخواہ مریض کو لایعنی مرض کا خوف دکھا کر ٹیسٹ کرانے کی ہدایت تاکہ اسپتال کے ٹیکنیشنز کی تنخواہ نکلتی رہے۔ اسپتال کی رونق بحال رہے۔ جعلی دوائیں بنانا، دواؤں کی قیمت کئی گنا زیادہ رکھنا تاکہ دکاندار و دیگر ایجنٹس کو کمیشن زیادہ دیا جاسکے۔ رہ رہ کر ایسی دوائیں جو مریض کے لیے انتہائی ضروری ہیں مارکیٹ سے غائب کر دینا، کیا یہ بھی یہود و ہنود کی سازش ہے؟ پینے کے پانی کی لائنوں میں۔ نالے کے قریب سے گزرتے بڑے پائپ میں سوراخ کر دینا تاکہ سیوریج کا پانی بہ آسانی پینے کے پانی میں مل جائے اور بدبودار پانی سے خوف زدہ ہو کر لوگ منرل واٹر کے نام پر صرف کلورین سے صاف شدہ پانی کی بوتلیں خریدنا شروع کر دیں جس کا معقول کمیشن اداروں کے چند افسران کی جیب میں جائے؟ نلکوں سے کس طرح کا پانی آرہا ہے۔ یہ نارتھ کراچی بالخصوص بفرزون کے پانی کا تجزیہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ کیا یہ بھی یہود و ہنود کی سازش ہے؟ لکھنے بیٹھوں تو ایک طویل فہرست بن جائے گی۔ اگر یہ دشمنانِ وطن کی سازش نہیں ہے تو پھر ایسی حرکتیں کرنے والوں کو ہم کیا نام دیں؟ اگر اس ذہنیت پر لگام نہ لگی تو اس کا انجام کیا ہوگا اس کا اندازہ بھی ہر ایک کو ہے بقول سید آل احمد

پھن پھیلائے ناچ رہے ہیں پگ پگ کالے ناگ
بستی بستی قریہ قریہ آگ لگی ہے آگ
ہائے رے اپنے بھاگ

معراج رسول

تربیت کار

سرگزشت

سکندر لودھی کے ساتھ 935 ہجری میں چشت سے ہند آنے والے ابوالاعلیٰ کے گھرانے نے کرنال کے قریب براس کو سکونت کے لیے منتخب کیا تھا لیکن شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً دہلی آ گیا۔ اس خاندان میں 1857ء کی جنگِ آزادی سے دو سال پہلے سید احمد حسن پیدا ہوئے۔ جب سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا تو اپنے قرابت داروں سے استدعا کی کہ اپنے بچوں کو ہمارے مدرسے میں داخل کراؤ۔ سید احمد حسن کی ماں سرسید کی رشتے دار تھیں۔ انہوں نے سید احمد حسن کو علی گڑھ بھیج دیا۔ ابھی وہ وہاں پڑھ ہی رہے تھے کہ دہلی کے ایک شخص کا وہاں جانا ہوا۔ اس نے وہاں کچھ بچوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ لیا۔ ان بچوں میں سید احمد حسن بھی تھے۔ ایک پیرِ طریقت کا بیٹا فرنگیوں کا کھیل کھیلتے نظر آیا تو وہ سخت متعجب ہوئے اور دہلی آتے ہی سیدھے اس کے والد سے ملے اور بولے ”بھائی صاحب احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے۔ یہ تو گیا کام سے۔ وہاں علی گڑھ میں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ کافر کرتی (پینٹ شرٹ) پہنے، ہاتھ میں یہ بڑا سا چوڑا ڈنڈا لیے۔ گول گیند کو پیٹنے کا کافرانہ کھیل کھیل رہا تھا۔“ باپ نے جو یہ سنا تو سخت طیش میں آ گئے کہ ہمارا بیٹا کافروں والا لباس پہنے، انہوں نے اسی وقت اسے واپس لانے کے لیے آدمی دوڑا دیا۔ اس طرح احمد حسن کی انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا رک گیا مگر ذہن میں کشادگی آ چکی تھی۔ اس لیے ماں سے ضد باندھی کہ مجھے الہٰ آباد بھیجا جائے۔ میں قانون پڑھوں گا۔ ماں نے کسی نہ کسی طرح شوہر کو رام کیا اور احمد حسن کو الہٰ آباد بھیج دیا۔ وہاں رہ کر اس نے اسکول کی اعلیٰ جماعتیں پاس کیں پھر مختار (قانون) کی تعلیم حاصل کی تاکہ وکالت کر سکے۔ مختار کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کہاں وکالت کی جائے یہ ابھی طے نہ کر پایا تھا کہ ریاست دیوگڑھ سے بلاوا آ گیا۔ راجا دیوگڑھ کے ولی عہد کے لیے اتالیق کی ضرورت تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ اسی اسامی کے لیے ان کے استاد جنہوں نے ایامِ طفلی میں ابجد سے روشناس کرایا تھا وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ احمد حسن نے اپنے استاد کے آنے کا سن کر راجا صاحب کو کہلوایا کہ ”میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا اس لیے یہ نوکری انہی کو دے دیں اور مجھے واپسی کی اجازت دیں۔“ دوسری طرف استاد نے جب یہ سنا کہ ان کا ایک پرانا شاگرد مقابلے پر ہے تو انہوں نے کہا۔ ”وہ میرا شاگرد ہے۔ بھلا میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا۔“ اخلاق کا یہ نمونہ دیکھ کر راجا صاحب نے کہا۔ ”ہمیں استاد کی ضرورت نہیں، ہمیں تو شاگرد کا اخلاق پسند آیا ہے۔ اسے ہی میں اپنے ولی عہد کا اتالیق مقرر کرتا ہوں۔“ کئی سال تک احمد حسن دیوگڑھ میں رہ کر ولی عہد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ پھر وہاں سازشوں کا سیلاب سا آ گیا اور بالآخر ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سانحے نے اسے صدمے سے دوچار کر دیا اور وہ دیوگڑھ کی ملازمت ترک کر کے واپس دہلی آ گئے مگر دہلی میں دل نہ لگا تو ایک کے بعد ایک کئی شہر گھوم ڈالے۔ کبھی میرٹھ تو کبھی غازی آباد اور کبھی بلند شہر میں وکالت کرتے دن گزارتے رہے۔ 1896ء میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں وکالت کے لیے اورنگ آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ یہاں مولوی محی الدین خان صوبے کے میر عدل (چیف جسٹس) تھے جو احمد حسن کے رشتے میں چچا تھے۔ ان کے ایما پر احمد حسن نے گلبرگ میں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں خاصی ترقی کر لی۔ اب تک وہ ایک ناکام مختار (وکیل) تصور کیے جاتے تھے مگر گلبرگ میں جلد ہی ان کا توتی بولنے لگا۔ اب ان پر فرنگیت کے اثرات حاوی ہونے لگے تھے۔ انگریزی خیالات وطرزِ معاشرت کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ وہ اب پوری طرح فرنگی لباس (کوٹ پتلون) پہننے لگے تھے جب کہ عام مسلمان ایسے لباس سے نفرت محسوس کرتا تھا مگر یہ عرصہ طویل ثابت نہ ہوا۔ ان کے بہکتے قدم کو مولوی محی الدین خان نے روک لیا اور وہ پھر سے مذہب کی جانب لوٹ آئے۔ اِدھر اُدھر کئی شہروں میں وکالت کی مگر اب وہ کیس لینے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے کہ کسی جھوٹے یا مجرم کی پیروی نہ ہو جائے۔ اس لیے وکالت ناکام ثابت ہونے لگی۔ گو کہ ایک ناکام وکیل تھے مگر بچوں کی تربیت پر خاص نظر رکھتے یہی وجہ تھی کہ بچے گوہر یکتا بنتے نظر آ رہے تھے۔ 1920ء میں وہ بھوپال اپنے بڑے بیٹے سید ابو محمد کے پاس گئے ہوئے تھے وہیں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ دنیا سے کوچ کر گئے۔ جانتے ہیں یہ سید احمد حسن کون تھے؟ یہ سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی کے والد تھے۔

شہرِ خیال

☆شوکت رحمٰن خٹک کا پشاور سے تعزیت بھرا خط۔ ”محترم آفاقی صاحب کو مرحوم لکھتے وقت دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میرے عزیز دوست شاہد جہانگیر شاہد نے میرے بیٹے کاشف کو فون پر بتایا کہ آفاقی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، میں براہِ راست خٹک صاحب کو نہیں بتا سکتا اس لیے تم اپنے والد کو احسن طریقے سے بتا دو کہ وہ بیمار ہیں کہیں وہ اس بات سے اثر نہ لے لیں۔ میں اس وقت فلمی الف لیلہ میں اداکارہ یاسمین خان کے مضمون کے سلسلے میں آفاقی صاحب کو خط لکھ رہا تھا کہ اچانک کاشف میرے کمرے میں آیا، آتے ہی بولا۔ ”بابا کیا لکھ رہے ہیں؟“ میں نے جواب میں کہا کہ ”آفاقی صاحب کو خط لکھ رہا ہوں۔“ کاشف نے کہا۔ ”مگر وہ تو شدید بیمار ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کاشف بیٹے! آفاقی صاحب پیرانہ سالی میں بھی بہت مضبوط ارادوں کے مالک ہیں۔ ان کو جوانی میں طرح طرح کی بیماریاں لگی ہیں مگر وہ مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں، کاشف نے سر نیچا کیا ”مگر وہ تو......“ مزید اس میں اس منحوس خبر کے سنانے کی تاب نہ تھی کہ خبرنامے کے نیوز کاسٹر نے خبر سنائی کہ مشہور ادیب علی سفیان آفاقی کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہیں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی جیسے بجلی مجھ پر گر پڑی۔ اب جب میں آفاقی صاحب پر لکھنے بیٹھا ہوں تو میرے سوچنے اور سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی ہیں۔ محترم آفاقی صاحب سے میری پہلی ملاقات 50 سال پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ 32 سال کے اور میں 22 سال کا نوجوان تھا۔ 1966ء میں جب میں نے اداکار بننے کی غرض سے لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے والد صاحب کی قصہ خوانی بازار میں کتابوں کی دکان تھی۔ قریبی دکان صادق کمیشن ایجنسی کی تھی جس کے مالک لالہ وزیر محمد صدیقی تھے، میں نے ان کو دل کی بات بتائی کہ میں فلموں میں کام کرنا چاہتا ہوں، میری رہنمائی کریں۔ انہوں نے مجھے چند سفارشی خطوط دیے۔ ان میں ایک خط آفاقی صاحب کے نام بھی تھا۔ لاہور پہنچ کر سیدھے ایورنیو اسٹوڈیو پہنچا۔ آفاقی صاحب اپنی کار سے ٹیک لگائے اداکاروں کے جھرمٹ میں کھڑے تھے۔ پہلی ملاقات میں آفاقی صاحب کا مجھ پر اچھا اثر پڑا۔ دراز قد، جاذبِ نظر، خوش لباس۔ میں نے آفاقی صاحب سے علیک سلیک کی۔ انہیں صدیقی صاحب کا خط دیا۔ انہوں نے خط پر سرسری نظر ڈالی اور خط واپس کر دیا کہ میرے پاس کام نہیں ہے۔ اس غیر متوقع جواب پر ذہنی تکلیف ہوئی مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ لاہور میں شاہ نور اسٹوڈیو سے کچھ فاصلے پر بی کلاس اداکاروں کے رہائشی علاقے میں اداکارہ اوما دیوی کی معرفت ایک مکان کا بیٹھک 20 روپے ماہوار کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگا۔ میں نے تیس سے زیادہ فلموں میں کردار کیے۔ آخر کار 1972ء کے لگ بھگ مجھے شباب کیرانوی نے فلم ”بازار“ میں شائستہ قیصر کے مدِ مقابل ہیرو منتخب کیا۔ دوسرے دن شباب اسٹوڈیو میں کنٹریکٹ سائن کرنے جانا تھا مگر میں نے ایک خاص وجہ کی بناء پر ہمیشہ کے لیے فلمی دنیا چھوڑ کر پشاور کا راستہ اختیار کر لیا۔ بعد میں ہیرو کا یہی کردار عمران کو دیا گیا۔ 2007ء کی بات ہے کہ ایک جاننے والے نے فلمی الف لیلہ پڑھنے کو دی۔ یہ ماہنامہ سرگزشت کے فلمی الف لیلہ کا انتخاب تھا۔ جب میری نظر لالہ وزیر محمد صدیقی صاحب کے مضمون پر پڑی تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے شکوہ شکایت کی صورت میں ایک خط آفاقی صاحب کو لکھا۔ مجھے اس خط کا جواب چند دنوں بعد 8 مارچ 2007ء کو ملا۔ یہ آفاقی صاحب کا پہلا خط تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے خط میں لکھا کہ میں نے کبھی اپنے گھریلو ملازم کو بھی ”تو“ سے نہیں پکارا اور اپنے رویے پر افسوس کا اظہار کیا اس طرح ہمارے مابین خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ مجھ میں لکھنے کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں تو انہوں نے مجھے لکھنے کی دعوت دی۔ 7 مئی 2007ء کو میرا پہلا مضمون ”قصہ خوانی“ کے عنوان سے چھپا اور میرے دیگر پانچ مضامین بھی متواتر چھپتے رہے اور ساتھ ساتھ آفاقی صاحب کا ارشاد تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

میری فلمی یادداشتوں کو فلمی الف لیلہ میں پشاور سے خط کے عنوان سے چھاپتے رہے۔ میں ان کو مزاحیہ انداز سے لکھتا اور میرا یہ انداز آفاقی صاحب کو بہت پسند تھا۔ پہلی ملاقات کو لگ بھگ پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اب غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ الہامی شخص تھے۔ وہ ایک اچھے ادیب اور داستان گو تھے اس کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کرنے والے انسان تھے۔ کیا مزیدار، دلکش اور دلچسپ شخص تھے۔ مجھے اس بات پر

افسوس نہیں کہ وہ میرے ہم عصر نہ تھے بلکہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کا اور میرا زمانہ ایک تھا۔ محترم آفاقی صاحب خود ایک اچھے قصہ گو تھے لیکن وہ قصہ سننے میں بھی لطف لیتے جیسے پاک و ہند کے غالب، ایران کے خواجہ حافظ اور ہمارے پختونخوا کے خوش حال بابا۔

آفاقی صاحب نے قومی زبان اردو ادب کی خدمت میں اپنی زندگی گزار دی۔ پیرانہ سالی میں بھی وہ جوانوں کی طرح لکھتے۔

محترم آفاقی صاحب کا تعلق ایک وقت فلموں سے رہا مگر وہ فلمی آدمی نہیں تھے۔ ایک ایسے مسلمان جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سچے مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو وہ اس مقولے پر پورا اترتے تھے۔ ان کا آخری خط 19 اکتوبر 2014ء کو ملا جس میں انہوں نے مجھے خالد نجیب خان صاحب سے رابطہ رکھنے کی ہدایت کی۔ اپنی بیماری کا تذکرہ کیا۔ میرا اور بچوں کا حال احوال پوچھا۔ میں نے آفاقی صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا جو انہوں نے بے حد پسند کیا مگر اس مضمون کی اشاعت سے انکار کیا اور لکھا کہ میں اپنی تشہیر پسند نہیں کرتا۔ اخبارات اور ٹی وی کو انٹرویو نہیں دیتا۔ گوشہ نشینی کی زندگی پسند کرتا ہوں۔ آفاقی صاحب جواں فکر، بلند حوصلہ بزرگ تھے۔ ان کا جس شعبے سے واسطہ رہا اس کو نمایاں مقام دلایا۔ یہ آفاقی صاحب کا کمال فن تھا کہ اپنے دور کے قابل قدر شخصیات سے ملے اور ان سے شرف دوستی حاصل کی جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پاکستان کی پہلی مزاحیہ فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کے نام سے بنائی۔ اداکار کمال، آفاقی صاحب کی دریافت تھے۔ کئی روزناموں اور ہفت روزوں کے ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ آفاق میں پہلی مرتبہ اداکارہ نگہت سلطانہ کا انٹرویو لیا۔ انہیں یہ شرف بھی حاصل رہا کہ انہوں نے ہی روزنامہ آفاق سے فلم ایڈیشن کا آغاز کیا اور ان کے نام کے ساتھ آفاقی نام مشہور ہوا۔ (کو کہ وہ اپنے والد کی وجہ سے آفاقی لکھتے تھے)۔ ہفت روزہ فیملی میگزین کے اجراء کے ساتھ بطور ایڈیٹر مرتے دم تک رہے اور بانی ایڈیٹر کا شرف حاصل کیا۔ 1990ء سے ماہنامہ سرگزشت میں اپنی یادداشتوں کو فلمی الف لیلہ کے عنوان سے ترتیب دیتے رہے جس نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، ایوارڈز حاصل کیے اور فلمیں بنائیں مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

☆ انجم فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے۔ ''ہمارے والد صاحب کے دوست اور ممتاز قلم کار علی سفیان آفاقی وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ شاید فلمی الف لیلہ کی جگہ اب کچھ اور شروع کیا جائے گا۔ میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ خونخوار شیرنیاں کے بعد ابھی تک ''سنگم پور کا آدم خور'' شائع نہیں ہوئی۔ (الفاظ کے برتنے پر توجہ دیں)۔ اُمید ہے ''تذکرہ'' چمن کے بعد ''تذکرہ گلستان'' محترم اقلیم علیم صاحب کے ذریعے سے آپ تک پہنچ گئی ہوگی۔ (دونوں ہی سرگزشت کے انداز کی نہیں ہیں)۔''

☆ ڈاکٹر قرۃ العین نے اسلام آباد سے لکھا ہے۔ ''پشاور میں آرمی پبلک اسکول کے واقعے نے پوری قوم کو صدمہ پہنچایا۔ ہمیں بھی اس واقعے نے متاثر کیا ہے کیوں کہ میرے کزن کا بیٹا بھی اس سانحے میں شہید ہوا ہے۔ چار بہن بھائی اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ تین چھوٹے بہن بھائی جو جونیئر سیکشن میں تھے پیدل ہی گھر بھاگ گئے جب کہ یہ بڑا بھائی اسی کلاس میں تھا جس کے سب بچے شہید ہوئے۔ معصوم بچے تو ایک گولی سے مر سکتے تھے لیکن ان سفاک درندوں نے ان کو چھلنی کیا۔ میرے کزن کے بیٹے کے سر پر بہت سی گولیاں لگیں۔ (پھر بھی بہت سے لوگ ان درندوں کو برا نہیں کہتے) سلیم قیصر صاحب نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے۔ آپ کی مدد تو قانون کا کوئی ماہر ہی کر سکتا ہے۔ یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ سرگزشت کا فروری کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ علمی مضامین بہت اچھے رہے۔ باکمال میں آئن اسٹائن کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوا۔ خلا میں نماز، بابائے فارسی، سمندر کے بھید، خون کے آنسو بہت پسند آئیں۔ سچ بیانیاں بہت اعلیٰ درجے کی تھیں۔ سرگزشت نے اپنا معیار نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ رانا محمد شاہد صاحب کی والدہ کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''میں علی سفیان آفاقی انکل کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔ علی سفیان جیسا درخشاں باب بند ہو گیا لیکن کیا ہم ان کو بھول پائیں گے؟ کیا فلم انڈسٹری ان کی خدمات بھول جائے گی؟ شاید بھول جائے کیونکہ ہم بہت بے وفا اور بے حس لوگ ہیں، ہم اپنے محسنوں کو بہت جلد بھولتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے بہت سے حساس بھی موجود ہیں جن کے دل میں درد اور آنکھوں میں سوز کے آنسو مسلسل چمکتے ہیں اور علی سفیان صاحب کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ ان جیسے نفیس، شائستہ اور دوستوں کے غم خوار انسان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے اور ان کے گھر والوں کو صبر (آمین ثم آمین)۔ میں نے 27 جنوری کو ہی فیس بک پر علی سفیان آفاقی صاحب کے لیے سب دوستوں سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ ان گروپ میں تکمیل عشق، JDP فن کلب، سرگزشت، جاسوسی اور سسپنس گروپ اور چینی نکتہ چینی اور مشہور رائٹرز ناصر ملک، امجد جاوید اور طاہر جاوید مغل صاحب کو فون کر کے بتایا تو وہ سب بہت دکھی ہو گئے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے رہے۔ آفاقی صاحب کے جانے سے جو کمی ہمارے ادب کو ہوئی ہے وہ شاید کہ پوری نہ ہو۔ یہ دکھ تو ہمارا مشترکہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ بھلا پائیں گے۔ ادارے میں معراج رسول انکل کی پُرسوز باتیں پڑھ کے بہت دکھ ہوا کہ ہم سب مسلمان اتنے کمزور ایمان کے کیوں ہو گئے ہیں۔ کیوں اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ واقعی آج ہم تمام پاکستانی یکجانہ ہوئے تو پھر تا قیامت ہم یک جا نہیں ہوں گے۔ اللہ ہم سب پاکستانیوں کو اتفاق اور اتحاد سے رکھے۔ یک صفحی پہ بابائے فارسی جناب پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی کے بارے میں پڑھا علم کی

کی تھوڑی اور کم ہوگئی دل سے سرگزشت اور ادارے کے لیے دعا نکلی کہ ہمارے اتنے پیارے پیارے سرگزشت میں ہم طرح طرح کی معلوماتی تحریریں پڑھتے ہیں اور اپنی علمی طاقت میں اضافہ کرتے ہیں ویلڈن معراج رسول صاحب ادارے کی خدمات دینے کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ دن دگنی اور رات چگنی ترقی کریں، آمین۔ چلتے ہیں اب ذرا دوستوں کے خطوط پر کی طرف پہلے نمبر پر ہمارے پیارے دوست رانا محمد سجاد صاحب آئے۔ سچ کہتے ہو سجاد بھائی میرا دل کرتا ہے کہ میں سراپا بارود بن جاؤں اور ان تمام آدم خور جو انسانیت کے روپ میں چھپے درندے ہیں ختم کردوں۔ ظالموں نے نہ صرف معصوم بچوں کو آنکھوں اور سر میں گولیاں ماری ہیں بلکہ چھری سے ان کے گلے بھی کاٹے ہیں۔ میرے کالج سے صرف 15 یا 20 منٹ کے فاصلے پر یہ افسوس ناک حادثہ ہوا ہے۔ ہمارے کتنے اسٹاف ممبر کے رشتہ داران میں شامل تھے کچھ شہید ہوگئے کچھ زخمی ہوئے۔ ابھی تک پورا پشاور سوگوار ہے اور بچے اور ان کے والدین ذہنی مریض بن گئے ہیں۔ شکریہ سجاد بھائی آپ نے مجھے تبصرہ کرنے کے قابل سمجھا۔ بھائی محمد انور مردان والسلام شکریہ کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ بھائی سہیل احمد عباسی صاحب آپ کس برابری کی بات کرتے ہیں، میں نے کوئی نامناسب بات نہیں کی۔ ارے پھر میرے پیچھے پڑ جاؤ گے برابری تو بڑے بڑے پیغمبروں سے نہیں ہوئی تو تم عام مرد کیا کرسکو گے۔ جب عورت ایک ظالم شوہر کے ساتھ یا مغرور شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہے تو تم مردوں کا گزارا ایک عورت کے ساتھ کیوں نہیں ہوسکتا؟ عمران جونانی بھائی آپ کا خط اچھا اور دلچسپ لگا۔ بشریٰ افضل جی چھوڑیے لوگوں کو، ان کو تو حسد اور کینہ کے مرض نے مارا ہے۔ بشریٰ افضل جی مردوں سے عورت کی کامیابی اور شہرت کہاں برداشت ہوتی ہے۔ آپ لکھا کریں کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ بشریٰ جی ڈٹ کر مقابلہ کریں میری طرح، کمزوری نہ دکھائیں لکھا کریں۔ سرگزشت ہم عورتوں کا بھی ہے۔ ہم ہاون فیصد ہیں۔ ہمارا زیادہ حق بنتا ہے۔ ملتا نہیں تو ہم چھین لیں گے۔ اویس شیخ صاحب کا خط بھی کافی دلچسپ اور شاندار تھا۔ قیصر خان بھائی آپ نے میری تعریف کی شکریہ لیکن آپ مجھے آپا طاہرہ گلزار اور باجی گل صاحبہ بھی کہتے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں مجھے میرے، بہن بھائی اور کزن باجی گل کہتے ہیں۔ اب تو بھابیاں اور بھتیجے بھتیجی بھی باجی گل کہتے ہیں۔ آپ کا انداز تحریر بہت پیارا ہے قیصر بھائی۔ سید انور عباس شاہ کا طرز تحریر بہت اچھا ہے۔ بہت دلچسپ ہوتا ہے آپ کا خط لکھنا مجھے بہت پسند ہے شکریہ بھائی۔ رانا محمد شاہد بھائی اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ہر رشتے کا اپنا مقام ہے لیکن ماں کا تو مقام ہی اعلیٰ ہے آپ کا تحریر کردہ خط بہت اچھا لگا یہ اور بات کہ بھائی مجھے آپ نے یاد ہی نہیں کیا۔ منشی محمد عزیز میمن کا خلوص نامہ بھی واقعی خلوص سے پُر تھا سب کو یاد کیا لیکن مجال ہے کہ اس ناتواں بوڑھے عزیز میمن نے مجھے یاد کیا ہو۔ ویسے بڑا تفصیلی اور محنت لگانے والا خط تھا۔ ویلڈن۔ ناصرہ احمد آف امریکا ویلکم آپ کی تجویز بہت عمدہ ہے کاش کہ ہم قدم بڑھا سکیں۔ احمد خان توحیدی بھائی آپ کا یوں بے بی گڑیا بہن کہنے سے میں شرما گئی۔ ہائے بھائی اتنا پیار، اللہ آپ کو خوش اور سلامت رکھے آمین۔ آپ کا خط ہمیشہ کی طرح دلچسپ رہا۔ محمد خواجہ بھائی آپ کا خط بھی کافی دلچسپ لگا۔ کہانیوں پر آپ نے زبردست تبصرہ کیا ہے۔ آخری خط رانا فیصل جاوید کا خط بھی کافی بہتر تھا۔ آتے رہیے (پلیز ذرا مختصر لکھا کریں تا کہ دوسروں کو بھی موقع مل سکے)۔"

☆ محمد احمد رضا انصاری نے کوٹ ادو سے لکھا ہے۔ "میں سرگزشت کا تھوڑا پرانا قاری ہوں۔ پچھلے دو سال سے پڑھ رہا ہوں مگر پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اب بات ہوجائے فروری کے سرگزشت کی۔ اداریہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ انکل جی یہ دہشت گرد کیا مسلمان ہیں؟ شہر خیال میں سارے خط اچھے تھے۔ آئن اسٹائن کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ دوسری تحریریں بھی اچھی لگیں۔ اس کے بعد سیدھے اپنے پسندیدہ سلسلے "سراب" کی طرف لپکے۔ انکل جی یہ تو طویل ہوتا جارہا ہے میں سمجھا تھا کہ شاید چند اقساط باقی ہیں۔ پہلی سچ بیانی جاسوسی قسم کی لگی مگر بہت اچھی تھی۔ دوسری سچ بیانیاں بھی اچھی تھیں۔"

☆ سید انور عباس شاہ نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ "فروری 2015ء کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال کی خبر پر نظر پڑی۔ دل افسردہ تو بہت ہوا لیکن کیا کریں ایک نہ ایک دن ہم سب کو اس دنیا سے جانا ہی ہے۔ بہرحال رانا صاحب کے اس دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ رانا محمد سجاد اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت کی زینت بنے بہت بہت مبارک قبول فرمائیں۔ ملک محمد ظفر اللہ، محمد انور اور سہیل احمد عباسی مختصر لیکن مسحور کن تبصروں کے ساتھ "شہرِ خیال" کی زینت بنے۔ محمد عمران جونانی کراچی سے تشریف لائے، خوب مزے مزے کی باتیں کیں۔ بشریٰ افضل صاحبہ بھی اس دفعہ مختصر خط کے ساتھ حاضر ہوئیں لیکن کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی تھیں۔ بھئی لوگ آپ کے لکھنے پر کیوں حسد کرنے لگے۔ کم از کم میں نے تو سرگزشت میں کسی بہن بھائی کو آپ پر تنقید کرتے نہیں دیکھا۔ نہ پڑھا بلکہ آپ کی تعریف کرتے ضرور پڑھا ہے۔ آپ آتی رہا کریں۔ آپ تو ہماری عظیم بہن ہیں۔ اویس شیخ نے بھی خوب لکھا۔ قیصر عباس خان حسبِ دستور اپنے سابقہ خطوط کی طرح خوب صورت انداز میں جلوہ افروز ہوئے۔ رانا محمد شاہد سے بھی ملاقات ہوئی۔ منشی محمد عزیز میمن کا خط بھی شاندار اور مفصل تھا۔ ناصرہ احمد بہت دور سے تشریف لاکر شہرِ خیال پر چھا گئیں۔ فقیر غلام حسین ضیا اور خالد شیخ ملک بھکر سے تشریف لائے۔ ان کا خط دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات کا خزانہ لیے ہوئے تھا اس دفعہ کے شمارے میں ہم بھکر کے چار قاری شامل شہرِ خیال ہوئے، بہت خوشی ہوئی۔ درد دل رکھنے والے رحم دل انسان احمد خان توحیدی یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ بھائی سلیم قیصر کے لیے روزانہ دعائیں پڑھتے ہیں۔ خداوند کریم آپ کی دعائیں

قبول فرمائے۔ اس کے علاوہ عزیز اللہ، محمد خولجہ اور رانا فیصل جاوید کے خطوط بھی شاندار تھے۔ ایک دفعہ پھر چند عظیم ہستیاں بلیک لسٹ کی نذر ہو گئیں جن کا افسوس ہے۔ قابلِ احترام و معزز شخصیت شاہد جہانگیر شاہد اور ہردلعزیز بہن طاہرہ گلزار نہ تو شہرِ خیال کی زینت بنے اور نہ ہی بلیک لسٹ میں ان کا نام شامل تھا۔ خدا خیر کرے ان دونوں کو محفل میں نہ پا کر ہمارے ہاتھ خود بخود ان کی سلامتی کے لیے اٹھ گئے۔ خداوند کریم ان کو بھی مع اہل و عیال اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ میں ایک دفعہ پھر اپنے ان تمام بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری سلور جوبلی والی تجویز کو پسند کیا اور کر بھی رہے ہیں۔ انشاء اللہ سلور جوبلی نمبر سچ کے ساتھ اپنے وقت پر ضرور خوشبو بکھیرے گا۔ اس دفعہ ''فلمی الف لیلہ'' کو پڑھتے ہوئے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ ماضی کے لاہور کی سیر اور بارہ دروازوں کے بارے میں معلومات مع ان کی تصاویر۔ واہ کیا لاجواب خزانہ تھا۔ کون سی کمی تھی جو اس مضمون میں رہ گئی تھی۔ بہرحال ہر لحاظ سے یہ مضمون اپنی مثال آپ تھا۔ ''حوادثِ زمانہ'' ایک بے مثال تحریر تھی۔ مجبوریاں بھی انسان کو کہاں سے کہاں تک لے جاتی ہیں۔ مجبور انسان بالکل بے بس ہوتا ہے لیکن خدا کی ذات کہیں نہ کہیں سے کوئی راہ نکال ہی دیتی ہے۔ زیادتیاں نصرت کے ساتھ بھی ہوتی رہیں۔ نعمان سے شادی والی خواہش بھی پوری ضرور ہوئی مگر کچھ دیر کے لیے۔ واقعی قدرت کے بھید بھی نرالے ہیں۔ بچوں کے بارے میں محتاط رویے اور ظالموں کے گھناؤنے کرتوتوں پر مبنی کہانی ''شیطان، فرشتہ'' اپنی مثال آپ تھی۔ عبدل جیسے درندہ صفت انسان اب بھی ہمارے اردگرد دندناتے پھر رہے ہیں۔ ہمیں ان پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ ''سفاک محسن'' واقعی ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ اس عجیب و غریب واقعے نے پڑھتے وقت ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لپیٹ لیا۔ ہوش میں تب آئے جب کہانی ختم ہو چکی تھی بالکل فلمی سچویشن تھی اس واقعے میں۔ اس کہانی کا عنوان یعنی سفاک محسن مکمل طور پر واقعے سے مطابقت رکھتا تھا جس سے اس کی شان میں مزید اضافہ ہو گیا۔''

☆ اویس شیخ کا خلوص نامہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''اداریہ پڑھا ہی تھا کہ سانحہ شکارپور ہو گیا۔ مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آئی ایس آئی اور ان سے منسلک ادارے آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ دوسرا یہ کہ ایک طرف پوری قوم دہشت گردی کے خلاف یکجا ہو گئی لیکن ہمارے سیاستدان آپس میں اتحاد پیدا نہ کر سکے۔ کوئی جوڈیشل کمیشن کا رونا رو رہا ہے تو کسی کو فوجی عدالتوں پر تحفظات ہیں۔ ہر کوئی اپنے مفادات کے پیشِ نظر کام کرتے نظر آتے ہیں اور عوام دہشت گردی کا شکار ہو رہی ہے۔ رہی سہی کسر پیٹرول بحران نے پوری کردی ہے۔ ''بابائے فارسی'' پڑھ کے ایک اور شخصیت کا تعارف ہوا۔ ''شہرِ خیال'' کی جانب گامزن ہوئے۔ جونانی صاحب کا ''یک صفحی سرگزشت'' متعلق جملہ شاندار تھا۔ سدرہ بانو نا گوری اور طاہر گلزار غیر حاضر رہیں۔ ''معبرِ خیال'' کے خطوط نگاروں سے گزارش ہے اگر کوئی ''مینا نا مینا'' نمبر کی ایک عدد کاپی رکھتا ہے تو مجھے دے دے۔ بہت اشد ضرورت ہے۔ میرے پاس پہلے شمارہ تھا۔ ایک جاننے والے نے مجھ سے مانگا۔ جب میں لینے گیا تو اس نے شمارہ کھو جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ مجھے پیسے دے رہا تھا لیکن میں نے کہا جو چیز کھو گئی وہ ان پیسوں سے کئی گنا اہم تھی۔ ''باکمال'' تحریر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں لیکن یادگار اور محفوظ ہمیشہ کے لیے ہو گئی۔ ''خون کے آنسو'' ایک بار پھر رلا گئے۔ منظر امام کا مضمون پابندی کا شکار کتابوں کا ذکر مختصر اور جامع تھا۔ سمندری لٹیروں کا تذکرہ بس ٹھیک لگا۔ ''فلمی الف لیلہ'' کے مصنف علی سفیان آفاقی رحلت فرما گئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ لاہور کے بارہ دروازوں کا تفصیل سے ذکر بہت خوب لگا۔ ''الوداع'' سفرنامہ اس دفعہ دلچسپ تھا۔ ''عیارِ اعظم'' کی عیاری نے شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ سچ بیانیوں میں ''سفاک محسن'' ایک معاشرتی کہانی تھی۔ پاکستان کا ''مینی پاکستان'' پتا نہیں کسے اس کی نظر لگ گئی۔ وہ بھی ایک وقت تھا جب امریکی سفارت کار کہتے تھے کہ ہم 60ء کی دہائی میں سوچتے تھے کہ 80ء کی دہائی میں کون سا شہر نمبر ایک ہوگا۔ واشنگٹن، لندن یا پھر کراچی۔ ''قسمت'' ایک لائف کونسلنگ تحریر تھی۔ ''سوکن'' سچ بیانی میں حد سے بڑھا ہوا اعتماد نظر آیا۔ ''سنہری دھوپ'' پڑھی لکھی لڑکیوں کا المیہ یہ ہے کہ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ بیٹھتی ہیں۔''

☆ وحید ریاست بھٹی کا مکتوب کلر سیداں سے۔ ''ماہ فروری کا سرگزشت ابھی موصول نہیں ہوا تھا کہ دل دہلا دینے والی خبر ملی کہ سدا بہار شخصیت جناب علی سفیان آفاقی اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔ ابھی پچھلے شمارے ماہ جنوری میں آفاقی انکل لاہور کے قبرستانوں کا تذکرہ فرما رہے تھے، کیا خبر تھی کہ چند دن بعد خود بھی سپردِ قبرستان ہونے والے ہیں۔ معراج انکل یقین مانیں اشکوں کا سیل رواں ہے جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اللہ پاک ان کے عزیز و اقربا، ان کے چاہنے والوں اور آپ تمام حضرات کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ معراج انکل آپ سے ایک پُرزور گزارش ہے کہ آپ فی الفور مرحوم و مغفور جناب علی سفیان آفاقی صاحب پر ایک جاندار مقالہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب یا انور فرہاد صاحب سے قلمبند کروا کر اگلے مہینے شاملِ اشاعت فرمائیں۔ یہ آفاقی انکل کی یادوں اور وفاؤں کا ادنیٰ ترین صلہ ہوگا اور ان کے محبین پر احسانِ عظیم (آفاقی صاحب نے اپنے بارے میں اتنا مفصل لکھا کہ کوئی اور لکھ ہی نہیں سکتا)۔ روزِ اوّل کی طرح سب سے پہلے فکر انگیز اداریہ پڑھا جو کہ آپ نے حزن دل سے تحریر فرمایا تھا، خاص کر انتخاب شعر میں تو آپ کو ملکہ حاصل ہے۔ ماہر نباض کی طرح آپ نے شعر بھی درست تجویز فرمایا۔ یک صفحی سرگزشت میں پروفیسر ڈاکٹر سید سبطِ حسن رضوی صاحب کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ سید سبطِ حسن رضوی صاحب میرے استادِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کے استادِ گرامی تھے۔ ''معبرِ خیال'' میں کرسیٔ صدارت پر ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب رانا محمد سجاد صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے خیالات کو پڑھ کر لطف آ گیا۔ انہوں نے میری سالانہ رپورٹ کو بے حد سراہا۔ فقیر جذبات احسان مندی کا اظہار کرتا ہے۔ محترمی جناب محمد عمران جونانی صاحب، بشریٰ افضل صاحبہ، قیصر خان صاحب، بھکر اور سید انوار عباس شاہ صاحب نے ہماری

سالانہ رپورٹ کو سراہا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ منشی عزیز میرے، احمد خان توحیدی اور رانا فیصل جاوید کا بھی بے حد شکریہ جو انہوں نے سالانہ رپورٹ کو سندِ قبولیت بخشی، دوستو انشاء اللہ اگلے سال کوشش ہوگی کہ اس سے بھی بہتر انداز میں رپورٹ مرتب کی جا سکے۔ اس ماہ شاہد جہانگیر شاہد، طاہرہ گلزار صاحبہ، اعجاز حسین سٔحار، سدرہ بانو ناگوری، انجم فاروق ساحلی وغیرہ غائب تھے۔ اللہ خیر کرے (خطوط ملے مگر تب تک پرچا پریس جا چکا تھا) میرے خیالِ ناقص میں اس ماہ کا سب سے تعمیری خط محترمہ ناصرہ احمد فرام امریکا تھا۔ کتنی انسانیت ہمدرد تجاویز ان کے تخیل میں اقامت پذیر ہیں۔ اللہ پاک انہیں حسنِ نیت پر اجرِ عظیم عطا فرمائے ویسے بھی حدیث شریف ہے کہ سرکار نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا۔ ''مومن کی نیت اس کے عمل سے بڑھ کر ہوتی ہے۔'' معراج انکل ہم رانا محمد شاہد صاحب کی والدہ محترمہ کے وصال پر ان سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنی خصوصی رحمتوں، شفقتوں کے سائے تلے جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب انسانی تاریخ کے سب سے بڑے سائنسداں آئن اسٹائن کے حوالے سے زبردست تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے آئن اسٹائن کو اہلِ اردو کے لیے دوبارہ زندہ کر دیا۔ ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ معراج انکل سے ایک التماس کرنا چاہوں گا اگر ہو سکے تو معروف صوفی شاعر بیدم شاہ وارثیؒ کے حوالے سے کوئی تحریر شائع فرما دیں تو از حد مہربانی ہوگی۔ منظر امام صاحب پڑھنا منع ہے کے باوجود پڑھنے کے لیے مجبور کرتے نظر آئے۔ بہت قابلِ قدر ستائش مضمون جناب منظر امام صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ ویسے بھی میں کتابوں کے حوالے سے جانکاری کو پسند کرتا ہوں۔ ہمارے ہر دلعزیز جناب انور فرہاد صاحب شہداء کے حوالے سے تاثرات جمع کرتے نظر آئے۔ انور صاحب کا یہ پہلو بھی دل کو بھا گیا۔ محترمی ابنِ کبیر صاحب خلا میں نماز کے حوالے سے ایک یادگار تحریر لیے حاضر تھے۔ بہت خوب ابنِ کبیر جی۔''

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت ملا۔ واہ جی واہ تین تین صنف کرخت ٹائٹل پر براجمان ہیں۔ صنفِ نازک حیران و پریشان ہیں اپنی محفل میں پہنچے کرسیٔ صدارت رانا محمد سجاد کے حصے میں آئی۔ خاصا تفصیلی تبصرہ تھا۔ رانا محمد سجاد مابدولت تو ہر ماہ حاضری دے رہی ہیں۔ رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال پر دکھ ہوا۔ خدا ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ قیصر خان آپ کی دعائیں ہی تو ہیں کہ دشمن سے بچی ہوئی ہوں۔ میری پیاری بہن ہم کو 16 جنوری کو تنہا چھوڑ گئیں۔ ان کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا وہ وفات پا گئیں ہیں، بہت یاد آتی ہیں ان کے لیے دعائے مغفرت کریں سب ساتھی۔ میگزین لیٹ ملا اس لیے کہانیوں پر تبصرہ نہ کر سکی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور لکھوں گی۔''

☆ خرم علی راؤ کا ای میل۔ ''محترم آفاقی صاحب کی وفات پر تعزیت قبول کریں۔ میں اوّلین شماروں سے ہی سرگزشت کا قاری ہوں۔ اسی سے آفاقی صاحب سے شناسائی ہوئی۔ (آپ کا مضمون سرگزشت کے مزاج کا نہیں تھا۔ آپ اس قسم کی تحریر بھیجیں جو سرگزشت کا حصہ بنتی رہی ہیں)''

☆ عبدالقیوم اٹک شہر سے۔ ''میں رسالے کا سالانہ خریدار نہیں لیکن اٹک میں ایک دوست کی شاپ سے سرگزشت مل جاتا ہے۔ کچھ تحریریں تو ادبی لحاظ سے قابلِ قدر ہوتی ہیں اور کچھ اتنی دلچسپ کہ ہر ماہ رسالے کا انتظار رہتا ہے۔ مضمون کی شکل میں ایک مزاحیہ ''فلمی ایکٹرز سے مختصر انٹرویو'' ارسال ہے۔ (اس قسم کی تحریر سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے) تین سال کی عمر سے نصف صدی کراچی میں گزار کر گیارہ سال سے بنجر قسم کے ماحول میں سسک رہا ہوں۔ پہلی جماعت سے سیکنڈ ایئر ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ کراچی کی فلمی صنعت میں سالوں گزارے۔ پُرامن کراچی کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ یار دوست کچھ منوں مٹی تلے جا سوئے کچھ ہجرت کر گئے۔ یاد آتے ہیں تو دل اداس ہو جاتا ہے۔ دل میں ہوک سی اٹھتی ہے اور یہ سوچ بے چین کر دیتی ہے کہ نہ جانے کب یہاں سے چھٹکارا پا کر اصل وطن یعنی کراچی کو دیکھنا نصیب ہوگا۔''

☆ اشفاق احمد ڈرائیور، حضرو ضلع اٹک سے لکھتے ہیں۔ ''میں گزشتہ پندرہ سال سے سرگزشت کا قاری ہوں اور 2000ء سے لے کر اب تک تمام شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میرے بہنوئی جناب اختر رشید کو گھر کے پاس گولی مار دی گئی ہے اسی لیے خط بھیجنے میں تاخیر ہوئی۔ قارئین سے فاتحہ کی اپیل ہے۔ (بہت شکریہ کہ آپ نے جن دو کہانیوں کے بارے میں اطلاع دی۔ مصنف سے بازپرس کی جا رہی ہے)''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ''آج صبح سرگزشت کا شمارہ ملا اور اسی شام انکل علی سفیان آفاقی انتقال کر گئے۔ فلمی دنیا کا ایک بڑا نام کہ جنہوں نے ہمیشہ اپنے دامن کو فلمی دنیا کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ ''فلمی الف لیلہ'' ایسے رازوں سے بھری کتھا تھی جو ان کے سینے میں محفوظ تھی۔ ایک دھوپ تھی جو گزر گئی ساتھ آفتاب کے۔ انکل کے سینے میں کیسے کیسے راز تھے کہ ابنِ صفی کا ایک شعر یاد آ گیا ''جو ہم کہہ گئے وہی ہمارا فن ٹھہرا اسرار۔ جو ہم کہہ نہ پائے نہ جانے وہ کیا چیز ہوگی۔ اور ہم کہتے ہی رہ گئے کہ ''زمانہ تو بڑے شوق سے سن رہا تھا ہم ہی سو گئے داستان کہتے کہتے'' یکم فروری کے ایکسپریس اخبار میں امجد اسلام امجد نے آفاقی انکل کا تذکرہ بڑے اچھے انداز میں کیا اور سرگزشت کو ایک ادبی جریدہ قرار دیا جو کہ سرگزشت کے قارئین کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ انکل آفاقی کے لیے ہماری طرف سے ایک چھوٹا سا نذرانہ کہ سرگزشت کے صفحات کی رونقیں بکھر گئیں جن کے دم سے قائم تھیں وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ اداریے میں انکل نے ایک مرتبہ پھر 16 دسمبر کی یادیں تازہ کر دیں۔

عجب خوف اور کرب کا عالم ہے کہ معصوم بچوں کے پھول سے چہرے بھلائے نہیں بھولتے۔ روتی ماؤں اور اجڑے شہر پشاور کی اداسیاں، راتوں کو سونے نہیں دیتیں اور اس بار شکار پور کی امام بارگاہ میں قیامت کا منظر دیکھنے کو ملا۔ آنکھیں نم اور سینہ غم سے بوجھل (اگلے ہی جمعہ کو پشاور کی مسجد پر حملہ ہو گیا) بس خدا ہمارے حالوں پر رحم فرمائے۔ محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اس مرتبہ ہم ''شہر خیال'' کی محفل میں شرکت نہیں کر پائے لیکن دوستوں کے خطوط میں ہمارا نام دیکھ کر اچھا لگا۔ طاہرہ باجی جنوری کے شمارے میں آپ نے ہماری تعریف کی آپ کا بہت شکریہ۔ رانا سجاد اپنے مکتوب خاص کے ساتھ ''صدارت کی کرسی'' پر نظر آئے اور چھا گئے ویلڈن سجاد بھائی رانا شاہد بھائی کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ رب تعالیٰ ان کو اور ان کی فیملی کو صبر دے۔ سہیل احمد عباسی بڑی دیر کر دی آپ نے آتے آتے۔ ناصرہ احمد آپ کی تجویز تو عمدہ ہے لیکن یہ باتیں صرف کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں ان پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ انور بھائی آپ خود کو نالائق اور کند ذہن کیوں سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے مختصر لیکن بہت بہترین لکھا ہے۔ ویری گڈ ''باکمال'' میں ڈاکٹر ساجد امجد نے آئن اسٹائن پر لکھ کر کمال کر دیا اور اپنے خوب صورت انداز میں لکھ کر سرگزشت کے صفحات پر چار چاند لگا دیے۔ منظر امام کی ہدایت کے باوجود ''پڑھنا منع ہے'' ہم نے بڑے شوق سے پڑھا اور متنازع کتابوں کی فہرست کو فوراً اپنی ڈائری میں اتار لیا۔ انور فرہاد ''خون کے آنسو'' لے کر آئے اور اداس لوگوں کی اداسیاں بکھیر گئے۔ ابن کبیر آپ کی تحریر کے ہیرو نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوگا گو کہ چاند پر پہلا قدم رکھنے کا اعزاز امریکیوں کے سر تھا لیکن خلا میں نماز اور روزہ رکھنے کا سہرا مسلمانوں کے سر سجا اور تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنہری الفاظ میں امر ہو گیا۔ ''سفاک محسن'' ایک انوکھی تحریر تھی کہ جس نے لرزا کر رکھ دیا۔ سفاک محسن نے انسانیت کا ثبوت دے کر خود کو تعریف کا حقدار ٹھہرایا لیکن اس کا انجام دکھی کر گیا بہت سے راز فاش کرتی ''سوکن'' میں شہلا صاحبہ نے بروقت ہوش میں آ کر اپنے گھر کو لٹنے سے بچا لیا۔ ''حوادث زمانہ'' میں نصیرت کے ساتھ قدرت نے بڑا عجب کھیل کھیلا۔ باپ کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے اس تحریر میں واضح ہو گیا اور ہمیں بروقت ایک شعر یاد آ گیا کہ یتیمی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے دکھ عالی۔ سنا ہے باپ زندہ ہوں تو کانٹے بھی نہیں چبھتے۔ آخری سچ بیانی ''ساحر'' میں ساحر نے عجیب سا سحر طاری کر دیا۔ ساحر نے اپنے سحر سے مہرو کو بڑی اذیت دی اور آخر میں اس کا انجام سارے گناہوں کو دھو گیا اچھی تحریر تھی۔''

☆ منشی محمد عزیز مے لڈن ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ ''ایک بات کا اعتراف شاید آپ بھی کریں گے کہ جتنی محبت مجھے سرگزشت سے ہے۔ اتنی کسی اور سے نہیں۔ مجھ جیسا مجنوں عاشق شاید ہی کوئی ہوگا اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں ہر ماہ بذریعہ رجسٹری خط آپ کو بھیجتا ہوں اور شاید سب سے پہلا موصول ہونے والا خط۔ ہر ماہ میرا ہی ہوتا ہے۔ ایک اور آپ کی محبتوں کا ثبوت جو آپ نے محترم علی سفیان آفاقی کی وفات سے متعلق ایس ایم ایس مجھے بروقت کر دیا لیکن اسے میں اپنی بدنصیبی ہی کہوں گا کہ میں ابھی تک لاہور نہیں جا سکا۔ بہت افسوس ہوا یہ سن کر اللہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو یہ صدمہ جانکاہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے' آمین۔ آہ آفاقی انکل! میں نے تین چار مرتبہ ہفت

روزنامہ ڈیلی میگزین فون کیا تو آپریٹر نے کہا کہ گیارہ سے تین بجے کے درمیان بات ہو سکتی ہے اور میں...... غم دوران کے چکر میں ان کی آواز سننے سے بھی محروم رہا، آہ۔ فروری کا سرورق خاصا سنسنی خیز تھا۔ یہ غالباً ذاکر صاحب کے برش کا کمال ہے ناں؟ اداریہ پڑھ کر ایک بار پھر شہدا پشاور کی مغفرت کے لیے بے ساختہ ہاتھ اٹھ گئے۔ یقین کریں اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اس قسم کا دل دیا ہے کہ بقول شاعر خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ اب بھی اگر کبھی کھانا کھاتے ہوئے مجھے وہ معصوم بچے یاد آجائیں تو حلق سے نوالہ نیچے نہیں اترتا اور کتنا خوب صورت جواب دیا ہے آپ نے سید انوار عباس شاہ کو کہ ضروری نہیں کہ محترم شاہد جہانگیر یا طاہرہ گلزار کے قریبی عزیز بچے ہوں۔ وہ سب بچے ہمارے تھے۔ ہمارا مستقبل تھے اور بزدل دشمن نے ہمارے مستقبل پر حملہ کیا ہے۔ بہرحال ایک بات حوصلہ افزا ہے کہ اس عظیم سانحے نے ایک بار پھر پوری قوم کو متحد کر دیا ہے۔ اللہ کرے ہمارا یہ اتحاد و اتفاق ہمیشہ قائم رہے تو شاید دشمن کو دوبارہ یہ ناپاک جسارت کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ ''معبرِ خیال'' سے اس بار محترم شاہد جہانگیر شاہد اور طاہرہ گلزار صاحبہ غیر حاضر تھے۔ (دونوں کے خط پرچا پریس جانے کے بعد مجھ تک پہنچے) شاید ان میں حوصلہ نہ تھا کہ وہ اپنے پیارے شہر پر بیتنے والے اس سانحے کے بعد سرگزشت کے لیے کچھ لکھتے۔ محترم شاہد جہانگیر اور طاہرہ باجی! آپ دونوں کا غم یقیناً ہم سب سے بڑھ کر ہے لیکن جب مجھے اپنے دل کی کیفیت کا پتا ہے تو آپ کے دل پر بیتنے والی کیفیت میں بخوبی محسوس کر سکتا ہوں۔ اللہ ہم سب کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے، آمین۔ رانا محمد سجاد عرصے بعد آئے اور خوب آئے۔ کرسی صدارت کے لیے مبارک باد۔ سہیل احمد عباسی ویلکم بیک۔ محترمہ بہن روبینہ نفیس انصاری، ایم اے خالق بھٹی، عبدالروف عدم اور دیگر پرانے ساتھی کہاں غیر حاضر ہیں اور ہاں ہمایوں دین پوری کا کوئی پتا چلا دیکھیے میں نے تو خط لکھ کر رکھ دیا ہے اور بیگم سے کہہ دیا ہے کہ اگر میں مرجاؤں تو وہ خط سرگزشت کو بھجوا دینا۔ کہانیوں پر تبصرہ الٹی طرف سے۔ آخری سچ بیانی ساحر میں احسن کا ایک فقرہ کہا ہوا، ساری کہانی کا نچوڑ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ نیک عورتوں کے لیے نیک مرد اور بدعورتوں کے لیے بدکار مرد۔ دیگر یہ کہ اس ساحر کا انجام اچھا ہوا، خس کم جہاں پاک۔ حوادث زمانہ میں ڈاکٹر عبدالحفیظ نے بے سہارا عورتوں کے جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے۔ چلیے نصرت کو کچھ تو فائدہ ہوا۔ شیطان فرشتہ پڑھ کر دل دہل گیا۔ عبدل جیسے درندوں کو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے تاکہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت کرنے سے پہلے سو بار سوچے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا قانون بہت نرم ہے شاید۔ خانہ بدوش رنجیدہ کر گئی۔ بعض اوقات انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ ''سنہری دھوپ'' اس ماہ کی بہترین سچ بیانی تھی۔ یہ ان لڑکیوں کے لیے سبق ہے جو محبت کے نام پر لٹ جاتی ہیں۔ حسنیٰ اور اس کی سہیلی کا فعل بہت اچھا تھا۔ صائمہ اقبال کی ''آسیب محبت'' پُراسرار سی عشقیہ داستان لگ رہی تھی یا شاید یہ سدرہ کی چھوٹی بہن سارہ کی کارستانی تھی۔ ''سوکن'' میں فرزانہ نے بہت زبردست جال بچھایا تھا لیکن ثنا کے خاندان کی قسمت اچھی تھی جو ایڈووکیٹ صاحب نے فرزانہ کا سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ بہرکیف اپنے شوہر کے معاملات سے لاتعلق رہنے والی عورتوں کے لیے اس میں بہترین سبق پوشیدہ ہے۔ ''قسمت'' کو اس ماہ کی دوسری بہترین کہانی کہا جا سکتا ہے۔ نایاب کا جذبہ قابل تعریف ہے کہ اس نے اپنی ہمت کے بل بوتے پر اپنے گھریلو حالات اور مریض باپ کو بھی بھلا چنگا کر دیا۔ ''سفاک محسن'' پہلی سچ بیانی تیسرے نمبر پر رہی۔ تنویر کی قسمت یقیناً اچھی تھی جو وہ بچ گیا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ ''خلا میں نماز'' اس شمارے کی بہترین تحریر ہے دیگر تحریروں میں باکمال، خون کے آنسو، پڑھنا منع ہے اور سمندر کے بھید پڑھ چکا ہوں۔''

☆ ناصر حسنین رند بہاولپور سے رقمطراز ہیں۔ ''سب سے پہلے آپ کا اظہاریہ پڑھا۔ آپ کے خیالات اور قلم کے جہاد پر ہمارے دل سے بید عا نکلی اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم پر سلامت رکھے' آمین۔ ''خون کے آنسو'' انور فرہاد کی 16 دسمبر کے سانحے پر غور طلب تحریر تھی جس میں انوہم کھیر اور سلمان خان نے ہمارے شہید بچوں کے لیے جن عظیم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے دل سے خود بہ خود یہ دعا نکلی کہ رب العالمین انوہم کھیر کو اسلام کی دولت نصیب فرمائیں اور سلمان خان کے ایمان کی حفاظت فرمائے، آمین۔ ''خلا میں نماز'' ابن کبیر کی عمدہ تحریر تھی۔ شیخ مظفر نے جب خلا سے زمین کی طرف نگاہ کی تو سورہ رحمٰن کی اس آیات کا ترجمہ پڑھ کر تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دل کی عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ ''پڑھنا منع ہے'' منظر امام ویری گڈ۔ ہمیشہ کی طرح الگ سی تحریر لائے۔ ایسی کتابیں جن کا پڑھنا ممنوع ٹھہرا اگر منظر امام صاحب ان کتابوں کا ذکر بھی کر دیں جو پاکستان اور دنیا میں بام عروج تک پہنچیں تو ہم ان کے شکر گزار رہیں گے۔ ''سمندر کے بھید'' عائشہ جو نیجو ہاتھی والے کی طرح سمندر کے بھید لیے حاضر تھیں۔ وہ پہلے کی طرح انوکھی اور حیرت میں لیے تحریر لاتی ہیں۔ ان کی چوائس شاندار ہے۔ سچی کہانیوں میں آخر میں لکھی جانے والی تحریر ''ساحر'' نے واقعی سحر میں مبتلا کر دیا۔ حیرت انگیز اور اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس طرح کے شیطانی قوتوں کے لوگ دنیا میں اتنی طاقت رکھتے ہیں تو اللہ کے رحمانی بندے کتنی طاقت رکھتے ہوں گے۔ آخر میں قرآن کی اس آیات سے صدفی صد ہم متفق ہیں کہ نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بدکار مردوں کے لیے بدکار عورتیں۔ آخری کہانی ''ساحر'' اول رہی۔ دوم ''آسیب محبت'' صائمہ اقبال ہمیشہ کی طرح سسپنس تجسس سے بھرپور شاہکار لیے حاضر تھیں۔ اگر اس تحریر کو نفسیاتی مسئلہ سمجھیں تو پھر فلم ''مدہوش'' جان ابراہم اور بپاشا باسو کی دیکھیں اور اگر روحانی نظر سے دیکھیں تو پھر تبو کی ''ہوا یا آ گئی''۔ تیسرے نمبر پر ''قسمت'' رہی۔ ''سنہری دھوپ'' افسانوی رنگ لیے ہوئے تھی۔ رانا محمد سجاد اتنا عمدہ لکھنے اور صدارت کی مبارک۔ رانا محمد شاہد کاش ایسے موقع پر جب آپ کی والدہ ماجدہ دار فانی سے رخصت ہو گئی ہیں ہم آپ کے گلے لگ کر افسوس

کرتے، کیا کر سکتے ہیں ہر کسی نے جانا ہے، اللہ تعالیٰ مہربان رحیم آپ کی والدہ کو فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سہیل احمد عباسی! بھائی آپ کی غیر حاضری دل کو پریشان کر دیتی ہے کیا کریں آپ 1991ء میں ''سحر خیال'' میں داخل ہوئے اور ہم 1992ء میں۔ آپ سے تعلق ہی ایسا ہے بہر حال ہمارے بلانے پر آنے کا شکریہ۔ ڈیئر معراج رسول صاحب ہم نے سلور جوبلی کی تجویز نومبر 2012ء اور پھر دوبارہ مارچ 2014ء کو دی پھر وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہے۔ سب سے پہلے ہماری تجویز کی تائید خود آپ نے کی۔ 2012ء کو ہم نے لکھا کہ آپ کے پاس صرف دو سال کا وقفہ ہے اس لیے کام شروع کر دیں آپ نے لکھا انشاء اللہ ہماری تجویز بورڈ کے سامنے رکھی جائے گی۔ خیال بہت اچھا ہے۔ پھر منشی محمد عزیز مئے نے اور جاوید خان درانی سرکانی نے سب سے پہلے بھرپور تائید کی تھی۔ لکھنے کا مقصد یہ ہے جب آپ نے ہماری تجویز قبول کر کے تیاری شروع کر دی تو ایک موصوف فرما رہے ہیں کہ ہماری تجویز ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے شاہد جہانگیر شاہد کی تحریر شاعر اعظم کو سال دو سال بعد ہم شاعر ولی کے نام سے سرگزشت میں شائع کروا دیں تو شاہد جہانگیر شاہد اور ادارہ کا ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ جو ضرور بیان کر دیجیے گا۔ بہر کیف ان خطوط کی فوٹو کاپی ثبوت کے ساتھ خط کے ہمراہ ہے۔ برائے مہربانی توجہ دیجیے گا۔ ان دنوں خونی چاند کا بہت زیادہ تذکرہ ہے یہودی کہتے ہیں جب آگے پیچھے 4 دفعہ خونی چاند بلڈ مون دنیا میں نظر آئے تو پھر ہمارا عظیم بادشاہ کا ظہور ہوگا۔ یعنی ''خروج دجال'' ہوگا۔ جن کا وہ پانچ صدیوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ پہلا خونی چاند 15 اپریل 2014ء کو نظر آیا۔ دوسرا خونی چاند 8 اکتوبر 2014ء کو ہوا۔ اب تیسرا خونی چاند 4 اپریل 2015ء کو نظر آئے گا۔ چوتھا اور آخری خونی چاند 28 ستمبر 2015ء کو نظر آئے گا۔ سلور جوبلی میں یا اس سے پہلے اس پر تحقیق اور معلوماتی تحریر لکھیں۔ جنوری کے شمارے میں شیراز خان، ... لے نے آب حیات لکھی۔ تلاش کی طرح عجیب زبردست تحریر تھی۔ ہمارے خیال میں وہ حیرت انگیز اور عجیب و غریب کہانیاں لکھنے پر ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ سرگزشت میں اچھا اور خوب صورت اضافہ ہیں۔ ان کو سرگزشت سے نہ جانے دیجیے گا۔ آپی طاہرہ گلزار آپ نے اتنی محبت سے پہلی برتھ ڈے کی مبارک باد دی کہ دل چاہا کہ پشاور پہنچ کر آپ کا منہ میٹھا کر دواؤں۔ سدرہ بانو ناگوری کہاں گم ہو گئیں؟ عمران جونانی آپ کا انتہائی مشکور ہوں۔ بشریٰ افضل بہنا ہمیشہ خوش رہیں۔ منشی عزیز مئے، احمد خان توحیدی اچھا لکھ رہے ہیں۔ عزیز اللہ کافی عرصے بعد ''سحر خیال'' میں آئے۔ انہوں نے مایا تحریر سے نہیں بن کھن اور کالے بچھو کے بارے میں جو معلومات دی ہے تو ہم عرض کریں جناب وہ کام تو ''وگرا'' بھی کر دیتا ہے۔ یہ کوئی اور چکر ہے۔ یا تو کینسر والا معاملہ ہے یا کوئی اور۔ معراج رسول صاحب سے گزارش ہے کہ بن کھن (زہریلا چھپکلا) اور کالے بچھو پر معلوماتی تحریر شائع کریں۔ سلور جوبلی نمبر غالباً اگست میں شائع ہوگا؟ ''با کمال'' آئن اسٹائن کا اس خط کے بعد مطالعہ کریں گے۔ اس تحریر کا شدت سے انتظار تھا۔ شکریہ۔

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا مختصر مگر بھرپور خط پشاور سے۔ ''گزشتہ چند ماہ سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا جس کی وجہ چند بہت ہی عزیز ہستیوں کا دنیا سے کوچ کر جانا ہے۔ سب سے بڑھ کر جس واقعے نے خون کے آنسو رلائے ہیں وہ آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچوں اور اساتذہ کا انتہائی بے دردی سے قتل ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت سب سے سستی چیز انسانی جان ہے۔ ماضی میں ہمارے حکمرانوں نے حماقتوں سے جو فصل بوئی وہ آج ہم کاٹ رہے ہیں۔ زخم زخم پشاور آج بھی سوگوار ہے۔ اللہ رحم کرے۔ اسکول کا غم تازہ ہی تھا کہ حیات آباد کی مسجد میں عین جمعہ کی نماز میں حملہ ہو گیا۔ وہ بھی تو کلمہ گو ہیں۔ عین نماز میں خودکش حملہ، اف خدایا۔ سرگزشت کے دیرینہ کالم نگار، فلم ساز و کہانی نویس علی سفیان آفاقی بھی ہم سب کو چھوڑ گئے۔ سحر خیال کے ساتھی رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال پر تعزیت۔ اس سے زیادہ اور کچھ لکھنے کی تاب نہیں۔ آئندہ ماہ بھرپور تبصرہ کے ساتھ حاضری دوں گا۔''

☆ مجید احمد جائی ملتان شریف سے رقمطراز ہیں۔ ''بندہ ناچیز کو مجید احمد جائی کہتے ہیں۔ منشی عزیز مئے کی دعوت پر ہم بھی شاملِ حال ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ امید ہے دل میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔ آپ سب کے لیے نیا ضرور ہوں لیکن ملتے ہیں تو ساتھ رہے گا۔ معراج رسول کا اداریہ پڑھتے ہی دل خون کے آنسو رونے لگا۔ شہدا پشاور کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں کو نیست و نابود کرے۔ مقبول ترین سلسلہ سحر خیال میں قدم جمائے تو رانا محمد سجاد کو صدارت کی کرسی پر براجمان پایا۔ تفصیلی تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس کے علاوہ پیارے دوست منشی محمد عزیز مئے اور رانا محمد شاہد بورے والے جن کو جانتا بھی ہوں بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ملک محمد ظفر اللہ، سہیل احمد عباسی، محمد عمران، اویس شیخ، بشریٰ افضل، قیصر خان، سید انوار عباس شاہ، ناصرہ احمد، فقیر غلام حسین ضیا، خالد شفیع، احمد خان توحیدی، عزیز اللہ، رانا فیصل جاوید شاندار تبصرے فرما رہے تھے۔ سبھی کو مبارک باد قبول کیجیے۔''

بصد افسوس مندرجہ ذیل قارئین کے خطوط تاخیر سے موصول ہوئے۔

ارباز خان، ذہیب اچکزئی (پشاور)، نادر مرزا (اسلام آباد)، صبیح اکرام (مظفر گڑھ)، دونیہ حسن (ساہیوال)، نازش صدیقی (کراچی)، فتح دین (سکھر)، ارشد علی وارث (جہلم)، مانی (دینہ)، اکرم ترمذی (ملتان)، عباس علی خان (دبئی۔ یو اے ای)

ڈاکٹر ساجد امجد

استادِ ادب

آزادی کے بعد اردو ادب میں ایسے گنتی کے نام ابھرے جنہیں ہم معمار اردو ادب کہہ سکتے ہیں۔ انہی نابغہ روزگاروں میں ایک نام ابواللیث صدیقی ہے جنہیں ہم فخریہ پاکستان کا اہم قلم کار کہہ سکتے ہیں۔ ان کے کاٹ دار جملے، پینی نظر، الفاظ کی پرکھ اور جملوں کی مضبوط ساخت اپنی مثال آپ ہے مگر ان کی زندگی کتنے عجیب انداز میں گزری، کن مصائب کا سامنا رہا۔ یہ بلند مقام کس جہد مسلسل کے بعد حاصل ہوا' اسے یاد رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کی زندگی سے ہی سبق بہ آسانی حاصل ہوتا ہے۔

کہانیاں جھوٹ بول سکتی ہیں، آنکھوں دیکھی کو جھوٹ کون کہے۔ ماضی نے حال کے بستر پر کئی شکنیں ڈال دی تھیں لیکن اب وہاں بھی اتنا تھا کہ جس دروازے پر ہیج کا ہاتھی جھوما کرتا تھا اب دو گھوڑوں کی بگھی آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اس حویلی نما مکان کے ایک مکین منشی مظفر علی اس بگھی پر سوار ہو کر شام کی سیر کے لیے نکلتے تو کئی کہانیاں ان کے آگے آگے چلتی تھیں۔ ایک کہانی سب سے زیادہ پُرعظمت تھی۔ وہ یہ کہ یہ صاحب جو بگھی میں بیٹھے ہیں اور جن کے چہرے پر نرمی اور جلال کے ملے جلے تاثرات نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے لیے ان کے اجداد نے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

اس سے بھی پیچھے چلے جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادے کے ایک بزرگ قاضی صدر الدین بہ عہد سلطان غیاث الدین بلبن سبزوار سے ہندوستان آئے اور بدایوں پہنچے۔ بدایوں کے قاضی سعد الدین کے جانشین ہوئے اور انہی کی دختر سے شادی کی۔ جب انہوں نے اتنی ترقی کر لی تو ان کے والد ملک حمید الدین سبزواری نے بھی رختِ سفر باندھا، سبزوار کو خیر باد کہا اور بدایوں آ گئے۔ یہ بزرگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آل میں سے تھے۔ ان کی علمیت کو دیکھتے ہوئے دربار دہلی سے انہیں اعلیٰ مناصب عطا ہوئے۔ انہی بزرگ کی مناسبت سے یہ خاندان ''حمیدی'' کہلانے لگا۔ قاضی صدر الدین کے تعلق سے اردگرد کے علاقے کو قاضی محلہ کہا جانے لگا۔

اس خاندان کے شجر سایہ دار کی شاخیں پھیلیں تو حمیدیوں کے بہت سے مکانات تعمیر ہو گئے۔ اس خاندان کے فرزندوں نے بدایوں کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی میں ایسے نمایاں کردار ادا کیے کہ بزرگوں کی عزت و عظمت کو چار چاند لگا دیے۔

وقت اور آگے بڑھا۔ ضرورتوں نے پاؤں پھیلائے۔ دلوں میں دبی گنجائشوں نے پاؤں سمیٹ لیے۔

نااتفاقیوں نے زور باندھا تو آنکھوں میں دیواریں اٹھنے لگیں۔ حصے بخرے ہونے لگے جن کی دسترس میں تھا انہوں نے اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوا لیے۔ مظفر علی نے بھی اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوا لیا۔ یہ مکان بھی کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔ اتنا خوب صورت بنا تھا کہ ماضی کی شان و شوکت کو حال کی آنکھوں سے دکھا رہا تھا۔

☆......☆

دیوان خانے میں چار دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک نظام الدین نظامی، نظامی پریس بدایوں کے مالک تھے۔ دوسرے اختر الاسلام تھے جو جیلر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ تیسرے دوست مولوی ہیبہ احمد صاحب تھے اور چوتھے خود منشی مظفر علی تھے۔

گفتگو کے دوران میں نظامی صاحب خاموش بیٹھے رہے تھے لیکن جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو نظامی صاحب نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''میرے خیال میں تو آپ کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ ہمیں آپ سے بچھڑنے کا دکھ ضرور ہو گا لیکن بدایوں سے آگرہ دور ہی کتنا ہے۔ آپ کے دل میں اگر ہماری محبت ہو گی تو ہفتہ پندرہ دن میں بدایوں کا پھیرا لگا سکتے ہیں۔ میں تو اکثر آگرہ جاتا رہتا ہوں۔ اگر آپ نہ آئے تو اپنے اخبار میں اشتہار چھاپ کر آپ کو بلا لوں گا۔ غرض ملاقات ہو ہی جایا کرے گی۔ ترقی کا ایک موقع ہاتھ آ رہا ہے تو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے نظامی صاحب۔'' منشی مظفر علی کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''جب ٹھیک ہے تو پھر کیا ہے؟''

''سوچتا ہوں دوستوں کی چوکڑی ختم ہو جائے گی۔ دو شہروں کا فاصلہ بہرحال فاصلہ ہوتا ہے۔ یوں شام کو روز کیسے مل سکیں گے۔ نوکریاں ہزار مل جائیں گی دوست کہاں ملتے ہیں۔''

''مظفر علی! بعض فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جاتے ہیں۔ لوگ سرکاری نوکری اس لیے کرتے ہیں کہ ترقی کریں۔ اس کے لیے سفارشیں کراتے ہیں آپ کو تو کسی سفارش کے بغیر ہی ترقی مل رہی ہے۔ بدایوں نہ سہی آگرہ سہی۔ میری تو یہی رائے ہے ویسے آپ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔''

اختر الاسلام صاحب نے بھی اس وقت یہی رائے دی۔ ''مظفر علی، یہ انگریز کا دور ہے انگریز کا۔ کسی ہندستانی کو ترقی ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ میں جیلر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے لوگ اس ترقی کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھیے یہ قوم بڑی ظالم ہے جسے انگریز کہتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ آپ نے ان کے احکامات ٹھکرا دیے تو زندگی بھر کے لیے ترقی کے خواب دیکھنا چھوڑ دیجیے گا۔ رجسٹرار خفیہ عدالت کوئی معمولی عہدہ نہیں ہوتا، آگرہ بڑا شہر ہے، بچوں کو اچھے اسکول بھی میسر آئیں گے۔ میں بھی نظامی کی طرح یہی مشورہ دوں گا کہ آگرہ چلے جاؤ۔''

مظفر علی سر جھکا کر سن رہے تھے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن تو ہو گئے ہیں لیکن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں۔ ابھی ان کے دل و دماغ نے کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا ہے۔

دوست رخصت ہوئے تو وہ غالباً کچھ مزید سوچنے کے لیے اپنے کتب خانے میں چلے گئے۔ ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ شرفا کے مشغلے شاعری پر بھی کاربند تھے اس لیے ان کے کتب خانے میں شعرا کی دواوین کثرت سے تھے۔ ان میں بھی زیادہ تعداد شعرائے لکھنو کے دواوین کی تھی۔ نثر کی کتابیں بھی اچھی خاصی تھیں۔ طلسم ہوشربا اور داستانِ امیر حمزہ سے لے کر شعرا کے تذکرے تک، سب کچھ تھا۔

ملازم نے حقہ تازہ کر کے رکھ دیا تھا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ میں ان کا ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ بدایوں چھوڑ کر آگرہ چلا جاؤں یا اسی ملازمت پر گزارہ کرتا رہوں؟ دوستوں کی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ کبھی ایک فیصلہ کرتے تھے تو کبھی دوسرا۔ درمیان میں کتابوں کی ورق گردانی بھی کرتے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کم از کم ایک فیصلہ کر لیا۔ آخری مرتبہ بیوی سے اور پوچھ لوں پھر جو وہ کہیں گی وہی کروں گا۔

وہ کتب خانے سے نکل کر اپنی بیوی فاطمہ صغرا کے پاس پہنچ گئے۔ فاطمہ صغرا کا شمار صرف خاندان ہی میں نہیں شہر بھر میں تعلیم یافتہ اور ذہین خواتین میں ہوتا تھا۔ ان کے خاندان میں عورتوں کے لیے لکھنے پڑھنے کا رواج ممنوع نہیں تھا البتہ لکھنے لکھانے پر پابندی تھی۔ اکثر عورتیں فارسی، اردو روانی سے پڑھتی تھیں لیکن انہیں لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ اس میں یہ نکتہ پوشیدہ تھا کہ لڑکیاں کسی کو عشقیہ خطوط نہ لکھ سکیں۔ اس وقت کی تہذیب کا بھی تقاضا تھا۔ اس پابندی کے باوجود فاطمہ صغرا نے اپنی تعلیم کو اس حد تک مکمل کیا تھا کہ

نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی دسترس حاصل کی تھی۔

فاطمہ صغرا اس وقت کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھیں کہ شوہر کی آہٹ سن کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بڑا بیٹا ابوظفر بھی قریب بیٹھا تھا۔ فاطمہ صغرا اٹھ کر بیٹھیں تو ابوظفر باپ کی شکل دیکھ کر وہاں سے کھسک گیا۔

فاطمہ صغرا بلا کی چہرہ شناس تھیں۔ شوہر کو دیکھتے ہی سمجھ گئیں کہ وہ اس وقت کسی الجھن میں ہیں۔

''خیر تو ہے آج دوستوں کے ساتھ بڑی لمبی نشست ہوگئی؟'' فاطمہ صغرا نے پوچھا۔

''وہ تو کب کے رخصت ہوگئے۔ میں تو کتب خانے میں تھا۔ وہیں سے سیدھا چلا آرہا ہوں۔''

''ایسا کیا سوال انہوں نے پوچھ لیا کہ آپ کو کتابوں کی ضرورت پڑ گئی۔''

''سوال ایسا ہے کہ جواب کتابوں میں بھی نہیں مل سکا۔ سوچا استانی جی سے پوچھا جائے۔''

''چھوڑیے بھی کیوں مذاق کرتے ہیں۔ میں کہاں کی عالم فاضل ہوگئی۔''

''میں اس وقت مذاق نہیں کررہا ہوں۔ میں واقعی الجھ گیا ہوں۔ آپ ہی کچھ بتا سکتی ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''اللہ خیر کرے۔ ایسا کیا معاملہ پیش آگیا۔''

''بیگم بات یہ ہے کہ میری ترقی کے احکامات آئے ہیں۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے۔''

''اُفوہ، مجھے تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ تو خوشی کی خبر ہوئی اس میں الجھن کیسی۔''

''آگے تو سنو۔ وقت یہ ہے کہ میری تعیناتی آگرہ میں ہوئی ہے۔''

''آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے ولایت جانا ہے۔ آگرہ، بدایوں کا ایک محلہ ہی تو ہے۔''

''ہم نے کس چاؤ سے یہ مکان بنوایا تھا۔ اب اسے چھوڑنا پڑے گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ بدایوں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں احباب ہیں، اجداد کی قبریں ہیں، عزیز رشتے دار بھی سب قریب قریب ہیں اب تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اب فاطمہ صغرا سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ سمجھ گئیں کہ معاملہ سنجیدہ ہے۔ ترقی کا ایک موقع ملا ہے اور مظفر علی اس سنہری موقع کو ٹھکرانے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس موقع پر انہیں سمجھانا ضروری ہے۔

''دیکھیے انسان اور پتھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پتھر ایک جگہ پڑا رہتا ہے جب کہ انسان آگے بڑھتا ہے۔ آپ کے عہدے میں اضافہ ہورہا ہے تنخواہ بھی بڑھے گی۔ ابوظفر کو ہم اچھی تعلیم دلا سکیں گے۔ چاروں کی زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوجائے تو کوئی حرج ہے کیا؟ میرے خیال میں تو ہمیں آگرہ چلے جانا چاہیے۔''

''اور یہ مکان؟ اور بدایوں؟''

''ہم یہ مکان فروخت تھوڑی کررہے ہیں۔ بدایوں آنا جانا لگا رہے گا۔ اسی مکان میں ٹھہریں گے اور پھر ہمیشہ کے لیے تھوڑی جائیں گے۔ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد بدایوں ہوگا اور ہمارا یہ گھر۔''

''تو آپ کی رائے بھی یہی ہے۔''

''صرف میری رائے نہیں میرا اصرار بھی یہی ہوگا۔''

''اب کسی اور سے کیا پوچھنا جب آپ نے بھی میرے دوستوں کی رائے سے اتفاق کرلیا تو اب آپ تیاری کریں۔ میں آگرہ جا کر رہائش کے لیے کوئی اچھا سا مکان دیکھتا ہوں۔''

وہ آگرہ گئے۔ پیپل منڈی وہاں کا ایک مشہور محلہ تھا۔ اس محلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ایک گھر کسی ہندو کا تو اس کے برابر کسی مسلمان کا ٹھکانا اور لطف یہ کہ سب اس محبت سے رہتے تھے کہ مذہب کی کوئی تفریق ہی نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے، کیا ہندو کیا مسلمان۔

اسی محلے میں مظفر علی نے بھی رہنے کے لیے مکان لے لیا۔ مکان کے سامنے ایک ہندو وکیل رہتے تھے۔ مظفر علی کا تعلق بھی چونکہ عدالت سے تھا لہٰذا وہ سب سے پہلے اس وکیل سے ملے اور اپنے آگرہ آنے کی نوید سنائی۔

مکان کا بندوبست ہوجانے کے بعد مظفر علی بدایوں آئے۔ بیوی اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹ ہی چکی تھیں۔ زائد سامان گھر میں بند کیا۔ ضروری سامان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئے۔ پلٹ کر گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر لگی سنگ مرمر کی تختی پر نظر پڑی جس پر ان کا اپنا کہا ہوا شعر کندہ تھا

رگ گل کی طرح رکھا ہے تنکوں کو نشیمن کے
پھلے پھولے مرے اللہ شاخ آشیاں میری

☆......☆

آگرہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا۔ دہلی سے پہلے بھی

دارالخلافہ تھا۔ میر تقی میر، مرزا غالب اور نظیر اکبر آبادی کے نام یاد دلاتا تھا۔ ادبی فضا بھی مظفر علی کے حسب منشا تھی۔ وہ بہت جلد یہاں کے ماحول میں ڈھل گئے۔ فطرتاً مجلسی مزاج کے حامل تھے۔ بہت جلد احباب کا کثیر حلقہ جمع کرلیا۔ اس حلقے میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ کیمیا گری کا شوق رکھنے والے بھی اور موسیقی کی تانوں پر سر دھننے والے بھی۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے جو اپنا تمام وقت اسی وسیع و عریض گھر میں گزارتے تھے۔ غائب ہوئے تو ہفتوں غائب آکر پڑے تو جانے کا نام ندارد۔

مظفر علی نے اپنی ملازمت میں بھی خوب ترقی کی۔ مختلف عہدوں سے ہوتے ہوئے آخری منصر مجی تک پہنچے اور ''منصرم صاحب'' کہلانے لگے۔

مظفر علی نے کبھی کہا تھا۔ ''پھلے پھولے مرے اللہ شاخ آشیاں میری۔'' شاید اس کی قبولیت کا وقت آ پہنچا تھا۔ فاطمہ صغرا نے شوہر کو خوش خبری سنائی کہ شاخ آشیاں میں ایک پھول کا اضافہ ہونے والا ہے۔

آگرہ کی سردیاں عروج کو چھونے کے بعد بہار کے موسم کی طرف راغب تھیں کہ چیپل منڈی کے اس مکان میں نومولود کے رونے کی آواز سنائی دی۔

مظفر علی نماز فجر ادا کرنے کے بعد گھر لوٹے تھے کہ اس خوش خبری نے ان کی سماعت کو شادکام کیا۔ اس بچے کا تاریخی نام ابواللیث صدیقی دانش مند تجویز ہوا جس کے اعداد سے 1335ھ برآمد ہوتا تھا۔

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ آسمان ادب پر ستارے کی طرح چمکے گا۔ محقق، مدبر، مدرس، نقاد، صحافی اور ماہر لسانیات ہوگا اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے نام سے نامور ہوگا۔

اس کا بچپن گھٹنوں چلتا ہوا اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ چار سال کا ہوگیا تھا۔ اس وقت کے مسلمان گھرانوں میں اور تقریباً اب بھی یہ عمر ایسی ہوتی ہے جب رسم بسم اللہ کے بعد بچے کی تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے۔

وہ اس عمر کو پہنچا تو مظفر علی کو شوق ہوا کہ بسم اللہ کی تقریب دھوم دھام سے کی جائے۔ دوستوں کا بھی اصرار ہوا کہ اس بہانے مل بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔ مظفر صاحب کا بیٹا پڑھنے کی عمر کو پہنچے اور تقریب نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

مظفر علی نے فاطمہ صغرا سے ذکر کیا کہ گھر کی منتظم تو وہی تھیں اور اس اعتماد کے ساتھ ذکر کیا کہ یہ خبر سنتے ہی بیوی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا۔

''لیث میاں خدا کے فضل سے چار سال چار ماہ کے ہوگئے ہیں۔''

''اللہ رکھے۔''

''اب اس کی رسم بسم اللہ ہونی چاہیے۔ بچہ ہے خوش بھی ہو جائے گا اور دوستوں کو جمع کرنے کا موقع بھی ملے گا۔'' بات خوشی کی تھی لیکن فاطمہ صغرا کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''میں نہیں چاہتی کہ میرا یہ بچہ بھی کسی حادثے سے دوچار ہو۔ ہمیں یہ رسم راس نہیں آتی۔ میں اس تقریب کے حق میں نہیں۔''

''وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔ اس وہم کو دل سے نکال دو۔ کوئی حادثہ زندگی کو آگے بڑھنے سے روک نہیں دیتا۔''

''جانتی ہوں لیکن کیا کروں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ ابواللیث کی بسم اللہ کا سن کر مجھے اپنا پہلا بچہ یاد آگیا۔ اس کی بھی بسم اللہ ہوئی تھی لیکن کیا ہوا چند دنوں بعد ہی میرا بچہ کس بے بسی کی موت مرگیا۔''

مظفر علی نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانیں۔ یہ تقریب نہ ہوسکی۔

اس کا پس منظر یہ تھا کہ ابواللیث کا بڑا بھائی جس کی رسم بسم اللہ ہوئی تھی اس کے چند دنوں بعد جل کر فوت ہوگیا تھا۔ فاطمہ صغرا اس صدمے سے نکل نہیں سکی تھیں بلکہ ایک وہم سا ہوگیا تھا۔ وہ اسی لیے ایسی کسی تقریب سے گریزاں تھیں۔

مظفر علی کو تو سرکاری کاموں سے فرصت نہیں تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری فاطمہ صغرا پر ہی تھی۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ پڑھی لکھی تھیں۔ بڑے بیٹے ابوظفر کو بھی وہی پڑھاتی تھیں۔ اب ابواللیث بھی پڑھنے کے لائق ہوگیا تھا۔ کسی مدرسے میں بھیجنے سے پہلے وہ خود اسے لے کر بیٹھ گئیں۔

چند روز ہی میں انہیں اندازہ ہوگیا کہ ابواللیث پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ بھی ہے اور ذہین بھی۔ متین ایسا کہ تختی دے دی جاتی اور وہ گھٹنوں بیٹھ کر لکھتا رہتا۔ کھیل کود سے کم ہی سروکار تھا۔ چند مہینے نہیں گزرے تھے کہ وہ اردو قاعدہ روانی سے پڑھنے لگا۔ اب وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ اسے کسی مدرسے میں داخل کرادیا جائے۔

انہیں محلے کے قریبی مکتب میں بھیج دیا گیا۔ عمر ایسی نہیں تھی کہ کہیں دور بھیجا جاتا۔ فاطمہ صغرا اسے اپنی آنکھوں کی چھاؤں میں رکھنا چاہتی تھیں۔

اس مکتب کے استاد مولوی سلامت اللہ تھے۔ نہایت بھاری بھرکم، گھنی داڑھی، چہرے سے غصہ ٹپکتا تھا۔ شاید ہی کوئی بچہ ہو جو ان کی مار کھانے سے بچا ہو لیکن ابواللیث ایسا خلیق و ذہین تھا کہ وہ دو سال ان کے مدرسے میں رہا لیکن کبھی مار نہیں کھائی۔ جو سبق ملتا فرفر سنا دیتا۔ لکھنے میں وہ مشاق، ہم جولیوں کی شرارتوں سے وہ دور پھر سزا ملتی تو کیوں۔

وہ صرف دو سال یہاں گزارنے کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اسے کسی دوسرے اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ نگاہِ انتخاب اسلامیہ ہائی اسکول پر پڑی اور اسے یہاں داخل کرا دیا گیا لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ یہ انتخاب غلط تھا۔ یہ اسکول گھر سے بہت دور تھا۔ آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ فاطمہ صغرا نے محسوس کیا کہ وہ اسکول سے آتا ہے تو بہت تھک چکا ہوتا ہے اگر کسی قریبی اسکول میں داخل کرا دیا جائے تو گھر پر پڑھنے کے لیے بہت وقت مل جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر کسی اچھے اسکول کی تلاش شروع ہوئی۔ قرعہ فال وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام نکلا۔ اس کا تبادلہ کرایا گیا اور وہ وکٹوریہ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا لیکن چین کی بنسری بجاتے صرف دو سال گزر سکے۔

مظفر علی منصر جی کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی دیانت داری کے چرچے پورے شہر میں تھے۔ مزید ترقی کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک مختصر سی علالت کے بعد مظفر علی کا انتقال ہو گیا۔ یہ اس خاندان کے لیے معمولی صدمہ نہیں تھا۔ بقول شخصے کچا ساتھ تھا۔ بچے ابھی چھوٹے تھے۔ ابواللیث کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس سے بھی دو چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی ابوظفر کی عمر بھی زیادہ سے زیادہ چودہ سال تھی۔

ان کی موت کا صرف گھر میں ہی کہرام نہیں تھا۔ شہر بھر میں سوگ کا عالم تھا۔ ایسی مقبول شخصیت تھے کہ جس نے سنا افسوس کیا۔ جس دن تدفین تھی عدالتیں ان کے سوگ میں بند ہو گئیں۔

جنازہ اٹھنے ہی والا تھا کہ بعض قریبی عزیز جو بدایوں سے آئے تھے انہوں نے اصرار کیا کہ تدفین بدایوں میں ہونی چاہیے۔ خاندانی قبرستان بدایوں میں ہے۔ وہاں سب بزرگوں کی قبریں ہیں۔ مظفر علی بھی اپنے ولد کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ بدایوں کی سرزمین اولیا اللہ کی سرزمین ہے۔ مظفر علی کو اسی پاکیزہ زمین میں سپردِ خاک کرنا چاہیے۔

جنازہ تیار تھا اور یہاں یہ بحث ہو رہی تھی۔ فاطمہ صغرا تو ایسی بے حال تھیں کہ کوئی رائے دینے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ بہرحال یہی طے ہوا کہ تدفین آگرہ میں نہیں ہو گی بلکہ میت بدایوں لے جائی جائے گی۔

اتنا وقت کس کے پاس تھا کہ گھر سمیٹا جاتا۔ بھرا پرا گھر آگرہ میں موجود بعض عزیزوں کے سپرد کیا۔ جلدی جلدی میت کو ٹرین سے بدایوں لے جانے کا بندوبست ہوا۔

میت بدایوں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے بچے اور بیوہ بھی ساتھ تھے۔

خاندانی قبرستان میں جو حوض قاضی قبرستان کہلاتا تھا منصرم مظفر علی کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا۔

چند دن کی تعزیت اور رسم دنیا داری نبھانے کے بعد جب اعزہ رخصت ہوئے تو فاطمہ صغرا کو یوں محسوس ہوا جیسے سارے جہان کی دھوپ ان کے گھر میں اتر آئی ہے۔ وہ جو سایہ تھا جو دھوپ سے بچائے رکھتا تھا سروں سے ہٹ گیا ہے۔ انہیں وہ دن یاد آئے جب وہ بدایوں سے آگرہ جا رہی تھیں۔ انہوں نے مظفر علی سے کہا تھا ہم ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہے ہیں۔ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد اسی گھر میں چلے آئیں گے۔ پھر وہی بدایوں ہو گا وہی گھر۔ گھر وہی تھا مگر گھر والا چلا گیا تھا۔ مدت ملازمت ختم نہیں ہوئی تھی کہ زندگی کی مدت ختم ہو گئی۔ گھر کے دروازے کھلے ضرور لیکن میت وصول کرنے کے لیے۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ عزیز و اقارب تو جائیداد پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری آنکھیں بھی بند ہو جائیں اور بچے بے سہارا رہ جائیں۔ مجھے جلد از جلد بچوں کو کسی قابل بنانا ہو گا تاکہ باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی حفاظت کر سکیں۔ انہوں نے اس وقت بڑی ہمت سے کام لیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پہلے بھی انہی کے ہاتھ میں تھی اب ذمہ داری اور بڑھ گئی۔ انہوں نے مظفر علی کے دوستوں سے مشورہ کیا اور ابواللیث کو مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس نیک دل خاتون نے یہ روایت برقرار رکھی تھی کہ اسکول گھر کے قریب ہو۔ مشن اسکول گھر کے قریب بھی تھا اور تعلیمی معیار بھی بہت اچھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر ایک اینگلو انڈین تھے۔ اساتذہ کی اکثریت بھی عیسائی تھی لیکن ہندو، مسلمان اور سکھ بھی تھے۔

مشن اسکول سے آٹھویں پاس کرنے کے بعد اسے یہ اسکول چھوڑنا پڑا کیوں کہ یہ اسکول آٹھویں تک ہی تھا۔ اب اسے میٹرک کرنے کے لیے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لینا پڑا جو گھر سے خاصا دور تھا۔

وہ صبح ناشتا کر کے اسکول کے لیے نکلا تھا۔ فاصلے کا اندازہ کیا تو اسکول تک پہنچتے پہنچتے تین چار میل کا فاصلہ طے کرلیا ہوگا۔ ناشتا ہضم ہو چکا تھا اور اب باقی وقت خالی پیٹ اسکول میں گزارنا تھا۔ کچھ پہلے دن کی اجنبیت کچھ بھوک، بڑی بے چینی سے وقت کٹا۔ چھٹی ہوئی تو پیٹ میں کچھ ڈالنے کی فکر ہوئی۔ باہر نکلا تو اسکول کا مٹھائی فروش راجا رام نظر آیا۔ اس سے مٹھائی لی اور گھر کی طرف واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ تین چار میل پھر چلنا تھا۔

کچھ دن اور گزرے تو اسکول کا گراؤنڈ بھی دیکھ لیا جہاں اسکول کے طلبہ چھٹی کے بعد مختلف کھیلوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہ بھی ان کھیلوں میں حصہ لینے لگا۔ اب معمول یہ ہو گیا کہ صبح گھر سے ناشتا کر کے اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا اور شام کو کھیل سے فارغ ہو کر گھر کو لوٹتا تو مغرب کی اذان ہو رہی ہوتی۔ جیب میں پیسے ہوتے تو اسکول کے مٹھائی فروش سے کچھ لے کر کھالیتا ورنہ واپسی پر شام کا کھانا ہی نصیب ہوتا۔ ریڈیو ٹی وی وغیرہ قسم کی چیزیں تو آئی نہیں تھیں وقت گزاری کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا کہ پڑھنے بیٹھا جائے۔

اسکول میں کچھ دن گزارنے کے بعد جب وہ میٹرک میں آیا۔ تعلیمی شعور بڑھا اور اچھے برے اساتذہ کی تمیز ہوئی تو اس نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ اسے اپنے استاد سبطین احمد کی ذات میں نہایت کشش معلوم ہوئی۔ وہ اسے انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ گریجویٹ بہت سے ہوتے ہیں لیکن وہ تو علم کا بحرِ ذخائر تھے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی اس قابلیت کے لوگ نہیں ہوتے جس پائے کے وہ تھے۔

ان کی قابلیت اور شخصیت دیکھ کر کسی طرح ان سے راہ ورسم پیدا کی جائے۔ کلاس میں سبطین صاحب کا رعب بہت تھا۔ بچے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ پڑھائی کے علاوہ ان سے کوئی بات کر سکے لیکن جب وہ ان کے قریب گیا تو معلوم ہوا وہ جتنے سخت نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔

سبطین صاحب، ابواللیث کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے لہٰذا جب ایک مرتبہ وہ وہاں گیا تو بار بار جانے لگا۔ وہ اسکول ٹیچر تھے لیکن اپنی علمیت کے اعتبار سے اپنی ذات میں علمی و تحقیقی ادارہ تھے۔ اعلیٰ پائے کے کتنے ہی لوگ تھے جو ان کی ذات سے فیض اٹھا رہے تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر ابواللیث کا ادبی ذوق پروان چڑھنے لگا۔ اس کا شوق دیکھ کر سبطین صاحب کی مہربانیاں بھی اس پر بڑھنے لگیں۔

ابواللیث کے دل میں جب ادبی ذوق نے جگہ بنائی تو اس نے والد کے کتب خانے کا رخ کیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا کتب خانہ تقریباً بند پڑا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ والدہ کا حکم تھا نصاب کی کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کو پڑھنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

وہ ڈرتے ڈرتے کتب خانے میں داخل ہوا اور پھر جیسے وہ کسی نمائش میں آگیا ہو جس میں نادرالوجود اشیا سجی ہوئی ہیں۔ تمام شعرائے لکھنو کے دواوین الماریوں میں ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ پھر وہ نثر کی کتابوں کی طرف گیا۔ اس نے محسوس کیا یہ اس کا خاص ذوق ہے۔ اس نے خود ہی طے کرلیا کہ کچھ لکھنے کے لیے لکھنا آنا چاہیے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ لکھا کیسے جاتا ہے۔ کون سا اسلوب اختیار کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ نثر کی کتابیں پڑھی جائیں۔ طلسم ہوشربا کی جلدیں رکھی ہوئی تھیں اس نے ایک جلد اٹھائی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے پڑھا کیسے جائے۔

اس نے ماں کی نظروں سے چھپ کر ان کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ ”طلسم ہوشربا!“ ختم کی تو وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔

اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ”اردو“ کیا ہوتی ہے۔ نئے نئے الفاظ سے آشنائی ہوئی جو نصاب کی کتابوں سے میسر نہیں آسکتی تھی۔ بعض الفاظ اس کے لیے اجنبی تھے۔ لغت کی مدد سے اس نے ان معموں کو حل کیا۔

داستانوں کی جتنی کتابیں مہیا تھیں ایک ایک کر کے سب پڑھ ڈالیں۔ پھر وہ شعراء کے تذکروں کی طرف مائل ہوا۔ ان کو پڑھ کر تو وہ یہ سوچنے لگا کہ اس کی اصل منزل تو یہ ہے۔ تذکرے لکھنے والوں نے کیسی جانفشانی دکھائی ہے۔ شعرا کے حالات کس محنت سے جمع کیے ہیں۔ انہیں کتنی تحقیق کرنی پڑی ہوگی۔ اسے شاید پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہوگا کہ ادب میں تحقیق کی اہمیت کیا ہے۔ لاشعوری طور پر وہ تحقیق کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔ ان تذکروں میں جو اشعار تھے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو اشعار سمجھ میں نہ آتے انہیں سبطین

صاحب کی خدمت میں لے کر پہنچ جاتا وہ نہ صرف شعر کا مطلب سمجھاتے بلکہ اس شاعر کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کرتے جو تذکروں میں بھی درج نہ ہوتے تھے۔ اس طرح نہ صرف اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا بلکہ سبطین صاحب کی علمیت کا سکہ بھی دل پر بیٹھتا رہا۔

ان تذکروں کے عمیق مطالعے کے بعد جب وہ شعرا کے دواوین کی طرف راغب ہوا تو منظرنامہ بالکل صاف تھا۔ کس شاعر کا رنگ سخن کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔ تشبیہات واستعارات کا نظام کیا ہوتا ہے۔ آتش و ناسخ میں فرق کیا ہے۔ لکھنوی شعرا کن معنی میں دہلوی شعرا سے مختلف ہیں۔

اس کے والد کے کتب خانے میں لکھنوی شعرا کے دواوین کثرت سے تھے لہٰذا پہلے پہل وہ غالب سے نہیں آتش، ناسخ، امیر مینائی وغیرہ سے واقف ہوا۔ وہاں کی زبان، وہاں کا طرز کلام، وہاں کے ادبی مناقشے سب اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گئے۔

اس کے ادبی ذوق کو مہمیز دینے کے لیے بدایوں کا شاعرانہ ماحول بھی موجود تھا۔ یہاں شعروشاعری کا ایسا چرچا تھا کہ کم وبیش ہر پڑھا لکھا آدمی دو چار شعر تو کہہ ہی لیتا تھا۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے شاعری ہوتی تھی۔ اس کے محلے میں بھی کئی شاعر تھے جن کے پاس اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا تھا۔

سبطین صاحب سے علمی بحثیں ہونے لگیں۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ اس کم عمری میں ابواللیث ادب کا ایسا پارکھ بن گیا ہے۔ وہ اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

"شاعری کے جھنجٹ میں مت پڑنا۔ تمہارا مزاج علمی وتحقیقی ہے اس پر کاربند رہنا۔"

وہ یہ مشورہ دے رہے تھے اور ابواللیث سوچ رہا تھا کہ تعلیمی سلسلہ چلے گا کیسے۔ یہ دن اس کی زندگی کے سخت آزمائش کے تھے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتا ہے۔

ذرائع آمدنی محدود کیا مفقود ہو گئے تھے۔ کچھ تو والد کی وفات کی وجہ سے اور کچھ برادر بزرگ کی ناوانی کی وجہ سے۔ رئیسوں کی اولاد کو نالائق مصاحب جس راستے پر لگاتے ہیں وہی راستہ بھائی صاحب نے دیکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سال میں والدہ صاحبہ سخت پریشانیوں میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے چند اصول تھے جن میں ایک یہ تھا کہ وہ اس بھرم کو قائم رکھنا چاہتی تھیں جو والد مرحوم کی زندگی میں قائم تھا اس لیے کسی عزیز قریب سے بھی کسی قسم کی مدد ان کو گوارا نہ تھی۔ دوسرے قرض لینا ان کی شریعت میں حرام تھا تیسرے مکان، جایداد اور زمینداری کو بیچ کر کھانا انہیں قبول نہ تھا۔ کئی سال ہم نے ایسی سختی میں گزارے کہ میں ان کو لکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا، نہ اس سے کوئی فائدہ۔ اپنے زخموں کو ہرا کر کے بہت سے عزیزوں کو اب کیا مطعون کروں۔"

1932ء میں جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ بدایوں میں کوئی کالج (رفعت وبوہ، ابواللیث صدیقی) نہیں تھا کہ مزید تعلیم کے لیے وہاں داخل ہوا جاتا۔ قریبی ضلع بریلی میں کالج تھا لیکن وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ بچپن میں کبھی بریلی کے پاگل خانے کا تذکرہ سنا تھا۔ یہ تصور اس کے ذہن میں کچھ ایسا جاگزیں ہو گیا تھا کہ جیسے بریلی میں ہر طرف پاگل ہی گھوم رہے ہوں گے۔

سبطین صاحب کی زبان سے اس نے علی گڑھ کے ایسے قصے سنے تھے کہ وہ علی گڑھ جانے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کے خاندان کے اکثر وبیشتر افراد نے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ خود اس کے بڑے بھائی ابوظفر علی گڑھ کے طالب علم رہے تھے۔ ان سب باتوں نے مل جل کر اسے علی گڑھ کی طرف راغب کیا لیکن والدہ کی اجازت کے بغیر وہ یہ قدم کیسے اٹھا سکتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر والدہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"امی جان! کالج میں میرے داخلے کا مسئلہ ہے۔"

"بدایوں میں کوئی کالج ہے نہیں۔ بریلی تم جانا نہیں چاہتے تو کیا بدایوں میں کالج کھلنے کا انتظار کرو گے۔"

"میں چاہتا ہوں آپ علی گڑھ کالج میں میرے داخلے کا بندوبست فرما دیں۔"

"ابوظفر کو میں علی گڑھ بھیج کر دیکھ چکی۔ اس میں جو بگاڑ پیدا ہوئے ہیں وہ وہاں کے ماحول ہی سے ہوئے ہیں۔ اب میں تمہیں وہاں بھیج کر دوسرا زخم نہیں کھا سکتی۔"

"بھائی کے بگڑنے میں ان کے اپنے مزاج کا قصور ہوگا۔ ورنہ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والے تو بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں ایسی کوئی خرابی نہیں۔ وہ تو مسلمانوں کا واحد ادارہ ہے جہاں قابل ترین اساتذہ ہیں۔ طلبہ کو نماز تک کی تلقین کی جاتی ہے۔ اب سبطین صاحب ہی کو دیکھ لیں۔ وہ بھی تو وہیں کے گریجویٹ ہیں۔"

''منجھلو بٹیا! مجھے تجھ سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو وہاں سے کچھ بن کر ہی لوٹے گا لیکن حالات تیرے سامنے ہیں۔ میں ابوظفر کی تعلیم پر اتنا خرچ کر چکی ہوں کہ اب مزید خرچ کرنے کی سکت نہیں۔ کسی سے قرض لینے کی میں روادار نہیں۔''

گھر کے حالات ابواللیث سے چھپے ہوئے نہیں تھے اور پھر اس کی ماں نے ایسی درد بھری آواز میں اپنی بے بسی کا ذکر کیا کہ وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ بس جسے کہتے ہیں دل مسوس کر رہ گیا۔

اسے علی گڑھ نہ بھیجا جائے لیکن کچھ نہ کچھ تو اسے کرنا ہوگا۔ گھر میں کئی دن تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر بڑے بھائی نے ایک تجویز پیش کی کہ اسے ہومیو پیتھک ڈاکٹری کرنی چاہیے۔ ابواللیث ظاہر ہے اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ سبطین احمد اور میر محفوظ علی سے ملاقاتوں کے بعد اس کا ذہن ادب کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ وہ تو اردو ادب میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دینا چاہتا تھا۔ ہومیو پیتھی اس کے بس کی کہاں تھی لیکن اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ یہی ہوا۔ اس کے ایک عزیز معین احمد حمیدی تھے جو تھے تو سرکاری ملازم لیکن ہومیو پیتھی سے شوق رکھتے تھے۔ ان سے بات کی گئی اور ابواللیث صدیقی کو ان کی شاگردی میں دے دیا گیا لیکن قدرت کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھی۔

معین احمد حمیدی کے مشورے سے بذریعہ خط کتابت کلکتہ کے ایک ہیومیو پیتھک کالج سے ہومیو پیتھی کی کچھ کتابیں اور ایک عدد ''سند'' منگوائی گئی۔ دواؤں کے بکسے بنوائے گئے۔ دوائیں خریدی گئیں اور ڈاکٹری کا کاروبار شروع کر دیا گیا۔

اس شغل کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بدایوں میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ استاد حمیدی صاحب کے دل میں خدمت خلق نے جگہ بنائی۔ اس وقت مخلوق خدا کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ جب ہم ڈاکٹر ہیں تو ہیضے میں مبتلا لوگوں کا مفت علاج کرنا چاہیے۔ انہوں نے دواؤں کا بکس اٹھایا۔ ابواللیث کو ساتھ لیا اور ان محلوں میں پہنچ گئے جہاں اس وبا کا زور تھا۔

یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ فاطمہ صغرا کو معلوم ہوا تو انہیں ابواللیث کی فکر ہوئی۔

''آپ اسے احتیاطی تدابیر کے بغیر ایسے مریضوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ میں اپنے بچے کو آپ کے پاس نہیں جانے دوں گی۔'' انہوں نے نہ صرف اسے حمیدی صاحب کے ساتھ جانے سے روک دیا بلکہ ابواللیث کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔

آہستہ آہستہ قدرت اسے اس مقام پر لاتی جا رہی تھی جو اس کا اصل مرکز تھا۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے سے بال بال بچ گیا۔

اسی دوران میں کچھ ایسے خاندانی مسائل سامنے آئے کہ اس کا نکاح ضروری ہو گیا۔ یہ عمر شادی کے لیے ہرگز مناسب نہیں تھی۔ ابھی نہ کوئی روزگار تھا نہ آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ۔ پھر شادی کیسی لیکن مجبوری تھی پھر یہ طے ہوا کہ نکاح ابھی کر دیا جائے۔ رخصتی بعد میں کسی وقت دیکھی جائے گی۔ خالہ زاد ریحان فاطمہ شریکِ سفر بنیں۔

یہ نکاح نہایت سادگی سے ادا ہو گیا۔

نکاح کے بعد ذمہ داری کا احساس خود بخود ہونے لگا۔ ہومیو پیتھی بھی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ اس نے سوچا اس سے پہلے کہ کسی اور بکھیڑے میں پھنسا دیا جاؤں علی گڑھ جانے کا کوئی بندوبست کر لیا جائے۔ علی گڑھ میں داخلے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ للہذا موقع اچھا تھا۔ یہ مسئلہ پھر بھی درپیش تھا کہ کسی سفارش کے بغیر داخلہ ممکن بھی ہو سکے گا؟ اگر کہیں سے سفارشی خط مل جائے کم از کم اتنا ہی ہو کہ علی گڑھ پہنچ کر کوئی کالج تک پہنچانے والا مل جائے۔ گھوم پھر کر اس کی نظر اپنے ایک عزیز مولانا یعقوب بخش راغب کی طرف گئی۔ مولانا نہایت عالم فاضل تھے۔ علی گڑھ میں ان کے بہت سے شناسا تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔

''میرے ایک دوست ہیں پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری علی گڑھ میں سنسکرت کے استاد ہیں۔ ان کے نام خط لکھے دیتا ہوں علی گڑھ جا کر ان سے مل لینا۔ وہ تمہاری ضرور مدد کریں گے۔''

ابواللیث نے وہ خط ان سے لے لیا اور گھر چلا آیا۔

اس وقت اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف علی گڑھ جانے کا فیصلہ کر رہا تھا۔ یہ اس کا شوق علمی ہی تو تھا۔

20 ستمبر 1932ء کی رات کو ٹرین میں بیٹھ گیا۔ جیب میں صرف اتنے پیسے تھے کہ ریل کے کرائے کے بعد شاید دو چار دن کا خرچ نکل آتا۔

وہ علی گڑھ اسٹیشن پر اترا تو ایسی خوشی ہوئی جیسے چاند پر پہلا قدم رکھ دیا ہو۔ اپنی خوشی کو چھپاتا ہوا۔ اسٹیشن سے باہر

آیا تو علی گڑھ کے مشہور یکے نظر آئے۔ اس نے یکے والے کو یونیورسٹی چلنے کے لیے کہا۔ اس کے پاس تعارفی خط تو موجود تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یونیورسٹی میں حبیب الرحمٰن شاستری کا مکان کہاں ہے۔ یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ یونیورسٹی پہنچ کر کسی سے بھی معلوم کیا جاسکتا تھا۔ یکہ جونہی یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوا ایک صاحب سائیکل پر جاتے نظر آئے۔ اس نے ان سے پوچھا۔ حبیب الرحمٰن کا مکان کدھر ہے۔ نہ ان صاحب نے تفصیل پوچھی نہ اس نے بتائی۔

''یکہ واپس سڑک پر لے جائیں۔ کوئی دو تین سو گز چلو گے تو حبیب الرحمٰن کا مکان نظر آجائے گا۔'' ان صاحب نے کہا۔

ابواللیث نے یکہ واپس مڑوایا اور ان صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر چلتا ہوا مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو جواب میں ایک لڑکا باہر آیا۔

''حبیب الرحمٰن صاحب کا مکان یہی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''ان کے نام خط ہے اسے اندر پہنچا دیجیے۔ شاید وہ مجھے بلوالیں۔''

وہ لڑکا خط لے کر چلا گیا اور جلد ہی واپس بھی آگیا۔ خط اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ خط پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری کے نام ہے۔ یہاں تو شعبہ تعلیم کے استاد حبیب الرحمٰن رہتے ہیں۔''

''حبیب الرحمٰن شاستری کہاں رہتے ہیں آپ کو معلوم ہے؟''

''جی نہیں۔ یونیورسٹی میں کہیں رہتے ہوں گے۔'' صاحب زادے نے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پوچھنے والے سے حبیب الرحمٰن کا پتا پوچھا تھا۔ پنڈت حبیب الرحمٰن کا نہیں۔ اسی لیے یہ خواری اٹھانی پڑی۔ وہ ضرور یونیورسٹی کے احاطے میں کہیں رہتے ہوں گے۔ وہ پھر یونیورسٹی آگیا۔ پنڈت جی کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ پتا تو معلوم نہ ہوسکا البتہ یہ معلوم ہوگیا کہ وہ شہر میں کہیں محلہ بالائے قلعہ میں رہتے ہیں۔ دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اتنا تو معلوم ہوا۔ ''بالائے قلعہ'' میں پہنچ کر مکان مل ہی جائے گا۔ یہ اطمینان اس وقت غارت ہوگیا جب یکے والے نے آگے جانے سے انکار کردیا۔ یونیورسٹی میں تعطیلات تھیں اس لیے

سوانحی خاکہ

نام: ابواللیث صدیقی
والد: منشی مظفر علی
والدہ: فاطمہ صغرا
وطن: بدایوں (بھارت)
پیدائش: آگرہ
تعلیم: ایم اے (اردو)، پی ایچ ڈی (علی گڑھ یونیورسٹی کا پہلا پی ایچ ڈی)
ملازمت: علی گڑھ کالج، علی گڑھ یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور۔ جامعہ کراچی۔
اہلیہ: ریحان فاطمہ
اولاد: زہرا صدیقی، پروین صدیقی، ثریا صدیقی، ابراہیم مظفر، مظفر صدیقی۔
تاریخ پیدائش: 15 جون 1916ء
وفات: 7 ستمبر 1994ء
تدفین: اسٹاف قبرستان، جامعہ کراچی۔

وہ ڈپارٹمنٹ میں تو مل نہیں سکتے تھے اور یکے والا آگے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں تو پھولنے ہی تھے۔ اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ یونیورسٹی آرہا تھا تو ڈاک خانے کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کے رشتے کے ایک چچا یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں۔ اس نے یکے والے کو راضی کیا اور ڈاک خانے پہنچ گیا۔ دل میں ڈرتا بھی جارہا تھا کہ اگر وہ بھی نہ ملے تو کیا ہوگا۔ کسی ہوٹل یا سرائے میں ٹھہرنے کے لیے تو جیب میں پیسے بھی نہیں ہیں۔ شکر ہوا کہ اس کے چچا کرم احمد سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی یکے والے سے اور یکے والے کی اس سے جان چھوٹ گئی۔ کرم احمد نے اس کی داستان سنی اور وعدہ کرلیا کہ ڈاک خانے سے اٹھنے کے بعد وہ اسے لے کر پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری کے پاس جائیں گے چنانچہ اس دن سہ پہر کو وہ چچا کے ساتھ بالائے قلعہ پہنچ گیا۔ ڈاک خانے والوں کو پتا تلاش کرنے کی کیا وقت۔ ذرا سی دیر میں مکان کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا۔ پنڈت جی گھر سے نکلے خط دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے۔ یہ سن کر سخت افسوس کرتے لگے کہ مکان ڈھونڈنے میں اتنی دقت اٹھانی پڑی۔

''مولانا یعقوب بخش کو تو میرے گھر کا پتا معلوم تھا۔

آپ کو بتا دیتے تو یوں خوار کیوں ہوتے۔ خیر جو ہوا سو ہوا میں کل ڈاک خانے آؤں گا تمہارے داخلے اور اقامت کا انتظام کرتا ہوں۔"

جب تک داخلہ نہیں ہو جاتا اور ہاسٹل میں جگہ نہیں مل جاتی اسے ان عزیز کے گھر رہنا تھا جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔

دوسرے دن حبیب اللہ شاستری حسبِ وعدہ ڈاک خانے آگئے اور اسے لے کر یونیورسٹی چلے گئے۔ یہ زمانہ داخلوں کا تھا اور قدرتی طور پر پورے ملک سے اُمیدوار اپنے والدین کے ساتھ علی گڑھ پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ یونیورسٹی کا اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کیوں کہ تمام داخلوں کے لیے ایک ہی مرکز تھا۔ اسے اپنی قابلیت اور شاندار رزلٹ کی وجہ سے یقین تھا کہ داخلے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی لیکن پھر بھی اتنے ہجوم کو دیکھ کر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سرسید کا دم کتنا غنیمت تھا کہ یہ ادارہ قائم کر دیا ورنہ یہ مسلمان لڑکے کہاں جاتے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ میرا داخلہ ہو نہ ہو ان بہت سے مسلمان لڑکوں کا داخلہ تو ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو اس وقت تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے اندیشے اس وقت خوشی میں بدل گئے جب اکتوبر 1934ء میں اس کا داخلہ علی گڑھ کالج میں ہو گیا۔ داخلہ فارم کے ساتھ اقامتی ایوانوں میں بھی داخلے ہوتے تھے کیوں کہ بنیادی طور پر یہ ایک اقامتی ادارہ تھا۔ صرف دس فیصد طلبہ کو اقامتی ایوان سے باہر رہنے کی اجازت تھی۔ وہ باہر رہتا تو کہاں رہتا۔ اس نے حبیب شاستری کے مشورے سے اقامتی ایوان کے خانے میں آفتاب ہال لکھوا دیا۔

آفتاب ہوسٹل اس سال بنا تھا بلکہ بن رہا تھا۔ اس ہوسٹل کی دو خصوصیات تھیں ایک تو یہ کہ اس میں داخلے کے لیے شرط بہترین تعلیمی ریکارڈ تھا۔ خرچ دوسرے ہوسٹلوں کے مقابلے میں بہت کم تجویز ہوا تھا اور اس میں بھی کھانے کے علاوہ صبح کا ناشتا شامل تھا جب کہ دوسرے ہوسٹلوں میں طالب علموں کی اپنی ذمہ داری تھی۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہر کمرا صرف ایک طالب علم کے قیام کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ پڑھائی سکون سے ہو سکے۔

اس کے شاندار تعلیمی ریکارڈ نے اس کی مدد کی اور اسے ہوسٹل کا کمرا نمبر 62 دیا گیا۔

آفتاب ہوسٹل طالب علموں کو سستی تعلیم فراہم کرتا تھا لیکن پھر بھی یہ تعلیم مفت نہیں تھی۔ کچھ نہ کچھ تو خرچ ہونا ہی تھا یہ مسئلہ ایسا تھا جو داخلہ لیتے ہی سامنے نظر آنے لگا۔

سرسید احمد خان کے پوتے سر راس مسعود اس وقت وائس چانسلر تھے۔ اسے کسی نے بتایا کہ ایک درخواست لکھ کر ان سے ملو۔ انہوں نے اپنی تنخواہ سے ایک فنڈ قائم کر رکھا ہے جس سے وہ مستحق طلبہ کی مدد کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری درخواست قبول کر لی تو تمہاری مالی مشکلات کا حل نکل آئے گا۔ کسی وائس چانسلر سے ایک طالبِ علم کا ملنا مذاق نہیں تھا۔ اس کے لیے ہمت درکار تھی۔ بہت سے طلبہ تو ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ان سے ملاقات کی ہمت نہیں کر پاتے تھے لیکن وہ ضرورت مند بھی تھا اور باہمت بھی۔ ایک صبح ان سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ ان کا قیام یونیورسٹی کے احاطے میں بنی کوٹھی میں تھا جو "سرسید ہاؤس" کہلاتی تھی۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع دی اور اسے بلا لیا گیا۔ وہ سر راس مسعود کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ نہایت خوب صورت بلند و بالا قد کا انسان سفید براق کرتہ پاجامہ پہنے ایک تخت پر بیٹھا تھا اور بہت سے کاغذات اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ یہی سر راس مسعود تھے۔ ان کا سیکریٹری ان کے قریب بیٹھا تھا۔ ابواللیث نے اپنی درخواست سیکریٹری کے حوالے کر دی۔ اس نے درخواست پر ایک نظر ڈالی اور سر راس مسعود کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے بھی اسے پڑھا۔ کچھ سوالات اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کیے اور ایک ایسی معقول رقم کی منظوری دے دی جو اس کے اخراجات کا کچھ ازالہ کر سکتی تھی۔

ابواللیث نے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں داخلہ لیا (1932ء) تو یہ یونیورسٹی میں شعبے کے قیام کا پہلا سال تھا۔ اس سے پہلے شعبے میں صرف لازمی اردو کا ایک نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج الگ تھا۔ اس سال انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو یونیورسٹی میں منتقل کر دیا گیا اور اسی سال اردو اختیاری کے نصاب کا نفاذ ہوا۔ وہ گویا شعبہ اردو کا پہلا طالب علم تھا۔ اس وقت شعبہ اردو میں صرف دو اساتذہ تھے۔ رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی۔ ایک مزاح نگار ایک شاعر۔ وہ ان دونوں اساتذہ کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ اس کے ذوق تحقیق کو دیکھ کر رشید احمد صدیقی کو تعجب ہوتا تھا۔ اس جیسے ماہرِ تعلیم نے اینڈ میں یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابواللیث اردو تحقیق میں بڑا

نام پیدا کرے گا۔ خود اسے اپنے آپ سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ لیکن ذرائع آمدن نہ ہونے کے سبب پریشان رہتا تھا۔ کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ کئی مضامین مقامی رسائل میں شائع بھی ہو چکے تھے جو کسی طالب علم کے نہیں بلکہ کسی استاد کے قلم سے تحریر کیے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب تو تھا لیکن سوچتا تھا کہ آیندہ کا تعلیمی سفر کیسے جاری رہے گا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت قدم قدم پر اس کی مدد کر رہی تھی۔ ایسے لوگوں سے ملوا رہی تھی جو اس کی انگلی تھام سکتے تھے۔ پہلے ہی سال بعض ایسی شخصیتوں کی شفقت اسے نصیب ہوگئی جو اپنے علم وفن اور کردار کے باعث قدآور لوگوں میں شمار ہوتی تھیں۔ سر راس مسعود نے اس کا وظیفہ جاری کیا تھا۔ پروفیسر محمد حبیب جو آفتاب ہوسٹل کے پرووسٹ تھے اور تاریخ پڑھاتے تھے اس پر مہربان ہوئے۔ اس کے حالات معلوم ہوئے تو اس کی مدد کرنے کو جی چاہا۔ یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ خود دار ہے۔ براہ راست اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن اس سے کہنے لگے۔

ابواللیث میاں پڑھنے لکھنے سے کچھ وقت بچ جاتا ہے؟

ابواللیث نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں کھیل کود کا شائق نہیں ہوں۔ دیگر تفریحات بھی نہیں ہیں۔ وقت اتنا ہے کہ پڑھائی کے بعد بھی بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔''

''اگر کچھ وقت تم ہمارے لیے پس انداز کر سکو؟''

''آپ میرے استاد ہیں اگر وقت نہیں بھی ہوگا تو آپ کے لیے نکالوں گا۔''

''میاں کچھ زیادہ کام نہیں ہے کچھ علمی کام ہے کچھ انتظامی۔ وہ تمہیں کرنے ہوں گے، کتابوں کے نشان زدہ حصے کو ایک کاپی میں اتار دیا کرنا، طلبہ کی حاضری کا رجسٹر درست کر دینا وغیرہ وغیرہ بس یہ کام ہیں۔''

انہوں نے ایک قسم کا پرائیویٹ سیکریٹری اسے مقرر کر لیا۔ اس پر یہ عقدہ اس وقت کھلا جب پروفیسر صاحب کو تنخواہ ملی اور انہوں نے کچھ رقم جیب خرچ کے نام پر اس کی جیب میں ڈال دی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک اس نے انٹرمیڈیٹ پاس نہیں کر لیا۔ یا شاید اس کے بعد بھی۔

ان مہربان اساتذہ کے سائے میں وہ اپنا تعلیمی سفر جاری کیے رہا۔ دو سال بعد یعنی 1934ء میں انٹرمیڈیٹ کی جو پہلی جماعت اردو کی اس یونیورسٹی سے کامیاب ہو کر نکلی اس میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے یہ امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں سائنس و آرٹس کو ملا کر دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اختیاری مضامین میں منطق اور نفسیات میں اس نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے جو ایک عرصہ تک ریکارڈ رہے۔

اسی سال یونیورسٹی میں اردو میں بی اے آنرز کے سال اوّل کا آغاز ہوا۔ اب وہ دوراہے پر کھڑا تھا۔ سوچ رہا تھا بی اے پاس میں داخلہ لوں یا آنرز میں۔ امتیازی نمبروں میں پاس ہونے کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کی طرف سے ملنے والے وظیفے کا حقدار ہو گیا تھا۔ آنرز میں داخلہ لینے کی صورت میں وہ تین سال تک اس وظیفے کا حقدار ہو سکتا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا کہ اسے فلسفے میں آنرز اور ایم اے کرنا چاہیے لیکن وہ تو عرصہ دراز تک اردو کی تحقیقی کتب پڑھتا چلا آیا تھا۔ ایک بے نام سی کشش تھی جو اسے اردو کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے اردو میں آنرز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لوگوں کے خیال کے مطابق اردو کی کوئی مانگ نہیں تھی۔ نہ کوئی ملازمت ڈھنگ کی مل سکتی ہے نہ کوئی احترام ہے۔ خود شعبہ اردو کا حال یہ تھا کہ یہاں صرف دو استاد تھے۔ رشید احمد صدیقی اور احسن مارہروی اور دونوں صرف لیکچرار تھے۔

وہ اپنے آپ سے لڑنے میں مگن تھا کہ خاندانی جھگڑوں نے پھر سر اٹھایا۔ بدایوں سے تار آیا کہ دو سال پہلے تمہارا نکاح ہوا تھا۔ کب تک انتظار کیا جائے۔ تم بدایوں فوراً آؤ تاکہ رخصتی عمل میں آئے۔ اسے جانا پڑا اور رخصتی بھی کرنی پڑی حالانکہ نہ ابھی کوئی ایسی عمر تھی نہ موقع۔ وہ تعلیم بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

شادی کے بعد اس نے کچھ دن بدایوں میں گزارے اور پھر علی گڑھ آ گیا۔ اب صورت یہ ہوگئی تھی کہ جمعہ کی شام کو وہ علی گڑھ سے بدایوں چلا جاتا اور دو دن تعطیل کے گزارنے کے بعد پیر کی صبح علی گڑھ پہنچ جاتا۔

ابھی اس نے آنرز کا ایک ہی سال گزارا تھا کہ بعض پیچیدگیوں کی وجہ سے اسے گھر والوں سے الگ ہونا پڑا۔ اس کا گزر اس وقت صرف اس لیاقت کے وظیفے پر تھا جو یونیورسٹی کی طرف سے اسے ملتا تھا۔ یہ اس کے اپنے خرچ کے لیے تو کافی ہوتا لیکن ایک گھر کی ذمہ داری اس سے پوری ہونا مشکل تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کہیں ملازمت کر لے اور تعلیم کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر جاری رکھے۔ اس مرتبہ وہ بدایوں گیا تو

اس نے بیوی سے مشورہ کیا۔

''قسمت نے ہمیں ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا ہے جہاں میں گھر چلا لوں یا ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرلوں۔ علی گڑھ اسکول میں استاد کی ایک اسامی خالی ہوئی ہے سوچ رہا ہوں وہاں ملازمت کرلوں اور تعلیم کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر جاری رکھوں۔''

بیوی کو اس اطلاع پر ایسا افسوس ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میں آپ کو ہرگز ملازمت نہیں کرنے دوں گی۔ مجھے یاد ہے آپ کتنے شوق سے علی گڑھ گئے تھے۔ مجرم میں ہوں سزا آپ کو کیوں ملے۔''

''نہ تم مجرم ہو نہ مجھے سزا مل رہی ہے۔ یہ تو حالات ہیں جن سے ہمیں نمٹنا ہے۔ جو وظیفہ مجھے ملتا ہے اس سے گھر کا خرچ اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ دنیا کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں میں آپ کو شرمندہ نہیں کروں گی۔ جتنی چادر ہوگی اتنے پاؤں پھیلاؤں گی۔ تنگی ترشی میں گزارہ کرلوں گی آپ اپنی تعلیم مکمل کرلیں۔ اللہ نے چاہا تو اچھے دن بھی آئیں گے۔''

بیوی نے ایسی ہمت بندھائی کہ اس نے ملازمت کا ارادہ ترک کردیا اور پوری طرح تعلیم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ابھی وہ آنرز کے پہلے سال میں تھا کہ اسے نواب حیدر یار جنگ رئیس حبیب گنج کا کتب خانہ دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اس وقت ان کے کتب خانے کی بڑی دھوم تھی۔ ابواللیث کے تحقیقی مزاج نے شور مچایا کہ اس نادر کتب خانے کی سیر کی جائے جو کتابیں وہاں ہیں ان کی فہرست مرتب کی جائے۔ حوالے لیے جائیں تاکہ اگر کسی وقت کسی کتاب کی ضرورت پڑے تو اس کتب خانے سے رجوع کیا جاسکے۔ سوال یہ تھا کہ کتب خانے تک رسائی کیسے حاصل ہو۔ اس نے نواب صاحب کو یونیورسٹی کے مختلف جلسوں میں دیکھا ضرور تھا لیکن ان سے تعارف نہیں تھا۔ ہر مشکل کا حل رشید احمد صدیقی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ رشید صاحب نے احسن مارہروی کی نگرانی میں اسے حبیب گنج جانے کی اجازت دے دی۔

وہ قبلہ احسن مارہروی کی ہمراہی میں علی الصباح علی گڑھ سے روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے حبیب گنج پہنچ گیا۔ احسن مارہروی ساتھ تھے اس لیے تعارف کے لیے کسی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ نواب صاحب نے مولانا احسن کو دیکھا تو ایک خندۂ زیرلب سے استقبال کیا اور گلے ملنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ مولانا نے اس کا تعارف کرایا۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئے تو ایک طالب علم کو ایسا شوق ہے کہ بصد اصرار کتب خانہ دیکھنے حبیب گنج چلا آیا۔ نہایت مہربانی سے کتب خانہ دیکھنے اور حوالے لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

یہ کتب خانہ قدیم و نادر مخطوطات و کتب کا خزانہ تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے مقالے ''پندنامہ شغلی'' کے لیے مواد حاصل کیا۔ یہ گویا اس کی تحقیقی زندگی کا آغاز تھا۔ اس نے اپنے مقالے کو مکمل کیا اور جامعہ دہلی میں شائع کرادیا۔ اس سے قبل اس تصنیف پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ مضمون اتنا بھرپور تھا اور ایسے پختہ اسلوب کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ کسی استاد کے قلم کا شاہکار معلوم ہوتا تھا۔ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی طالب علم کے قلم کی کاوش ہے تو وہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے کئی مضامین اس سے پہلے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اس مضمون کے ذریعے تو اس نے ایک گم شدہ تصنیف کی بازیافت کرکے دنیائے ادب سے متعارف کرایا تھا۔ یہ تنقید نہیں تحقیق تھی جس کی امید ایک طالب علم سے کم ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ خود اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے قدرت اللہ شوق کے تذکرے کی تلخیص، تذکرے اور مصنف کے تعارف اور تذکرہ نویسی کی تاریخ تفصیل کے ساتھ علی گڑھ میگزین میں شائع کی۔ علی گڑھ میگزین ہی میں ایک طویل مضمون ''تذکرہ حالی'' کے نام سے لکھا جس میں حالی کی حیات اور تصانیف پر روشنی ڈالی اور حالی کا مقام متعین کیا۔ ''شبلی اور اردو'' کے عنوان سے ایک مضمون میں شبلی کی تصانیف اور اسلوب کا تجزیہ کیا۔ ''امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر'' کے نام سے ایک مضمون شائع کرایا۔ محسن کاکوروی کی نعت گوئی پر ایک مضمون لکھا۔

یہ اس کی وہ خدمات تھیں جو وہ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں انجام دے رہا تھا۔ یہ خدمات یونہی ادا نہیں ہوگئی تھیں۔ یہ اس کا جنون تھا جو ہوش مندی کی باتیں کررہا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کھلنڈروں اور رئیسوں سے آباد تھی۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا لیکن ایسے طلبہ کی بھی کمی نہیں تھی جو تعلیم سے سروکار رکھتے تھے۔ ابواللیث کا شمار ایسے ہی طلبہ میں ہوتا تھا لیکن اسے کتابی کیڑا بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ بھرپور حصہ لے رہا تھا لیکن اس کا میلان

تقریری مقابلوں اور مضمون نویسی کے مقابلوں کی طرف تھا۔ سیکڑوں تقریری مقابلے جیتے، انعام پائے اور میڈل حاصل کیے علی گڑھ میگزین میں اتنے مضامین و مقالات کسی ایک طالب علم کے شائع نہیں ہوئے۔ جتنے اس کے ہوئے خاص طور پر لسانیات پر بلا مبالغہ سیکڑوں صفحے لکھے۔ اس زمانے میں لسانیات اور اس کے مباحث سے دلچسپی بہت کم تھی۔ وہ ابھی طالب علم ہی تھا کہ اس نے اس مشکل میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

علی گڑھ میگزین میں لکھنے والے طالب علموں میں ایک طالب علم کو بہترین علمی و ادبی مقابلے پر انعام ملتا تھا۔ 1936ء میں یہ انعام اسے ملا۔

وہ خود تعلیم کی غرض سے علی گڑھ میں تھا اور بیوی بدایوں میں تھی۔ اسے ہر ہفتے دو دن کی چھٹیوں میں بدایوں جانا پڑتا تھا۔ کرایہ بھی خرچ ہوتا تھا اور سفر میں جو وقت خرچ ہوتا تھا وہ ضائع بھی ہوتا تھا۔ جب رشید احمد صدیقی سے اس کی بے تکلفی بڑھی اور وہ ایک طرح سے ان کا پرائیویٹ سیکریٹری بن گیا اور وہ اس کی قابلیت سے متاثر بھی ہو چکے تو رشید صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اہلیہ کو علی گڑھ لے آئیں۔

''میاں تمہارے لچھن یہ بتا رہے ہیں کہ اب تم علی گڑھ سے جانے والے نہیں۔ تعلیم بھی یہیں حاصل کرو گے اور ملازمت بھی یہیں کرو گے اور اس میں ظاہر ہے ابھی بہت وقت درکار ہوگا کب تک چھ بے بلی کا کھیل کھیلتے رہو گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہماری بہو کو بھی علی گڑھ لے آؤ۔''

وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ صدیقی صاحب نے ہمت بندھائی تو وہ اہلیہ کو علی گڑھ لے آیا۔ دودھ پور سے میرس روڈ کو ملانے والی سڑک پر نور منزل کے سامنے واقع وارث منزل میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔

بیوی کو علی گڑھ لانے کے بعد ذہنی فراغت مل گئی تھی لیکن مالی تنگی کا وہی عالم تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے ملنے والے وظیفے پر گزر بسر ہو رہی تھی اگر بیوی معقول نہ ملی ہوتی تو یہ دن کاٹنے مشکل ہو جاتے۔ وہ اللہ کی بندی ایسی صابر شاکر تھی کہ حرف گلا زبان پر آتا ہی نہیں تھا۔ کسی فرمائش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا حالانکہ یہ شادی کے شروع کے دن تھے۔ یہ بڑا جذباتی دور ہوتا ہے۔ وہ اس سلیقے سے گھر چلا رہی تھیں کہ شوہر کو یہ احساس ہی نہیں ہونے دے رہی تھیں کہ گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ کسی کے گھر اس خوف سے جاتی نہیں تھیں کہ ہم کسی کے گھر جائیں گے تو کوئی ہمارے گھر بھی آئے گا۔

ابواللیث بھی اسی کفایت شعاری سے گھر چلا رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے سب شوق ختم کر دیے تھے۔ طالب علمی کی شرارتوں میں بھی کوئی نہ کوئی علمی پہلو نکال لیتا تھا۔

علی گڑھ کے طلبہ کی شرارتوں میں ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ بغیر ٹکٹ دہلی کا سفر کرتے تھے اور گھوم پھر کر واپس آ جاتے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی دوست تو دہلی کی رنگینیوں میں گم ہو جاتے اور وہ کباڑیوں کی دکانوں کا رخ کرتا اور پرانی کتابوں کی تلاش میں وقت گزارتا۔ ان ہی قلمی نسخوں کی بدولت اسے مخطوطہ شناسی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ فارسی اور اردو کی بہت سی کتابیں اس نے انہی کباڑیوں کی دکانوں سے خریدیں اور انہیں کارآمد بنایا۔ ان کی مدد سے مضامین تحریر کیے۔ انہی دکانوں سے اس نے قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعرا بازیافت کر کے اس کی تلخیص علی گڑھ میگزین میں شائع کی۔ ان پرانی کتابوں کی دکانوں ہی کی یہ دین تھی کہ وہ ''لسانیت'' کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتا چلا گیا۔ اردو زبان کی تاریخ اور صوتیات پر اس کے مضامین علی گڑھ میگزین اور ''سہیل'' میں شائع ہوئے۔

علمی ذہن رکھنے والے طلبہ کی معراج یہ تھی کہ وہ مجلّہ علی گڑھ کے مدیر بن جائیں۔ یہ صرف ایک یونیورسٹی کا میگزین نہیں تھا بلکہ اس کا شمار ادبی مجلوں میں ہوتا تھا بلکہ بہت سے ادبی پرچوں سے زیادہ وقیع ہوا کرتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر بننا نہایت خوش نصیبی کی بات سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی بھر میں اس کے ایڈیٹر کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ابواللیث کو اپنی اہلیت کا مکمل عرفان تھا۔ اس کے

چند تصانیف

لکھنو کا دبستان شاعری، مصحفی اور ان کا کلام۔ جرأت ان کا عہد اور شاعری۔ نظیرا کبر آبادی کا عہد اور شاعری۔ اردو قواعد، جامع القواعد، ہندوستانی گرائمر (ترجمہ) ملفوظات اقبال، اقبال اور مسلک تصوف، اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، تاریخ زبان و ادب اردو، رفت و بود اور ڈیڑھ سو سے زائد مضامین و مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ نیز نصابی کتب۔

لاتعداد مضامین شائع ہو چکے تھے لہٰذا وہ بجا طور پر یہ خواہش رکھتا تھا کہ اسے ایڈیٹر بنایا جائے لیکن وہ ادبی سیاست کا شکار ہو کر پچھلے دو سالوں سے اس اعزاز سے محروم ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس وقت ترقی پسند ادب کا زور تھا بلکہ ترقی پسند کہلوانا فیشن بن گیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی ترقی پسندوں کا ایک گروہ بن گیا تھا۔ جو ان کے ہم خیال نہیں تھے وہ رجعت پسند کہلاتے تھے۔ ابواللیث ترقی پسند ادب کے خلاف تھا۔ اس کی تحریر و تقریر سے ترقی پسندوں کی مخالفت ظاہر ہوتی تھی لہٰذا وہ ان کی نظر میں رجعت پسند تھا۔ لہٰذا اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔

میگزین کا نگراں کوئی استاد ہوا کرتا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے خواجہ منظور حسین نگراں تھے۔ یہ انگریزی کے استاد تھے۔ ابواللیث نے بھی ان سے انگریزی پڑھی تھی۔ ان کا جھکاؤ ترقی پسندوں کی طرف تھا لہٰذا وہ ابواللیث کو اس منصب کے لیے پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ معین الدین دردائی اور دوسری مرتبہ جاں نثار اختر کو نامزد کر دیا تھا۔ ابواللیث اسے اپنی حق تلفی سمجھتا تھا۔

اس نے آنرز پاس کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا بلکہ اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے یونیورسٹی بھر میں اوّل آیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

اس کامیابی نے نہ صرف اس کے اعتماد میں اضافہ کیا بلکہ اب اسے یہ خیال ہونے لگا کہ طالب علمی کا صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اگر اب بھی اس نے کوشش نہ کی تو اس سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا۔ اس نے آخری سال میں آخری معرکہ لانے کا فیصلہ کرلیا۔ اے بی حلیم اس وقت پرو وائس چانسلر تھے۔ میگزین کے نگراں کی سفارش پر وہی مدیر کی تقرری کرتے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفی کی روئیداد بیان کی۔ حلیم صاحب نے اس کی باتوں کو غور سے سنا اس کے تعلیمی ریکارڈ پر نظر ڈالی۔ اس کی ادبی خدمات کی چھان بین کی۔ اس کے لیے انہیں کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ ابواللیث اپنے ساتھ تراشے لے کر گیا تھا۔ حلیم صاحب نے ہر تراشے کو غور سے دیکھا اور حیرت کا اظہار کیا کہ اب تک اسے مدیر بنایا کیوں نہیں گیا جب کہ وہ کوشش بھی کرتا رہا۔

ابواللیث نے اپنا کیس کچھ اس طرح لڑا کہ اے بی حلیم نے اس سال کے لیے اسے مدیر مقرر کر دیا۔ یہ خبر خواجہ منظور حسین پر بجلی بن کر گری۔ ابواللیث سمجھ رہا تھا کہ معاملہ نمٹ گیا لیکن معاملہ طول پکڑ گیا تھا۔ خواجہ منظور کو اس کی تقرری پر اعتراض تھا۔ انہوں نے اے بی حلیم کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ رشید احمد صدیقی ان کے دوست تھے۔ انہوں نے ابواللیث کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنا نام واپس لے لے لیکن وہ نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ منظور حسین نے میگزین کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا۔

اس نے میگزین کی ادارت چیلنج کے طور پر قبول کی تھی۔ اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کی تقرری غلط نہیں ہوئی ہے۔ اس نے مجلّے کی ترتیب کے لیے سخت محنت شروع کر دی۔

اسے احساس تھا کہ وہ جس دعوے کے ساتھ مدیر بنا ہے اس کے لیے اسے سخت محنت کرنی پڑے گی۔ اس کے ذہن میں جو خاکہ تھا اس کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا۔ بطور صحافی اس کا یہ پہلا تجربہ تھا لیکن جب علی گڑھ نمبر کے نام سے اس مجلّے کا ضخیم نمبر نکالا تو اس سے قبل اردو رسالوں کی تاریخ میں اتنا ضخیم نمبر کوئی نہیں نکلا تھا۔ اس رسالے میں اس نے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متعلق ایسی یادیں اور تصاویر پیش کیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں اور بہت سے بزرگوں کی تحریروں کے عکس بھی شامل کیے۔ کئی تحریریں خود لکھ کر دوسروں کے نام سے شائع کیں۔ مدیر کی حیثیت سے اس کا لکھا ہوا ''شذرہ'' بھی قابلِ تعریف تھا۔ اس مجلّے کی دوسری خاص اشاعت ''اقبال نمبر'' کی تھی۔ ایک نمبر وہ تھا جو علامہ کی زندگی میں ''نیرنگ خیال'' نے نکالا تھا۔ اس کے بعد کسی بھی اردو رسالے کا یہ دوسرا اقبال نمبر تھا۔ اس میگزین میں مدیر کے شذرات، اقبال کے گرامی نامے، مولانا کی سیرت و فلسفے پر مضامین کے علاوہ فارسی قطعات بھی شامل تھے جن میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا بے مثال کرتا تھا۔ یہ دونوں شمارے بھی ایسے ہی بے مثال کارنامے ثابت ہوئے۔ اقبال نمبر جیسا کارنامہ کسی ادبی پرچے نے بھی انجام نہیں دیا تھا اور بہت بعد تک اس معیار کا کوئی پرچہ نہیں نکلا۔

اس کی ادارت میں چار مجلّے شائع ہوئے تھے کہ اس کا آخری تعلیمی سال ختم ہو گیا۔

ایم اے کا امتحان دینے کے بعد وہ گھر بیٹھا تھا مگر کب تک بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے مالی حالات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ گھر بیٹھ کر نتیجے کا انتظار کرتا جب کہ وہ

دوران طالب علمی دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور بدایوں پہنچ گیا۔

"بیگم بات یہ ہے کہ اگلے چند ماہ میں مولانا احسن مارہروی سبک دوش ہونے والے ہیں۔ اس وقت تک میں ایم اے کر چکا ہوں گا۔ مجھے اپنی لیاقت پر پورا بھروسا ہے۔ رشید صاحب نے بھی اُمید دلائی ہے کہ ان کی جگہ میرا تقرر ہو جائے گا۔"

وہ بدایوں میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔ زیادہ وقت سبطین صاحب کے دردولت پر یا میر محفوظ علی کے ساتھ گزرتا تھا۔ یہ دونوں حضرات علم کے سمندر تھے۔ وہ ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھ بھی رہا تھا اور یہ ثابت بھی کر رہا تھا کہ علی گڑھ سے بہت کچھ سیکھ کر آیا ہے۔ ان صحبتوں میں کبھی کبھی شیخ وحید احمد بھی شریک ہو جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یو پی میں پہلی کانگریس حکومت قائم ہوئی تھی۔ گوبند بلبھ پنتھ وزیراعلیٰ تھے۔ شیخ وحید احمد اس وزارت میں پارلیمنٹری سیکریٹری تھے۔

ایک روز وہ سبطین صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میر محفوظ علی وہاں تشریف فرما تھے۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایم اے کرنے کے بعد کیا پروگرام ہے۔ تعلیمی سلسلہ آگے رکھنا ہے یا ملازمت کا ارادہ ہے۔ اسی دوران میں شیخ وحید احمد بھی آ گئے۔ وہ ابواللیث سے بھی واقف تھے اور اس کی لیاقت کے بھی قائل تھے۔ اس کی تحریر و تقریر سے بھی آشنا تھے۔ ادبی شخصیت تھے لہٰذا ادب شناس تو تھے ہی ابواللیث کی تحقیق و تنقید کے کمالات سے واقف تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں فارغ بھی ہے اور ملازمت کا خواہاں بھی تو انہوں نے پیشکش کر دی۔

"مجھے آج کل ایک ایسے مددگار کی ضرورت ہے جو مجھے اپنے متعلقہ محکمے سے متعلق تحریر و تقریر کے لیے مواد جمع کرنے میں مدد دے سکے۔"

کچھ تو ملازمت کی کشش کچھ شام اودھ کے نظاروں سے فیض یاب ہونے کا شوق۔ وہ شیخ احمد کے ساتھ لکھنو چلا گیا۔ شیخ وحید احمد کا قیام کونسلر ریزیڈنسی یعنی اراکین اسمبلی کی قیام گاہ میں تھا وہ بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔

اس کا قیام اور اس کی ملازمت کی نوعیت دونوں سیاسی تھیں۔ یہاں وزراء، اراکین اسمبلی اور سیکریٹریوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس بات کرنے کے لیے سیاست کے سوا کوئی اور موضوع تھا ہی نہیں اور سیاست بھی تعصب اور منافقت سے لبریز۔ اسے چند روز ہی میں یہ تجربہ ہو گیا کہ یہاں حکومت کا کاروبار کم اور اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے جوڑ توڑ کا بازار زیادہ گرم ہے۔ چند دن بعد ہی اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے لکھنو کی گلیوں میں نکل جاتا۔ وہاں کی ریوڑیاں کھاتا کسی سڑک کے کنارے چائے خانے میں بیٹھ کر لکھنو کے ماضی پر غور کرتا رہتا۔

یہ ملازمت ہرگز اس کی طبیعت کے مطابق نہیں تھی۔ اس دوران میں اس نے ایم اے بھی کر لیا تھا۔ وہ علیگڑھ کا منہ دیکھ کر یہاں پہنچا تھا۔ وہ کسی ایسے ادارے میں کام کر ہی نہیں سکتا تھا جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو اور وہ زبردستی اپنا غلبہ منوانا چاہتا ہو۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر مجھے سرکاری نوکری ہی کرنی تھی تو اعلیٰ سول سروس کے امتحان میں بیٹھتا۔ اس کی تربیت اب تک ایسی ہوئی تھی کہ لکھنا پڑھنا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔ اسے بہت جلد احساس ہونے لگا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ پھر اگر ضرورتوں نے گلے پر پاؤں نہ رکھا ہوتا تو وہ یہ ملازمت بھی نہ کرتا۔

اسے لکھنو میں رہتے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ رشید احمد صدیقی کا خط آ گیا۔ انہوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ اب ان کی جگہ کسی کی تقرری کا مسئلہ ہے۔ تم فوراً علی گڑھ آؤ اور قسمت آزماؤ۔ جو کچھ مجھ سے ہو گا میں بھی کروں گا۔ وہ اس وقت میدان میں اکیلا تھا۔ آلِ احمد سرور اس کے مقابلے میں آ سکتے تھے لیکن وہ اس سے ایک سال پہلے شعبہ اردو میں آ چکے تھے۔ اب کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ وہ میدان میں تنہا تھا۔ اسے اپنی تقرری کی اتنی اُمید تھی کہ بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور علی گڑھ پہنچ گیا۔

چند روز بعد اس تقرری کے لیے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ وہ کونسل ہال کے باہر ایک کمرے میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا یہ انتظار کر رہا تھا کہ کب اجلاس ختم ہو اور کب اس تک خوش خبری پہنچے۔ ناکامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے اجلاس ختم ہوا۔ کونسل کے ایک ممبر عبدالمجید قریشی بھی تھے جن سے اس کی قربت تھی۔ وہ ان کے قریب پہنچا۔ ان کے تیور دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کیا ہوا ہے۔ وہ پھر بھی ان کے قریب پہنچا۔ اس کی تو صورت سوال بنی ہوئی تھی۔ قریشی صاحب اسے دیکھتے ہی بول پڑے۔ "جاؤ میاں مارے گئے۔ کچھ نہیں ہوا۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ رشید صاحب نے مجھے خود بلایا تھا۔ میری لیاقت و قابلیت میں بھی کوئی کلام نہیں۔ میرا مطبوعہ کام بھی سب کے سامنے ہے۔ ڈویژن بھی میری فرسٹ ہے۔ آل احمد سرور اور میرے سوا کوئی دوسرا فرسٹ ڈویژن نہیں۔ پھر کس کی تقرری ہوگئی۔"

"ظہیر الدین علوی کی تقرری ہوئی ہے۔"

"ان کی تقرری کس خوشی میں ہوگئی۔ انہوں نے تو پرائیویٹ ایم اے کیا ہے اور ڈویژن میں فرسٹ نہیں۔ کوئی ایسا ادبی کام بھی ان کی پہچان نہیں بن سکا ہے۔"

"ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی سفارش تھی۔"

عبدالمجید قریشی تو اپنے راستے چل دیے۔ ابواللیث غصے میں بھرا ہوا سیدھا رشید صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ غصے میں تو تھا ہی ڈاکٹر ذاکر حسین کی شان میں جتنی گستاخیاں کر سکتا تھا کرتا رہا۔ خوب برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال کر گھر واپس آگیا۔ بیوی قیافہ شناس تھیں۔ صورت دیکھتے ہی ناکامی کی تحریر پڑھ لی۔ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی غم زدہ ہو گئیں۔ وہ ابھی غصے میں تو تھا ہی ایک مرتبہ پھر ذاکر حسین کے خلاف زہر اگلنے لگا۔

"میری حق تلفی ان کے ہاتھوں ہوئی ہے جو عوام کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے بارے میں اتنی خوش فہمی ہے کہ ان کی دیانت داری کی قسمیں کھاتے ہیں۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ مجھے نہیں معلوم کس نے اور کیا کردار ادا کیا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ میری تقرری نہیں ہو سکی۔"

"آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ آپ کا حق آپ کو مل کر رہے گا۔"

"تین بچیوں کا ساتھ ہے۔ گھر چلانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں ہی نوکری کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں اب کیا ہوگا۔"

"چلیے بدایوں چلتے ہیں۔ وہاں عزیز و اقارب ہیں۔ نہیں ہوا تو دوبارہ لکھنو چلے جائیے گا۔"

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ لکھنو کی مسموم فضا سے بھاگ کر ہی تو وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے سامان باندھا اور بدایوں کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس واقعے کے بعد اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن شکست ماننا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بھی اس نے شکست قبول نہیں کی تھی۔ اس نے بیوی بچوں کو بدایوں میں چھوڑا اور اکیلا علی گڑھ آگیا۔ اسے اے بی حلیم پرو وائس چانسلر کی مہربانیوں کا اس وقت تجربہ ہو چکا تھا جب وہ علی گڑھ میگزین کی ادارت کا حق مانگنے ان کے پاس گیا تھا۔ وہ پھر ان کے پاس پہنچ گیا اور اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفی کا پورا ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

"جسٹس شاہ محمد سلیمان وائس چانسلر ہیں۔ تقرری کا اختیار ان کے پاس ہے۔" اے بی حلیم نے کہا۔ "میں آپ کو ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ آپ پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرالیں۔ ریسرچ اسکالر کے لیے 75 روپے ماہانہ وظیفہ جاری کرنا میرے اختیار میں ہے۔ میں وہ وظیفہ جاری کر سکتا ہوں۔ اس طرح آپ یونیورسٹی سے وابستہ رہیں گے۔ ہوسکتا ہے کسی وقت مستقل ملازمت کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"ابھی تک علی گڑھ کیا کسی اور یونیورسٹی سے بھی کسی نے اردو میں پی ایچ ڈی نہیں کیا ہے۔ کیا یہاں میرا رجسٹریشن ممکن ہوگا؟"

"یہ اس یونیورسٹی کے لیے اعزاز ہوگا کہ پہلا پی ایچ ڈی یہاں سے ہو رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی آپ کے نگراں ہوں گے۔ ان سے مل کر تحقیق کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کرلیں۔"

وہاں سے اٹھ کر اس نے جس کے سامنے بھی اپنے اس ارادے کا ذکر کیا اسے تعجب ہوا۔ پی ایچ ڈی اردو میں اور وہ بھی علی گڑھ سے۔ اس سے پہلے علی گڑھ میں کسی نے اس کی ہمت نہیں کی تھی۔

رشید احمد صدیقی نگراں مقرر ہوئے اور موضوع "لکھنو کا دبستان شاعری" قرار پایا۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ اوائل عمری کے تاثرات تمام عمر انسانی ذہن پر مرتسم رہتے ہیں۔ اس نے نوعمری میں اپنے والد کے کتب خانے میں لکھنوی شعرا کے بہت سے دواوین دیکھے تھے اور ان کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ یہ اثرات اس وقت ابھر کر سامنے آگئے اور اس نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

دوسرے یہ کہ لکھنو سے اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ لسانیات ابواللیث کا خاص میدان تھا۔ ایم اے کرنے سے پہلے ہی وہ علی گڑھ میگزین میں کئی سو صفحات کا ایک طویل سلسلہ مضامین کا لسانیات کے حوالے سے شائع کرا چکا تھا۔ اس لیے بھی لکھنو کا دبستان شاعری اس کی

دلچسپی کا باعث تھا۔

اسے یہ مقالہ رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں لکھنا تھا اور مصیبت یہ تھی کہ رشید صاحب تحقیق کے آدمی نہیں تھے۔ وہ مزاح نگار تو بہت اچھے تھے لیکن تحقیق سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے پہلے دن ہی فرما دیا تھا کہ مواد کی فراہمی اور تحقیق و تفتیش تم جانو اور تمہارا کام۔ مقالہ لکھ لو تو مجھے دکھا دینا، نوک پلک درست کر دوں گا اور کوئی بات نامعقول ہوئی تو خارج کر دوں گا۔ تحقیق کے آدمی نواب صدر یار جنگ ہیں ان سے مشورہ کر لینا۔ ان کا کتب خانہ بھی تمہارے بہت کام آئے گا۔

اس کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اس وقت تک پی ایچ ڈی کے لیے اردو کا کوئی مقالہ ہندوستان بھر میں نہیں لکھا گیا تھا جس کو نمونہ بنا کر کام کا آغاز کیا جاتا۔ بہرحال اس نے بھاری پتھر سمجھ کر اسے اٹھا لیا۔ نگران مقالہ نے تو بالکل ہی ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ لے دے کے نواب صدر یار جنگ تھے جن سے وہ مشاورت کر سکتا تھا۔ انہوں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا۔ اسے مشوروں سے نوازتے رہے۔ اپنے کتب خانے کے دروازے بھی اس پر کھول دیے۔ یہاں سے اسے وہ مواد میسر آیا جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اتنے پھیرے لگائے کہ علی گڑھ اور حبیب گنج ایک ہو کر رہ گیا۔

مالی اعتبار سے یہ دور اس کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ وہ بیوی بچوں کو علی گڑھ لے آیا تھا۔ آمدنی وہی پچھتر روپے ماہانہ کی تھی جو ریسرچ اسکالر کے طور پر اسے مل رہے تھے۔ اس کی بیوی کے لبوں پر بدستور کوئی شکایت نہیں تھی لیکن خود کبھی کبھی ضرور سوچتا تھا کہ اگر بطور لیکچرر تقرری ہو گئی ہوتی تو کم از کم ایک سو پچیس روپے ماہانہ تنخواہ ضرور ہو جاتی۔

وہ دن بھر شعبہ اردو میں مصروف کار رہتا۔ رشید صاحب کی طرف چلا جاتا یا حبیب گنج جا بیٹھ جاتا۔ تھکا ہارا گھر پہنچتا۔ بیوی کی ایک مسکراہٹ اس کی تھکن دور کرنے کے لیے بہت تھی۔ کچھ دیر اپنی بچیوں کے ساتھ کھیلتا۔ پھر دن بھر محنت سے جو مواد جمع کیا ہوتا اسے ترتیب دینے بیٹھ جاتا۔ صبح اٹھتا، ناشتے کے نام پر جو ہوتا، کھاتا اور کسی مزدور کی طرح پھر گھر سے نکل جاتا۔

ایک دن وہ شعبے میں پہنچا تو اسٹاف روم میں ایک اجنبی صورت نظر آئی۔ کوئی ملنے والے بھی نہیں ہو سکتے تھے کیوں کہ ان کے ہاتھ میں طالب علموں کی حاضری کا رجسٹر تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ مہمان نہیں بلکہ شعبہ اردو کے کوئی استاد ہیں لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا تھا کہ ان کا تقرر کب ہوا اور یہ صاحب ہیں کون۔ علی گڑھ کے طلبہ میں سے تو نہیں ورنہ صورت آشنا ہوتے۔ اس نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ ان کا نام محمد عزیز ہے۔ یہاں آنے سے پہلے دار المصنفین اعظم گڑھ میں تھے اور تالیف و تصنیف کا کام کر رہے تھے۔ ابھی حال ہی میں اردو میں ایم اے کیا ہے اور اب عارضی طور پر چھ ماہ کی مدت کے لیے لیکچرار مقرر کر دیے گئے ہیں۔

یہ سنتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے زخم تازہ ہو گئے۔ میرے لیے اسامی نہیں اور ان صاحب کو رکھ لیا گیا۔ کوئی اشتہار نہیں درخواست نہیں انٹرویو نہیں۔ معلوم ہوا وائس چانسلر کو کسی بھی جگہ پر خواہ جگہ ہو یا نہ ہو بجٹ میں ہو نہ ہو، اپنی صوابدید پر چھ مہینے کے عارضی تقرر کا اختیار ہے۔

"یہ تو چور دروازہ ہوا۔ جو صدر دروازے سے داخل نہ ہو سکے اسے عقبی دروازے سے داخل کر لو۔ بعد میں یہ اسامی مستقل بھی ہو سکتی ہے۔"

یہ چوٹ ایسی تھی جسے وہ آسانی سے نہیں سہہ سکتا تھا۔ ابھی پہلی چوٹ کی دکھن کم نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا زخم لگ گیا۔ اگر یہ چور دروازہ کھلنا ہی تھا تو میرے لیے کھلنا چاہیے تھا۔ اس کا حقدار تو میں تھا۔ وہاں کیا شور مچاتا۔ الٹے پاؤں گھر لوٹ آیا۔ ابھی دن بھی نہیں گزرا تھا کہ دوپہر کو ملنے والی گاڑی میں بیٹھا اور دہلی پہنچ گیا۔

جسٹس سر شاہ سلیمان وائس چانسلر تھے۔ وہ دن علی گڑھ میں گزارتے تھے اور پانچ دن دہلی میں رہتے تھے۔ گویا جز وقتی وائس چانسلر تھے۔ وہ ان کے علی گڑھ آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے دہلی آ گیا تھا اور اب ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر ان سے ملاقات کی کوشش کر رہا تھا۔ کوشش اس لیے کہ ان کا سکریٹری ملاقات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

"جسٹس صاحب، یونیورسٹی سے متعلق کام صرف علی گڑھ میں رہ کر کرتے ہیں۔ یہاں وہ آپ سے نہیں مل سکتے۔" سکریٹری نے بتایا۔

"کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میں ان کے علی گڑھ پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔

"انتظار تو آپ کو کرنا پڑے گا۔"

"میں نے علی گڑھ سے دہلی تک کا سفر یہ سننے کے لیے نہیں کیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتے۔ مجھے آج اور ابھی ان سے ملنا ہے۔"

"میں آپ کو ان سے ملوا بھی دیتا لیکن ان کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔" سیکریٹری نے پینترا بدلا۔

"اگر آپ نہیں ملوائیں گے تو میں کوٹھی کے دروازے پر اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک وہ باہر آ کر مجھ سے مل نہیں لیں گے اور جو کچھ مجھے کہنا ہے ان سے کہہ نہیں لوں گا۔"

سیکریٹری نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اندر جا کر اطلاع کی اور جسٹس صاحب نے اسے بلوالیا۔ وہ اندر گیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے اس نے اپنی داستان بیان کرنے کے لیے الفاظ تراش لیے۔

"میرا نام ابواللیث صدیقی ہے۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ آنرز اور فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا ہے۔ میرے علاوہ اس وقت تک کسی کو یہ اعزاز نہیں ملا ہے۔ میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام بھی کر رہا ہوں۔ یہ ہندوستان میں کسی بھی یونیورسٹی میں ہونے والا پہلا پی ایچ ڈی ہوگا۔ میں ایک نوکری چھوڑ کر تدریس کے جنون میں علی گڑھ آیا تھا۔ چند ماہ پہلے مجھے نظر انداز کر کے ایک تقرری عمل میں آئی جس کا فیصلہ میرٹ پر نہیں کسی اور معیار پر ہوا۔ یہ کہا گیا کہ امیدوار ضرورت مند ہے۔ ضرورت مند تو میں بھی تھا۔ میں اس وقت خاموش ہو گیا لیکن اب ایک نیا تقرر ہو گیا۔ اس کی بنیاد بھی میرٹ نہیں۔ دروغ بر گردن راوی، سنا یہ ہے کہ وہ آپ کے کوئی عزیز ہیں۔ بس یہی میرٹ ہے۔ بے شک یہ میرٹ ہے لیکن بہرحال حق میرا ہے۔ اب یہ آپ کی صوابدید پر ہے کہ آپ کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔"

جسٹس صاحب نے خاموشی سے اس کی باتیں سنیں۔

"اچھا آپ ملاقاتیوں کے کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

وہ باہر آ کر ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جسٹس صاحب کا سیکریٹری اندر آیا اور ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا یہ اے بی حلیم پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کے نام ایک خط تھا۔

وہ اس خط کو لے کر باہر نکلا۔ بے تاب اتنا تھا کہ راستے ہی میں لفافہ چاک کیا۔ اس میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

"ابواللیث صدیقی کا تقرر چھ ماہ کی عارضی مدت کے لیے وائس چانسلر کے خصوصی اختیارات کے تحت کیا جاتا ہے اور اسی تاریخ سے جس سے محمد عزیز صاحب کا کیا گیا ہے۔"

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سڑک پر ہی سجدہ کر لے۔ اللہ نے اس کی کیسی سنی تھی۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد اگلے ہی دن اس نے اے بی حلیم کی خدمت میں پیش ہو کر وہ خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے خط کو پڑھا اور اسی وقت رجسٹرار سے حکم نامہ لکھوا کر شعبہ اردو کو روانہ کر دیا۔

اس کا تقرر تو ہو گیا لیکن شعبے میں گرم جوشی سے اس کا استقبال نہیں ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ بن بلایا مہمان ہے۔ اس کے تقرر میں نہ صدر شعبہ کی سفارش تھی نہ کوئی درخواست نہ اسامی نہ بجٹ لیکن کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے مخالفین اسے پچھتر روپے کے وظیفے سے ایک سو پچیس روپے ماہانہ کا لیکچرر ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے نکال نہیں سکتے تھے لیکن یہ تو کر سکتے تھے کہ اسے اتنا پریشان کیا جائے کہ وہ خود ہی چھوڑ کر چلا جائے لیکن وہ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ غالب کے الفاظ میں ہوا یہ کہ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔

تعلیمی اداروں میں کسی استاد کو پریشان کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ٹائم ٹیبل ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ اس کے لیے ایسا ٹائم ٹیبل بنایا گیا کہ صبح پہلا گھنٹا بھی اسے لینا پڑتا اور سہ پہر میں آخری گھنٹا بھی۔ نہ صبح دیر سے آ سکتا تھا نہ شام کو جلدی جا سکتا تھا اور پھر مرے پہ سو درے اور بھی۔ ایک گھنٹا (پیریڈ) سائنس میں دوسرا آرٹس میں۔ ان دونوں شعبوں کے درمیان فاصلہ کافی تھا۔ سارا دن اسی بھاگ دوڑ میں گزر جاتا۔ گھر سے یونیورسٹی بھی دور تھی۔ سواری کی استطاعت نہیں تھی پیدل آنا پڑتا تھا۔ آتے ہی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔ آرٹس سے سائنس میں۔ پھر سائنس سے آرٹس میں۔ سانس ابھی قابو میں نہیں آتی تھی کہ کلاس شروع ہو جاتی تھی۔ کلاس بھی ایسی دی گئی جو تعداد کے اعتبار سے کسی نو وارد کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ آرٹس میں بی اے کی کلاس اتنی بڑی ہوتی کہ کوئی بڑے سے بڑا کمرا کافی نہ ہوتا۔ اس کلاس کو اسٹریچی ہال میں لینا پڑتا تھا اور وہ

بھی مائیکروفون کے بغیر۔ دوسو کی کلاس اور وہ بھی علی گڑھ کے طالب علموں کی جو ذرا سی دیر میں آدمی کو اس کی حیثیت یاد دلا دیں۔ مضمون بھی اردو جس کی لڑکوں کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

یہ بھی اسی سازش کا حصہ تھا کہ وہ چھوڑ بھاگے یا لڑکے اسے بھگا دیں۔

اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ پہلے دن کلاس میں جانے سے پہلے خود بھی سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی کلاس کا مقابلہ کر بھی سکے گا۔ اس کا قد ذرا کم تھا۔ اس وقت دبلا پتلا بھی تھا۔ جنہیں پڑھا رہا تھا ان سے بھی چھوٹا نظر آرہا تھا۔ پڑھانے کو بھی ملا تو اقبال کی بانگ درا اس میں پہلا سبق ''خضر راہ'' کا تھا۔ سب سے پہلے صرف نظم کے عنوان خضر راہ پر گفتگو شروع کی اور کم از کم دو ہفتے اس کی علامتی اہمیت پر بات کرتا رہا۔ اس عرصے میں یہ نظم اسے زبانی یاد ہوگئی۔ کلاس میں جاتا اور کتاب کھولے بغیر زبانی پڑھانا شروع کر دیتا اور ایسا تجزیہ کرتا جو شاید بی اے کی سطح کے لیے ضروری بھی نہیں تھا لیکن طلبہ پر اس کا اچھا اثر پڑا اور وہ اسے توجہ سے سننے لگے۔ گویا وہ کامیاب ہوگیا۔ وہ قدرتی طور پر بلند آواز تھا۔ یہ خوبی بھی اس کے حق میں گئی۔

ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی آواز گونجنے لگتی۔

وہ ان کلاسوں سے نمٹ ہی رہا تھا کہ اسے ایم اے میں تاریخ زبان و ادب کا پرچہ پڑھانے کو ملا۔ یہ اس وقت بھی ایم اے کے سات پرچوں میں سب سے مشکل تھا۔

اس نے اس پرچے میں لسانیات کا ایک جزو داخل کرایا اور اس کی تدریس شروع کی۔ یہ اس لسانیات کے شعبے کی داغ بیل تھی جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مستقل، مضبوط اور الگ شعبہ ہے۔

اب وہ اپنی جگہ بناتا جارہا تھا۔ شروع میں اس کا حال ناخواندہ مہمان کی طرح رہا لیکن اس نے تدریسی مہارت اور حسن اخلاق سے سب کے دلوں کو فتح کرلیا۔ کم از کم شعبے میں کوئی مخالفت نہ رہی۔

اس زمانے میں یونیورسٹی گرلز کالج میں بی اے کی اردو کلاس شروع ہوئی۔

اچھے خاصے تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسکول یا کالج بھیجنا تو درکنار لڑکوں کی تعلیم بھی عام نہیں تھی تو لڑکیاں بے چاری کس گنتی میں۔ بہر حال بعض احباب کی کوششوں سے گرلز کالج کے قیام کی نوید ملی۔ ابتدا میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ 1936ء میں اس کا الحاق یونیورسٹی کے ساتھ ہوگیا۔ صرف دو سال ہوئے تھے کہ ''خواتین کالج'' کے لیے جو اب یونیورسٹی کا حصہ تھا اردو کے استاد کی ضرورت پیش آئی۔ لڑکیوں میں تعلیم کا رواج ہی نہیں تھا تو کسی خاتون لیکچرار کا ملنا کیسے ممکن ہوتا۔ اس کے لیے ابواللیث کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ اعزاز بھی اس کی قسمت میں تھا کہ وہ گرلز کالج میں اردو کا پہلا استاد ہوا۔

ان دنوں مخلوط تعلیم کا رواج تو ہوا نہیں تھا۔ وہ پہلے دن کلاس میں گیا تو اسے ایک پردے کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ پردے کی دوسری جانب علی گڑھ کی وہ لڑکیاں تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے علی گڑھ کے طلبہ سائیکلوں پر پردے لگے تانگوں کا پیچھا کیا کرتے تھے یا علی گڑھ کی نمائش میں کالے برقعوں کی دھوم ہوا کرتی تھی۔ اس وقت کے نوجوان شعراء اس نادیدہ مخلوق پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔

وہ بھی بائیس سال کا نوجوان، دھڑکتے دل سے پڑھانا شروع کیا۔ دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے سوال پوچھا۔ اس نے مسئلہ سمجھا دیا۔ کسی عاشقانہ شعر پر دبی دبی ہنسی کی آوازیں آئیں۔

کلاس ختم ہوئی۔ وہ ''بڑی مشکل سے دل قابو کیا ہے۔'' کہتا ہوا کلاس سے باہر گیا۔

پردے کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی لڑکیاں سوچ ضرور رہی ہوں گی کہ موصوف نوجوان ہیں، کچھ دنوں میں کھلیں گے ضرور لیکن موصوف کا حال یہ تھا کہ شروع سے اتنی سختیاں جھیلی تھیں کہ عشق کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔ قحط سالی کے وہ ایسے دن گزار رہا تھا کہ جس میں عشق کرنے والے بھی عشق فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اس نے عشق کیا ہی نہیں تھا تو فراموش کیا کرتا۔ یہ احساس بھی تھا کہ وہ شام آوارہ میں ''استاذ'' ہے۔ پردے کے کونے اٹھتے گرتے رہے۔ عشقیہ اشعار کے مطلب بار بار پوچھے جاتے رہے۔ اسے خوشی تھی تو یہ کہ اب تنخواہ ایک سو پچیس سے بڑھ کر ایک سو پچھتر ہوگئی۔ پچاس روپے تنخواہ بڑھ گئی۔ اس پچاس روپے کے اعزازیے میں اسے ہفتے میں چار روز دو دو گھنٹے کلاس میں پڑھانا پڑتا تھا۔

اسے دوسری خوشی یہ تھی کہ اس کالج میں برصغیر پاک و ہند ہی کی نہیں بلکہ کمبوڈیا، تھائی لینڈ، مصر، عراق اور سری لنکا

تک سے مسلمان لڑکیاں آتی تھیں اور اس طرح سرسید کے خواب کا دوسرا حصہ یعنی تعلیم نسواں بھی شرمندۂ تعبیر ہوگیا تھا۔

خواتین گرلز کالج اس کے گھر "وارث منزل" سے قریب تھا لہٰذا پیدل ہی آجاسکتا تھا۔

پچاس روپے کی اس اضافی آمدنی کے بعد اس کا ہاتھ کچھ کھل گیا تھا۔ اس نے ایک ڈپارٹمنٹ سے دوسرے ڈپارٹمنٹ تک جانے کے لیے ایک سائیکل خرید لی۔ یہ پرانی سائیکل تھی بعد میں نئی سائیکل خرید لی جو 1947ء میں علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت تک اس کے پاس رہی۔

اس نے درس وتدریس کے ساتھ یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہوسٹل عثمانیہ کے نگراں کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وائس چانسلر کے دفتر میں ان کے معاون کے طور پر بھی کام کیا۔ اس دوران میں شعبہ اردو سے بدستور منسلک رہا اور کوئی اضافی تنخواہ نہیں لی۔

اس نے عروج کی کئی منزلیں دیکھیں لیکن یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی والدہ زندہ نہیں رہیں جو اسے علی گڑھ بھیجنے کی مخالفت کرتی رہی تھیں۔ جن کا خیال تھا کہ علی گڑھ میں رئیسوں کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔ ہم وہاں کے اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ علی گڑھ کا ماحول بچوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ والدین سے دور رہ کر بچوں کو بگڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ خیالات ان کے ذہن میں یونہی جاگزیں نہیں ہوگئے تھے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو علی گڑھ بھیج کر دیکھ چکی تھیں۔ جنھوں نے اپنی نادانیوں اور شاہ خرچیوں سے گھر میں مفلسی کا پہرا بٹھا دیا تھا۔ ابواللیث والدہ کی مرضی کے خلاف علی گڑھ گیا اور ایسی عمر میں گیا کہ خرابی کا کوئی بھی دریا اسے تنکے کی طرح بہا کر لے جاسکتا تھا لیکن اس نے اپنی محنت اور لگن سے اپنا مقام بنایا مگر افسوس! یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی والدہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں وہ اگر ہوتیں تو دیکھتیں کہ انسان اپنی محنت سے جو چاہے کرسکتا ہے۔

☆......☆

اس کا قیام وارث منزل میں تھا۔ اس میں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک بیڈروم اور ایک ڈرائنگ روم۔ یہی کمرا وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ دونوں اطراف برآمدے تھے۔ اندر کی طرف برآمدے کے ایک پہلو میں اسٹور اور دوسرے میں غسل خانہ تھا۔

اس وقت رات کے تقریباً دو بجے ہوں گے کہ پیاس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اندر کے برآمدے میں صراحی رکھی تھی اور اس پر چاندی کا کٹورا ڈھکا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو کٹورا غائب تھا۔ اتنے میں نظر جو اٹھائی تو اسٹور کا دروازہ جو مقفل رہتا تھا چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ حیرانی ہوئی کہ دروازہ کھلا کیوں ہے۔ ذرا اور آگے بڑھا تو صحن میں لحاف، گدے اور کپڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خیال آنا لازمی تھا کہ چوروں نے گھر کا صفایا کردیا ہے۔ وہ گھبرا کر اندر کی طرف بھاگا۔ بیوی کو اٹھایا۔ اٹھایا کیا جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"اٹھ کر دیکھو تو گھر میں چوری ہوگئی ہے۔"

وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ صحن میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ کر انہیں بھی شک نہیں رہا کہ گھر کا صفایا ہوگیا ہے۔ چور کو لحاف گدوں سے غرض نہیں تھی۔ وہ یہیں چھوڑ گیا۔ اپنے کام کی چیزیں لے گیا ہوگا۔ اب دونوں نے تلاشی لینی شروع کی کہ کیا کیا چیزیں گئی ہیں۔ مہینے کا آغاز تھا جو پیسے مہینے بھر کے خرچ کے لیے رکھے تھے اب اپنی جگہ نہیں تھے کچھ تھوڑا بہت زیور تھا وہ بھی غائب تھا۔ چاندی کے کچھ برتن تھے وہ بھی چوروں کی نذر ہوگئے تھے۔ بستر کی چادریں تک کوئی لے گیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ یہ سارا سامان سائیکل پر رکھ کر لے گیا تھا کیوں کہ سائیکل بھی نہیں تھی۔

سامان کو تلاش کرتے اور تخمینہ لگاتے لگاتے صبح ہو گئی۔

بیوی بولیں کہ پولیس میں رپورٹ درج کرا کر آؤ۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن اس نے تھانہ جاکر رپورٹ درج کرادی۔

گھر میں جتنی رقم تھی سب جاچکی تھی۔ سرہانے رکھی شیروانی کی جیب میں تھوڑی سی ریزگاری رہ گئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ اس سے دوپہر کی ہنڈیا کا انتظام ہوسکتا تھا۔ بیوی باورچی خانے میں گئیں تو وہاں رکھا ہوا گھی کا بڑا کنستر بھی نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"میاں ہم تو بری طرح لٹ گئے۔ چوروں نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔ برتن تک نہیں چھوڑے۔ میں نے پائی پائی جوڑ کر کتنا کچھ جمع کرلیا تھا کچھ بھی تو نہیں رہا۔ ابھی تو پورا مہینا پڑا ہے کیا ہم دانے دانے کو ترسیں گے۔ آپ کی سائیکل بھی چلی گئی۔ اب آپ کو پھر یونیورسٹی پیدل جانا

پڑے گا۔"

وہ سچ مچ رو رہی تھیں اور ابو اللیث انہیں تسلی دے رہا تھا۔

"اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ یہ بھی ہمارا امتحان ہے۔ تم دیکھنا زندگی میں تمہیں اللہ اتنا دے گا کہ سنبھالا نہیں جائے گا۔ پوری دنیا دیکھے گی۔ جانے والے برتنوں کی حیثیت کیا ہے۔ دنیا بھر کی نادر اور قیمتی اشیاء ہوں گی تمہارے پاس۔"

یہ وقت ایسی قبولیت کا تھا کہ یہ دعا حرف بہ حرف پوری ہوگئی۔ اللہ نے دولت، شہرت سب کچھ دیا۔ دنیا بھی گھومی اور وہاں سے لائے ہوئے نادر تحفوں سے گھر بھی بھر گیا۔

وہ بیوی کو تسلی دینے کے بعد یونیورسٹی گیا اور رشید صاحب کو اطلاع دی۔ انہیں بھی سن کر افسوس ہوا تسلی دی اور بڑی محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے فوری خرچ کے لیے کچھ رقم بھی دی۔

چوری ایسی تھی کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کم آمدنی میں گھر کو دوبارہ بنانا پڑ گیا۔

وہ تو مضبوط اعصاب کا تھا اس صدمے کو سہہ گیا۔ عورتیں گھرداری کی طرف سے بہت حساس ہوتی ہیں۔ ریحان فاطمہ کو ایسا دھچکا لگا کہ کئی دن بخار میں پڑی اپنی گم شدہ چیزوں کو یاد کرتی رہیں۔

اس حادثے سے ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس گھر سے جی اچاٹ ہوگیا۔ بیوی نے اپنی ذات کے لیے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا تھا لیکن اب کہتی تھیں کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ یہ گھر بدل لو۔

ابو اللیث کا بھی اس گھر سے جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر ایک اور گھر "مسرت منزل" میں منتقل ہو گیا۔ اس مکان میں انہوں نے دو سال گزارے اور پھر یونیورسٹی کے مکان ماریسن روڈ میں منتقل ہو گئے جہاں پاکستان آنے تک مقیم رہے۔

☆......☆

اس کا رجسٹریشن پی ایچ ڈی کے لیے ہو چکا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر وہ کام کا آغاز کرسکتا کیوں کہ اس وقت تک اردو کا کوئی مقالہ ہندوستان بھر میں نہیں لکھا گیا تھا۔ نگراں رشید احمد صدیقی مقرر ہوئے تھے۔ ان کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ مواد کی فراہمی اور تحقیق تمہیں خود کرنی پڑے گی۔ مقالہ لکھ لو تو مجھے دکھا دینا میں نوک پلک سنوار دوں گا۔ اس سلسلے میں نواب صدر یار جنگ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اتنا کر سکتے تھے کہ اپنے کتب خانے کے دروازے اس پر کھول دیں اور وہ انہوں نے کھول دیے۔ اس نے خود ہی کمرِ ہمت باندھی۔ اپنے مقالے کے لیے خاکہ تیار کیا اور مواد کی فراہمی کے لیے کوشاں ہوگیا۔ جو ملا سب محفوظ کرلیا۔ تذکروں، تاریخوں اور دوسری کتابوں میں جہاں کہیں لکھنو اور لکھنوی شاعری کا ذکر آیا اسے محفوظ کرلیا۔ شعرا کا کلام محفوظ کرلیا۔ سیکڑوں صفحوں کے حوالے جمع ہوگئے۔ اتنا مواد جمع ہوگیا کہ وہ گھبرایا۔ اتنا مواد کتنے صفحات گھیرے گا اور اسے کون سمیٹے گا۔ اب اس کے ذوقِ تنقید نے خود اس کی رہنمائی کی۔ میں لکھنوی شاعروں کا تذکرہ مرتب نہیں کر رہا ہوں بلکہ لکھنوی شاعری کے دبستان کا تجزیہ کرنا مقصود ہونا چاہیے۔ اس تجزیے کے بعد یہ ثابت کرنا ہے کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے لکھنو ایک "دبستان" ہے۔ وہ مواد بیشتر بے کار رہا۔ محنت اکارت گئی۔

اب اسے لکھنوی شاعری کا مطالعہ ایک دبستان کی حیثیت سے کرنا تھا اور اس میں سلطنت اودھ کے قیام وہاں کی مخصوص معاشرت اور اس میں ابھرنے والی شاعری اور اصلاحِ زبان کی تحریک کے اسباب و نتائج سے خاطر خواہ بحث کرنی تھی۔ قابلِ ذکر شعراء کا تعارف کرانا تھا اور ان کے کلام کے رنگ کو متعین کرنا تھا۔ یہ اردو دنیا میں اس کی اولین کوشش تھی۔ اب تک جو تذکرے ملتے تھے ان میں شعراء کا مختصر تعارف ہوتا تھا اور نمونہ کلام۔ لیکن لکھنوی شاعروں کو ایک دبستان کا نمائندہ اور لکھنوی شاعری کو ایک دبستان کی حیثیت سے مربوط کرنے کی تحقیقی کاوش وہ پہلی مرتبہ کر رہا تھا۔

اس نے اپنے مقالے کو دس ابواب میں تقسیم کیا اور کام شروع کردیا۔

اس نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کے ایک خاص دور کو اس کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ لکھنو کی تہذیب و معاشرت اور وہاں کے خاص مزاج کو متعین کرنے میں مذہب اور مسلک کو خاصا دخل تھا۔ اس نے اس موضوع کو اجاگر کرنے کے لیے مستند حوالے تلاش کیے اور بہت سا مواد جمع کرلیا۔

مرثیے کی صنف کے بیان میں شعرائے لکھنو کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک باب ہرزہ گوئی پر بھی لکھا۔ مقصد یہی تھا کہ لکھنوی شاعری میں جو کچھ لکھا گیا اسے تاریخی طور پر محفوظ کرلیا گیا لیکن اس کی یہ محنت رائیگاں چلی گئی۔

اس نے مقالے کی تکمیل کے وقت نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی سے بھی مشاورت کی۔ نواب صاحب نے یہ دونوں حصے قلم زد فرمادیے۔ اس لیے نہیں کہ یہ غلط تھے بلکہ اس کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بات ٹھیک سہی مگر یہ اس کے اظہار کا محل نہیں۔ تم مناظرے میں کیوں پڑتے ہو۔ خدا معلوم ممتحن کون ہو، کس مسلک کا ہو اپنے خلاف علمی محاذ کیوں بناتے ہو۔“

وہ ابھی طالب علم تھا۔ نواب صاحب سے اختلاف بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ڈر الگ تھا کہ کہیں ڈگری ہی کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔ یہ خیالات پھر کسی وقت کسی تصنیف میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اس نے ایسے تمام حصے قلم زد کردیے۔ یہ حوالے اس نے بڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ وہ سب ضائع ہوگئے۔

نواب صاحب کی شستعلیق طبیعت کو ہرزہ گوئی کی ثقالت بھی برداشت نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسے بھی اصل مقالے سے خارج کرادیا۔ ”میاں یہ تو گالیاں ہیں۔ ادب کے نام پر کیا گالیاں بھی لکھوگے۔“

اگر یہ باب مقالے میں شامل ہوجاتا تو تاریخ کا ایک اہم گوشہ رقم ہوجاتا اور اس مقالے کی دلچسپی اور انفرادیت میں بھی اضافہ ہوتا۔ یہ سرمایہ بھی جو اس نے بڑی مشکل اور محنت سے جمع کیا تھا ضائع ہوگیا۔“

اسے اپنی محنت کے اس طرح ضائع ہونے پر بہت دن افسوس رہا چنانچہ اس نے اپنی خودنوشت میں لکھا۔

”اب سوچتا ہوں کہ اس صنف کے نمونے ہماری کسی ادبی تاریخ میں نہیں ملتے۔ جب ہم نے ”چرکین“ کے دیوان کی اشاعت قبول کرلی۔ کلیات افتق مرتب کرڈالی۔ جان صاحب کا دیوان ایسا صحیفہ بن گیا کہ لغت کی کتابوں میں اس سے سندیں اخذ ہونے لگیں تو پھر ہرزہ گوئی کے نمونے محفوظ رکھنے میں کیا تامل تھا۔ آخر گالیاں بھی تو ہماری لغت کا جزو ہیں۔ گالی سے بھی زبان کے ذریعے سے قوم کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی شرافت کے معیار کا تعین بھی ہوتا ہے۔“

افسوس یہ سرمایہ جو میں نے بڑی مشکل اور محنت سے جمع کیا تھا ادبی اور لسانی حیثیت سے نہ سہی تاریخی حیثیت سے محفوظ رہ جاتا۔

اس مقالے کو جانچنے کے لیے تین ممتحن مقرر ہوئے۔ ایک تو خود رشید احمد صدیقی تھے۔ دوسرے نگراں حسرت موہانی تھے۔ ایک اور ممتحن ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ ان کو ممتحن اس بنا پر مقرر کیا گیا تھا کہ انہوں نے ایک یورپین ملک سے پی ایچ ڈی کیا تھا اور بیرونی ملکوں میں پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لیے جو قاعدے قانون تھے ان سے وہ گزر چکے تھے۔

جب زبانی امتحان کا وقت آیا تو ابواللیث کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ انہیں لینے اسٹیشن جائے۔ وہ ٹرین آنے سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین نے پلیٹ فارم کے پاؤں پکڑے تو حسرت موہانی اپنی روایت کے مطابق تھرڈ کلاس کے ڈبے سے برآمد ہوئے۔ ان کا بوریا بستر ان کے ساتھ تھا جس کے ساتھ رسی سے ایک لوٹا بھی بندھا ہوا تھا۔ تعارف کی ضرورت یوں پیش نہیں آئی کہ حسرت موہانی اسے کانپور اور بدایوں میں دیکھ چکے تھے۔

وہ ریل سے اترے اور پیدل یونیورسٹی تک گئے۔ اصرار کے باوجود اس وقت کی علی گڑھ کی واحد محبوب سواری ”یکے“ کا سفر قبول نہیں کیا۔ راستوں سے وہ واقف تھے کیوں کہ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ویسے بھی مشاعروں وغیرہ میں آتے رہتے ہوں گے۔

زور صاحب حیدرآباد سے سیکنڈ کلاس میں تشریف لائے۔ انہیں لے کر وہ رشید احمد صدیقی کے مکان تک گیا اور گھر چلا آیا یہ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ جس طالب علم کا آپ امتحان لینے آئے ہیں وہ میں ہی ہوں۔

اگلے دن صبح شعبہ اردو میں صدر شعبہ کے دفتر میں (رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو تھے) اس کا زبانی امتحان ہونا تھا۔ اس دفتر کا حال یہ تھا کہ درمیان میں ایک دفتری میز پڑی رہتی تھی اور اس کے ساتھ ایک کرسی جو بظاہر صدر شعبہ کے لیے تھی لیکن رشید صاحب شاذ ہی اس کرسی پر نظر آتے تھے۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی کمرے کے ایک کونے میں ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک اسٹول پر ٹیبل فین رکھا ہوتا اور نیچے ایک اگال دان۔ یہی رشید صاحب کی نشست تھی۔ صدارتی کرسی پر عموماً وہ نیاز مند بیٹھا رہتا جو رشید صاحب کی طرف سے دفتری کام انجام

دیتا تھا۔

وہ رشید صاحب کے دفتر میں ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ پہلے قادری صاحب پہنچے پھر حسرت موہانی بھی آگئے۔ قادری صاحب نے بیٹھتے ہی رشید صاحب سے کہا۔ اب امیدوار کو بھی بلا لیجیے تاکہ کارروائی شروع ہو۔ رشید صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ موجود ہیں۔''

''امیدوار یہ ہیں؟'' قادری صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی ہاں امیدوار میں ہی ہوں لیکن آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی۔'' ابواللیث نے کہا۔

اب قادری صاحب کو مزید حیرت ہوئی۔ فرمانے لگے۔ ''آپ کے مقالے کا موضوع اور لکھنے کا اسلوب دونوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا تھا کہ اردو پڑھانے والے استادوں کی طرح عام سی ہیئت ہوگی۔ چہرے پر داڑھی کا نور، میلی کچیلی شیروانی، سر پر ٹوپی۔ علی گڑھ کے ہیں تو ترکی ہو گی۔ کناروں پر میل جما۔ منہ میں پان، ہونٹوں اور باچھوں سے پیک کے چھینٹے اڑاتے ہوئے لیکن آپ تو اردو کے استاد سے زیادہ مسٹر معلوم ہوتے ہیں۔''

بہرحال قہقہوں کے بعد زبانی امتحان کا مرحلہ ہوا۔ قادری صاحب نے کم لیکن حسرت موہانی نے بہت تفصیل سے امتحان لیا اور کامیابی کا مژدہ اسی وقت سنا دیا۔

یہ علی گڑھ سے ملنے والی اردو کی پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری تھی جو 1941ء میں عطا ہوئی۔ یونیورسٹی نے اس مقالے کی اشاعت کا ذمہ لیا اور طباعت کی مد میں پانچ سو روپے کی مالی امداد دے کر اسے یونیورسٹی کی مطبوعات کے سلسلے میں شائع کیا۔

''طباعت پر اس وقت بھی پانچ سو سے زیادہ رقم صرف ہوئی۔ وہ کیسے پوری ہوئی اس میں منجملہ اور حضرات کے سر عبدالقادر کی اعانت بھی شامل تھی۔''

''انہوں نے مقالہ شائع ہونے پر میری بڑی ہمت افزائی فرمائی اور تعریف کا ایسا خط لکھا جس کا نہ میں اس وقت مستحق تھا نہ اب ہوں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی بڑی شفقت فرمائی اور اپنے تبصرے سے میری حوصلہ افزائی کی۔'' (ابواللیث صدیقی)

اس وقت سے لے کر اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی یہ حوالے کی مستند کتاب کے طور پر جامعات کے نصاب میں شامل ہے بلکہ یہی کتاب اس کی شہرت اور پہچان بھی جاتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی اشاعت 1944ء میں ہوئی۔

اس کارِ عظیم سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے پرانے ذوق یعنی لسانیات کی طرف متوجہ ہوا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ یہ شوق جنون اور دیوانگی میں تبدیل ہو گیا۔ ہندوستان میں رہ کر اس شوق کی تکمیل کے لیے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ انگلستان جائے گا۔ اس نے لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز سے خط کتابت شروع کر دی۔ خیال تھا کہ یونیورسٹی سے تعلیمی رخصت مل جائے گی۔ تعلیمی رخصت کے دوران میں اسے نصف تنخواہ مل سکتی تھی۔ اس وقت تنخواہ تین سو نوے روپے ماہوار تھی۔ گویا کم و بیش دو سو روپے مل سکتے تھے۔ اس میں کچھ رقم اہل و عیال کے لیے چھوڑنا تھی اور باقی میں لندن میں گزارہ کرنا تھا۔

جب انگلستان میں داخلے کی اُمید بندھ گئی تو اس نے تعلیمی رخصت کی درخواست دے دی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ تعلیمی رخصت پر گئے تھے۔ انوکھی بات یہ تھی کہ اردو کا آدمی اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانا چاہتا ہے۔ انتظامیہ کو حیرت تھی کہ لندن میں اردو کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے کیا معنی۔ درخواست نامنظور ہو گئی۔ اعتراض یہی تھا کہ آپ کا مضمون اردو ہے لندن کا اس مضمون سے کیا تعلق؟ اس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کا مقصد اردو کے کسی شاعر پر تحقیق یا تنقید نہیں۔ میں تو لسانیات کی تعلیم کے لیے جانا چاہتا ہوں۔

''اردو کے تعلق اور پس منظر اور مسائل کو سامنے رکھ کر لسانی مطالعے کا آغاز ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اس سے آگاہی لندن جا کر ہی ہو سکتی ہے۔ واپس آکر میں اردو پر بہت کام کرسکتا ہوں۔''

اس کی یہ بحث بے کار گئی۔ کوئی یہ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ لسانیات کا مفہوم کیا ہے اور بہ حیثیت ایک مستقل اور الگ مضمون کے اس کی افادیت کیا ہے بلکہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ یہ کوئی الگ مضمون ہے۔

وہ دل برداشتہ ہوتا تھا۔ مایوس ہونا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہار ماننا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کی طرف سے دل برداشتہ ہونے کے بعد وہ اس وقت کے وائس چانسلر نواب محمد اسماعیل خان کے پاس پہنچ گیا۔ نواب صاحب خاندانی آدمی تھے۔ نواب اسحٰق خان کے بیٹے اور

نواب شیفتہ کے پوتے تھے۔ اپنے عہدے کو بالائے طاق رکھ کر نہایت شفقت سے پیش آئے۔ نہایت اطمینان سے اس کی پوری بات سنی۔ وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے نہ صرف مدد کا وعدہ کیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں بھوپال کے عبیداللہ ٹرسٹ سے بھی مدد دلانے کی کوشش فرمائیں گے۔

اسی سلسلے میں وہ کرنل حیدر خان سے بھی ملا۔ وہ ذرا دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ کیمیا کے صدر شعبہ تھے اور یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ سنتے ہی فرمایا۔ ”ضرور جاؤ کے دیکھوں گا کون روکتا ہے۔“

ان دونوں حضرات کی کوششوں سے رخصت منظور ہو گئی۔ چھٹی منظور ہوتے ہی اس نے لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخلے کی درخواست بھیج دی۔ اس کے کوائف ہرگز ایسے نہیں تھے کہ داخلہ نہ ملتا۔ داخلہ مل گیا۔

اس کی ان کوششوں میں اتنا وقت ضائع ہو گیا کہ سیاسی حالات نے پلٹا کھایا۔ وہ چنگاریاں جو ابھی دبی دبی نظر آ رہی تھیں، شعلہ بن گئیں۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہو گیا اور ساتھ ہی ملک گیر ہنگاموں کا بازار گرم ہو گیا۔ فسادات پھوٹ پڑے۔ مسلمان ہونا جرم ہو گیا۔ اس نے 38ء میں لکھنؤ کی ملازمت کے دوران میں جو صورتِ حال دیکھی تھی اور جو تیور مشاہدہ کیے تھے اب اس کی عملی شکل نظر آ رہی تھی۔ علی گڑھ پر ہندوؤں کی خاص نظر تھی۔ یہ ادارہ سرسید کا قائم کردہ تھا اور سرسید نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں جانے سے روکا تھا۔ سرسید ہی وہ شخص تھے جنہوں نے یہ بانگ دہل کہا تھا۔ ”ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں۔“ قائداعظم بھی علی گڑھ یونیورسٹی کو تحریکِ پاکستان کا اسلحہ خانہ کہہ چکے تھے۔ تحریک پاکستان میں یہاں کے اساتذہ اور طلبہ نے بھرپور حصہ لیا تھا لہٰذا اس تحریک کے کامیاب ہوتے ہی نظریۂ پاکستان سے اختلاف رکھنے والے علی گڑھ سے بدلہ لینے پر تل گئے۔

اس انتقام کی پہلی شق تو یہ تھی کہ طلبہ اور اساتذہ کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ کم از کم ہندو مخالفین نے حکومت کو یہ یقین دلایا تھا کہ یہاں بہت اسلحہ ہے جو کسی بھی وقت ہندوؤں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے چنانچہ یہ حکم جاری ہوا کہ تمام اسلحہ تھانے میں جمع کرا دیا جائے۔ طلبہ کے پاس ریوالور تک نہیں تھا لہٰذا لکھ کر دینا پڑا کہ اسلحہ نام کی کوئی چیز یہاں نہیں۔ چند اساتذہ کے پاس شکار کے لیے بندوقوں کے لائسنس تھے۔ ایسی تمام بندوقیں رکھوالی گئیں۔

فسادات کی آگ آہستہ آہستہ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ علی گڑھ خطرے میں ہے۔ یہ آوازیں روز بلند ہو رہی تھیں۔ یہ باتیں یونہی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں نے آس پاس کے دیہات میں حملے شروع کر دیے تھے۔ رات ہوتے ہی کہیں کہیں آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے، کسی طرف سے ہیبت ناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ صبح ہوتی تو معلوم ہوتا رات کو حملہ کہاں ہوا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بلوائی کس رات یونیورسٹی کو نشانہ بنائیں۔ طالب علموں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ قریبی دیہات میں جا کر بے بس مسلمانوں کی ہم مدد کریں گے لیکن اساتذہ انہیں روک رہے تھے۔ ایک مرحلے پر تو یہ سوچا گیا تھا کہ یونیورسٹی کو بند کر دیا جائے لیکن اس کی مخالفت کی گئی۔ اس طرح حملے کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا البتہ یہ طے کیا گیا کہ گشت پارٹیاں بنائی گئیں اور طلبہ سمیت سب کو ہدایت کی گئی کہ راتوں کو جاگ کر پہرا دیا جائے۔ ابواللیث نے بھی یہ ذتیرہ بنا لیا کہ بیوی بچوں کو لے کر عثمانیہ ہوسٹل چلا جاتا۔ نگرانِ اعلیٰ کے دفتر میں بچوں کو سلاتا اور دونوں میاں بیوی ہوسٹل کی چھت پر پہرا دیتے۔

عجیب دن تھے عجیب حالات۔ پاکستان بن چکا تھا اور وہ لندن جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو ہندوستان چھوڑ کر انگلستان چلا جائے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بیوی بچوں کو پاکستان میں چھوڑ کر خود لندن چلا جائے گا۔ غرض جب لندن جانے کا پورا ارادہ ہو گیا تو اس نے آخری مرتبہ بدایوں جانے کا ارادہ کیا تاکہ ماں باپ کی قبروں پر آخری مرتبہ فاتحہ پڑھ لے۔ فسادات تھم گئے تھے لیکن نفرتیں ابھی تک قائم تھیں۔ ٹرین کا سفر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ڈبے میں جو ہندو بیٹھے تھے وہ مسلمانوں کو کھلم کھلا گالیاں دے رہے تھے۔ ہر گالی کے بعد کہتے اوسلے (مسلمان) پاکستان بن گیا تو ابھی تک یہاں ہے کیا ہم تجھے وہاں پہنچا دیں۔

ان خطروں سے لڑتا ہوا وہ بریلی گیا اور وہاں سے بدایوں۔ اپنے باپ کا گھر دیکھا قبروں پر فاتحہ پڑھی اور عزیز و اقارب سے ملنے کے بعد علی گڑھ آ گیا۔

بیوی بچوں کو پاکستان پہنچانا تھا مگر کہاں پہنچایا جائے اور کس کے پاس چھوڑا جائے؟ وہ طالب علمی کے زمانے

میں ایک مرتبہ لاہور آیا تھا۔ وہاں کون ہے۔ اس نے غور کیا تو اپنے ایک شاگرد صابر علی خان کا نام یاد آیا۔ علی گڑھ کے بہت سے احباب کوئٹہ میں تھے۔ اس نے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ پہلے لاہور جایا جائے اور وہاں سے کوئٹہ۔ بیوی بچوں کو کوئٹہ میں چھوڑ کر خود لندن چلا جائے گا۔ اس نے صابر علی خان کو خط لکھ دیا اس خط کا جواب بھی آگیا۔

اس وقت جہاز کی نشستیں ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ یہ کام بھی ایک صاحب کے ذریعے آسان ہوگیا۔ رحم علی الہاشمی جو ایک زمانے میں علی گڑھ کے شعبہ صحافت سے وابستہ رہے تھے۔ ان دنوں دلی میں تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکریٹری تھے۔ ان سے رابطہ کیا انہوں نے نشستوں کا انتظام کردیا۔ جہاز میں کتنا سامان جاسکتا تھا جو لا سکتے تھے لائے باقی وہیں چھوڑنا پڑا۔

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاز کا انتظام ہونے کے بعد علی گڑھ سے دہلی تک ٹرین سے سفر کرنا تھا۔ یہ سفر اس طرح طے کیا گیا کہ بیوی نے ہندو عورتوں کی طرح ساڑی باندھی۔ ماتھے پر بندیا لگائی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ راستے بھر کچھ نہ بولیں۔ ایسا نہ ہو کہ بلوائیوں پر ان کے مسلمان ہونے کا راز کھل جائے۔ پانچ بچے ساتھ تھے ان سے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ خاموش رہیں۔ بیوی کو زنانہ ڈبے میں سوار کرکے خود مردانہ میں آگیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹرین چلنے اور دہلی تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

خدا خدا کرکے دہلی نے خوں میں نہایا ہوا چہرہ دکھایا۔ چاروں طرف پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں (سکھوں) کے ریلے تھے۔ کرپانیں اور تلواریں ہوا میں لہراتے پھر رہے تھے۔ میاں بیوی اور پانچ بچوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ ڈرا سہما "پالم" کے ہوائی اڈے تک پہنچ گیا جہاں سے ہوائی جہاز کو روانہ ہونا تھا۔ یہاں عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر طرف رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آرہے تھے۔ جانے والے آپس میں گلے مل کر رو رہے تھے۔ جانا نہیں چاہ رہے تھے مگر جارہے تھے۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ روکتا بھی تو کس اُمید پر۔ ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا اور تلاشی ہو رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو سامان مقررہ وزن سے زیادہ نکلا۔

"ہم زائد محصول ادا کرنے کو تیار ہیں۔"

"نہیں جو سامان زیادہ ہے وہ یہیں چھوڑ دو۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ تم کو یہاں سے صحیح سلامت جانے دے رہے ہیں۔"

ایک اور صاحب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"لاہور جل رہا ہے تم کیا وہاں تماشا دیکھنے جارہے ہو۔"

اب ان سے یہ بحث کون کرتا کہ ہم اپنے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے پاکستان جارہے ہیں۔ خون کا دریا پار کرکے جارہے ہیں۔ جتنا سامان کم کیا جاسکتا تھا کیا۔ حکم ہوا تو ہوائی جہاز میں بیٹھے۔

صابر علی خاں کو خط پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا۔ انہیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ ایک دن کا وقفہ دے کر کوئٹہ کے لیے ٹکٹ خرید کر نشستیں محفوظ کرلیں۔

جہاز لاہور کے ہوائی اڈے پر اترا۔ صابر علی خاں استقبال کے لیے موجود تھے۔

یہاں کا حال بھی دلی سے مختلف نہ دیکھا۔ یہ سوچے بغیر کہ لٹے پٹے قافلے کس مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہنچے ہیں ان کے ساتھ ہتک آمیز سلوک ہورہا تھا۔ کسٹم ہال میں اسے سامان کھولنے کو کہا گیا۔ آدھا سامان پہلے ہی "پالم دہلی" کے ہوائی اڈے پر چھوڑ آیا تھا۔ اب بچا ہی کیا تھا۔ اس میں بھی انہیں ایک پرانا ریڈیو نظر آگیا۔

"اس پر ڈیوٹی لگے گی۔"

"کس قانون کے مطابق۔"

"ہم سے زیادہ قانون جانتے ہو۔"

"میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں۔"

"پھر بھی ہم رعایت نہیں دے سکتے۔ ڈیوٹی تو آپ کو دینا ہی ہوگی۔"

"یہ ریڈیو میرے ذاتی استعمال کا ہے اور دس سال پرانا ہے۔"

"ہم نے آپ سے اس کی عمر نہیں پوچھی۔ پرانا ہے اسی لیے تو کم ڈیوٹی مانگ رہے ہیں۔"

اس نے سمجھ لیا تھا کہ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈیوٹی ادا کرسکتا تھا لیکن غصہ اتنا تھا کہ ریڈیو وہیں پٹخا اور بقیہ سامان وہیں چھوڑ کر نکل آیا۔

اس نے تو لاہور پہنچتے ہی شکر ادا کیا تھا کہ جان بچ گئی ایک نظریاتی مملکت میں آگیا۔ ہمارے ساتھ مہمانوں کی طرح سلوک کیا جائے گا لیکن میزبان کی گفتگو سن کر اس کے

تصورات کو سخت دھچکا لگا تھا۔

وہ رات اس نے اورینٹل کالج کے ہوسٹل میں گزاری۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیا گول ہے اسے گھوم پھر کر یہیں آنا پڑے گا اور اسی کالج میں خدمات انجام دینی ہوں گی۔

علی گڑھ والوں نے کوئٹہ میں بھی اپنی ایک برادری بنا رکھی تھی اس میں مقامی اور مہاجر دونوں تھے۔ پرانے لوگوں میں امتیاز احمد خاں تھے جو اس وقت وہاں ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔ دوستوں میں صالح محمد خاں تھے جو ڈپٹی اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ کچھ اور شناسا اور نیاز مند تھے خصوصاً محکمہ زراعت میں بہت سے لوگ تھے۔

صابر علی خاں کا تقاضا تھا کہ دو چار روز ٹھہر جاؤں مگر اسے کوئٹہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ اسے لندن کا سفر کرنا تھا اور اس سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ بیوی بچوں کے لیے کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لے۔

ایک دن کا وقفہ دینے کے بعد وہ کوئٹہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہاں کا ماحول' یہاں کے لباس' چہرے مہرے سب اجنبی تھے۔ آنکھیں ایسے چہرے دیکھنے کی عادی نہیں تھیں لیکن اس اجنبیت کے باوجود ایک قلبی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جان کا خوف تھا نہ عزت و ناموس کا۔ سب اپنے تھے۔ سب مسلمان تھے۔ زبان مختلف تھی لیکن دین ایک تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہر دکھ بھول کر یہ خوشی طاری ہونے لگی کہ ہم پاکستان میں ہیں ایک نظریاتی مملکت میں ہیں۔ آزاد ملک میں ہیں۔

ریگستانوں کا ایک وسیع سلسلہ پار کرنے کے بعد کوئٹہ کا اسٹیشن آیا۔ اسٹیشن پر احباب کی ایک جماعت موجود تھی۔ ان ہی احباب کی مدد سے رہنے سہنے کے لیے مختصر سا دو کمروں کا مکان مل گیا۔ امتیاز صاحب کی مدد سے بچوں کا اسکول میں داخلہ بھی ہو گیا انہوں نے اور ان کی بیگم نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔

اس موقع پر اس کا لندن جانا بہت بڑا امتحان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ یہ بدایوں یا علی گڑھ نہیں تھا۔ ایک اجنبی شہر میں محض دوستوں کے سہارے بچوں کو چھوڑ کر دیار غیر میں جانا اور وہ بھی کمانے کے لیے نہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمت ہی کی تو بات تھی۔ بیوی کی تابعداری کو داد دینے کی ضرورت ہے۔ اس نے بھی طعنہ نہیں دیا کہ ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر لندن جاتے ہو۔ یہیں رہ کر ہاتھ پاؤں مارو۔ پہاڑوں سے چشمے نکالو اور ہمارے عیش کا سامان فراہم کرو۔ اس کی خوش دامن، ان کی بڑی بیٹی ایک چھوٹا بچہ اور اس کے دو سالے یہ سب لوگ بھی اس کے سہارے کوئٹہ آ گئے۔ ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ وہ جون میں یہاں پہنچا تھا اور ستمبر کے آخر تک ہر صورت میں لندن پہنچ جانا تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد اینکر لائنز کے جہاز بر کیشیا میں جگہ مل گئی۔

اس بحری جہاز کو پکڑنے کے لیے کوئٹہ سے کراچی جانا تھا۔

معلوم ہوا دریائے سندھ میں سیلاب آیا ہوا ہے جس نے کوئٹہ کراچی ریلوے لائن اور سڑک کاٹ دی ہے۔ ہوائی سروس شروع نہیں ہوئی تھی۔ سفر ایسا تھا کہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر بروقت کراچی نہ پہنچتا تو جہاز نکل جاتا اور لندن میں داخلے کا وقت گزر جاتا۔ مطلب اس کا یہ ہوتا کہ ایک سال ضائع ہو جاتا۔ علی گڑھ واپس کیا جاتا۔ یہاں بھی کسی نوکری کا امکان نہیں تھا۔ غرض اتنے مسائل تھے کہ جن سے بہ یک وقت نہیں نمٹا جا سکتا تھا۔ وہ اللہ کا نام لے کر کوئٹہ سے روانہ ہو گیا۔ ٹرین نے اسے شکار پور اتار دیا۔ آگے راستہ بند تھا۔ فوج امدادی کاموں میں معروف تھی۔ اس نے ایک فوجی افسر سے ملاقات کی۔ اپنا تعارف کرایا اور سفر کے مقصد سے آگاہ کیا۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس کا کراچی جانا کتنا ضروری ہے۔ افسر نے اس کی مجبوری کو سمجھ لیا اور اس کی مدد کا وعدہ کیا۔

''آپ رات یہاں گزار لیں۔ صبح کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کو کسی نہ کسی طرح سکھر پہنچا دیں گے۔ سکھر سے آگے لائن صاف ہے۔ آپ کو کراچی جانے والی کوئی نہ کوئی ٹرین مل جائے گی۔''

صبح ہوتے ہی وہ افسر جیپ لے کر آ گیا۔ دور دور تک سڑک بہہ گئی تھی۔ جہاں تک جیپ چل سکتی تھی چلی۔ پھر کچھ سفر کشتیوں میں کچھ پیدل طے کیا۔ مختصر سے راستے نے دن بھر کھا لیا۔ شام پانچ بجے کے قریب سکھر پہنچا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا پہلی ٹرین صبح روانہ ہو گی۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا کہ اسے اپنے ایک دوست سراج الحق قریشی کا خیال آیا۔ انہوں نے کبھی کہا تھا کہ ان کے ایک عزیز ریلوے میں ٹی ٹی آئی ہیں اور سکھر میں ہیں۔ اس نے اسٹیشن سے ان کا پتا لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے قریشی صاحب کا نام لیا اور

اپنا تعارف کرایا۔ ان صاحب کا نام یاسین تھا۔ مل کر بہت خوش ہوئے اور مردانے میں اس کا بستر لگا دیا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ یاسین صاحب سے زیادہ دیر باتیں بھی نہ کر سکا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نماز فجر کے بعد کا کوئی وقت ہوگا کہ یاسین صاحب گھبرائے ہوئے آئے۔

''لیٹ صاحب بہت بری خبر ہے قائداعظم کا انتقال ہوگیا۔''

یہ سننا تھا کہ ایک لمحے کے لیے دماغ ماؤف ہوگیا۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے جیسے اب کہنے کو کچھ بھی نہ رہا ہو۔

''لیٹ صاحب! اب اس نوزائیدہ مملکت کا کیا بنے گا۔''

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ ابھی تو پاکستان اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں ہوسکا ہے۔ ابھی تو اس عظیم قیادت کی ضرورت تھی۔ قائداعظم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ یہ کھوٹے سکے کتنے دن اس مملکت کو چلائیں گے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ جس اللہ نے اس ملک کو بنایا ہے وہی اسے چلائے گا۔ اے اللہ تو میرے ملک کی مدد کرنا۔''

دونوں اس خلا کے پیدا ہو جانے کے بعد کے حالات پر گفتگو کرتے رہے۔

یاسین صاحب نے اسے کراچی جانے والی ٹرین میں سوار کرا دیا۔ ٹرین میں بھی فضا سوگوار تھی۔ ہر شخص کی زبان پر یہی باتیں تھیں وہ کراچی اسٹیشن پر اترا تو ہو کا عالم تھا نہ قلی نہ مزدور، نہ رکشا نہ وکٹوریہ۔ خوش قسمتی سے ٹرین میں ایک صاحب سے دوستی ہوگئی تھی جو ریلوے ملازم تھے۔ اس نے اپنا سامان ان کے یہاں چھوڑا اور پیدل اسی طرف چل پڑا جدھر ہر شخص قائداعظم کے آخری دیدار کے لیے جا رہا تھا۔

اگلے دن وہ جہاز پر سوار ہونے کے لیے بندرگاہ پہنچ گیا۔

☆......☆

داخلے کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب وہ لندن میں تھا۔ اب اسے لسانیات پر کام کرنے کے لیے موضوع کا تعین کرنا تھا۔ اس نے شمالی ہند میں ''ہند آریائی زبانوں کا ارتقا'' کا موضوع یونیورسٹی کے سامنے پیش کیا۔

انہیں مسٹر ماسٹر کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔ یہ صاحب دراصل انڈین سول سروس کے پنشن یافتہ افسر تھے اور اس زمانے میں جز وقتی طور پر لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس کا کام انجام دے رہے تھے۔ گجراتی زبان سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔

الفریڈ ماسٹر سے ان کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔

''آپ کو جرمن یا فرانسیسی زبان آتی ہے؟'' مسٹر ماسٹر نے پوچھا۔

''میں نے جب علی گڑھ میں سال اوّل میں داخلہ لیا تھا اس وقت جرمن زبان کا ایک اضافی کورس کیا تھا۔ اب تو دس بیس جملے ہی یاد رہ گئے ہوں گے۔''

''یہ تو ناکافی ہوں گے۔ آپ جرمن یا فرانسیسی میں سے کسی ایک زبان میں مہارت حاصل کریں اس کے بعد لسانیات پر کام شروع ہوگا۔''

''میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہندوستان پاکستان کے سیاسی خلفشار سے بھی آپ واقف ہیں میں تو جلد سے جلد کام ختم کر کے واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر زبان سیکھنے میں دو تین دن بھی ضائع ہوگئے تو مجھے بڑی پریشانی ہو گی۔''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' مسٹر ماسٹر اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''اب ہماری ملاقات تین مہینے بعد ہوگی۔ اس عرصے میں اپنی فرانسیسی ٹھیک کر لینا۔''

اس نے فرانسیسی زبان ٹھیک کی اور تین مہینے بعد لسانیات پر کام شروع ہوا۔

لندن اسکول کی مصروفیات سے جو وقت بچ جاتا وہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریری میں گزارتا تھا۔ یہاں بھی اس نے اپنا شغل جاری رکھا۔ برٹش میوزیم کے بالکل سامنے پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ اس مکان پر برٹش میوزیم کے بعض خطوطات بھی دستیاب تھے۔ فرسٹ کا فائدہ اٹھا کر اس نے کچھ خطوطات پر مضامین لکھے جو بعد میں اورینٹل کالج میگزین میں شائع بھی ہوئے۔

☆......☆

شمالی ہند میں آریائی زبانوں کے ارتقا کے موضوع پر کام کرنے کے بعد وہ مقررہ وقت پر لندن سے کوئٹہ واپس آ گیا۔ کام ختم کرنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ وہ یہاں چند ماہ مزید قیام کرے گا لیکن اہلیہ کی شدید بیماری کا خط موصول ہوا تو وہ پریشان ہوگیا۔ چند دن ہالینڈ میں اور چند دن مصر میں گزارنے کے بعد وہ کوئٹہ پہنچ گیا۔ بیوی کی صحت دیکھ کر مزید پریشان ہوگیا۔ بلوچستان کی شدید آب وہوا نے ان کی صحت کو گھن لگا دیا تھا۔ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ ...

کمزوری ہی ان کی بیماری تھی۔ ضروری تھا کہ ان کی آب و ہوا تبدیل ہو۔ اب سوال یہ تھا کہ کہاں جائے۔ وہ علی گڑھ سے تعلیمی رخصت پر لندن گیا تھا۔ چاہتا تو علی گڑھ واپس جاسکتا تھا۔ رشید احمد صدیقی ریٹائر ہونے والے تھے۔ ان کے بعد دوسرا نمبر اس کا تھا۔ یہ کھٹکا بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ تعلیم وتدریس کہیں اور رہتی نہ رہتی علی گڑھ میں ضرور رہتی۔ اس کے ذاتی مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ہندوستان میں اس کی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ انگریزوں کی غلامی سے تو آزادی مل گئی مگر اب کیا ہندوؤں کی غلامی میں رہنا ہوگا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہوگی۔ یہاں اردو کے اساتذہ کی ضرورت بھی ہوگی اور گنجائش بھی، کام کرتے ہوئے یہ احساس بھی ہوگا کہ ہم اپنے وطن کی خدمت کررہے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ فیصلہ کرنا دشوار ہورہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہ جائے۔ علی گڑھ چھوڑ دے۔ وہ سر عبدالقادر سے مشورہ کرنے کے لیے لاہور گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں اور ملاقاتوں پر پابندی لگادی گئی ہے۔ وہ ملاقات کے لیے گیا تو بڑی شفقت سے اندر بلوا لیا۔ مشورہ بلکہ حکم دیا کہ ہندوستان جانے کی کوئی ضرورت نہیں یہیں رہ جاؤ۔ اس وقت کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اور تم کام کے آدمی ہو یہاں ایسے لوگوں کی بہت ضرورت ہوگی جو اردو کے لیے کام کریں۔

وہ مولانا صلاح الدین (ادبی دنیا والے) سے بھی ملا۔ وہ اردو کے مشاق زار میں سے ایک تھے۔ انہوں نے بھی سر عبدالقادر کے مشورے کی تائید کی اور مجبور کیا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین خان علی گڑھ میں وائس چانسلر ہیں۔ ذاکر حسین خاں سے اس کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے۔ اس لیے اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کی موجودگی میں وہ علی گڑھ چلا جائے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان میں رہ جائے گا اور اپنی روزی یہیں تلاش کرے گا۔

انہی دنوں ایک اسامی مشتہر ہوئی جس کے جواب میں اسے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں سینئر لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ کرلیا گیا۔

کالج کا شعبہ اردو اس وقت صرف کاغذی شعبہ تھا اور فارسی شعبے میں ملا ہوا تھا۔ اردو پڑھانے والے مستقل اساتذہ میں صرف طاہر فاروقی تھے۔ سید عبداللہ شعبہ فارسی میں استاد تھے اور اردو بھی پڑھاتے تھے۔ باقی اساتذہ کالج سے باہر کے تھے اور جز وقتی یا اعزازی طور پر آتے تھے۔ ابوالليث کے بعد ڈاکٹر عبارت بریلوی، سید وقار عظیم اور مشرف انصاری بھی آگئے اور یوں چہار درویش اس کالج میں جمع ہوگئے۔

یہ سکون ملنے کے بعد اس نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرایا اور بیوی بچوں کو کوئٹہ سے لاہور لے آیا۔

''لکھنو کا دبستان شاعری'' کے بعد اس کالج میں رہتے ہوئے اس کی وہ اہم تصنیفات سامنے آئیں۔ ''جرأت ان کا عہد اور شاعری'' اور ''نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری''۔

اس کے دل میں اور نہ جانے کیا کیا ارمان تھے جو وہ تصنیفی دنیا میں رہ کر نکالنا چاہتا تھا کہ بعض احباب نے اسے پیشہ وارانہ سیاست میں گھسیٹ لیا۔ جہاں اس سے محبت کرنے والے موجود تھے وہیں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے اس کی معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ جن لوگوں سے معرکہ آرائی ہوئی ان میں سرفہرست ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ وہ بھی دبنے والا کہاں تھا۔ خوب خوب چوٹیں ہوئیں۔ پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ وہ کبیدہ خاطر رہنے لگا۔

یہ جنگ اس وقت طول پکڑ گئی جب پنجاب یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کی تقرری کا مسئلہ تھا۔ اُمیدوار دو تھے ایک سید عبداللہ اور دوسرا وہ خود یعنی ابوالليث صدیقی۔ اس اسامی کے لیے وہ خود کو جائز حق دار تصور کرتا تھا۔ اسے اُمید بھی کہ تقرری اسی کی ہوگی لیکن تقرری سید عبداللہ کی ہو گئی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر وحید قریشی کے نام سے ''لکھنو کا دبستان شاعری'' پر ایک طویل تنقیدی مضمون بمبئی کے ایک رسالے میں شائع ہوا اور اس کے نسخے پاکستان میں تقسیم کیے گئے۔

ابوالليث کو یہ گمان تھا کہ یہ تنقیدی مضمون سید عبداللہ نے تحریر کیا ہوگا اور وحید قریشی کے نام سے شائع کرایا گیا یا کم ازکم اس مضمون کی تیاری میں سید عبداللہ نے مدد کی۔

وہ ان سب باتوں کو ذاتی لڑائی سمجھ کر بھلا بھی سکتا تھا لیکن بعض باتیں ایسی ہوئیں جنہیں وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے تمام عمر اردو کی توسیع وترقی کے لیے گزاری تھی

لیکن اب اس کی ناقدری کے جلوے سامنے آرہے تھے وہ ایسے ناقدروں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشرقی علوم کے سخت مخالف تھے۔ نجی محفلوں میں اکثر کہتے سنائی دیتے تھے۔ ''یہ علوم مر چکے ہیں۔ ان کو دفن کر دیجیے۔''

ان کے حاشیہ نشیں ان سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہیں خوش کرنے کے لیے اورینٹل کالج اور اس کے اساتذہ کو تضحیک و تذلیل کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ انہی دنوں اس نے ایک مضمون ایک تقریب میں پڑھا۔ یہ مضمون غزل کے موجودہ رجحانات سے بحث کرتا تھا۔ اس مضمون میں ضمناً تقسیم ہند، فسادات، ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی قربانیاں اور قیام پاکستان کے بعد کی صورتِ حال کو بیان کیا گیا تھا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ان حالات کی روشنی ہی میں غزل کے موجودہ رجحانات پر بحث کرنا تھی۔

اس نے تو صرف حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

''آج بھی قافلے پہلے کی طرح بھٹکتے ہیں۔ آج بھی راہی حیران ہیں۔ افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت کے طوق ایک آزاد ملک کے آزاد فرزندوں کی گردنیں اپنے بوجھ سے جھکا رہے ہیں۔ عدل و انصاف کے الفاظ آج بھی شرمندۂ معنی نہیں۔ یقیناً یہ وہ منزل نہیں جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ وہ منزل ابھی دور ہے۔ یہ وہ صبح نہیں جس کا انتظار تھا۔ وہ صبح ابھی دور ہے لیکن افق کی تاریکی میں دور سے کچھ کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں اور قافلہ اسی طرح رواں دواں ہے۔''

اس نے حقائق کی ترجمانی کی تھی لیکن مایوسی کا اظہار نہیں تھا۔ اسے اندھیرے میں کرنیں پھوٹتی نظر آرہی تھیں لیکن اسے اس کی وطن دشمنی سمجھ لیا گیا یا جان بوجھ کر اس کے خلاف محاذ بنانے والوں نے یہ موقع تلاش کر لیا۔ اتنی سخت مخالفت ہوئی کہ اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔

کراچی یونیورسٹی میں ریڈر کی اسامی مشتہر ہوئی تھی۔ اس اسامی کے لیے دو امیدوار تھے ایک ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور دوسرے ابواللیث۔ انٹرویو ہوا اور ابواللیث کی تقرری عمل میں آگئی۔ یونیورسٹی اس زمانے میں نانک واڑہ میں تھی۔

اس نے لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں رہنے کا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی جس سے وہ یونیورسٹی آتا جاتا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ اب وہ مستقل قیام لاہور میں کرے گا لیکن حالات ایسے ہوگئے کہ کراچی جانا پڑا۔ گھر بار چھوڑ کر کراچی جانا آسان نہیں تھا۔ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد ایک ٹھکانا ملا تھا۔ اس کی بیوی کو تو لاہور سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ کراچی میں قدم جماتے جماتے دیر لگ سکتی تھی۔ اس نے بیوی بچوں کو لاہور میں چھوڑا اور اکیلا کراچی آگیا۔ انسان جب ہمت کر لیتا ہے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ علی گڑھ کے ایک رفیق کار سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ دن ان کے ساتھ رہا۔ کراچی کی سڑکوں پر ہی اس کی ملاقات ابن انشا سے ہو گئی اور وہ ان کے کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ بعد میں وہ پاپوش نگر کے ایک مکان میں رہنے لگا۔

اس وقت شعبہ اردو میں کوئی مستقل استاد نہیں تھا۔ شعبہ اردو کا وجود صرف انتظامی تھا۔ ابواللیث کے آنے کے بعد شعبہ قائم ہوا اور مستقل اساتذہ کا تقرر ہوا۔

وہ جہاں جاتا تھا نئے دوست بنا لیتا تھا۔ طبیعت میں نیاز مندی تھی لہٰذا بزرگ بھی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ مولوی عبدالحق سے قربت نصیب ہوئی۔ پیر حسام الدین راشدی سے تعارف ہوا اور پھر قربت بڑھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر عباد الرحمٰن خان تو یونیورسٹی ہی میں تھے۔ ڈاکٹر عبادالرحمٰن خان علیگیرین تھے۔ جس وقت ابواللیث طالب علم تھا وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ جغرافیہ کے پروفیسر اور صدر تھے۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی جو ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ڈاکٹر بشیر احمد ہاشمی وائس چانسلر تھے۔ یہ بھی علی گڑھ کی برادری سے تھے۔ کچھ دنوں تک تو ابواللیث کو یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ علی گڑھ میں ہے۔

اس نے یونیورسٹی کی بہتری کے لیے وائس چانسلر کو ایک تجویز پیش کی۔ ''ہم دورانِ تعلیم اپنے بہترین طلبہ کا انتخاب کریں اور ان کو اپنے شعبوں میں پوری توجہ سے تربیت دیں۔''

''آپ کی یہ تجویز اچھی ہے لیکن اس کے لیے ہمیں اسٹاف کی کمی کا سامنا ہوگا۔''

''اس کے لیے مددگار پروفیسر مقرر کیے جاسکتے ہیں۔''

انہوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور مختلف شعبوں میں اس طرح کے زیر تربیت مددگار مقرر ہو گئے۔ اس کی درخواست پر انہوں نے شعبہ اردو کے لیے فرمان فتح پوری کو مقرر کر دیا۔

یہ منصوبہ یہیں تک پہنچا تھا کہ اسے نیویارک کی کولمبیا

چند اہم قومی کام

1۔ حکومت پنجاب کی طرف سے 1952ء میں اسکرپٹ کمیٹی کے کنوینر مقرر کیے گئے۔ اردو اسکرپٹ رموز واوقاف وغیرہ پر ایک رپورٹ تیار کی اور سرکاری تحریروں میں شامل کرنے کے لیے اپنی سفارشات پیش کیں۔
2۔ 1976ء میں ترقی اردو بورڈ کے معتمد اور پھر لغت کے مدیر اعلیٰ بنے۔ لغت کی چھ جلدیں شائع کیں۔
3۔ اردو ٹائپ رائٹر کا کلیدی تختہ (کی بورڈ) تیار کیا۔
4۔ ترقی اردو بورڈ کے لیے ایک ایسا کی بورڈ تیار کیا جو سندھی اور پشتو میں بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔
5۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور کے لیے اردو کے بنیادی الفاظ پر مبنی ایک لغت تیار کی جس کے تراجم سندھی، پنجابی، فارسی اور ترکی میں شائع ہوئے۔
6۔ مرکزی اردو بورڈ کے ایک منصوبے کے لیے اردو کے نمایاں رسائل کا ابتداء سے 1960ء تک کے عرصے کا اشاریہ تیار کیا۔
7۔ سائنسی ادب کی کتب کا اشاریہ تیار کیا۔
8۔ اردو قواعد کا حصہ ''صرف'' تحریر کیا۔
9۔ علامہ اقبال کی صد سالہ جوبلی کے لیے لکھی گئی تمام کتب پر نظر ثانی کی اور ترتیب کی خاص کمیٹی کے رکن بھی رہے۔
10۔ پنجاب یونیورسٹی کے منصوبے کے مطابق ہندو پاک کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ تحریر کرنے کے لیے جو پلاننگ کمیٹی قائم کی گئی اس کے ممبر رہے۔
11۔ کراچی یونیورسٹی کی جانب سے فرسٹ ٹیچنگ کانفرنس لاہور کے لیے سرکاری نمائندہ مقرر ہوئے۔

یونیورسٹی سے پیشکش آئی اور وہ مطالعہ پاکستان کے وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر امریکا چلا گیا۔
اس سفر میں وہ بیوی بچوں کو ساتھ لینا نہیں بھولا۔ اس لیے نہیں کہ وہ امریکا میں تنہائی محسوس کرتا بلکہ اس لیے کہ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ بیوی بچوں کو اب تک سکون کا ایک لمحہ بھی فراہم نہیں کرسکا ہے۔
وہ امریکا پہنچا تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سے مشورہ کیا کہ رہائش کہاں اختیار کی جائے۔
ان کا قیام ''بٹلر ہال'' میں تھا جو کولمبیا یونیورسٹی میں اکثر و بیشتر مہمان پروفیسروں اور ان کے اہل خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بھی بٹلر ہال میں قیام کرے حالانکہ اس سے صرف چند گلیاں آگے پیچھے اس سے بہت کم خرچ میں بھی انتظام ہوسکتا تھا۔ اس غیر ملک میں کسی شناسا ہمسائے کی موجودگی نعمت سے کم نہیں تھی۔
ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اشتیاق حسین قریشی وہاں کے گلی کوچوں سے واقف تھے۔ سستی دکانوں کے پتے جانتے تھے۔ اس کا فائدہ ابواللیث کو تو کم اس کی بیوی کو زیادہ ہوا۔ وہ ان کے ساتھ خریداری کے لیے نکل جاتی۔ حتیٰ کہ ہفتے دو ہفتوں میں انہوں نے خود خریداری شروع کر دی۔
اشتیاق حسین قریشی کا اکثر وقت کام کے اوقات کے بعد اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ ایک عظیم مورخ ایک عظیم اردو داں بٹلر ہال کی تو جیسے تقدیر ہی بدل گئی۔
ابواللیث تو جہاں جاتا تھا اپنے مطلب کے لوگ ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اس نے بہت سے احباب بنا لیے۔ کھانے کا وہ شوقین بھی تھا اور کھلا کر خوش بھی ہوتا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں اس کا گھر پاکستانیوں کا کلب بن گیا۔ جب بھی کوئی اچھی چیز پکتی تو احباب کو مدعو کیا جاتا۔ ان میں پاکستانی بھی ہوتے اور علی گڑھ برادری کے لوگ بھی۔
کولمبیا پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد اس کا لسانیات کا شوق پھر عود کر آیا۔ یہاں وقت بھی تھا اور مواقع بھی۔ اس نے طالب علم کی حیثیت سے باقاعدہ داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ لسانیت میں مشینوں کے استعمال سے وہ یہیں واقف ہوا اور واپس آکر جامعہ کراچی میں لسانیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کی جو پاکستان کی واحد تجربہ گاہ تھی۔
یہ دن اس کے آئیڈیل دن تھے۔ وہ صبح یونیورسٹی چلا

12۔ لینگوسٹک ریسرچ گروپ آف پاکستان کے تاحیات ممبر مقرر ہوئے۔
13۔ کولمبیا یونیورسٹی میں 59 تا 60ء وزٹنگ پروفیسر رہے۔
14۔ سیٹو (بنکاک) میں ماہر لسانیات کی حیثیت سے 61 تا 63ء کام کیا۔
15۔ 1965ء میں مغربی جرمنی، ترکی، لبنان اور سعودی عرب کا مطالعاتی دورہ کیا۔
16۔ 1968ء میں فیڈریشن آف کامن ویلتھ لندن یونیورسٹی کی جانب سے سینئر فیلوشپ ملی اور لندن آکسفورڈ، کیمرج اور اسکاٹ لینڈ کی جامعات کے لیکچر پروگراموں میں شریک ہوئے۔
17۔ سعودی عرب کے لیے ثقافتی اور تعلیمی وفد کے رکن مقرر ہوئے۔
18۔ 70ء میں امریکن یونیورسٹی آف بیروت (لبنان) میں اعلیٰ تعلیم کے سیمینار میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد کے لیڈر مقرر ہوئے۔
19۔ برکلے یونیورسٹی کی امریکن اسکالر مسز لین نے ان کی رہنمائی میں اردو زبان میں قانون بیداری کے موضوع پر تحقیقی کام کیا۔
20۔ برطانوی کونسل کی درخواست پر باہر سے آنے والوں کے لیے ایک خاص، مختصر المیعاد اردو نصاب تشکیل دیا۔
21۔ باہر سے آنے والوں کی تعلیم کے لیے جامعہ کراچی میں اردو کا خاص سمعی و بصری نصاب مرتب کیا اور چینی، جاپانی، فرانسیسی اور امریکی دانش وروں کو تعلیم دی۔
22۔ مختلف سیمیناروں اور صد سالہ تقریبات میں سرکاری نمائندے کے طور پر شرکت کی۔

☆☆☆

جاتا۔ سہ پہر کو نیویارک کی سیر ہوتی۔ رات کو اکثر و بیشتر لسانیات کی تجربہ گاہ میں کام کرنے چلا جاتا۔ اس وقت بھی اہلیہ اس کے ساتھ ہوتیں۔ دیر گئے واپسی ہوتی۔

اس طرح دن گزر رہے تھے۔ کولمبیا کی زندگی خاصی پُرکشش تھی۔ تفریح کے مواقع بھی میسر تھے اور مطالعے اور مشاہدے کے بھی۔ ڈاکٹر قریشی کی قربت بھی نصیب تھی۔ اس کے باوجود طبیعت اکثر اداس ہو جاتی تھی۔ ایک سال ہی گزرا تھا کہ پاکستان بہت شدت سے یاد آنے لگا۔ قریشی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ دن گنے جانے لگے کہ تعلیمی سال ختم ہو اور وہ پاکستان جائیں۔

تعلیمی سال کے خاتمے پر دونوں نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ قریشی نے ہوائی جہاز سے جانا پسند کیا جب کہ بچوں کے اصرار پر ابواللیث نے بحری سفر کا پروگرام بنایا اور نیویارک سے کوئن میری میں اپنی نشستیں محفوظ کرالیں۔

واپسی میں ایک ہفتہ لندن میں قیام کیا۔ اس کے لیے لندن نیا نہیں تھا لیکن اس کی اہلیہ اور بچوں کے لیے یہ بالکل نئی دنیا تھی۔ ایک مرتبہ پھر پارک میوزیم کتب خانے دیکھے۔ لندن سے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی ایک بیٹی ناظم آباد میں مقیم تھی۔ اسے فی الحال وہیں قیام کرنا تھا۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور ناظم آباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ یونیورسٹی ناتک واڑہ سے نئی عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ عمارت کیسی ہوگی کہاں ہے، چل کر اسے دیکھنا تو چاہیے مگر کس کے ساتھ جاؤں۔ خیر کل صبح دیکھا جائے گا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے میجر آفتاب حسن کی آواز آرہی تھی۔ ”مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کراچی پہنچ گئے ہیں۔“

”اللہ نے خیریت سے پہنچا دیا۔“

”آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہو کہ یونیورسٹی نئی عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔“

”مجھے نہ صرف معلوم ہو گیا ہے بلکہ وہاں جانے کے لیے بے چین بھی ہوں۔“

”پھر کیا خیال ہے کل چلیں۔“

”بھئی جانا تو ہے جوائننگ تو دینی ہے۔“

”تو پھر اکٹھے ہی چلیں گے۔ تین ہٹی سے ایک بس یونیورسٹی تک جاتی ہے۔ آپ وہاں آجائیں میں آپ کو وہاں مل جاؤں گا۔ وہ وعدے کے مطابق تین ہٹی پہنچ گیا۔ بس نے چلنا شروع کیا تو راستہ نہیں جنگل تھا جس میں بس چل رہی تھی۔ وہ میجر صاحب سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ وہ

اسے کہاں لے جا رہے ہیں کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ یونیورسٹی جا رہا ہے۔"

یونیورسٹی پہنچ کر وہ مزید حیران ہوا۔ کچھ عمارتیں بن رہی تھیں کچھ بن چکی تھیں۔ بجلی نہیں تھی، پانی کے نلکے نہیں تھے۔ سڑکیں اور دکانیں نہیں تھیں۔ بیمار پڑ جایئے تو اسپتال اور ڈاکٹر نہیں۔ باہر نکلیے تو کیمپس سے نیو ٹاؤن تک ویرانا ہی ویرانا۔ یہ بشیر احمد ہاشمی ہی تھے جو یونیورسٹی کو اس نئے کیمپس میں اٹھا لائے تھے۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ روزانہ یونیورسٹی آنا جانا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ اس ویرانے کو آنکھوں میں بسائے ہاشمی صاحب سے ملنے پہنچ گیا۔ وہ اس عمارت میں مقیم تھے جو یونیورسٹی کے مہمان خانے کی نیت سے بنی تھی۔ اس لحاظ سے وہ کیمپس کے تنہا مکین تھے۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"میں تمہاری کمی بہت محسوس کر رہا تھا۔ اچھا ہوا جلدی چلے آئے۔ دو چار دن آرام کر کے جوائن کر لینا۔"

"آرام کیا کرنا۔ میں تو آج ہی جوائن کرنے کو تیار ہوں۔"

"قیام کہاں رکھا ہے۔"

"ابھی تو ناظم آباد میں بیٹی کے ساتھ ہوں۔ وہیں کرائے پر مکان لینے کا ارادہ ہے۔"

"وہاں سے آنے میں تو بڑی دقت ہوا کرے گی۔"

"دقت تو ہوگی مگر میں نے بڑے بڑے پہاڑ کاٹے ہیں۔ یہ مشکل بھی گزار ہی لوں گا۔"

"میں اس کیمپس میں بالکل اکیلا رہتا ہوں۔ تم یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ نہ بس کا جھنجھٹ نہ سواری کی تلاش شہر میں مکان لو گے تو کرایہ بھی دینا پڑے گا۔"

"اس ویرانے میں رہنے کی ہمت آپ ہی کر سکتے ہیں۔"

"یہ تو سوچو یہاں کی تنہائی میں تمہیں لکھنے پڑھنے کی کتنی سہولت مل جائے گی۔"

"میں اگر آ بھی جاؤں تو اہلیہ کو سخت اعتراض ہوگا۔ وہ تو کبھی نہیں آئیں گی۔"

"تم ہامی بھرو۔ ہم سب انہیں بھی منالیں گے۔"

"انہیں لاہور سے عشق ہے۔ وہاں میں نے گھر بھی بنا لیا ہے۔ انہوں نے اگر لاہور چھوڑا بھی تو کراچی کے کسی اچھے علاقے میں رہنا پسند کریں گی۔ اس جنگل میں کیا آئیں گی۔ اب تو وہ امریکا، انگلستان سب دیکھ چکی ہیں۔"

"آپ تو آ جائیں پھر وہ بھی آ جائیں گی۔ ہم انہیں منالیں گے۔"

وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ وہ ان کی بات کو ایک حد تک ہی ٹال سکتا تھا، مان تو گیا لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ اس مکان کو دیکھے جو اسے ملنے والا تھا۔ وہ کیمپس کے اس حصے میں گیا جہاں رہائشی مکان تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر گھبرا گیا۔ کوئی مکان مکمل نہ تھا۔ نہ بجلی نہ پانی نہ سڑک نہ کموڈ کام کرتے تھے۔

"آپ آ تو جائیں۔ سڑکیں تو ابھی نہیں بنیں گی لیکن مکان بہت جلد اس حالت میں آ جائے گا کہ آپ آرام سے رہیں گے۔" انہوں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ آ گیا۔ وہ اس بستی کا پہلا مکین تھا۔

1960ء کے آخر میں اس کی اہلیہ بھی لاہور سے کراچی منتقل ہو گئیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوشی کے بعد وہ کراچی میں نہیں رہیں گی۔ لاہور والے گھر میں مستقل قیام کریں گی۔

اس کا تقرر ریڈر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ دو سال بعد اسے پروفیسر کا درجہ دے دیا گیا۔

اس کی علمیت اور تنقیدی و تحقیقی کاموں کا اعتراف اب ہر جگہ کیا جا رہا تھا۔ غیر ملکی یونیورسٹیاں اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بے چین تھیں چنانچہ کامن ویلتھ یونیورسٹیز کی تنظیم کی طرف سے برطانوی یونیورسٹیوں میں لسانی تحقیق کرنے اور اپنی پسند کی یونیورسٹیوں میں تدریسی اور توسیعی لیکچروں کے لیے اس نے فیلوشپ قبول کر لی۔ ایک مرتبہ پھر لندن یاترا کے لیے کمر کس لی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بڑی بیٹی زہرہ لندن میں تھی۔ یہ سفر اس سے ملاقات کا بہانہ بھی بن سکتا تھا۔ جب بیٹی اور نواسی وہاں تھیں تو اہلیہ کو لے جانا بھی ضروری تھا کہ وہ بھی بیٹی سے مل لیں گی لہٰذا لندن کے اس قیام میں بھی اہلیہ ساتھ تھیں۔

اس نے اہلیہ کو بیٹی کے گھر چھوڑا اور خود انگلستان کے مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں کے جائزے کے لیے نکل گیا۔ کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینا تھا، کہیں مختصر تدریسی فرائض انجام دینے تھے۔ یہ لیکچر زیادہ تر لسانیات پر ہوا کرتے تھے کیوں کہ اسے لسانیات سے عشق تھا۔ پاکستان میں اردو کے پروفیسر تو بہت تھے لیکن ماہرین لسانیات انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ وہ اپنی اس حیثیت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے کے لاتعداد مضامین شائع ہو چکے تھے۔

دوسرے یہ کہ انگلستان کی یونیورسٹیاں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی طلب گار تھیں لہٰذا اس کے یہ لیکچر اسی نوعیت کے تھے۔

ان لیکچروں سے ہٹ کر وہ اپنا وقت انڈین آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں گزارتا تھا۔ اس نے یہاں کے ذخیرے سے استفادے میں دن رات ایک کر دیے۔ وہ چاہتا تھا پاکستان روانگی سے قبل جتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھا لے۔ اس کی یہ محنت آئندہ لکھے جانے والے مضامین و تصنیفات میں نظر آتی ہیں۔ یہاں کی لسانی تجربہ گاہوں میں وقت گزار کر ان جدید آلات کا جائزہ لیا جو لسانی تجربات میں کام آتے تھے۔ واپس آ کر جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں لسانیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کی جو پاکستان میں لسانیات کی واحد تجربہ گاہ تھی۔ یہ ایسی معیاری تجربہ گاہ تھی جس کا اعتراف بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین لسانیات بھی کرتے تھے۔

لندن میں قیام طول پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ تو اپنے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ اہلیہ کا دل اب بھر گیا تھا۔ واپس جانے کا ابھی دور دور تک امکان نہیں تھا۔ ایک دن وہ گھر پہنچا تو منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

"آپ تو اپنے تجربات میں اضافے کر رہے ہیں میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کام کیا کم ہے کہ آپ میری واپسی کی راہ تکتی رہتی ہیں۔"

"مذاق چھوڑیے میرے لیے کوئی کام بتائیے۔"

"یہ تو آپ پر منحصر ہے۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ کہیں داخلہ لے لوں اور انگریزی رواں کر لوں۔"

"رواں کرنا ہے تو انگریزی رواں کیجیے آپ انگریزی کا کیا کریں گی۔"

"آپ کی اردو ہی نے تو میری تھوڑی بہت انگریزی کا بیڑہ غرق کیا ہے۔"

انہوں نے ضد کر کے ایک ادارے میں داخلہ لے لیا اور پاکستان واپس آنے تک انگریزی روانی سے بولنے لگیں۔

☆......☆

حکومتِ پاکستان کی ایک قرارداد کے ذریعے 1958ء میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ بورڈ کے ذمے آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے طرز پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کی جائے گی۔

جب لغت کا کام شروع ہوا تو مولوی عبدالحق پہلے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ اسامی تقریباً پندرہ سال خالی رہی۔ اس دوران میں یعنی 1976ء میں وہ جامعہ کراچی کی مدت ملازمت مکمل کر کے ریٹائر ہو گئے لیکن ان کی علمی و ادبی خدمات اتنی تھیں کہ ابھی جامعہ کو ان کی ضرورت تھی لہٰذا انہیں پروفیسر ایمریطس (پروفیسر تاحیات) مقرر کر دیا گیا۔ اب وہ کچھ وقت دوسرے کاموں کے لیے بھی دے سکتے تھے۔ صحت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ جوانوں سے زیادہ تیز چلتے تھے لہٰذا اردو بورڈ کی نظر ان پر پڑی۔ لغت کا کام ادھورا پڑا ہوا تھا۔ لغت نویسی کے لیے ان سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ انہیں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے متعین کر دیا گیا۔ صبح کیمپس سے نکلتے۔ کچھ دیر شعبہ اردو میں آتے۔ انتظامی معاملات دیکھتے کوئی پی ایچ ڈی کا طالب علم انتظار میں بیٹھا ہوتا تو اس کا کام دیکھتے، کچھ مشورے دیتے، اساتذہ آ کر بیٹھ جاتے۔ ان سے خوش گپیاں کرتے اور پھر خود ہی ڈرائیونگ کرتے ہوئے اردو لغت بورڈ پہنچ جاتے اور ایسے تر و تازہ جیسے ابھی غسل کر کے نکلے ہوں۔ یہاں پہنچ کر بھی عملے کے ارکان سے خوش اخلاقی سے ملتے۔ اراکین کے ساتھ ان کا رویہ نہایت نرم تھا لیکن کام میں کوتاہی قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا لیکن وہ ایسے ہی موقعوں پر نکلتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ طلبہ کے لیے ان کے پاس اس غصے کا ایک فیصد بھی نہیں تھا۔

جس طالب علم میں ذرا سی بھی قابلیت دیکھتے اسے اکساتے کہ وہ کسی موضوع پر تحقیق کرے۔ جب وہ کام شروع کر دیتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے انہوں نے کوئی کتاب لکھ دی ہو۔ طالب علم سے محنت تو خوب کراتے لیکن اس کے وکیل بن کر مقدمہ ایسے لڑتے کہ ڈگری مل کر ہی رہتی۔ مشہور تھا کہ نگراں انہیں بنا لو پھر ڈگری پکی ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ انتظامی معاملات میں ان کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ سب لوگ ان کی عزت بھی بہت کرتے تھے لہٰذا جب وہ دلچسپی لیتے تھے تو مہینوں کا کام ہفتوں میں ہو جاتا تھا۔ ممتحن کا انتخاب زبانی امتحان کے لیے ممتحن کو منتخب کرنا، سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں ان ناموں کو پاس کروانا جلد سے جلد انٹرویو کا اہتمام کرانا۔ یہ سب بھاگ دوڑ کے کام تھے اور وہ ا

طرح بھاگ دوڑ کرتے تھے جیسے یہ ان کا اپنا کام ہو۔ وہ علی گڑھ کے اساتذہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے جہاں اساتذہ طلبہ کے دوست بن جاتے تھے۔ ان کے استاد رشید احمد صدیقی کا یہی عالم تھا۔ یہی اثرات ابواللیث صدیقی میں آئے تھے۔ محلے کا کوئی آدمی کتنے ہی ضروری کام سے ان کے پاس آیا ہوتا اور کوئی طالب علم آجاتا تو اس سے معذرت کر لیتے اور کام چھوڑ چھاڑ کر طالب علم کی مشکلات سننے لگتے۔ ان کی اس مہربانی کا میں خود عینی شاہد ہوں۔

یونیورسٹی دور تھی اس لیے انہوں نے مجھے یہ اجازت دے دی تھی کہ میں ان سے اردو بورڈ کے دفتر میں مل لیا کروں۔ جو اس وقت ناظم آباد میں تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ کسی کام میں مشغول ہیں یا بورڈ کا کوئی رکن کسی کام سے آیا ہوا ہوتا اور میں پہنچ جاتا وہ اسے کچھ دیر بعد آنے کے لیے کہتے اور میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ بعض نگراں طالب علم کی طرف سے لکھے گئے مواد کو پڑھنے میں کئی کئی ہفتے لگا دیتے ہیں جس سے کام میں دیر لگتی ہے۔ طالب علم بے چارہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ نگراں کی طرف سے پچھلا مواد جانچ لیا جائے تو وہ اگلا باب شروع کرے۔ مجھے کبھی ان کی جانب سے یہ شکایت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کہتے میں اسے رات میں پڑھ لوں گا کل آکر لے جانا۔ مجھے پہلی مرتبہ تو تعجب ہوا تھا کہ اتنی معروفیت سے وقت نکال کر کس طرح وہ اسے پڑھ لیں گے لیکن دوسرے دن گیا تو میرے لکھے ہوئے صفحات ان کی ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ یہ صفحات انہوں نے پڑھے بھی ہیں یا یونہی واپس کر دیے لیکن جب یہ نوٹ لکھا ہوا دیکھا کہ اس باب کے لیے فلاں کتاب بھی دیکھ لینا تو مجھے یقین ہوا کہ صفحات انہوں نے پڑھے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اگر کبھی دیر ہوتی تو میری طرف سے ہوتی۔ انہوں نے مجھے کبھی چکر نہیں لگوائے۔ نہ کبھی کوئی ایسی بات کی جس سے میری دل شکنی ہو۔

میں خود استاد تھا۔ استادوں سے واسطہ رہتا تھا لیکن میں نے ان جیسا استاد دوسرا نہیں دیکھا۔ فروغ علم کا ایسا شوق تھا کہ طلبہ کو اس کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایسی عزت کرتے تھے جیسے ان کا اس سے کوئی مطلب ہو۔ مطلب یہی تھا کہ اس کے علم کا کچھ حصہ اسے منتقل کر دیں اور پھر وہ اسے آگے بڑھائے۔ اس طالب علم سے تو بہت ہی خوش ہوتے تھے جس میں علم کے حصول کی تڑپ دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ جو وہ سلوک کرتے تھے اس کو تو میں ناز برداری کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ جس بات پر کوئی استاد دکھانے کے لیے ہی سہی بھڑک سکتا ہے اسے بھی وہ تحمل سے برداشت کر لیتے تھے۔

مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے اور اب خیال آتا ہے کہ میری طرف سے ہی کچھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں مقالہ تحریر کرتے ہوئے کسی جگہ اٹک گیا اور اپنی عادت کے مطابق سخت پریشان ہو گیا کہ کس طرح یہ مسئلہ حل ہو۔ میری بے صبری نے رات کا کٹنا دوبھر کر دیا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ فجر کی نماز ختم ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور اس دن تو سردی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنی سر دصبح کسی کے گھر جانا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر اور انتظار کر لوں ذرا دھوپ تو چمکنے دوں۔ میں تو خیر جوان ہوں جس سے ملنے جا رہا ہوں وہ تو بوڑھا آدمی ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے سو کر اٹھنے کے معمولات کیا ہیں۔ وہ سو رہے ہیں یا اٹھ گئے ہوں گے۔ فجر کی نماز کے بعد کیا خبر پھر سو گئے ہوں۔ غرض میں نے کچھ نہیں سوچا اور کیمپس پہنچ گیا۔ دستک کے جواب میں دروازے کی اوٹ سے ایک سر باہر آیا۔ سر پر ایک اس طرح کا اونی ٹوپا تھا کہ پورا چہرہ ڈھکا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ تھے ابواللیث صدیقی۔ چند لمحوں تک تو وہ آنکھیں گھورتی رہیں اور پھر آنکھوں نے مسکرانا شروع کر دیا۔ ان کی فراخ دلی نے دروازہ کھول دیا۔ ''جلدی اندر آجایئے باہر بہت سردی ہے اور آپ ایک سوئٹر میں چلے آئے۔'' انہوں نے چھت پر ایک کمرا بنایا ہوا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے لکڑی کا زینہ تھا۔ غالباً گھر میں سب لوگ سو رہے تھے اس لیے وہ مجھے لے کر چھت پر چلے گئے۔ مجھے وہاں بٹھا کر کچھ کہے بغیر خود نیچے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آئے تو ایک ٹرے میں دو کپ رکھے ہوئے تھے۔

''ساجد میاں اس وقت تو گرم گرم چائے پیو، سردی بہت ہے۔''

مجھے یقین ہے یہ چائے وہ خود بنا کر لائے ہوں گے۔ اس وقت کسی کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔ گفتگو شروع ہوئی تو جتانے تک کے لیے یہ نہیں کہا کہ یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔ کوئی مہمان ناوقت ہمارے گھر آجائے تو ہمارا منہ بن جاتا ہے لیکن ان کا چہرہ اسی طرح گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ جو میرا مسئلہ تھا اسے حل کرنے کے بعد جب میں اٹھنے

لگا تو انہوں نے مجھے روک لیا۔ ’’سواری ہے؟‘‘
’’جی نہیں۔ بس سے آیا تھا۔‘‘
’’اب کہاں یہاں سے وہاں تک پیدل جاؤ گے اور پھر بس پکڑو گے۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔‘‘
وہ اردو بورڈ جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ان کے پاس اس وقت ہائی روف تھی۔ مجھے بھی بٹھالیا۔
اسی طرح ایک اور واقعہ میں نہیں بھولتا۔ اس وقت میں پی ایچ ڈی کر چکا تھا۔ میرا پہلا مجموعہ کلام ’’قافیہ پیائی‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی ہونا تھی۔ میں نے جو دعوت نامہ چھپوایا اس میں ابواللیث صدیقی کا نام بطور مقرر یہ سوچ کر نہیں رکھا کہ انہیں کیوں زحمت دی جائے کہ وہ یونیورسٹی سے اس معمولی سی تقریب میں شرکت کے لیے آئیں البتہ دعوت نامہ ان کی خدمت میں پہنچا دیا۔ وہ بھی براہِ راست نہیں۔ وہ اس وقت یونیورسٹی میں موجود نہیں تھے۔ میں ان کا دعوت نامہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کو دے آیا۔ کشفی صاحب کو بھی آنا تھا۔ میں نے سوچا اگر یہ آئے تو ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ اگر انہیں تقریر کرنی ہوتی تو وہ پابند ہو جاتے۔ اب اگر مناسب سمجھیں گے تو آجائیں گے۔
تقریب شروع ہونے ہی والی تھی۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے) معلن (اسٹیج سیکریٹری) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ابھی مہمانوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دے ہی رہے تھے کہ ابوالخیر کشفی کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب پنڈال میں داخل ہوئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی پیرزادہ قاسم نے ڈاکٹر صاحب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب انکار کیے بغیر بہ خوشی اسٹیج پر آگئے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جب انہیں خیالات کے اظہار کے لیے دعوت دی گئی تو یہ دعوت بھی قبول کی۔ یہ نہیں کہا کہ مقررین میں میرا نام تو ہے نہیں۔ یہ ہوتی ہے بڑے لوگوں کی پہچان۔ میں نے بعد میں معذرت بھی کی اور وضاحت بھی کی کہ میں نے انہیں تقریر کی زحمت کیوں نہیں دی تھی۔ انہوں نے بڑے ناز سے فرمایا۔
’’ساجد میاں تم میرے شاگرد ہو۔ میرا تمہارا رسمی تعلق نہیں ہے کہ دعوت نامے میں نام لکھنے کی رسم نبھاتے۔ تم نے اچھا ہی کیا۔ اگر میں نہ آتا تو تمہارا ایک مقرر کم ہو جاتا۔ میں آ گیا میں نے کچھ الفاظ بول دیے۔ مجھ پر تمہارا حق تھا میں نے ادا کر دیا۔‘‘

ایک میں ہی ان کا شاگرد نہیں تھا کہ وہ اتنا خوش ہو رہے تھے۔ ان کی نگرانی میں سینکڑوں لوگوں نے پی ایچ ڈی کیا ہوگا۔ وہ ہر شاگرد سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ وہ اس طرح ملتے تھے کہ طالب علم میں علم کا شوق پیدا ہو جائے۔ یہ سلوک ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ وہ چپکے چپکے طالب علم کی تربیت کرتے رہتے تھے۔ وہ اتنی نرم گردن کے نہیں تھے۔ جس کے دوست تھے اس کے دوست تھے لیکن جس سے ٹھن جاتی اس کو گھر تک چھوڑ کر آتے تھے۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا لیکن وہ اس کے اظہار میں بہت محتاط تھے۔ یہ غصہ اس وقت سر اٹھاتا تھا جب ان کے کاموں میں کوئی بے جا دخل اندازی کرتا تھا۔ ان کے مزاج سے واقف ہو جانے والا بہت فائدے میں رہتا تھا۔

☆......☆

لغت کے مدیر اعلیٰ ہونے کے بعد اسی سال معتمد بنا دیا گیا۔ گویا اس عہدے کے حصول کے بعد وہ بااختیار تھا۔ ابھی تک لغت کی ایک بھی جلد شائع نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی وجوہات مختلف تھیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ الفاظ کے استعمال کے لاکھوں کارڈ ایسے افراد نے لکھے تھے جنہوں نے املا کی غلطیاں کی تھیں اور اقتباسات میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ دوسری بڑی وجہ سنسکرت یا پراکرت سے ماخوذ الفاظ کے اشتقاق کا اندراج اور تکمیل تھی۔ پاکستان میں سنسکرت کے ماہر ناپید تھے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور اختر حسین رائے پوری نے کام کو آگے بڑھایا مگر تکمیل نہ ہو سکی اور طویل عرصہ گزر گیا۔ ابواللیث کی تقرری نہ ہوتی تو شاید یہ کام یونہی پڑا رہ جاتا لیکن ابواللیث صدیقی کی بے پناہ قوت ارادی نے اس کام کو ایک سال میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ سنسکرت کے جتنے اشتقاق لکھے گئے تھے نستعلیق رسم الخط میں لکھے گئے تھے جو نہایت غیر علمی صورتِ حال تھی۔ سنسکرت ٹائپ موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کوششیں بسیار کے بعد سنسکرت ٹائپ مہیا کیا اور سنسکرت کے کل اشتقاق نئے سرے سے لکھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے سوا یہ کام شاید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی محنت تھی کہ جو کام پندرہ سال سے رکا ہوا تھا انہوں نے ایک سال میں مکمل کر کے لغت کی پہلی جلد شائع کر دی۔ لغت میں شامل ابواللیث کا مقدمہ بذاتِ خود ایک علمی کارنامہ ہے۔
اس کے بعد ان کی ادارت میں پانچ جلدیں مزید

شائع ہوئیں۔ تنقید کرنے والے ہر چیز پر تنقید کرتے ہیں۔ اس لغت پر بھی تنقیدیں ہوئیں۔ یہ تنقید درست ہوں گی۔ اس جلد میں یا اگلی کئی جلدوں میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ تنقید کرنے والے ان مشکلات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے جو ڈاکٹر صاحب کو پیش آ رہی تھیں۔ عرصہ تک بورڈ کی اپنی عمارت نہیں تھی۔ اپنا پریس نہیں تھا۔ سنسکرت ٹائپ کی سہولت تک موجود نہیں تھی۔

نکالنے والے تو خدا کی تخلیق میں بھی عیب نکال لیتے ہیں یہ تو ابواللیث کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے آٹھ سال میں چھ جلدیں فراہم کر دیں۔ ان میں خامیاں بھی ہیں لیکن خوبیاں زیادہ ہیں۔ یہ ان ہی کا کارنامہ تھا جس نے بنیاد فراہم کر دی جس پر لغت کی عمارت کھڑی ہوئی اور اب تک بائیس تئیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

بورڈ کا کام تدوین لغت کے کام کو جاری رکھنا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب تو جہاں جاتے تھے چند کام ایسے ضرور انجام دیتے تھے جو ہمیشہ کے لیے یادگار رہ جاتے تھے۔ ان کاموں میں ایسے منہمک ہوتے کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے۔ انہوں نے اردو بورڈ کے لیے ٹائپ مشین کے لیے کلیدی تختے (Key bord) کی تیاری کا کام بھی سرانجام دیا جو منظور کر لیا گیا اور اس کے مطابق ٹائپ مشینیں تیار کی گئیں۔

بورڈ کا دفتر اب تک کراچی کے مختلف علاقوں میں کرائے کی عمارتوں میں چلا آ رہا تھا۔ اس طرح بہت سا فنڈ بھی ضائع ہوتا تھا اور ضروری نہیں کہ عمارت کی ساخت بورڈ کے کاموں کے عین مطابق ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں کوششیں شروع کر دیں کہ بورڈ کی اپنی عمارت ہو جو اپنے نقشے کے مطابق تعمیر کرائی جائے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور گلشن اقبال میں نیپا چورنگی کے نزدیک زمین حاصل کر لی گئی۔ تعمیری کام شروع ہوا تو خود کھڑے ہو کر نگرانی فرماتے تھے۔ ایسی دلچسپی لے رہے تھے جیسے اپنا ذاتی مکان بنوا رہے ہوں۔ دو منزلہ یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو 1984ء میں بورڈ کا دفتر اس عمارت میں منتقل ہو گیا۔ انہوں نے اس عمارت کی تعمیر کے بعد محیط اردو اور پریس کے نام سے ایک پریس بھی لگوایا اور اس کے متعلق تمام معلومات خود حاصل کیں تاکہ اس کی کارکردگی پر نظر رکھی جا سکے اور ضرورت پڑنے پر چھوٹی بڑی خامیوں کو از خود رفع کیا جا سکے۔ اس قسم کی کوئی دوسری مثال کیا نظر آ سکتی ہے؟

یہ کام تو کوئی دیوانۂ اردو ہی کر سکتا تھا۔

☆......☆

''میاں، میں نے ایک خواب دیکھا ہے خواب ایسا ہے کہ آپ کو سنانے کو جی چاہتا ہے۔''

''یہ چند کاپیاں ہاتھ میں ہیں۔ انہیں جانچ لوں تو پھر سنتا ہوں۔''

''آپ کی کاپیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے انہیں ہاتھ سے رکھ دیں۔ پھر میں بھول جاؤں گی۔''

''اچھا سناؤ۔'' ڈاکٹر صاحب نے کاپیاں ہاتھ سے رکھ دیں۔

''میاں میں نے دیکھا کہ میں تلاوت کر رہی ہوں، سورۃ کے آخر میں ''کانا توابا'' ہے۔'' ابواللیث نے کہا۔ ''اذا جا نصراللہ'' کے آخر کا حصہ ہے۔'' قرآن اٹھا کر دیکھا۔

''اس میں تو اسی سورۃ پر نشانی کا ایک کاغذ رکھا ہے۔''

اس دن کے بعد سے ان کی اہلیہ نے اس کی تلاوت کو ورد بنا لیا۔ ایک ڈیڑھ مہینا گزرا تھا کہ 24 فروری 1980ء کی رات گیارہ بجے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بستر پر ایک کاپی کھلی پڑی تھی جس پر فارسی کے کچھ ادھورے جملے لکھے ہوئے تھے۔ کچھ دن ہوئے انہوں نے فارسی سیکھنی شروع کی تھی۔ غالباً اسی کی مشق کر رہی تھیں۔ انتقال کے بعد ایک عزیز بزرگ کے یاد دلانے پر یاد آیا کہ جو صورت انہوں نے خواب میں دیکھی تھی وہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کی بشارت تھی۔ ان بزرگ نے یہ بھی بتایا کہ اس سورۃ کے متعلق تفسیر میں صاف لکھا ہے۔ ''اب دنیا کا کام مکمل ہوا۔ سفر آخرت اختیار کرو۔''

غالباً خواب دیکھنے کے بعد ریحان فاطمہ نے تفسیر بھی دیکھی ہو گی۔ اسی لیے ان ڈیڑھ مہینوں میں وہ عبادت کی طرف شدت سے راغب ہو گئی تھیں۔

یوں تو کسی کی موت ہو صدمے کا پہاڑ لے کر آتی ہے لیکن اہلیہ کی موت ان کے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ اسے اپنی بیوی سے جتنی محبت تھی اس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے شدید تنگ دستی میں حرف شکایت زبان پر لائے بغیر ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ انٹر میں تھے کہ ان کی شادی ہو گئی تھی۔ عرصے تک یونیورسٹی سے ملنے

والے وظیفے پر گھر بھی چلاتے رہے، تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتے رہے۔ بیوی کی یہ قربانی انہیں ہمیشہ یاد رہی۔ وہ دل سے ان کی قدر کرتے رہے۔ بعد میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اہلیہ کو دنیا بھر کی سیر اکرائی۔ حج، عمرہ سب کرایا۔ اس اعزاز سے بھی آشنا کیا کہ وہ ممتاز ماہر تعلیم اور اہم ترین ادیب و نقاد و محقق کی بیوی ہیں۔ ابواللیث سے ان کی محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب جو اچانک ساتھ چھوٹا اور زوجہ کو یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کیا تو قبر کی مٹی نے آواز دی۔ ''ہم آپ سے جدا ہو گئے ہیں ہماری محبت کو دل سے مت نکالنا۔'' اس دن کے بعد سے یہ معمول بنالیا کہ فجر کی نماز کے بعد اہلیہ کی قبر پر چلے جاتے۔ فاتحہ خوانی کرتے۔ دل کی باتیں کرتے اور لوٹ آتے۔ بیوی کو گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔ گھر میں بھی گلاب کے پودے لگائے ہوئے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد جاتے تو قبر پر گلاب کے پھول بکھیرتے۔ مغرب تک وہیں رہتے۔ پھول والوں سے ہفتے بھر کے پھول خرید کر فریج میں رکھ لیتے۔

''وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے۔''

انہوں نے وفاداری ایسی نبھائی کہ جب تک زندہ رہے (تقریباً چودہ سال) آندھی ہو یا طوفان فجر کے بعد اہلیہ کی قبر پر چلے جاتے۔ پھر عصر کے بعد جاتے۔ قبر پر پھول چڑھاتے مغرب تک وہیں رہتے۔ اپنی وفات سے ایک دن قبل تک بھی یہی معمول رہا۔

''پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ''

کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے دل برداشتہ ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا لیکن ان کی قوت ایمانی تھی جو موت کو برحق جانتی تھی۔ انہوں نے بیوی کی محبت کا حق ان کے لیے دعائے مغفرت کر کے ادا کیا اور بہت جلد اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

☆......☆

اردو بورڈ کی طرف تندہی سے متوجہ ہوئے۔ اردو بورڈ کی نئی عمارت اہلیہ کی وفات کے بعد ہی تعمیر کروائی۔ پریس لگوایا۔ اہلیہ کی کمی گھر پہنچنے کے بعد ہی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا کہ لکھنے پڑھنے کی طرف پہلے سے بھی زیادہ مشغول ہو گئے۔ وہ صرف مدرس نہیں تھے کہ کلاسوں تک محدود ہو جاتے۔ انہوں نے خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کے لیے قلم سنبھال لیا۔ یہ نہیں تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ جرأت، مصحفی، نظیر جیسے شعرا پر مستقل تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں ''ملفوظات اقبال'' اقبال اور مسلک تصوف جیسی کتب پڑھنے والوں کو دے چکے تھے۔ لاتعداد مضامین تھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ دو کتابیں لکھ کر ادبی مورخ کا درجہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ''اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ'' اور ''تاریخ زبان و ادب اردو'' جیسی کتابیں انہیں ادبی مورخ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ''آج کا اردو ادب'' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد مضامین کثرت سے شائع کروائے۔ اقبال اور علی گڑھ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جو رسالہ ''تصنیف'' میں قسط وار شائع ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی دو مضامین ''تہذیب'' شائع ہوئے۔ ''تہذیب'' ہی میں ''لسان اور مطالعہ لسان میں مسلمانوں کی خدمات'' کے عنوان سے دو مضامین شائع ہوئے۔ ''نگار'' میں ناول فنی نقطہ نظر سے شائع ہوا۔

اس وقت تک ان کی علمی خدمات اور کارنامے اس منزل تک پہنچ گئے تھے کہ ان کی سوانح شائع ہو جانی چاہیے تھی کہ لوگ اس عظیم ماہر تعلیم کی زندگی سے واقف ہوں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ہی قلم کو منتخب کیا۔ اپنی خود نوشت ''رفت و بود'' روزنامہ جسارت میں شائع کرانی شروع کی مگر یہ مکمل نہ ہو سکی اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اپنا ایک مجلہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ ابواللیث صدیقی بھی مجلس انتظامیہ میں شامل تھے۔ انہوں نے اس مجلے کا نام ''تہذیب'' تجویز کیا۔ انہیں اس مجلے کا مدیر اعلیٰ اعزازی مقرر کیا۔ عام طور پر مدیر اعزازی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا نام چھپتا رہے لیکن وہ تو جو کام کرتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے اداریے بھی تحریر کیے اور اس کے بعد جتنے مضامین لکھے وہ ''تہذیب'' کے لیے لکھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ تجارتی پرچہ نہیں۔ اس کی سرکولیشن زیادہ نہیں۔ وہ ایک ایسے مقام پر تھے کہ وہ جس پرچے کے لیے لکھتے اس کی قیمت وصول کرتے لیکن انہوں نے اس پرچے کے لیے مفت کام کیا۔ انہوں نے اپنی خود نوشت بھی تہذیب میں شائع کرانی شروع کی۔ اس کا سلسلہ ان کی وفات تک

جاری رہا۔ علمی کاموں سے وقت نکال کر وہ اسے پابندی سے شائع کراتے رہے۔

یہ خودنوشت صرف ان کی سوانح نہیں رہی بلکہ پڑھنے والے کو لگتا ہے جیسے وہ برصغیر کی علمی تاریخ پڑھ رہا ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر اور علی گڑھ کی عالم فاضل شخصیات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ خودنوشت ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

ان کے تنقیدی نظریات کی ایک جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے جو انہوں نے مختلف کتابوں پر ''فلیپ'' یا پیش لفظ کے طور پر لکھے ہیں۔ یہ تحریریں بغیر پڑھے نہیں لکھ دی گئی ہیں جیسا کہ اکثر لکھنے والے لکھ دیتے ہیں بلکہ وہ انہیں باقاعدہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے خود ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

''میں ان کتابوں پر اس لیے لکھنا قبول کر لیتا ہوں کہ اس بہانے ایک کتاب پڑھ لیتا ہوں۔''

[illegible]ھی کہ ان کا مطالعہ کلاسیکی کتب تک محدود نہیں تھا بلکہ [illegible] شائع ہونے والی کتب سے بلاواسطہ تعلق تھا [illegible]نہ ان کی [illegible] میں تھا نہ اس قسم کی تحریروں میں ملتا [illegible]نہیں اس لیے محض تعارف تک محدود رہتے ہیں۔ جب میرا شعری مجموعہ شائع ہونے لگا تو انہوں نے میری درخواست پر یہ فلیپ لکھ دیا۔

''......ساجد امجد اس نئے دور کے نوجوان شاعر ہیں۔ انہوں نے اچھا ہی کیا کہ اپنے پہلے شعری مجموعے کی تدوین اشاعت سے پہلے اپنے دور کی رسمی تعلیم مکمل کر لی اور ادب کے طالب علم کی حیثیت سے اس راہ کی نشیب و فراز سے کچھ واقف ہو گئے۔ اس ریاضت سے ان کے فن میں نکھار اور اسلوب میں پختگی آئی اور انہوں نے اپنے لیے الگ ایک راہ متعین کر لی۔''

''یہ اشعار ساجد کے جذبات بھی ہیں اور ان کے ماحول کے ردِعمل کے تاثرات بھی۔ یہ غزل کے اشعار ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی غزلوں کی صدیوں پرانی ایمائی روایت ہے۔ علامتوں اور استعاروں کے پردے اٹھائیں تو ان اشعار میں الفاظ کے تانے بانے سے آگے بھی کچھ اور ہے۔''

ایک مجھ پر ہی منحصر نہیں۔ انہوں نے جس کے لیے بھی لکھا صاف اور کھری باتیں ہی لکھیں۔ بے جا قدردانی سے دور مبالغے سے پاک۔

''ارشدی بدایونی کسی نئی طرز کے بانی نہ تھے۔ وہ غزل کے شاعر تھے اور جس کا مزاج کلاسیکی غزل کا مزاج تھا اس میں داستانِ دل اور حکایت درد تھی۔ غزل کے لیے نئی زبان کی تخلیق جس کا ہمارے اکثر نوجوان شاعروں کو سودا ہے ان کا دستور نہ تھا۔ ہاں زبان صاف اور مستند لکھتے تھے۔''

وہ رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی جیسے اساتذہ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان میں ایک ادیب تھا ایک شاعر۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب بھی نثر و نظم کی چھان پھٹک میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ وہ خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعری کے رموز سے خوب واقف تھے۔ وہ جس فن پارے پر قلم اٹھاتے تھے اس کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرتے تھے۔ وہ محقق تھے لہٰذا تنقید کرتے ہوئے ہوائی باتیں نہیں کرتے تھے۔ نہ بے جا تعریف نہ جانب داری۔ ان کا ذہن کلاسیکی تھا لیکن عصر حاضر سے غافل نہیں تھا۔ پرانی تربیت نے مزاج میں شائستگی پیدا کر دی تھی۔ کسی فن پارے کی خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے تو بڑی خوب صورتی سے۔

لسانیات سے خاص شغف تھا اس لیے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی لسانی خامیوں اور خوبیوں کا ضرور ذکر کرتے تھے۔ انہیں صرف وہی تحریریں پسند آتی تھیں جو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ ایسی تمام تحریروں پر بے باک تنقید کرتے تھے جو اردو زبان کے مزاج کے خلاف ہوں تاہم وہ رجعت پسند نہیں تھے۔ ہاں مشرق و مغرب کے توازن کے قائل تھے۔ ان کی تنقید میں مغربی دبستانوں کے اثرات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً جرأت کی شاعری پر لکھتے ہوئے انہوں نے فرائڈ کے نفسیاتی دبستان سے مدد لی تھی۔ اسی طرح ان کی تحریروں میں مارکسی طرزِ تنقید کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تنقید کی جمالیاتی قدروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ترقی پسند تحریک کے خلاف تھے۔ اس تحریک کے تحت لکھے جانے والے ادب پر تنقید کرتے ہوئے ان کی تحریروں میں قدرے غصہ آ جاتا تھا لیکن یہ غصہ صرف اس وقت آتا تھا جب اخلاقیات اور مذہب کا سوال آتا تھا۔ دراصل وہ انتہا پسندی کے خلاف تھے۔ کسی سیاسی نظریے کی تبلیغ کے لیے فن کی جمالیاتی قدروں کو قربان کر دینا ان کے نزدیک مستحسن نہیں تھا۔ ترقی پسند ادب کے خلاف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریوں کو جگہ جگہ رد کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر اشتراکی نظریاتی کے۔ مذہب

کے ساتھ ساتھ پاکستانی قومیت کا بھی انہیں شدید احساس تھا۔

ان کے تنقیدی کارناموں کی اصل اور بنیاد ان کا اسلوب نگارش تھا۔ لکھنو کے دبستان شاعری پر کام کرنے کے باوجود اور بچپن سے لکھنوی شعرا کو پڑھنے کے باوجود ان کا اسلوب نگارش لکھنوی تکلف پسندی سے پاک رہا۔ ان کے اسلوب کو اگر ہم کسی مثال سے بیان کریں تو وہ ہے سرسید احمد خان۔ صاف سادہ جو دل سے نکلے دل میں اتر جائے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے سرسید کی نقل کی۔ ان کی نثر سرسید کی طرح خشک اور بے مزہ نہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کا تعلق سرسید کے مکتبۂ فکر سے تھا۔ وہ زبان و بیان سے زیادہ مضمون پر توجہ صرف کرتے تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ علی گڑھ کی محبت میں شرابور تھے اور اس لیے بھی کہ وہ محقق تھے افسانہ نگار نہیں۔ وہ فارسی پر عبور رکھتے تھے لیکن ان کی تحریروں کو مفرس نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ایک منفرد صاحب اسلوب تھے۔ یہ اسلوب ان سے شروع ہوا اور ان کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

☆......☆

ماہ نامہ ''تہذیب'' میں ان کی خودنوشت ''رفت و بود'' اشاعت کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ لوگ اسے پسند بھی کررہے تھے اور اس میں دلچسپی بھی لے رہے تھے۔ یہ احساس بھی تھا کہ لیث صاحب کی عمر بڑھتی جارہی ہے۔ ان کی صحت قابلِ رشک ہے لیکن عمر آخر ہوتی ہے۔ ان سے تقاضا کیا جائے کہ وہ اس خودنوشت کو جلد از جلد مکمل کریں۔

آرٹس کونسل کراچی کے قریب ''انکل'' روڈ پر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا دفتر تھا۔ یہیں سے تہذیب شائع ہوتا تھا۔ جنرل سیکریٹری ذاکر علی خاں کے دفتر میں احباب جمع تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب بھی وہاں آگئے۔ علی گڑھ اور رام پور کی باتیں چھڑی ہوئی تھیں کہ ذاکر علی خاں (سابق ایم ڈی واٹر بورڈ) کو خیال آیا اس وقت موقع اچھا ہے۔ قسطوں کا ذکر چھیڑا جائے۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کی خودنوشت بے حد پسند کی جارہی ہے۔ آپ اس کے صفحات بڑھا دیں بلکہ اسے مکمل کر کے ہی دے دیں تاکہ ہم اسے چھاپتے رہیں۔ آپ مصروف آدمی ہیں کسی اور کام میں لگ گئے تو یہ ادھوری رہ جائے گی۔ ایسے ایسے واقعات اس میں بیان ہورہے ہیں جو اب کسی کی یادداشت میں محفوظ نہیں۔ محفوظ ہیں تو انہیں لکھنے کے لیے وہ قلم کسے ملا ہے جو آپ کو عطا ہوا ہے۔''

''لکھ تو دوں۔'' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''مگر اس کے پڑھنے والے کہاں سے لاؤ گے۔''

''آپ کو اندازہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب پاکستان سے زیادہ انڈیا میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ خدا بخش لائبریری پٹنا سے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے کئی خط آچکے ہیں کہ اس خودنوشت کو کسی طرح بھی ڈاکٹر صاحب سے مکمل کرایا جائے۔''

''فکر مت کرو، ابھی میں مرنے والا نہیں۔''

''آپ کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رہے۔ ہم سب تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ایک قسط بھیج کر اس کے چھپنے کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ کئی کئی قسطیں لکھ کر بھیجتے رہیں تاکہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ مواد جمع ہوجائے۔ ہم صفحات بھی بڑھا دیں گے جو چیز پڑھی جارہی ہے اسے شائع ہونا چاہیے۔''

انہوں نے وعدہ کرلیا کہ اب وہ کئی کئی قسطیں ایک ساتھ لکھ کر بھیجا کریں گے۔

وہ دفتر سے اٹھ کر گئے تو [illegible] تک انہی کی [illegible] ہوتی رہیں۔

''ماشاء اللہ 78 سال کے ہوگئے ہیں لیکن نہ ہاتھ میں چھڑی ہے نہ کوئی سہارا دے کر لایا ہے۔ غالباً گاڑی بھی خود ہی چلا کر لائے ہوں گے۔''

''آواز میں بھی وہی گرج ہے جیسے علی گڑھ میں دو سو لڑکوں کی کلاس لے رہے ہوں۔''

''لسانیات کے طلبہ گھر پر آتے ہیں انہیں پڑھاتے ہیں۔ سینکڑوں پی ایچ ڈی کے مقالے آتے ہیں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دل گھبراتا ہے تو شعبہ اردو میں چلے جاتے ہیں۔ تمام کام معمول کے مطابق کررہے ہیں۔''

''سب سے بڑی بات یہ کہ پابندی سے بلاناغہ بیوی کی قبر پر جاتے ہیں۔''

''جی ہاں 80ء میں شاید ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ایک دن کی غیر حاضری نہیں ہوئی۔ پابندی سے قبر پر جاتے ہیں۔''

''ایسی وضع داریاں اب کہاں صاحب جس کے ہو گئے بس ہو گئے۔ موت بھی حائل نہیں ہونے پاتی۔''

''کتنا کام کیا ہے اس شخص نے۔''

''حکومت کی بے حسی دیکھیے آج تک حکومتی سطح پر

انہیں سراہا نہیں گیا۔ کیسے کیسے لوگ حسن کارکردگی کے تمغوں اور تمغائے امتیاز سے نوازے جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کو کسی نے پوچھا؟"

"ان تمغوں سے کیا ہوتا ہے جناب۔"

"ہوتا تو کچھ نہیں لیکن کام کرنے والے کا حوصلہ بڑھتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب پر ان چونچلوں کا کوئی اثر نہیں۔ وہ برابر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔"

"بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی لابی نہیں۔ دربار داری ان کے مزاج میں نہیں۔ کھرے آدمی ہیں۔ جو بات ہوتی ہے منہ پر کہہ دیتے ہیں انہیں نوازا جائے تو کیسے۔"

"وجہ کوئی بھی ہو۔ ہے یہ حکومت کی بے حسی۔"

☆......☆

سادگی نے کمر ہمت باندھی۔ پذیرائی کی خوشبو ذہن کے دریچوں کو مہکانے لگی۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں جو باتیں ہوئی تھیں خودنوشت مکمل کرنے کا جو اصرار ہوا تھا وہ ابھی تک ذہن کو جھنکار رہا تھا۔ رات ہوئی تو یادوں کا دفتر کھل گیا۔ قلم اٹھایا اور اگلی قسط لکھنا شروع کر دی۔ پھر یہ ہوا

راتوں میں جو گزر گئی ہیں باتیں
باتوں میں گزر گئی ہیں راتیں

جان کو کام اتنے لگے ہوئے تھے کہ فراغت کم ہی مل رہی تھی لیکن جب وقت ملتا تھا علی گڑھ کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ ماضی کو آواز دیتے تھے اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ شاید کچھ ہونے والا تھا کہ دل کہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو یہ کام نمٹا لیا جائے۔

6 ستمبر 1994ء کا دن طلوع ہوا تھا۔ وہ حسب معمول اہلیہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد قبرستان سے واپس لوٹے تھے۔ لکھنے کی میز پر خودنوشت کے لکھے ہوئے صفحات رکھے ہوئے تھے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ یہ کم از کم چھ قسطوں کا مواد تھا جو وہ لکھ چکے تھے۔ انہیں یاد آیا کہ اکتوبر کی قسط چھپنے کے لیے تہذیب کے دفتر میں کچھ نہیں ہے۔ اتفاق سے ایک صاحب ایسے بھی آ گئے جن کے ذریعے یہ صفحات تہذیب کے دفتر بھیجے جا سکتے تھے۔ انہوں نے یہ صفحات ان کے حوالے کر دیے۔ ٹیلی فون بھی کر دیا کہ کم از کم چھ قسطوں کا مواد روانہ کر رہا ہوں۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لسانیات کی تعلیم کے لیے آنے والے طلبہ آ گئے۔ انہیں پڑھانے بیٹھ گئے۔

دوپہر تک بالکل ٹھیک تھے لیکن شام کو ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ انہیں میڈی کیئر اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے انہیں فوراً طبی امداد دی۔ یہ خوش خبری بھی دی کہ فکر کی بات نہیں البتہ احتیاط کے طور پر داخل کر لیا کہ رات بھر یہ آرام کریں گے اور صبح انہیں چھٹی دے دی جائے گی۔

وہ رات انہوں نے آرام سے بسر کی۔ 7 ستمبر کی صبح وہ سو کر اٹھے تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ خود اٹھ کر غسل خانے میں گئے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ تر و تازہ ہو کر باہر نکل آئے۔ چھٹی ہونے والی تھی۔ چھٹی سے پہلے ڈاکٹر معائنے کے لیے آیا اور ان سے بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے کروٹ بدلی لیکن یہ کروٹ آخری حرکت ثابت ہوئی۔ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

ایسی سہل موت نیک لوگوں کو ہی ملتی ہے۔

یہ خبر جیسے ہی جامعہ پہنچی تمام دفاتر بند کر دیے گئے۔ اساتذہ، طلبہ وطالبات افسر اور ملازم تعزیت کے لیے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہر آنکھ اشکبار ہر چہرہ اداس تھا۔

ان کا جنازہ شام 5 بجے ان کی قیام گاہ سے اٹھایا گیا۔ جامعہ مسجد اسٹاف ٹاؤن میں عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ وہی قبرستان تھا جہاں ان کی اہلیہ دفن تھیں۔ دونوں کی قبریں گلاب کے پھولوں سے چھپی ہوئی تھیں۔

دوسرے دن ملک بھر کے اخباروں نے ان کی تعزیت کی خبریں شائع کیں۔ کئی دن تک اداریوں میں ان کی خدمات کو سراہا جاتا رہا۔ ان کی شخصیت پر مضامین شائع ہوتے رہے۔

محشر بدایونی نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا۔ یہ قطعہ جنگ کراچی میں شائع ہوا۔

جہان ادب میں کہاں
وہ دانش ور نکتہ داں
یہی اب ہے دل کی صدا
ہوئے لیث جنت نشاں

(7 ستمبر 1994ء)

ماخذات

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (علمی و ادبی خدمات)
ڈاکٹر شیراز زیدی۔ رفت و بود (خودنوشت)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

شمس العلماء

ابن کبیر

ایک چھوٹے سے انتہائی پسماندہ علاقے میں جنم لینے والے نے اپنی تحریر اور لیاقت کی بدولت پورے برصغیر میں خود کو منوایا۔ اس نے سندھی ادب کو نئی زندگی دے کر اس کے خزانے کو لبالب بھر دیا۔

سندھ کے اس سپوت کا زندگی نامہ جس پر پورا پاکستان فخر کرتا ہے

سورج کی کرنیں نہر کنارے اتر آئیں۔ جاڑے کی دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی مگر ابھی زمین خوابیدہ تھی۔ سکوت کے اس لمحے کچے مکان میں قلقاری گونجی۔ وہ کسی ترانے کے مانند تھی۔ دہلیز پر کھڑے آدمی کا دل تشکر سے بھر گیا۔ اس نے آسمان پر پھیلے نور پر نگاہ کی۔ کان میں ایک سرگوشی ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کا نام پالیا۔ قلیچ.. یعنی تلوار! یہ انتخاب بے سبب نہیں تھا۔ اس کا ایک پس منظر تھا۔ دریائے سندھ سے نکلنے والی پھلیلی نہر کے کنارے کھڑا وہ آدمی

فقط پانچ عشروں میں کئی صدیاں جی چکا تھا۔ طویل جنگوں اور ہجرتوں پر محیط اس کی کہانی افسانوی لگتی تھی۔ اور اُس صبح جب مؤذن فلاح کی سمت پکار رہا تھا، تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اپنے سپوت کا نام تجویز کرے۔

مرزا فریدوں بیگ گزر بسر کے لیے ٹوپیاں بناتا تھا۔ اس کی سُگھڑ بیوی سلائی کڑھائی کیا کرتی۔ بمشکل گزارہ ہوتا۔ مگر کسمپرسی اُس کا مقدر نہیں تھی۔ کچھ برس قبل وہ سندھ کا معزز ترین آدمی تھا۔ شاہی قلعے کا ایک بااختیار مکین۔ میروں کی حکومت کا ایک ستون... پر اب وہ ایک کچے مکان میں مقیم تھا۔ اور حالات کے جبر سے بچ جانے والے جواہرات فروخت کر کے اپنی اولاد کے لیے تعلیم خرید رہا تھا۔ یہی زیور نومولود کے ماتھے کا جھومر بننے والا تھا، جس کی قلقاری سے درختوں پر پھول کھل اٹھے تھے۔

اس کہانی کا آغاز کچھ عرصے قبل ہوا۔

اٹھارویں صدی کا آخری عشرہ تھا۔ ایرانی سلطنت قاچاری بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں نے ابھی سندھ پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ تب مرزا فریدوں بیگ یہاں سے میلوں دور... بحیرہ اسود کے کنارے اُس ریاست میں پیدا ہوا، جو آج جارجیا کہلاتی ہے۔ اس نے شہر کاختی کے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جس کے باسی انجیل کھولنے سے پہلے چوما کرتے اور ہر اتوار باقاعدگی سے گرجا جاتے۔ علاقے کے پادری نے اس کا نام سڈنی تجویز کیا۔

ابھی وہ کم سن تھا کہ بدبختی نے اس کے آبائی وطن پر حملہ کر دیا۔ فارسی اور ترک جب روسیوں کے خلاف صف آراء ہوئے، تو یہ خطہ میدانِ جنگ بن گیا۔ فارسی غالب آئے۔ اُس کا باپ جنگ میں کھیت رہا۔ جن لوگوں کو جنگی قیدی بنا کر ایران بھیجا گیا، ان میں چھ سالہ سڈنی بھی شامل تھا، جو ابھی خوف سے تازہ تازہ آشنا ہوا تھا اور اردگرد کے واقعات کو حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔

شاہی قید خانے میں پہنچنے سے قبل وہ بھرے پرے بازاروں سے گزرا۔ آسمان کو چھوتے میناروں، پُرشکوہ گنبدوں والے شہر سامنے تھے۔ پر یہ چمک دمک اُس کا خوف کم نہ کر سکی۔ زنداں کے اُدھر آسمان پھیکا اور خاموش تھا۔ ایک چپ تھی، اداسی تھی کہ وہ حسین کا مہینا تھا۔

ایران کی سرحدیں سندھ سے ملتی تھیں جہاں کلہوڑوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ میر برسراقتدار آ گئے۔ اب اُدھر میر کرم علی خان تالپور کا سکہ چلتا تھا۔ قاچاری بادشاہ محمد کرین خان رند اور میروں کے روابط مضبوط تھے۔ تحائف کا تبادلہ معمول تھا۔ جارجیا پر غلبے کے بعد فارسیوں نے سندھ کو جو تحائف بھیجے، ان میں ایک نو سالہ بچہ بھی شامل تھا۔

سڈنی نے ایرانی سرحد عبور کی، تو ایک نئی دنیا دیکھی۔ یہ وہ زمین تھی، جس کے بارے میں ہندوؤں کی مقدس کتاب ”رگ وید“ میں درج ہے ”تو گھوڑوں کی دولت سے مالا مال ہے، رتھوں کے بیڑوں سے مالا مال ہے، زرق برق کپڑوں کی فراوانی سے مالا مال ہے۔“ اور اس کے دریاؤں کے بارے میں کہا گیا ہے ”اے سندھو، تو اپنی روانی میں آگے ہی آگے دوڑے چلا جاتا ہے کہ خوش حالی کے دیوتا نے دھرتی پر تیری گزرگاہ متعین کر دی ہے۔“

فارسی بولنے اور سمجھنے والے تو ادھر بھی تھے مگر طرز تعمیر اور رہن سہن خاصا مختلف۔ کشادہ اور ہوادار مکانات۔ دریا کنارے آباد شہروں میں شام اترتی تو ساتھ ٹھنڈی ہوائیں لاتی، جو مزارات کے گنبدوں سے ٹکرا کر پُررونق بازاروں میں گشت کرتی۔ بازار... جہاں خریداروں کا ہجوم ہوتا۔ بھاؤ تاؤ ہو رہا ہوتا تھا۔ اس زمانے کا سندھ معاشی طور پر مستحکم تھا۔ تجارت عروج پر تھی۔ یوں تو یہاں کے زیورات، کپڑوں، منقش ظروف کا چرچا تھا، مگر سب سے زیادہ مشہور تھے یہاں کے ہتھیار۔ موجودہ حیدرآباد کی گنتی اس وقت ہندوستان میں ہتھیاروں کی بڑی منڈیوں میں ہوا کرتی تھی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہاں مکانوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے بادگیر لگے ہوتے جو منگ کہلاتے تھے۔ جب انگریزوں نے شہر پر حملہ کیا تو وہ اُسے توپیں سمجھ بیٹھے۔

دائی کی پکار نے فریدوں بیگ کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ سورج کی تازہ روشنی اب مکان کو بھرنے لگی تھی۔ دائی نے بچہ گود میں دے دیا۔ اس نے روشنی کے رخ پر بچے پر نظر ڈالی۔ بچے کی آنکھوں میں وہ چمک تھی، جو اس کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں ماند پڑنے لگی تھی۔ آدمی دھیرے سے مسکرایا۔

باہر پیڑ ہل رہے تھے۔ اندرونی کمرے میں بستر پر دراز اُس کی بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کی گندمی رنگت اور مقامی خدوخال کے پیچھے ایک اجنبی رنگ دکھائی دیتا تھا۔ ایسا رنگ جو ہزار میلوں دور واقع ایک سرسبز خطے سے عورت کے تعلق کی کہانی بیان کرتا۔ اُسی خطے سے... جہاں فریدوں بیگ نے آنکھ کھولی تھی۔ اور یہ تعلق کوئی راز نہیں تھا۔ وہ جس شخص کی بیٹی تھی، اس

نے بھی جورجیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ایسے ہی جنگیں اور ہجرت دریائے سندھ کے کنارے کھینچ لائی تھی۔ وہ بھی شاہی قلعے میں پروان چڑھا تھا... اور اب فریدوں بیگ کے مانند بے گھر ہو چکا تھا۔

خسرو بیگ نے سندھ کے جلبانی گھرانے کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جب بیٹی جوان ہوئی، تو اپنے عزیز دوست فریدوں بیگ کے نکاح میں دے دیا۔ یہ وہ دور تھا، جب ان دوستوں کو تالپور دربار میں شاہ کی خصوصی شفقت اور توجہ میسر تھی۔ جب وہ شہزادوں سی زندگی گزار رہے تھے، مگر اب... یہ دھرتی غیروں کے قبضے میں تھی۔

باورچی خانے میں کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ فریدوں بیگ نے بچہ دائی کو سونپ کر خاندانی ملازم کو پکارا، جسے اس کچے مکان میں فقط وفاداری کے جذبے نے باندھ رکھا تھا۔ گھر کے مالک کے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ وہ ملازم رکھ سکے۔ گو اُسے نئی سرکار نے متعدد بار ملازمت کی پیشکش کی، مگر اس وضع دار شخص نے بڑی نرمی سے انکار کر دیا۔

اپنا نام سن کر ملازم دوڑا چلا آیا۔ فریدوں بیگ اُسے اپنے سسر کے گھر بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ انہیں خوش خبری پہنچا سکے، مگر کچھ سوچ کر خیال بدل دیا۔ ''میں خود ہو آتا ہوں۔''

وہ ان بازاروں، راستوں اور نہروں کے پاس سے ہوتا ہوا گزرا، جہاں کل زندگی چہکا کرتی تھی مگر اب اداسی کا راج تھا۔ سب ہوتے ہوئے بھی ایک خلا تھا، غلامی کا پیدا کردہ خلا۔

خسرو بیگ نے دروازے پر آ کر اس کا استقبال کیا۔ یہ دونوں جورجین باشندے ادھر کے ماحول سے خوب گھل مل گئے تھے۔ یہاں کی بود و باش اپنا لی تھی، مگر لہجوں میں وہ رنگ کچھ کچھ باقی تھا جو اُن کی عجیب و غریب کہانی کی جانب اشارہ کرتا۔

مبارک باد کے تبادلے اور ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرانے کے بعد وہ اوطاق میں آن بیٹھے۔ خیر خیریت پوچھ لی تو علم و ادب پر بات ہوئی جو انہیں چپکے سے سیاست پر لے گئی۔

یکدم اپنی ریاست پر قبضے اور قلعے سے بے دخلی کا غم تازہ ہو گیا اور ساتھ ہی وہ مشترکہ داستان بھی جس نے اُنہیں باہم جوڑ رکھا تھا۔

☆☆☆☆

چار عشروں قبل ایک یخ بستہ صبح فریدوں نے پہلی بار اس نوجوان کو دیکھا تھا جس سے اُس کی دوستی مرتے دم تک قائم رہنے والی تھی۔

اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ معزز افراد میں بیٹھے نفیس لباس میں ملبوس اس نوجوان میں آخر ایسا کیا تھا جو اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کیوں وہ اسے اپنا اپنا لگتا ہے۔ مگر جب اس نے سورج کی تیز روشنی میں اس پر دوسری بار نظر ڈالی تو فوراً سمجھ گیا کہ وہ بھی اس کی طرح غیر مقامی ہے۔ البتہ یہ جاننے کے لیے کہ اس کا تعلق بھی گرجستان سے ہے، اسے چند روز انتظار کرنا پڑا، جب دونوں میں ابتدائی جملوں کا تبادلہ ہوا۔

خسرو بیگ کے نام سے پکارے جانے والے نوجوان نے جب اس کی مادری زبان میں خیریت دریافت کی تو وہ بھونچکارہ گیا۔ تاہم یہ پہلا موقع نہیں تھا جب حیرت کی لہر پوری قوت سے اُس سے ٹکرائی ہو۔ تحیر کا پہلا تجربہ اس روز ہوا تھا جب ننھے سڈنی کو میر کرم علی خان کے پُرشکوہ دربار میں پیش کیا گیا تھا اور بادشاہ اُس سے پدرانہ شفقت سے پیش آیا تھا۔

ممکن ہے کہ شفقت کا جذبہ میر میں بہ درجہ اتم موجود ہو، مگر مورخین کے خیال میں اس کا بنیادی سبب بے اولادی کا بے انت کرب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ برس قبل جب قاچاری بادشاہ کی جانب سے بھیجے جانے والے جنگی قیدیوں میں اُس کی نظر نیلی آنکھوں والے گرجستانی لڑکے پر پڑی تو یوں لگا جیسے وہ اپنے بیٹے کو دیکھ رہا ہے۔ اور ایسا ہی احساس کچھ برس بعد تب جاگا، جب اُس نے دس سالہ سڈنی کو اپنے روبرو پایا۔

میر کرم علی نے نوجوان خسرو بیگ کی مانند اس بچہ کی ذمے داری بھی شاہی اساتذہ کو سونپ دی۔

نئی ثقافت، نئے مذہب سے ہم آہنگ ہونا، نئے طور طریقے سیکھنا یقینی طور پر بچے کے لیے مشکل ہوتا، مگر خسرو بیگ کی موجودگی نے مشکل آسان کر دی جو اس نئی دنیا اور گرم موسموں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ اسے سڈنی میں... جسے اب فریدوں بیگ کہہ کر پکارا جاتا تھا، اپنا چھوٹا بھائی نظر آتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فریدوں کی پرورش اور شخصیت سازی میں جہاں دربار کے جید اساتذہ کا ہاتھ تھا، وہیں خسرو بیگ نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

وہ پرندوں کے ساتھ بیدار ہوتے۔ صبح ساتھ نماز ادا کرتے۔ مکتب سے لوٹ کر خسرو اسے تلوار بازی سکھاتا۔ باغبانی کے نئے طریقوں سے روشناس کرواتا کتب ان کے مطالعے میں رہتیں۔ وہ کشتی کی سیر کو جاتے۔ دربار میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب بھی وہ جلد جان گیا۔ فارسی سیکھنے میں تھوڑا

وقت ضرور لگا، مگر اس کی ذہانت نے یہ پہاڑ بھی سر کر لیا۔

الغرض چند برسوں میں وہ اتنا بدل گیا کہ اگر اسے قاچاری بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ بھی پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی جنگی قیدی ہے جو اس نے اپنے دوست کو تحفے میں دیا تھا۔

کھجوروں اور آموں کے اس دیس میں وہ ایسا رچ بس گیا کہ اپنی زمین سے جدائی کا غم ماند پڑ گیا۔ ہاں کبھی کبھی سینے میں ایک خلا کا احساس ہوتا مگر وقت بڑا مرہم ہے۔

شاہی قلعے میں شہزادوں کے مانند رہنے والے ان دونوں غیر ملکیوں نے اپنی قابلیت کے وسیلے سے جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ دونوں میر کرم علی کے بے حد قریب تھے۔ اُنہیں مرزا کا خطاب دیا گیا۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد خسرو بیگ نے سندھ کے ایک معزز قبیلے کی ایک دوشیزہ سے شادی کر لی۔ اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جب وہ جوان ہوگی، تو اسے اپنے عزیز دوست کو بیاہ دے گا۔

تو 1853 کی اس ٹھٹھرتی صبح خسرو اور فریدوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جہاں کرب ناک ماضی کی پرچھائیں تھیں وہیں، ایک روشن کل کی آس بھی جھلکتی تھی... کیونکہ قلیچ پیدا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

فصل پک کر تیار کھڑی تھی۔ گندم کے کھیتوں میں لہریں سی ڈوبتی ابھرتیں۔ کسان بھی کٹائی کو تیار ہو گئے تھے۔

کل تک درانتی چلاتے ہوئے اُن کے لبوں پر ایک لازوال شاعر کے گیت ہوتے:

اجنبی بستیوں سے تو منہ موڑ
آئے دن کا رونا دھونا چھوڑ
جوگ لے اُس کے گاؤں میں جا کر
توڑ دنیا سے اپنے ناتے توڑ

پر اب پہلے سا جوش نہیں تھا۔ وہ خوف زدہ تھے۔ اپنے حق پڑدا کے کا خیال انہیں کھائے جاتا۔ تبدیلی ابھر رہی تھی۔

سندھ جہاں مسلمانوں کے ساتھ ہندو، مسیحی اور پارسی بھی آباد تھے، جہاں فارسی سرکاری زبان تھی، جہاں شاہ لطیف کے گیت گاؤں گاؤں گائے جاتے تھے... دھیرے دھیرے بدلنے لگا تھا۔ نئے حکمران نئے طور طریقوں کے ساتھ اس دھرتی پر اترے تھے۔ اور تبدیلی کی اُن ہی ہوائیوں میں قلیچ نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا۔

وہ اور بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ جب اس کے بھائی کھیل کود میں مصروف ہوتے، وہ صحن کے کونے میں بیٹھا انہیں تکتا رہتا۔ اور جب دیگر بچے ضد کرتے، وہ خاموشی کو اپنا ہتھیار بناتا۔ ایک سہ پہر پڑوس کی ایک بڑی بی یہ جاننے کے لیے کہ فریدوں بیگ کا لڑکا اکیلا بیٹھا کرتا کیا رہتا ہے، کئی گھنٹے نظریں گاڑے بیٹھی رہیں۔

اس تھکا دینے والی جاسوسی کے بعد ان پر عقدہ کھلا کہ بچہ تنکے سے مٹی میں لکیریں بناتا ہے۔ جب یہ بات باپ کو پتا چلی تو ذہن کے پردے پر ماضی کے مناظر گھومنے لگے۔ اسے بھی تو بچپن میں ایسا ہی شوق تھا۔ وہ بھی زمین پر لکیریں بنایا کرتا۔ مگر پھر اس کی زمین بارود اور خون سے بھر گئی۔ لکیریں مٹ گئیں۔

فریدوں بیگ نے سر جھٹک دیا۔ اپنے بیٹے کی سمت دیکھا، جس کے کشادہ ماتھے کے نیچے چھوٹی اور تیز... آنکھیں خوب جچتی تھیں۔

"یہ مصور بنے گا مصور۔" آدمی نے تالی بجائی۔ "میں اس کے لیے رنگ لیے آتا ہوں۔ ان سے کھیلتا رہے گا۔"

رنگوں سے جلد ہی اس نے دوستی کر لی، مگر ننھے بچے کو اصل عشق ان کہانیوں سے تھا جو اس کی ماں اور نانی سنایا کرتیں۔ جو اتنی پُرتجسس ہوتیں کہ راتیں گہری ہوتی جاتیں اور وہ نیند کے جھونکوں سے آزاد کہانی سنے جاتا۔

یوں تو کتنی ہی کہانیاں تھیں... اولیاء کے قصے، نیک دل بادشاہوں کی داستانیں، جنات اور پریوں کی باتیں، مگر جس کہانی نے اس کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے، اسے سناتے ہوئے نہ جانے کیوں عورتوں کی آواز رندھ جاتی اور صحن میں بچھی باپ کی چارپائی سے سسکی بلند ہوتی۔

"ایک تھا بادشاہ۔ نیک اور رحم دل۔ علم و ادب کا دلدادہ۔" تاروں بھرے آسمان تلے عورت کی آواز سنائی دیتی۔ "اس کی سلطنت میں ہرسوں چین ہی چین تھا۔ گلی گلی مکتب۔ امن و امان۔ بازار پُررونق۔ تمام مذاہب کے لوگ، تمام قومیں مل جل کر رہتیں۔ کوئی کسی سے نہیں جھگڑتا۔ شہر کیا تھے، اسلامی طرزِ تعمیر کے شاندار نمونے تھے۔ بڑے بڑے روشن اور ہوادار گھر۔ بزرگوں کے مزارات۔"

قلیچ اور اس سے بڑے بھائی توجہ سے یہ کہانی سنا کرتے۔ فریدوں بیگ کے کان بھی ادھر ہی لگے ہوتے۔

"یوں تو خدا نے بادشاہ کو ہر نعمت سے نوازا، مگر ایک غم اُسے کھائے جاتا۔ اس کی اولاد نہیں تھی۔ یہ قلق تھا کہ اس کی وسیع و عریض سلطنت کا کوئی وارث نہیں۔ بہت جتن کیے۔

بزرگوں سے دعا کروائی۔ چلّے کاٹے، مگر خوشی پر یاس کا پہرہ رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ پڑوسی ملک سے کچھ جنگی قیدی آئے، جن میں ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ بچے کو دیکھ کر بادشاہ کے دل میں...''

فریدوں بیگ مسکراتا۔ عورت بولے جاتی تارے بھی جھک کر سننے لگتے۔

تو کہانی آگے بڑھتی ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر جارہی تھی کہ اچانک بدبختی کے بے انت سلسلے کا آغاز ہوا۔ ایک عفریت نے سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ شیاطین کی فوج تھی اور اس کے ہتھیار آگ اُگلا کرتے تھے۔ اس عفریت نے پہلے ہی اردگرد کی ریاستوں پر قبضہ جمالیا تھا، مگر بادشاہ کی بہادر فوج کے خوف سے دشمن نے براہِ راست حملہ کرنے کی بجائے سازشیں شروع کر دیں۔ تجارتی قافلوں کو لوٹا۔ اردگرد کے قصبوں میں کہرام مچایا۔ بالآخر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ 1843 میں انہوں نے قلعے کو جانے والی نہریں بند کر دیں اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ کی فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مگر عفریت کے پاس جہان بھر کا اسلحہ تھا۔ بالآخر بادشاہ کو شکست ہوئی۔ قلعے پر قبضہ کر لیا گیا۔ بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور کئی میل دور بنگال کے ایک شہر بھیج دیا گیا۔''

عورت کی آواز یہاں پہنچ کر رندھ گئی۔ سامعین کی کشتی بھی غم کی لہروں میں ہچکولے کھانے لگی۔ کہانی کے اس موڑ پر فریدوں کے دل میں اپنے محسن سے جدائی کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ جب میر کرم علی کو جلاوطن کر کے بنگال بھیجا جا رہا تھا، تب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اور خسرو بیگ بھی ساتھ جائیں گے، مگر میر کرم علی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ فریدوں کی ضد اپنے محسن کے حکم کے آگے ہار گئی۔ اسے یہیں رہتے ہوئے تالپور حکمرانی کی دیکھ ریکھ کی ذمے داری سونپی گئی، جو اب نہر کے کنارے کچے مکانات میں آباد تھا۔ قلعے پر تو انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک عرصے سے سندھ کی دولت پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔

لٹیرے وسائل پر قابض ہو گئے تھے۔ جاگیریں ضبط ہوئیں۔ شاہی گھرانے کے معززین کے پاس فقط شاہ کے عطا کردہ جواہرات تھے، جنہیں فروخت کر کے وہ گزر بسر کا امکان پیدا کرتے، مگر فریدوں بیگ کا تعاقب کرتی بدقسمتی اس بچے کھچے اثاثے پر بھی حملہ کرنے والی تھی۔ تقدیر اس جری شخص کا امتحان لے رہی تھی۔

ایک رات مکان میں چھائی تاریکی میں دو دہکتی آنکھیں ظاہر ہوئیں۔ پہلے پہل جس نے دیکھا، خیال کیا کہ یہ کوئی ناگ ہے۔ ملازم لاٹھی لے آیا۔ مگر پھر ان آنکھوں کی دہک بڑھتی گئی۔ مکان کے ایک کونے میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے مکان کو لپیٹ میں لے لیا۔

ننھے قلیچ کی سماعتوں سے چیخیں ٹکرائیں تو وہ سمجھا کہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہے۔ جب بڑے بھائی نے جھنجوڑ کر اٹھایا تو وہ متحیر رہ گیا کہ آخر رات اتنی روشن کیوں ہے اور یہ حدت کیوں بڑھ رہی ہے؟

اگر کوئی کھینچ کر نہ نکالتا، تو وہ گرتے شہتیر کی زد میں آجاتا۔ کچھ پریشان کن پلوں بعد وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مبہوت کھڑا تھا اور اس کا مکان دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ اردگرد کہرام مچ گیا۔ لوگ پانی لیے دوڑے۔ کچھ لوگ برتن اٹھائے نہر کی سمت گئے۔ پورا محلہ فریدوں بیگ کی مدد کے لیے آ گیا، مگر نقصان پر قابو پانا کٹھن تھا۔ آگ نے بڑے حصے کو اپنی

> مرزا قلیچ بیگ بلاشبہ جدید سندھی ادب کے بنیاد گزاروں میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اُن کی اکیلی شخصیت، محنت اور کام نے جدید سندھی ادب کو جتنا ثروت مند بنایا، اتنا ثروت مند بہت سے ادارے بھی نہیں کر سکے۔ سندھی کے نثری ادب کا قلیچ بیگ کے بغیر تصور بھی ممکن نہیں۔
>
> ادبی تاریخ میں کبھی کبھی ایسی جینئس شخصیتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، جنھیں بیک وقت مختلف تخلیقی صلاحیتیں ودیعت ہوتی ہیں، وہ بیک وقت نثر و نظم میں اپنے کمالات کے ایسے جادو جگا جاتے ہیں کہ قاری فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ اپنے ممدوح کا شمار بہ حیثیت شاعر کرے یا انہیں نثرنگار کی حیثیت سے یاد کیا جائے، اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی اس کی بہترین مثال ہیں۔ بالکل اسی طرح کی شخصیت سندھ ادب میں مرزا قلیچ بیگ کی ہے، جنہوں نے نثر کا دامن ڈھائی تین سو کتابوں کے ذخیرے سے پرمایہ بنا دیا ہے۔ اُن کا بنیادی کام دراصل جدید سندھی ادب کو عالمی ادب کے منتخب شہ پاروں سے مالا مال کرنا رہا۔
>
> (جدید سندھی ادب از سید مظہر جمیل)

پلیٹ میں لے لیا تھا۔

جب آگ بجھی، تو پیچھے ایسے چھوڑ گئی۔ مکان تو کچا ہی تھا، اس کا غم نہیں، وہ تو محلہ داروں نے چند روز میں پھر تعمیر کر دیا، مگر میر کرم علی کے عطا کردہ جواہرات اس آتش زدگی نے نگل لیے۔ انمول موتی اور زیورات جل کر بے مول ہو گئے۔

آسمان تک اٹھتے دھویں میں تمام اسباب خاکستر ہوا۔

کوئی اور ہوتا تو صدمے سے ڈھے جاتا مگر اس تاریک حبس زدہ رات فریدوں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ صدمے دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی شاید۔

سرکار نے ایک بار پھر ملازمت کی پیشکش کی مگر اُس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ غاصبوں کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کا، جنہوں نے اسے بے گھر کیا۔ اس کی دھرتی پر قبضہ کیا۔ اسے کسمپرسی قبول تھی۔ ٹوپیاں بنانے میں وہ خوش تھا۔ تاہم نچلا بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ وہ اپنی اولاد کو ایک جدید ہتھیار سے لیس کرنے والا تھا۔ ایسا ہتھیار، جس کی بابت کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆☆

مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولنے والا بچہ خوش [illegible] ساتھ لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ رسمی تعلیم کے آغاز [illegible] ایسی کتاب سے اکتساب فیض کرتا ہے، جو تمام علوم کا منبع ہے، کتاب، جو عظیم ترین انکشاف ہے۔

قلیچ نے سب سے پہلے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ اس کی قرأت متاثر کن تھی۔ آیات کی ادائیگی کے سمے اس کی توجہ دیکھنے کے لائق ہوتی۔ قرآن پاک پڑھنے کے ... بعد اس کے لیے اچھے استاد کی کھوج شروع ہوئی۔ اس زمانے میں اساتذہ کو معاشرے میں کلیدی درجہ حاصل تھا۔ معززین بھی ان کے استقبال کو کھڑے ہو جاتے۔ یوں تو کئی اساتذہ مشہور تھے، جن میں کچھ اپنا مکتب چلاتے اور کچھ گھروں میں جا کر تعلیم دیتے، مگر فریدوں کی نظر انتخاب آخوند محمد شفیع کی درس گاہ پر ٹھہری جس کی قابلیت کا ایک زمانہ معترف تھا۔

مدرسہ نہر کے شمالی سمت تھا۔ درختوں میں گھرا ہوا۔ پُرسکون اور کشادہ۔ ماحول نیا تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ قلیچ کو کوئی دقت ہوتی۔ فارسی اور عربی دونوں سے واقف تھا۔ جلد اس کی گنتی نمایاں طلبا میں ہونے لگی۔ جو دیکھتا یہی کہتا ہے کہ واقعی مرزا فریدوں بیگ کا پسر ہے۔

سندھ کو صوفیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ یہاں چپے چپے پر ان کے پیغامات ثبت ہیں۔ ان کا کلام یہاں کے باسیوں کے دل کا تار ہے۔ صوفیانہ گیتوں نے سازوں کو بھی قبولیت و مقبولیت بخشی۔ جب شامیں اترتیں تو کسی خاموش مکان میں سارنگی کے تار چھڑتے، کہیں ستار بج رہا ہوتا۔ کہیں سے بانسری کی مدھر آواز سنائی دیتی۔ یہ وہ موسیقی وہ گیت تھے، جو انسان کو اپنے خالق کی سمت متوجہ کرتے۔ روح کی غذا ثابت ہوتے۔ جب اس سنگیت کی لہریں ننھے قلیچ کے دل سے ٹکراتیں تو وہاں جل ترنگ سا بجنے لگتا اور وہ صوفیانہ کلام کی سمت کھنچا چلا جاتا۔

یہ صنم خانے اور یہ ناقوس
کاش ہٹ جائیں تیری راہوں سے
دیکھ ساجن تجھے بلاتا ہے
اپنا دامن بچا گناہوں سے

تو یہ شاہ لطیف کے جادوئی الفاظ تھے جنہوں نے اوائل عمری میں اس کے خیالات کو جلا بخشی۔ ان ہی نغموں کی تاثیر تھی کہ اس نے ستار سے ربط پیدا کیا اور اپنی انگلیوں کی معصومانہ [illegible] سے تاروں میں چھپا سُر کھوج نکالا۔ ستار سے اس کی دوستی آنے کئی برس قائم رہی۔ جہاں تک شاہ لطیف سے عشق کا [illegible] اختتام کے لیے خود موت کو حاضر ہونا پڑا۔

مدرسے کے ماحول سے تو ہمارے قلیچ کی گاڑھی چھنتی تھی مگر شہر بھر میں ہونے والی تبدیلیاں اسے متعجب رکھتیں۔

دریائے سندھ کے پُرسکون پانیوں پر تیرتی کشتیوں کے درمیان ہلچل مچاتے تیز رفتار اسٹیمر اُس سمیت بہت سے مقامیوں کو متحیر کر دیتے تھے۔ وہ شور مچاتے ہوئے پانی پر اڑتے معلوم ہوتے۔ نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ اس عمل میں جدت در آئی تھی۔ دریا عبور کرنے کے لیے قوی الجثہ پلوں کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ ویرانے کھٹ پٹ سے گونجا کرتے کہ چھاپے خانے لگ رہے تھے۔ سرکاری دفاتر میں بھی جا بجا نئے آلات۔ زندگی کا پہیہ یکدم تیزی سے گھومنے لگا تھا۔

یوں تو ہر نئی شے مقامیوں کی توجہ اپنی جانب کھینچتی اور وہ راہ چلتے اسے مڑ مڑ کر دیکھتے مگر سب سے اہم تھے جا بجا کھلنے والے انگریزی اسکول جنہوں نے اقتدار سے محروم مسلمانوں کو آگ بگولا کر دیا۔ انہوں نے اُسے سازش گردانا۔ اوطاق، قہوے خانوں اور محفلوں میں وہ سائنس کی تعلیم اور نئے علوم سے متعلق کھلے عام اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔

ممکن ہے فریدوں بیگ بھی کسی سطح پر اُن درسگاہوں کے بارے میں متذبذب ہو مگر ایک خاص واقعے نے اس

کے ذہن کی زمین پر تبدیلی کا بیج بویا۔

گو سندھی اس کی مقامی زبان نہ تھی مگر وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا، جتنا کسان اپنے کھیت سے کرتا ہے۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس زمانے میں سندھی زبان کے بارہ رسم الخط رائج تھے۔ کوئی فارسی خط میں لکھتا تو کوئی دیوناگری میں۔ ہر بڑے شہر کا اپنا رسم الخط۔ اس کی وجہ سے یگانگت کی واضح کمی محسوس ہوتی۔

جب انگریزوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک مشترکہ اور متفقہ رسم الخط لانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو سراسیمگی پھیل گئی اور کھیتوں پر اندیشے اتر آئے۔

بہت سوں نے اسے جدیدیت کی آڑ میں نئی سازش قرار دیا، مگر جب اس عمل کے لیے سندھ کے اسکالرز سے رابطہ کیا گیا اور ان کی تجاویز کی روشنی میں کام شروع ہوا، تو فریدوں بیگ جیسے کچھ باشعور افراد کا ذہن دھیرے دھیرے تبدیل ہونے لگا۔ اس نے بدلاؤ کے اس عمل کو بے حد قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تختیوں [illegible] اضافی نکتے لگائے گئے۔ زبان میں موجود تمام آ[illegible]وں کو الفاظ میں قید کیا گیا۔

... غدر سے کچھ برس قبل یہ رسم الخط [illegible] کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

اس کی پختگی اور افادیت نے جلد ہی اسے قبولیت کی سند ادا کر دی۔ انگریزوں سے ہونے والی میل ملاقاتوں نے سوچنے کی نئی جہتیں عطا کیں تاہم فریدوں بیگ ہنوز متذبذب تھا۔ مگر پھر جون کی ایک حبس زدہ دوپہر جب وہ برگد کے نیچے چارپائی ڈالے بیٹھا تھا اور گھنی چھاؤں کی آغوش میں نیند میں اتر چکا تھا، نہر کی سمت سے آنے والی ہوائیں غنودگی کا جھونکا لائیں۔ اس نے ایک باریش بزرگ کو دیکھا۔ نورانی چہرہ۔ لمبا چغہ۔ سر پر ٹوپی۔ وہ کوشش کے باوجود شناخت نہیں کر سکا کہ یہ شخص میر کرم علی ہے یا وہ صوفی جسے اس نے کم سنی میں شاہ ایران کے دربار میں دیکھا تھا۔

"اصل غلام وہ ہے، جس کا ذہن غلام ہے، نہ کہ وہ جس کی سلطنت پر غیروں نے قبضہ کر لیا۔"

یہ الفاظ اسے غنودگی سے یکدم باہر لے آئے۔ کچھ دیر وہ سکوت میں سانس لیتا رہا۔ شاید ان کی تفہیم میں کچھ اور وقت لگتا، اگر شام میں خسرو بیگ کے ساتھ ہونے والی بیٹھک میں ایک مصلح کا ذکر نہیں چھڑتا، جو برصغیر کے مسلمانوں کو جدید علوم کی جانب راغب کرنے کے لیے خود کو تج چکا تھا۔ وہ سرسید کی تحریک کے آغاز کا زمانہ تھا۔ سندھ کے شہری علاقوں میں دھیرے دھیرے ان کا پیغام قبولیت حاصل کرنے لگا تھا۔

جب گرما کی چمکیلی دوپہر فریدوں بیگ نے اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا اعلان کیا تو احباب نے بہت واویلا کیا۔ "جناب، آپ خود ان ظالموں کا شکار بنے، اب ان کے بچھائے نئے جال میں کیوں پھنستے ہیں؟"

جواب میں وہ مسکرایا۔ "بھائیو، انگریز ظالم، ان کی غلامی لعنت، مگر ان کے علوم سے دشمنی کیسی۔ شیخ سعدی کا قول ہے، علم شیطان سے جنگ میں بہترین ہتھیار ہے۔"

کسی اور نے اعتراض کیا، تو وہ گویا ہوا۔ "عزیزو، سائنسی ایجادات اور ترقی تو انسانیت کی فلاح کے لیے ہے۔ انگریز ہمیشہ یہاں تھوڑی رہنے والے۔ چلے جائیں گے تو پھر ہم حکومت کریں گے۔"

شاید اس کے احباب دیگر باتیں نہ سمجھ سکے ہوں، مگر انگریزوں کے واپس چلے جانے کی پیشگوئی نے دھڑکن تیز کر دی۔ وہ خواب پھر جگا دیا، جسے وہ بھلا بیٹھے تھے۔

اور اگر ان دلائل سے بھی کوئی نہ مانا، تو اُسے یوں [illegible] کیا۔ "اب انگریزوں نے یہ علوم سیکھے کس سے؟ ایک [illegible]مانے [illegible] یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، تب مسلمان کیمیا، [illegible] اور حیوانیات میں نئی نئی جہتیں کھوج رہے تھے۔ فلسفہ اور منطق بھی ہماری دین۔ ریاضی میں ہمارے کارناموں سے ایک عہد واقف۔ ہمارے ہی علم سے اب وہ لوگ استفادہ کر رہے ہیں جناب۔ اور علم تو مومن کی گمشدہ میراث ہے۔"

فریدوں کے دونوں بڑے لڑکوں نے انگریزی اسکولوں سے پڑھا۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے بمبئی کا رخ کیا، مگر اس کے جس سپوت کو سندھی ادب کو نئی صورت ادا کرنی تھی، اُسے ابھی کچھ انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

"مالی حالت خستہ۔ بیوی سلائی کڑھائی کرے، خود ٹوپیاں بنائیں، ایسے میں کیا ضرورت تھی لڑکوں کو بمبئی بھیجنے کی۔ کیا قرآن، عربی اور فارسی کی تعلیم کافی نہیں تھی؟"

محافل میں تو معززین شہر اس قسم کی باتیں کرتے، مگر دل ہی دل میں اس کی ہمت کی بھی داد دیتے۔ اس کے حوصلے پر رشک کرتے۔ شکست خوردگی سے ابھر کر مالی وسائل کے باوجود بچوں کو اعلیٰ درس گاہوں میں تعلیم دلانا واقعی ایک بڑا کارنامہ تھا، جس پر فریدوں بیگ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

فریدوں بیگ نے پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور اس کا سب سے زیادہ احساس اس کے تیسرے لڑکے فلیح بیگ کو تھا، جو حساس دل اور روشن ذہن لے کر پیدا ہوا تھا۔ گو نوجوانی کی دہلیز پر تھا، پر لڑکا خرافات سے دور ہی رہا۔ جب اس کے ہم عمر میلوں ٹھیلوں میں دل بہلا رہے ہوتے، وہ شمع کی مدھم پڑتی روشنی میں مطالعے میں غرق ہوتا۔ جب اوروں کے ہاتھ میں غلیل ہوتی، اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا۔

درمیانہ قد۔ صاف رنگت۔ کشادہ ماتھا۔ روشن مسکراتی آنکھیں۔ لباس سادہ مگر بے داغ۔ باوقار چال۔ فلیح اپنے باپ کا عکس تھا اور اس کے مانند علم و ادب کا دلدادہ۔ اینگلو ورنیکولر اسکول میں اساتذہ کا چہیتا تھا وہ۔ ہاں، اپنے عمر کے لوگوں سے ہم آہنگ ہونا اس کے لیے تھوڑا مشکل تھا کہ اس کی پرورش دو بوڑھوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک خسرو بیگ اور دوسرا اس کا باپ فریدوں بیگ۔

دونوں دوست جب شام میں بیٹھتے تو فلیح بھی بڑوں کی اس محفل میں شامل ہو جاتا۔ انھیں سیاسی اور علمی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا، جرأت کر کے سوالات بھی کر لیتا۔ اسی صحبت نے شعر کہنے کی جوت جگائی۔ ابتدائی سامع اس کے نانا اور والد ہی تھے، جنھوں نے فقط حوصلہ افزائی نہیں کی، غلطیوں کی جانب بھی توجہ دلائی۔

یوں تو سب ہی لوگ دینی رجحان رکھتے تھے مگر انگریزوں کے ہاتھوں شکست نے انھیں مزید مذہبی بنا دیا تھا۔ البتہ صوفیاء کے نقش قدم کا تعاقب کرنے والے سندھ کے باسیوں نے شدت پسندی سے ہمیشہ اپنا دامن پاک رکھا۔ شاہ لطیف کے محبت بھرے گیت ان کی زندگی کا جزو تھے۔ معززین شہر بھی موسیقی سے شغف رکھتے۔ خود فلیح بہت عمدہ ستار بجاتا تھا۔ ساز تھامتے ہی وہ خود کو بھول جاتا۔ انگلیاں تاروں سے مل جاتیں اور ماحول پر طلسم طاری ہو جاتا۔

اس کی مہارت دیکھ کر ایک بوڑھی عورت نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں لڑکا تعلیم وغیرہ چھوڑ کر سازندہ ہی نہ بن جائے۔ یہ اندیشے ماں کے دل پر کسی گھونسے کی طرح لگے۔ وہ ضد کرنے لگی کہ لڑکا فی الفور ستار چھوڑ دے۔

جب بات بڑھی تو گھر کے سربراہ کو درمیان میں آنا پڑا۔ ”ایسا ہی ہوگا نیک بخت۔ بس صحیح وقت آنے دو۔“

اب فلیح میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔ گذشتہ نسل تو انگریزوں سے تعلق قائم کرنے میں متذبذب تھی، مگر وسیع مطالعے کا حامل یہ نوجوان سمجھ چکا تھا کہ آنے والا زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ انگریزی ہی ابلاغ کی کلیدی زبان ہوگی۔ سو جہاں عربی اور فارسی پر دسترس حاصل کی۔ وہیں انگریزی بھی جم کر پڑھی۔

وہ مزید پڑھنا چاہتا تھا، مگر خزاں کی ایک شام جب تیز جھکڑ کھجور کے درختوں سے ٹکرا کر شور پیدا کرتے اور گلیوں میں دھول اڑ رہے تھے، اسے یکدم ادراک ہوا کہ ماں باپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس نے باپ کی سمت دیکھا تو ایک جھریوں زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ ماں کے ہاتھوں میں رعشہ اتر رہا تھا۔ مکان کی دیواروں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ چھت بارش میں ٹپکنے لگی تھی۔

خزاں کی اس شام فلیح کے شعور نے چھلانگ لگائی۔ وہ اچانک سمجھدار بن گیا۔ خرد غلامی سے آزاد ہو گئی۔

شام جب اس کے دوست میر خورشید نے دروازے پر دستک دی کہ ان کا ارادہ ایک مشاعرے میں شرکت کا تھا، تو اس نے بڑی محبت سے انکار کر دیا۔ ”مجھے کچھ ضروری کام ہے۔“

حیرت میں غلطاں اس کے دوست کے لیے یہ سمجھ پانا مشکل تھا کہ شاعری کے رسیا فلیح کو اچانک کیا ہوا۔

عشائیے کے بعد جب اس نے فریدوں بیگ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا، تو وہ چونکا ضرور مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

جب عورت اپنے شوہر کی پُراسرار خاموشی سے پریشان دکھائی دی، تب اُس مردِ بحران نے کہا۔ ”نیک بخت اب وہ سیانا ہو گیا ہے۔“

فریدوں نے خود تو سرکاری ملازمت نہیں کی تھی، مگر جب بیٹے نے اپنی خواہش ظاہر کی تو اس کے پاس اعتراض کی کوئی وجہ معقول نہیں تھی۔ اگر اعتراض کرتا، تو لوگ پوچھتے، میاں پھر اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کس لیے دلائی تھی، کھیتی باڑی کرنے کے لیے۔

فلیح نے عملی زندگی میں قدم رکھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی قابلیت اس کی عرضی تھی... یقین محکم اس کی سفارش تھا۔ تو شہر کے ہائی اسکول میں فارسی کا استاد لگنا خاصا سہل رہا۔ اور وہ ایک اچھا استاد ثابت ہوا کہ جہاں فارسی کے معتبر شعرا کا کلام ازبر، وہیں ان میں پنہاں معنی کا بھی ادراک۔ پھر اپنی زمینوں سے بھی گہرا شغف، جس کے طفیل پیغام مقامی مثالوں کے ساتھ طالب علموں تک پہنچتا اور ان کے ذہنوں پر ثبت ہو جاتا۔ سعدی کی حکایات اُن کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنتیں اور حافظ کی شاعری

ان کی تخیل کو پرواز عطا کرتی۔ شاہ لطیف کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں، وہ تو اس خطے کی رگ رگ میں سمویا ہوا تھا۔ شاہ جو رسالو من پسند کتاب تھی۔

فریدوں بیگ اپنے ہونہار سپوت کو نئی نسل کی تربیت کرتا دیکھ کر جہاں جی ہی جی میں خوش ہوتا، وہیں اسے یہ قلق بھی تھا کہ قلیچ گھریلو ذمے داریوں میں الجھ کر اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ گیا ہے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی بڑے بھائیوں کی طرح بمبئی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔

یہ خواب پورا تو ہوا، مگر اس کی تکمیل وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا۔ 1873 میں روسی زار کے دورہ لندن کے چند روز بعد... جب مہران پر سرما کی اوّلین دھند چھائی تھی اور سندھو ست روی سے بہہ رہا تھا، فریدوں بیگ نے دروازے پر موت کی دستک سنی اور اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

یوں وہ باہمت شخص، جو بیڑیوں میں اس خطے میں داخل ہوا، اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے میروں کے دربار میں اہم ترین عہدے تک پہنچا اور بادشاہ کی معزولی کے بعد اس کے خاندان کی دیکھ ریکھ کرتا رہا... بڑی طمانیت کے ساتھ موت کے ہمراہ چلا گیا کہ وہ اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔

وہ ایک حقیقی سورما تھا، جس نے شکست خوردہ شخص کی بجائے ایک سچے سپہ سالار کی موت قبول کی۔

تدفین والے روز آسمان نے گرج کر فریدوں بیگ کی بلند حوصلگی کو خراج تحسین پیش کیا، بارش نے زمین نرم کر دی اور وہ اپنی دھرتی کے سینے میں سما گیا۔

☆☆☆

کہانی کا یہ ٹکڑا ساحلوں پر لکھا گیا تھا۔ اگر سترہویں صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا دفتر سورت سے ادھر منتقل کر کے اُسے پریزیڈنسی ہیڈ کوارٹر کا درجہ نہ دے دیتی، تو نہ ہی 1845 میں تمام جزائر جوڑ کر اکائی بنانے کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا اور نہ ہی بیسویں صدی کے اوائل میں جارج پنجم کے استقبال کو ادھر گیٹ وے آف انڈیا کی تعمیر کا خیال سامنے آتا۔ تاہم آخر الذکر واقعہ ابھی چالیس برس دور تھا۔ ابھی فضا صاف تھی۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی کا بمبئی ایک بھرا پرا شہر تھا۔ بحر ہند کی لہریں اُس کے ساحلوں سے ہم آغوش ہوتیں تو پانیوں پر پرواز کرتے پنچھی عالم مستی میں جست لگاتے اور سطح پر تیرتی مچھلی دبوچ لیتے۔

> **کلام قلیچ کے چند نمونے**
>
> پردہ اٹھے گا جب جدائی کا
> حال کھل جائے گا خدائی کا
>
> مے کدے میں گیا تھا پاک دامن کی طرح
> اور لوٹا ہوں وہاں سے چاک دامن کی طرح
>
> آہیں ہوئیں جو بند تو اشکوں کی جھڑی ہے
> بڑھ جائے اگر حبس تو برسات کھڑی ہے
>
> دریا کنارے جا کے بیٹھا اک دن تو کیا دیکھتا ہوں
> دریا کے اندر کشتی ہے اور کشتی کے اندر ہے دریا
>
> بیٹھا ہوں پاس آ کے تو اس پر برا نہ مان
> میں خار ہوں اور پہلوئے گل کا نصیب ہوں
>
> (ترجمہ: مسلم شمیم)

کیا نہیں تھا وہاں۔ انگریزوں کی ترقی کے تمام رنگ ادھر بکھرے تھے۔ منظم ریل کا نظام! جہاز سازی کے بڑے بڑے کارخانے۔ درس گاہیں۔ نئے نئے اخبارات اور رسائل۔ بحیرہ عرب کی سب سے بڑی بندرگاہ تصور کیا جانے والا بمبئی تیزی سے مغربی طرز ثقافت اپنا رہا تھا۔ انگریزوں کی وہاں بھرمار تھی۔ البتہ ایسا نہیں تھا کہ مقامی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہی اس نظام کی روح تھے۔ حاجی علیؒ کی درگا... کی وجہ سے معروف اس شہر کی ترقی میں مقامیوں کا جذبہ اور خلوص شامل تھا۔

یہاں بمبئی ایلفنسٹن کالج تھا۔ اُدھر ہی سے سندھی ادب کو نیا روپ عطا کرنے والے قلیچ بیگ کو اکتساب فیض کرنا تھا۔ اس کے بڑے بھائیوں نے بھی ادھر ہی پڑھا تھا۔

وہ بحری جہاز کے ذریعے اس جادوئی بندرگاہ پر اترا تھا۔ بندرگاہ پر مچھلیوں کی بُو سے زیادہ ان کھانوں کی مہک تیر رہی تھی، جن کے مسالوں کی شہرت سمندر عبور کر چکی تھی۔ وہ بازاروں کی چہل پہل دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک نفیس بگھی میں سوار اپنے کالج پہنچا۔ وہاں قدم رکھتے ہی یوں لگا، جیسے وہ کہانیوں کی دنیا میں آ گیا ہے۔ ایسی درسگاہوں کا تذکرہ تو فقط کتابوں میں ہوا کرتا تھا۔ ہرے بھرے درختوں کی اوٹ میں

چھپی عمارتوں میں بے آواز چلتے اساتذہ۔ ٹولیوں کی صورت بیٹھے طالب علم۔ چھت تک کتابوں سے بھری لائبریریاں۔ مخلص عملہ۔

قلیچ خوش ضرور تھا، مگر مرعوب نہیں تھا۔ سندھ کی دھرتی اسے جو اعتماد عطا کر چکی تھی، اس میں لغزش لانا مشکل تھا، مگر بمبئی کو اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی فریدوں بیگ کے دو بیٹوں پر اپنی محبت نچھاور کر چکا تھا اور اب اس مسلم نوجوان کا ہمسفر بننے والا تھا، جس کی مسکراتی آنکھوں میں غضب کی قابلیت پوشیدہ تھی۔

کچے مکان میں آنکھ کھولنے والے قلیچ کے یہاں پہنچنے کا ایک سبب تو اہل عیال ٹھہرے، جن کا اصرار تھا کہ اسے بمبئی جا کر اپنے مرحوم باپ کی آخری خواہش ضروری پوری کرنی چاہیے۔ جب اس نے ارادہ باندھ لیا، تو پھر راستہ بھی نکل آیا۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں، محنت کرنے والوں کی کبھی ہار نہیں ہوتی۔

کالج نے اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے بیس روپے کا وظیفہ جاری کر دیا، جو کہ ضرورت کے لیے کافی نہیں تھا۔ بمبئی مہنگا شہر تھا۔ مگر قناعت پسند قلیچ مطمئن تھا۔

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ قلیچ نے جلد بارشوں کے شہر سے دوستی کر لی۔ چھتری لیے مون سون کی بارشوں میں گھومنے کا تجربہ اسے بھا گیا۔ نیا ماحول راس آ گیا تھا۔ جب مینہ برستا اور وہ ستار کے تار چھیڑتا، تو ایک طلسماتی لمحے کا جنم ہوتا اور ہاسٹل میں اس کے کمرے کے باہر طالب علموں کا جمگھٹا لگ جاتا، جو حیرت اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس اجنبی کو تکتے تھے۔ اس کی فطری دانش اور بے ساختگی نے اساتذہ کے دلوں میں جگہ بنانے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ مراٹھی اور گجراتی بھی اس نے ادھر ہی سیکھی۔ اس روانی سے بولتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔

چند مورخین محبت کے بے بدل تجربے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اور یہ قابلِ فہم ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ جو ہے۔ وجیہہ قلیچ کا دل کسی دوشیزہ کی سمت مائل ہونا عین امکانی ہے کہ آخر وہ بمبئی میں تھا، جو آج کے مانند اس زمانے میں بھی سپنوں کی نگری تھا۔ لیکن یہ جادو ایسا بھی نہ تھا کہ قلیچ کو راہِ زیست سے بھٹکا دے۔ دل پر دستک ضرور ہوئی ہوگی، مگر دروازہ نہیں کھولا گیا۔ بس کھڑکی ہی سے سلام دعا ہوگی۔ کوئی دوشیزہ ملی ہوگی، تو جاں نثار اختر والا لہجہ اپنایا ہوگا:

تو بھی اک دولتِ نایاب ہے، پر کیا کہیے
زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے

ہاں نے شاہ لطیف کے اشعار کے سائے میں اس لیے رخصت تھوڑی کیا تھا کہ وہ کسی کی زلف کا اسیر ہو کر تعلیم سے غافل ہو جائے۔ ادھر بمبئی میں جو اساتذہ میسر آئے، ان میں حیرت دہلوی نمایاں ترین، عالم فاضل آدمی۔ وضع دار، بااخلاق۔ مون سون کی ایک سہ پہر جب نئی وضع قطع کے ایک نوجوان کو انہوں نے اپنی کلاس میں دیکھا تو گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ تجربے کار آنکھوں نے پرکھ لیا کہ ماتھا ذہانت کی گواہی دیتا ہے۔ ایک پُرپیچ سوال اس کی سمت پھینکا، جب اس نے بڑے اعتماد سے جواب پیش کیا، تو جان گئے کہ شاگرد مل گیا ہے۔

حیرت دہلوی کی توجہ نے نوجوان کی صلاحیتیں نکھارنے میں بڑا کام کیا۔ اس کا نقطۂ نظر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ قلم کی قوت حقیقی معنوں میں آشکار ہوئی اور کتابوں سے عشق گہرا ہونے لگا۔ یہ خیال بھی راسخ ہونے لگا تھا کہ غلامی مستقل نہیں۔ آج نہیں تو کل... انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ مایوسی کا کرب جلد چھٹ جائے گا۔ وہ احساسات سینے میں تھے، جنہیں کئی برس بعد سرور بارہ بنکوی نے الفاظ دیے۔

رات کا انجام بھی معلوم ہے، مجھ کو سرور
لاکھ اپنی حد سے گزرے تا سحر، جائے گی رات

قلیچ فارسی اور عربی پر تو خوب گرفت رکھتا تھا، انگریزی سے بھی اچھی نبھتی تھی، تو استاد نے اسے ترکی زبان سکھانے کی ٹھانی۔ استاد سیر تو شاگرد سوا سیر۔ ترک گھوڑے پر سواری میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ کچھ ہی روز میں قلیچ کے تاج میں ایک اور پر کا اضافہ ہو چکا تھا۔

نوجوان کا زیادہ وقت اونچے ستونوں والی لائبریری میں گزرا کرتا۔ وہاں کا سکوت اُسے لطافت کے احساس سے بھر دیتا۔ اپنے وطن سے دوری کا غم کچھ کم ہو جاتا۔ لائبریری میں جہان بھر کے موضوعات پر کتابیں تھیں۔ دریائے سندھ کے کنارے سے آئے نوجوان نے جم کر مطالعہ کیا۔ اور اسی بے انت مطالعے کے دوران وہ خیال اُس پر اترا، جس نے اُس کی زندگی کو نئی ترتیب عطا کی۔

ہوا یوں کہ قلیچ جب بین الاقوامی شعرا کو پڑھتا، تو جہاں اُن کی تخلیقی جست اور ادبی گرفت پر عش عش کر اٹھتا، وہیں یہ امر بھی اُسے متجسس رکھتا کہ ایسا ہی پیغام وہ کہیں اور بھی پڑھ چکا ہے۔ ہاں... ایسے ہی احساسات کسی اور نے بھی اس میں اجاگر کیے تھے۔

اب قاصد نہ نامہ کوئی، آیا نہ پیغام
کوئی تو دیس سے آیا ہوتا، نامہ میرے نام
قید کے ہیں ایام، کون سندیسہ لائے

یہ شاہ لطیف کا تذکرہ ہے، جس کی شاعری کے آفاقی رنگوں سے مماثل رنگ اُسے بین الاقوامی ادب میں جابجا نظر آتے تھے۔ اسی تجربے نے پہلے پہل یہ خواہش جگائی کہ وہ اپنے دیس کے اس بطل جلیل کو دنیا کے سامنے متعارف کروائے۔

اور پھر ایک واقعہ ہوا۔

قلیچ کے علمیت نے اُسے جن معززین کی قربت عطا کی، ان میں سر آغا خان دوم کا گھرانا بھی شامل تھا، جن کے بیٹے آغا اکبر شاہ سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس دوستی کا ایک سبب جہاں مشترکہ عالمی مشاغل ٹھہرے، وہیں یہ وجہ بھی تھی کہ آغا اکبر حیرت دہلوی کی شاگردوں میں شامل تھے۔

تو ایک روز علی اکبر کے ساتھ قلیچ نے ایک اعلیٰ سطح کی تقریب میں شرکت کی، جہاں آکسفورڈ سے آئے کچھ طلبا بھی موجود تھے۔ چائے کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو شاعری کا موضوع نکل آیا۔ ہر کوئی اپنے من پسند شاعر کا کلام پیش کرنے لگا۔ قلیچ کی باری آئی تو اس نے بھٹ شاہ کے درویش کے اشعار کا ترجمہ پیش کیا۔

روزِ اوّل سے روزِ ابد تک سب ہی پردہ قادر ہے
جلوے بھی ہیں سارے اس کے اور وہ خود ہی ناظر ہے

سننے والے جھوم اٹھے۔ پوچھا گیا، یہ شاعر کون ہے جناب؟

جب لڑکے نے صوفی کی زندگی کے چند گوشوں پر روشنی ڈالی، تو فرمائش ہوئی کہ کچھ اور اشعار سنائے۔ اس نے گیت چھیڑ دیے۔

گرج چمک اور جھوم کے آئے بدرا اب کی بار
چھم چھم چھکے گھن گرجے برسے میگھ ملھار

پُراثر الفاظ سامعین کے دلوں میں اترتے چلے گئے۔

ہر موضوع چھوڑ کر سندھ دھرتی کے اس شاعر پر مکالمہ شروع ہوا۔ کسی نے کہا "آج کا فلاں انگریز شاعر بھی یہی کہہ رہا ہے۔" دوسرا بولا، جناب آج کی کیا بات کرتے ہیں، شیکسپیئر نے بھی فلاں فلاں بند میں یہی بات کہی۔ چند نے نطشے کا ذکر کیا، چند نے کیٹس کا۔ ولیم ورڈز ورتھ کا بھی نام لیا گیا۔

اپنے معشوق کے والہانہ تذکرے نے اس پر سرشاری طاری کر دی۔ لوٹتے سے جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ آغا اکبر نے خوشی دیکھی، تو ٹہوکا دیا۔ "دوست، آج تو محفل لوٹ لی۔" پھر کچھ سوچ کر کہا۔ "تم شاہ لطیف کا انگریزی میں ترجمہ کیوں نہیں کرتے؟"

وقت جیسے یکدم ٹھہر گیا۔ ہوا تھم گئی اور بلندیوں میں پرواز کرتے پرندے منجمد معلوم ہونے لگے۔

"کون میں؟" وہ ہکلایا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ تم سے بہتر بھلا کون کر سکتا ہے۔" دوست نے دوست کا حوصلہ بڑھایا۔

واپسی کا سفر کیسے طے ہوا، دریا خاموش تھا یا منہ زور، تانگے یکدم غائب کیوں ہو گئے تھے، موسم خنک تھا یا حبس زدہ... یہ سب باتیں غیر متعلقہ ہو گئیں۔ وہ اپنے تخیل میں دست بستہ کھڑا تھا، ٹیلے پر درویش موجود تھا، ہاتھ میں طنبورہ، جس کے تاروں پر کائناتی ساز چھڑے تھے۔

وہ رات بے حد انوکھی تھی۔ ایک ایک کر کے مقاصد زندگی خود کو منکشف کرنے لگے۔ کلام لطیف کو انگریزی میں ڈھالنا... دنیا بھر کے ادب کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ... سندھی ادب کی صورت گری۔

اسے اپنا مقصد مل گیا تھا۔ مگر پھر... ایک حادثہ ہوا۔

☆☆☆

صدیوں قبل، جس زمانے میں فرعون کی فوجیں نیل میں غرق ہوئیں، ہندوستان کی دھرتی پر ایک گیانی نے جنم لیا تھا، جو کہا کرتا تھا "بھکشو، وابستگی سے یاد جنم لیتی ہے اور یاد سے خواہش۔ اور خواہش دکھ ہے۔"

گوتم بدھ کے ان سادہ سے الفاظ میں کتنی گہری حقیقت پنہاں ہے، اس کا مطلب قلیچ نے تب جانا، جب ایک گرد آلود صبح اسے وطن سے ایک تار موصول ہوا۔ بری خبر کا جھکڑ اس کے دل سے ٹکرایا اور روح میں اتر گیا۔

اس کی ماں... وہ مہذب اور ذہین عورت جس نے کٹیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کی پرورش شہزادوں کی طرح کی، شدید علیل تھی۔ وہ آواز جس نے سندھو دریا کے کنارے اُسے دعاؤں میں رخصت کیا تھا، اب کمزور پڑ گئی تھی۔

کالج کے آخری سال کا وہ طالب علم سب چھوڑ چھاڑ کر اپنے شہر لوٹ گیا، تا کہ وہ شفیق چہرہ دیکھ سکے، جس نے کم سنی کے خوف میں اس پر سایہ کیا اور زندگی کی سیاہ تاریک راتوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

تار موصول ہونے کے بعد جس خطرے نے دل پر

زلزلہ طاری کر دیا تھا، وہ سامان باندھتے ہوئے، بحری جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اور طوفانی بارشوں میں سفر کرتے ہوئے قائم رہا، پر جب کراچی کی بندرگاہ قریب آئی... یکدم بپھرا ہوا سمندر خاموش ہوگیا۔ ہر طرف اداسی چھا گئی۔

قلیچ نے سسکی لی۔ حادثہ ہو چکا تھا۔ جس روز اس نے اپنے آبائی وطن میں قدم رکھا، ماں کی تدفین کو تیسرا روز تھا۔

قبر کی مٹی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی اور اس کا امکان بھی نہیں تھا۔ آنسو اس کی نمی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک بیٹے کے آنسو، جس کے ماتھے کی کشادگی کچھ ماند پڑ گئی اور آنکھ کی روشنی دھیمی پڑنے لگی۔ یوں لگتا تھا، جیسے کسی نے اُس کا خون نچوڑ لیا ہو۔

آنے والے دن یخ بستہ ہوائیں ساتھ لائے۔ اتنا پالا پڑا کہ زندگی ٹھٹھر گئی اور ندی جم گئی۔ رات چاندنی دھندلی سی ہوتی۔ پنچھی ہجرت کر گئے اور شہر پر ویرانی اتر آئی۔

قلیچ بیمار پڑ گیا تھا۔ تیمارداروں کی کوششیں کام نہ آئیں۔ حکیموں کے نسخے بے کار گئے۔ افسردگی نے اس کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ زندگی سے ناتا توڑنا چاہتا ہے۔ بمبئی سے دوستوں کے خط آئے۔ اساتذہ نے بھی خیریت پوچھی، مگر وہ کسی مکتوب کا جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

گھر والوں کا خیال تھا کہ اگر وہ یہیں رہا، تو بیماری اور اس کے جسم کے بیچ اٹوٹ رشتہ بن جائے گا اور راتوں کو چھایا رہنے والا غبار اس کا نصیب ہوگا۔ تو انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ بمبئی لوٹ کر تعلیم پھر شروع کرے۔

وہ بمبئی لوٹا ضرور، مگر اب اس شہر کے پاس نوجوان کے درد کی دوا نہیں تھی۔ بحر ہند کی لہریں اپنی موسیقیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ ساحلوں پر پرواز کرتے اکتاہٹ کا شکار نظر آتے۔ ریل کی چھک چھک کا طلسم ماند پڑ گیا۔ بازاروں کا شور اپنا جادو کھو بیٹھا۔

سچ تو یہ ہے کہ بمبئی پہنچ کر اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ یوں لگتا، جیسے ہر منظر دبیز دھند میں گم ہوگیا ہے۔ وہ کئی کئی روز اپنے بستر پر پڑا رہا۔ اداسی کی ایسی ہی ایک رات اس نے خواب میں وہ منظر دیکھا، جو اس نے اپنی ماں کی موت سے ایک رات قبل دیکھا تھا۔

وہ ہولناک طوفان میں گھرا تھا۔ بھید بھری تاریکی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں ایک آواز اُسے اپنی سمت پکار رہی تھی۔ وہ آواز کی جانب دوڑتا چلا گیا۔ بہت دیر تک دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ہانپنے لگا۔ جب دھند چھٹی تو اس نے خود کو ایک ریگستان میں پایا۔ دور ایک ٹیلا تھا، جہاں ایک درویش کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں سازِ محبت تھا۔ ہرن وادیوں میں رقص کرتے تھے۔

جب وہ پسینے میں شرابور اپنے بستر سے اٹھا، تو جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ اسی شام وہ سامان باندھ کر بندرگاہ کی سمت چل دیا۔

سندھ اپنے سپوت کو پکار رہا تھا۔

☆☆☆

گوٹھ کو بندرگاہ کا درجہ حاصل کیے ایک صدی بیت چکی تھی۔ اقتدار خان آف قلات کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے پاس آئے ہوئے بھی خاصا وقت گزر گیا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے موقع پر یہاں ایک بغاوت ضرور ہوئی، مگر اُسے کچل دیا گیا۔ جس سمے قلیچ نے اس شہر میں قدم رکھا... برصغیر کی سیاست میں مرکزی کردار ادا کرنے والے محمد علی جناح کی پیدائش ہو چکی تھی۔

ساحلی شہر میں نئے جیون کا آغاز کرنے والے مرزا قلیچ بیگ نے ابتدا میں بڑے بھائی کے ہاں قیام کیا۔ کراچی کے معتدل موسم نے طبیعت کو سنبھالا دیا۔ اکتاہٹ کچھ ٹوٹی تو شعر کہنے شروع کیے۔ گلستان و بوستان حفظ تھی، تو اظہار فارسی ہی میں کیا، پر انداز صوفیوں سا برتا۔ موضوع آفاقیت۔ زبان سادہ اور رواں۔ البتہ ہیئت نئی۔

شاعری ادبی ذوق کی تسکین کا تو سبب بنی، مگر ماں کے غم سے ابھرنے کا امکان اس وقت پیدا ہوا، جب فریدوں بیگ کا یہ سپوت بھیس بدل کر شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ کبھی مزدور، کبھی ماہی گیر، کبھی درویش۔ وہ نئے نئے لوگوں سے ملا کرتا۔ ان کی بیٹھک میں جاتا۔ بیچ ان کے مسائل سمجھنے لگا، تو دھیرے دھیرے اپنا غم بھی بھولنے لگا۔

دلاور بھائی کے بچے کی گمشدگی کا کرب لیے وہ شہر کی گلیوں میں کئی راتوں گھومتا رہا۔ زلیخا کے جنگ میں کام آنے والے شوہر کی بپتا سنتے ہوئے دن چپکے سے رات میں ڈھل گیا اور بھوک کا احساس مٹ گیا۔ لکشمن کے گھوڑے کی چوری کی رپورٹ لکھوانے کی کوششوں میں کتنے ہی روز خوار ہوا۔

وہ اپنے دوست ہیرا نند سے کہا کرتا۔ ”برادر۔ ان محلوں میں تو غم کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ آہ، شمرو کی معذوری میرے دل میں کھب گئی۔ کیا میرے یہ زخم بھر سکیں گے برادر؟“

"یہ زخم ہی تمہارے ستارے بنیں گے عزیز۔" ہیرانند نے سرخ جلد والی ڈائری بجائی جس میں وہ نوٹس لیا کرتا تھا۔ وہ ایک معروف انگریزی اخبار میں رپورٹر تھا اور نچلے طبقات کے مسائل پر لکھا کرتا تھا۔

زندگی کے عمیق مشاہدے نے دریائے سندھ کی سبک روی کے بھید اس پر کھولے۔ سرما کی بارشوں نے راز عیاں کیے۔ ساحل اب اس سے کلام کرنے لگا تھا اور شاعری میں نئی جہتیں نکل آئی تھیں۔

اس زمانے میں قلیچ "سندھ نیوز" نامی ایک اخبار سے منسلک تھا۔ وہ تواتر سے خود پر ہونے والے انکشافات پر مضامین لکھا کرتا۔ کئی اداریے بھی لکھے۔ وہ مطمئن تو تھا، پر خوش نہیں تھا۔ بمبئی سے سندھ کھینچ لانے والا مقصد دھیرے دھیرے ستانے لگا تھا۔

آغاز تراجم کی پُرپیچ دنیا سے ہوا۔ سرما کی یخ بستہ ہوائیں رات کو اُس کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھہر جاتیں اور حیرت سے اُسے تکتی رہتیں۔ سرگوشیاں کرتیں۔ کون ہے یہ دیوانہ۔ ادھر پورا شہر سو رہا ہے اور یہاں چراغ کی مدھم روشنی میں قلم دوات لیے بیٹھا ہے؟

پورا سرما گزر گیا اور وہ کاغذات میں الجھا رہا۔ جب وہ اپنے کمرے سے نکلا... بہار کی ابتدائی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔

ناشر صاحب ابھی ابھی مندر سے لوٹے تھے اور بھکتی رس میں ایسے بھیگے تھے کہ نفیس لباس پہنے نوجوان کو اپنے دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر بھی نہ کھڑے ہوئے۔ البتہ جب انہیں پتا چلا کہ نوجوان شیکسپیئر کے منتخب ڈراموں کے سندھی ترجمے کا مسودہ بغل میں لیے گھوم رہا ہے، تو ناشر صاحب اچھل پڑے۔

چائے منگوائی۔ پھر بیڑی پیش کی۔ چند صفحات پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ سامنے گوہر نایاب ہے۔ بڑے رچاؤ سے پوچھا۔ "ویسے کیا شغل ہے جناب کا؟"

"تحصیل داری کا امتحان دیا ہے قبلہ۔ نتائج کا انتظار ہے۔ فی الحال پیشہ ہمارا صحافت ہے۔"

"دام وام تو اچھے مل جاتے ہوں گے؟"

قلیچ مسکرایا۔ قناعت پسندی محدود وسائل میں امکانات کھوج نکالتی ہے۔ یہی اُس کے باپ کی نصیحت تھی۔

سمجھ دار ناشر نے گردن ہلائی۔ "شیکسپیئر کا تو ایک عالم معترف ہے جناب، مگر آج کل سر آرتھر کونن کا چرچا ہے۔ شرلاک ہومز کی کہانیاں تو پڑھ رکھی ہوں گی آپ نے؟"

"جی بالکل۔ کس نے نہیں پڑھی ہوں گے۔" اس نے چائے کی چسکی لی۔

"تو طے پایا کہ جناب ہمارے لیے سر آرتھر کونن کے تراجم کریں گے۔ دام کے معاملے میں بے فکر رہیں۔ رام قسم، ہم سے اچھا جواہری نہیں ملے گا۔"

سر آرتھر کونن کا وہ مداح تھا، مگر جب ترجمہ کرنے بیٹھا، ایک ایک سطر کو اپنی زبان میں ڈھالنا شروع کیا تب جانا کہ وہ شخص کیسا فسوں گر تھا۔ یکتا اور انوکھا۔ کتنے ہی مقامات پر وہ جھوم اٹھا۔

تکمیل کے بعد مسودہ لیے ناشر کے پاس پہنچا، تو اس نے مزید چند کتابیں تھما دیں۔ ایک تو وکٹر ہوگیو کا ناول تھا، فرانسس بیکن اور گوگول کی کہانیاں تھیں۔ سب ہی اس نے پڑھ رکھی تھیں۔

اُن کتب کی اشاعت نے قلیچ کو راتوں رات مشہور کر دیا۔ یوں تو شہر کی معزز شخصیات اُس کی علمیت کی قائل تھیں اس کا احترام کرتی تھیں لیکن اب عوام الناس بھی اُس کے نام سے آگاہ ہو گئے۔ اگلی بار وہ ایک انوکھے خیال کے ساتھ ناشر سے ملا۔

"کیوں ناں دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود یکساں الفاظ پر ایک کتاب مرتب کی جائے۔"

ناشر اچھل پڑا۔ "کیا خیال سوجھا ہے جناب۔ ذرا انتظار مت کیجیے، کام پر لگ جائیں۔"

قلیچ چپ رہا۔ کام شروع ہوئے تو کئی ماہ ہو چکے تھے۔ پورا موسم گرما کتب خانوں میں گزرا تھا۔ کتنی ہی زبانوں کی کتب وہ کھنگال چکا تھا۔ وہ متعدد زبانوں پر گرفت رکھتا تھا اور یہ قابلیت خوب کام آ رہی تھی۔

فارسی اور ہندی کا تو ذکر ہی کیا، اسے تو مراٹھی اور گجراتی پر بھی عبور تھا، حیرت دہلوی جیسے استاد نے ترک زبان بھی سکھائی تھی۔ اور سنیے، وہ تو پشتو اور بلوچی بھی جانتا تھا۔ سندھی اور انگریزی پر گرفت کا تو پہلے ہی تذکرہ ہو گیا۔ تو اس نے بڑی مہارت سے ادب، مذاہب، طب، اخلاقیات، سائنس اور تاریخ پر لکھی معروف کتب کو اپنی مادری زبان کا خرقہ عطا کیا۔ اس کے علاوہ خود بھی کئی کتابیں لکھیں۔

نئی صدی کے آغاز سے قبل مرزا قلیچ بیگ نے تحصیل داری کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت حاصل کر لی تھی۔ اس ملازمت نے اسے خاصا مصروف رکھا مگر تحقیق و تصنیف کے لیے وہ وقت نکال ہی لیتا۔ اس کام کے لیے اس نے اپنی نیند قربان کر دی تھی۔ بھوک پیاس سے ماورا ہو گیا۔ راتیں جاگتے ہوئے گزاریں۔ دیگر مشاغل بھی ترک کر دیے۔ دوستوں سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔

جب حلقۂ یاراں نے شکایت کی، اس کی بے انت مصروفیات پر ناک بھوں چڑھائیں، تو ان میں موجود ایک معزز صاحب نے قلیچ کا دفاع کیا۔ "سپاہی اپنے مقصد کے لیے سب کچھ تج دیتا ہے۔ ہمارے مرزا قلیچ بیگ بھی اپنا سب کچھ تج چکے ہیں۔ ان سے شکوہ کیسا۔"

یہ صاحب حسن علی آفندی تھے۔ وہی جنھوں نے سندھ میں پہلا مسلم اسکول سندھ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کرنے والے محمد علی جناح نے بھی اسی درس گاہ سے اکتساب فیض کیا تھا۔

تو قلیچ کے قلم کا گھوڑا علمی و ادبی وادیوں میں سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے اُسے اکثر سفر کرنا پڑتا۔ کبھی بلوچوں کی دھرتی کی سمت، کبھی پشتونوں کے وطن کی طرف۔ اور ہر سفر میں سب سے زیادہ بوجھ کتابوں کا ہوتا۔

اُسے اندازہ تھا کہ اگر سندھ کو جدید دنیا سے روشناس کروانا ہے، تو اُسے نئی نسل پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ اسی خیال نے بچوں کے لیے لکھنے کی تحریک دی۔ اس نے کہانیاں لکھیں۔ ضرب الامثال اکٹھی کیں۔ ساتھ ہی سندھی صرف ونحو پر ایک ایسی کتاب تیار کی، جس کی اثر انگیزی دیکھ کر بڑے بڑے ماہر لسانیات انگشت بدنداں رہ گئے۔

قلیچ نے عادت بنا لی تھی۔ جس موضوع کا بھی سیر ہو کر مطالعہ کرتا، اُس پر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک معیاری کتاب لکھ ڈالتا۔

ملنے والے کہتے۔ "میاں شعر بھی کہتے ہو... کہانیاں بھی لکھتے ہوئے، تراجم بھی، تحقیق بھی۔ کیوں خود کو ہلکان کرتے ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بھی سوچو۔"

وہ ہنس دیتا۔ "یہ کام میں نے اپنی زوجہ کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔"

1888 کے موسم خزاں میں قلیچ سندھ کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی کو اپنے کتابوں سے بھرے گھر لے آیا تھا۔ لڑکی مغل تھی۔ اردو اور سندھی پر اچھی گرفت رکھتی تھی۔ قلیچ کو اندازہ تھا کہ تہذیب یافتہ نسل کے لیے ایک تعلیم یافتہ ماں ضروری ہے۔ سو اس نے اپنی بیوی کو فارسی اور انگریزی کی تعلیم دی۔ اس کی بیگم ذہین اور سگھڑ عورت تھی۔ خوب جانتی تھی

کہ اس کا شوہر ایک عظیم مقصد کا تعاقب کر رہا ہے۔

قلیچ نے کتنے ہی علوم حاصل کیے مگر ایک موضوع ایسا تھا، جس بابت مطالعہ تو جم کر کیا، تجربات بھی کیے..مگر قلم نہیں اٹھایا۔ اور یہ تھا موسیقی کا گیان۔

وہ اکثر آسمان کی سمت دیکھ کر خدا سے سوال کرتا کہ اُسے یہ صلاحیت کیوں ودیعت کی گئی۔ پر اُدھر سے کوئی جواب نہیں آتا۔ آسمان خاموش رہتا۔ دراصل اس منصوبے کے آغاز کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

نئی صدی کے آغاز سے کچھ عرصے قبل...جب وہ منتخب شدہ لمحہ آیا تو قلیچ کے اس کشادہ مکان میں کتنے ہی پراسرار واقعات ہوئے۔

ایک صبح اُسے اپنی لائبریری کی ترتیب میں کچھ بدلاؤ محسوس ہوا۔ خیال گزرا کہ ملازمہ نے صفائی کرتے ہوئے کتابوں کا مقام بدل دیا ہوگا، مگر پوچھنے پر عورت نے صاف انکار کر دیا۔ دو روز بعد اُسے میز پر کچھ ایسی کتابیں نظر آئیں، جنہیں اُس نے وہاں نہیں رکھا تھا۔ پہلے بیگم سے دریافت کیا، بچوں سے سوال کیا، مگر سب نے نفی میں گردن ہلا دی۔

سوموار کی صبح محلے میں درویشوں کی ٹولیاں نظر آئیں جو ساز ہاتھ میں لیے سمندر کی سمت جا رہے تھے۔ اگلے روز اس نے دوات غائب پائی۔

دیگر علوم کے ساتھ وہ تصوف کا بھی درک رکھتا تھا۔ پریشان ہونے کی بجائے مراقبے میں بیٹھ گیا۔ کتب خانے کی بدلی ہوئی ترتیب پر نگاہ کرنے کا اشارہ ہوا۔ اور جب وہ اُس سمت گیا، تو ششدر رہ گیا۔

اس لیے نہیں کہ وہاں ایک پرانی یاد منتظر تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اتنے برسوں تک اُسے بھولا کیوں رہا۔

نئی ترتیب...شاہ جو رسالو اور سندھی میں اس پر لکھی کتب کو یکدم سامنے لے آئی تھی۔ گمشدہ قلم اور دوات بھی ادھر ہی ملے۔ کچھ روز قبل لکھنے کی میز پر جو نئی کتب ملی تھیں، وہ ساری لغات نکلیں۔

کلام درویش کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

تخیل نے جست لگائی۔ حروف آسمان سے اترے۔

قلم سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ دن اور رات اپنی ترتیب کھو بیٹھے۔

جب شہر کو خبر ہوئی کہ فریدوں بیگ کا بیٹا کس کام میں مصروف ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ شرفاء کے درمیان جب یہ موضوع زیر بحث آتا تو وہ اپنی آواز دھیمی کر لیتے۔ اعلیٰ عہدے دار سرگوشیوں میں بات کرتے۔ جب انگریزوں تک خبر پہنچی، تو وہ بھی حیران رہ گئے۔

تو سب متحیر تھے، مگر کوئی شبہات کا شکار نہیں تھا، بلکہ ایک خاص قسم کی طمانیت تھی۔

قلیچ بیگ ایک دشوار گھاٹی میں اتر چکا تھا۔ تاہم اس کے قدردان خوش تھے کہ انہیں علم تھا، یہ شخص ہمالیہ سا بلند حوصلہ رکھتا ہے۔ دھن کا پکا ہے۔ جو ٹھان لے، کر گزرتا ہے۔

قلیچ نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ اس نے شاہ لطیف کے ہمہ جہت کلام کو بڑی گرفت اور مہارت سے شستہ انگریزی میں ڈھال دیا۔

جب انگریزوں نے اُسے پڑھا تو سر دھنا۔ ان کے دل محبت اور عقیدت سے بھر گئے۔ ایسا پُراثر کلام انہوں نے پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ جہاں قلیچ کے مداح تھے، وہیں کچھ ناقد بھی تھے۔ ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ اس ترجمے میں کاملیت کی کمی ہوگی۔ شاہ کے وسعت کو گرفت میں لانا آسان کہاں۔

مگر کتاب دیکھتے ہی ان کے اندیشے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے، بلکہ اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔ دنیا کے سامنے سندھ کا حقیقی اور روشن چہرہ پیش کرنے کے لیے وہ قلیچ کے شکر گزار تھے۔

یہ اُس کی موسیقی پر گرفت ہی تھی، جس نے کتاب کو نئی جہت عطا کی۔ وہ سُروں میں چھپے بھید جانتا تھا، راگوں کے اسرار سے واقفیت تھی۔ عربی پر گرفت کی وجہ اس کی بھی خبر تھی کہ کہاں شاہ لطیف نے قرآن کا حوالہ دیا ہے، کہاں احادیث کا تذکرہ ہے۔ فارسی اور ترکی زبان و تاریخ پر عبور کی وجہ سے علم تھا کہ کہاں وہ قادر الکلام شاعر اپنے بزرگوں کا تذکرہ کرتا ہے اور کہاں مستقبل کی خبر دیتا ہے۔

جس زمانے میں اس ترجمے کی شہرت نے سندھ کی سرحد عبور کی، قلیچ اُس شہر میں تعینات تھا، جو ایران اور وسط ایشیا سے بدراستہ قندھار آنے والے تاجروں کا پڑاؤ ہوا کرتا تھا اور اپنے اچاروں کے لیے پورے ملک میں مشہور تھا۔

یہ شکارپور کا ذکر ہو رہا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔ لوگ ابتدا سے جانتے تھے کہ محکمہ محصولات میں تحصیل دار لگنے والا یہ شخص اعلیٰ عہدے تک جائے گا مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر لگ جائے گا۔ ڈپٹی کلکٹر ہندوستان میں سب سے بڑا سرکاری منصب تھا۔

ایک زمانے تک انگریز افسر ہی اُس عہدے پر فائز رہے۔ کچھ مورخین کا دعویٰ ہے کہ وہ سندھ میں یہ عہدہ پانے والا پہلا ہندوستانی تھا۔
اور اگر ایسا تھا بھی تو اس میں حیرت کیسی؟ اس کے سوا اِس اعزاز کا بھلا کون حق دار ہوسکتا تھا۔ مگر ان کامیابیوں کے پیچھے جدوجہد اور قربانیوں کی طویل داستان تھی۔ اپنوں کی قربانی کی داستان۔

☆☆☆

دہاڑتی ہواؤں نے حملہ کیا۔ چوہے اور پسو نکل آئے۔ انسانوں کے بدن سوج گئے۔ گٹھلیاں پڑ گئیں اور موت کے پروں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔
طاعون دہشت کا دوسرا نام ہے۔ ایک وبا جس پر قابو پانے کے دعوے ہمیشہ باطل ثابت ہوئے۔ جب بھی یہ ناسور پھیلا تو بستیوں کی بستیاں چاٹ گیا۔
1855 میں چین کے شہروں سے اٹھتی خوف کی ابتدائی چیخوں کو دبانے کی سرتوڑ کوششیں کی گئیں، مگر طاعون کا جراثیم بندرگاہوں کے ذریعے پھیلتا چلا گیا۔ کچھ روز خاموش رہنے کے بعد پھر یہ کسی نئی جگہ ظاہر ہوتا اور لاشیں بچھ جاتیں۔ یہ نئی صدی کے آغاز تک دہشت پھیلاتا رہا۔ چین کے پڑوسی ممالک بھی اُس کی لپیٹ میں آگئے، جن میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ اس وبا نے اتنے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائی کہ آج تاریخ دان اُسے طاعون کی تیسری عالمگیر لہر کے طور پر یاد کرتے ہیں۔
اسی مرض نے 1903 میں قلیچ کو اس کی بیوی سے محروم کر دیا۔ یہ ایک بھاری صدمہ تھا۔ زندگی تلپٹ ہوگئی۔ حویلی میں چپ ٹھہر گئی۔ اور درختوں کے پتے گر گئے۔
وہ اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھتا۔ وہ معصوم ممتا کا سایہ ہٹتے ہی صحرا کی دھوپ میں آگئے تھے۔ اس کا دل کٹ جاتا۔
کرب کے طوفان تھمنے کے بعد اُن بچوں کی وجہ سے وہ زندگی کی سمت لوٹنے کے قابل ہوا۔ غم کو بھول کر دفتر جانا شروع کر دیا۔ تحقیقی کاموں کا بھی آغاز ہوگیا تھا، مگر ایک خلا تھا۔ جسے زندگی کی چہل پہل بھرنے میں ناکام رہتی۔ ایک کمی کا احساس تھا۔
احباب اس پر دوسری شادی کرنے کے لیے زور ڈالنے لگے۔ جب وہ خود سے سوال کرتا کہ کیا وہ اپنی بیوی کی موہنی صورت کی جگہ کوئی نیا چہرہ قبول کر لے گا۔ تو جواب نفی میں آتا، مگر جب حبس زدہ دوپہر اپنے لڑکوں کو درخت کے نیچے خاموش بیٹھا پاتا، تو آنگن میں چھایا سکوت اُسے توڑ دیتا۔
اپنے بچوں کو ماں دینے کے لیے اس نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا، مگر قدرت مزید امتحان لینا چاہتی تھی۔ دوسری بیوی کو بھی موت کا عفریت لے گیا۔ مگر یہ واقعہ کچھ برس بعد ہوا۔ اِس دوران بچے کچھ بڑے ہوگئے تھے اور قلیچ نے عظمت کی سمت جانے والے اور کتنے ہی زینے طے کر ڈالے تھے۔
کلام لطیف کے انگریزی ترجمے کے بعد قلیچ کے جس کام نے علمی و ادبی حلقوں میں تہلکہ مچایا، وہ سندھ سے متعلق عربی میں لکھی ایک معروف کتاب تھی، جسے سولھویں صدی میں علی بن حامد کوفی نے فارسی کے قالب بھی ڈھالا۔ اگلی تین صدیوں تک محقق اور علماء اسی نسخہ سے استفادہ کرتے رہے، جو سندھ کے قدیم ہندو راجاؤں سے اسلام کی اس خطے میں آمد تک کی کہانی تفصیل سے بیان کرتا تھا۔
اس کے کچھ ٹکڑوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تھا، جو سندھ کے نئے کمشنر ایچ ای ایم جیمس کی نظر سے گزرے۔ وہ ایک علم دوست آدمی تھا۔ کتاب کی اہمیت فوراً بھانپ گیا۔ ارادہ باندھا کہ اس کا مکمل ترجمہ کروائے، مگر یہ سہل نہ تھا۔ یہ مفروضہ عام تھا کہ عربی سے فارسی میں منتقل کرتے ہوئے کتاب میں کئی سقم پیدا ہوگئے ہیں۔
کتنے ہی روز وہ پریشان رہا۔ پھر کسی نے مرزا قلیچ بیگ سے متعلق بتایا۔ سیانا آدمی تھا۔ فوراً چائے کی دعوت دے ڈالی۔
درختوں پر بور آگیا تھا اور شام کے بعد ہی کھلی فضا میں بیٹھنا ناگوار نہیں گزرتا۔ قلیچ کی بگھی کا دروازہ ایک باوردی ملازم نے کھولا۔ لان میں بیٹھے کمشنر آگے بڑھ کر ملا۔
چائے کے بعد جب اس نے قلیچ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا، تو مغربی افق پر چند ہی کرنیں بچی تھیں۔ قلیچ نے آسمان کی سمت دیکھا۔ کمشنر کا خیال تھا کہ وہ فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت لے رہا ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ قدرت کے حسین چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا جس نے اسے چن لیا تھا، ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لیے۔
مون سون کا زمانہ لائبریری میں گزرا۔ جہاں کچھ برس قبل جب قدرت اُسے کلام لطیف کے ترجمہ کا اشارے دے رہی تھی، عجیب وغریب واقعات پیش آئے تھے۔
آنے والے دن مصروفیات کے پختہ رنگوں سے رنگے

تھے۔ شمعیں پگھلتی گئیں۔ چراغ سیاہ ہوئے۔ کتنی ہی کتابیں کھنگالی گئیں۔ سیکڑوں ورق پھاڑے گئے۔ اس کی بگھی نے شہر کے کتنے ہی چکر لگائے۔ بارشوں میں اس کے پہیے کیچڑ میں پھنس پھنس جاتے۔ ٹرینوں سے بھی سفر کیے۔ بپھرے ہوئے سمندر میں اترنا پڑا۔ عربی کے علماء کے ساتھ قہوؤں کے کتنے ہی دور چلے۔ فارسی کے ماہر لسانیات کے ساتھ نشستیں ہوئیں، جو کتنی ہی دوپہریں ساتھ لے گئیں۔ انگریزی کے عالموں سے بھی تواتر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ اور یوں کئی دن کی کڑی تپسیا کے وسیلے محرم سے ذرا پہلے چچ نامہ کا انگریزی میں ترجمہ مکمل ہوا۔

جب اس کا علمی وادبی حلقوں میں چرچا ہوا، تو قلیچ نے وہی خوشی محسوس کی، جو فصل پکنے کے بعد کسان محسوس کرتا ہے، جس نے ہل چلا کر مٹی نرم کی ہو اور اس میں بیج بویا ہو۔ اور پھر کونپل پھوٹنے کا انتظار کیا ہو۔

☆☆☆

مرزا قلیچ بیگ نامی اس نابغۂ روزگار نے بطور محقق اور قلم کار اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا کہ تذکرے کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔ اجمالی جائزہ لیا جائے تو سندھ کے اس سپوت کے تراجم اور تصانیف کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ بیشتر کتب سندھی میں۔ اس کے علاوہ ستّر کے قریب انگریزی کتابوں کو اپنی مادری زبان کی صورت دی۔ مذہب اور فلسفے کے موضوعات پر لگ بھگ سو کے قریب تصانیف۔ علمی اور درسی کتب کا وسیع ذخیرہ۔ بلوچی، اردو، عربی اور فارسی میں بھی لکھا۔ انگریزی میں تحریر کردہ کتابوں کی تعداد چالیس بتائی جاتی ہے۔ بچوں اور خواتین کے لیے قلیچ بیگ کے قلم سے نکلی کتابوں کا تذکرہ ازحد ضروری ہے کہ اس نے وہ زمین تیار کی، جس پر جدید سندھی ادب کی بنیاد رکھی جانی تھی۔

شاعر وہ باکمال تھا۔ کتنی ہی رمز تھے اس کے مصرعوں میں۔ کیسی گہرائی تھی شبدوں میں۔ خیال یوں لگتا، جیسے غیب سے اترآتے ہوں۔ محققین کے نزدیک شعری مجموعوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔

جہاں وہ پختہ شاعر تھا، وہیں فکشن پر بھی خوب گرفت رکھتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ جدید سندھی فکشن کی بنیاد قلیچ بیگ کے بیٹے ہی نے رکھی۔ سندھ اور یہاں بسنے والوں سے متعلق اس کا ناول ''زینت'' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناقدین اسے رجحان ساز قرار دیتے ہیں۔ ایک عرصے تک یہ مقبولیت کے افق پر جگمگاتا رہا۔ کچھ تجزیہ کاروں کے مطابق سندھی خاندانوں پر تحریر کردہ یہ قصہ سندھی زبان کا پہلا ناول ہے۔ بغیر ٹیک والی کرسی پر بیٹھ کر لکھنے والا قلیچ بیگ وقت کئی کتابیوں پر کام کیا کرتا تھا۔ البتہ جب وہ ''زینت'' لکھ رہا تھا، تب اس نے اپنی کل توجہ اس ناول پر مرکوز رکھی۔

شاید قلیچ جیسی اور بھی چند مثالیں ہوں، مگر ایک فرق ہے۔ ان صاحبان علم نے یقینی طور پر خود کو علم و تحقیق کے لیے وقف کر دیا ہوگا، پر اس شخص کا معاملہ الگ تھا۔ وہ سرکار کے انتہائی اہم عہدے پر فائز تھا، جہاں مصروفیات ہمہ وقت تعاقب میں رہیں۔ پھر گھریلو ذمّے داریاں کہ دونوں بیویاں داغ مفارقت دے گئیں اور اسے اپنے بچوں کی پرورش اور گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے تیسری شادی کرنی پڑی۔ ان تین شادیوں سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

الغرض مصروفیت رکاوٹ نہیں بنی۔ یا پھر یہ کہہ لیں کہ اس نے ہر رکاوٹ کو شکست دے دی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ ہندوستان ذہنی غلامی کی گھٹن سے نکل آیا تھا۔ وہ سیاسی طور پر دھیرے دھیرے مستحکم ہونے لگا۔

اس دھرتی کے ہنرمندوں نے غاصبوں کے تعصب پر غلبہ پالیا تھا۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا۔ ادھر اقبال اور ٹیگور کا جھنڈا لہرایا تو ادھر سندھ میں قلیچ نے ایک بلند ستون کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کون سا شُہر ہوگا، جو اُس کے سامنے احترام سے نہ جھکتا ہو۔ ٹپکتی جھونپڑی میں آنکھ کھولنے والا یہ شخص سندھ کے ماتھے کا جھومر بن چکا تھا۔

اور سندھ ہی کیا، جب بنگال سے نوبل انعام یافتہ ٹیگور نے جسے شانتی نکیتن میں سب گرودیو کہہ کر پکارتے، سندھ کا رخ کیا تو سفیدے کے درخت تلے عام سی کرسیوں پر بیٹھ کر اُنھوں نے ان ندیوں کا بہاؤ بازیافت کیا، جوان کے بچپن کی سب سے حسین یاد تھی۔ بدلتے ہندوستان سے متعلق بھی بات ہوئی۔ قلیچ کے ذہن میں یہ خیال پنپنے لگا تھا کہ انگریز یہ زمین، جسے وہ مچھروں کا گھر کہتے ہیں، چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔ آفاقی پیغام کو گیتوں کی شکل دینے والا ٹیگور یہ بات سن کر مراقباتی خاموشی میں اتر گیا۔ اس گیانی کی خاموشی ہی مکمل جواب تھی۔

ٹیگور کے نام سے سندھ میں ایک ڈراما سوسائٹی ہوا کرتی تھی۔ مرزا قلیچ بیگ کا ایک بیٹا بھی تھیٹر کرتا تھا۔ اس عمل میں اُس نے ڈرامے لکھ کر اپنا حصہ ڈالا۔

انگریزی ادب کے دلدادہ جیمس برٹن سندھ کی کمشنری سنبھالنے سے قبل مسٹر جیمس سے قلیچ کا تذکرہ سن چکا تھا۔ چونکہ خود بھی قلم کار تھا، اس لیے خوب جانتا تھا کہ قلیچ نے جو کتابیں لکھیں، ان کے لیے کتنا پاپا مارنا پڑا ہوگا۔

اس نے عہدہ سنبھالنے کے جو ابتدائی فیصلے کیے، ان میں مرزا قلیچ بیگ کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازنے کا ارادہ بھی تھا۔ قلیچ بلاشبہ اس کا حقدار تھا۔ اس نے نہ صرف تصنیف و تالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، بلکہ پیغام صوفیاء کے فروغ اور سندھ میں بسنے والی مختلف قومیتوں کو قریب لانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اپنے عقائد پر اسے کامل یقین تھا، مگر وہ دوسرے کے مذاہب کا بھی احترام کرتا تھا۔ جہاں اپنی روایات سے جڑا رہا، وہیں نئے علوم اور افکار بھی قبول کیے۔ نہ ہی مغرب پرست بنا، نہ ہی مشرق کی ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس جھنجھٹ میں پڑا ہی نہیں۔ بس سر نیہوڑائے کام میں لگا رہا۔ کام... جو اُسے زندہ رکھنے والا تھا۔

چچ نامہ کے انگریزی ترجمے نے انگریزوں کو سندھ اور ہندوستان کی قدیم اور زرخیز تاریخ سے آگاہ کیا۔ احباب کے اصرار پر اس کا ترجمہ سندھی میں بھی کر ڈالا کہ جس خطے کی تاریخ ہے، وہاں کے باسی بھی اُسے پڑھ سکیں۔

قلیچ کا کمال یہ تھا کہ اس نے ادبی اور علمی سرگرمیوں کے ساتھ پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے بھی مکمل انصاف کیا۔ ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ایک بڑا علاقہ اس کے زیرِ نگرانی تھا۔ اب شہروں میں تو موٹریں اور لاریاں مل جاتیں، مگر دور افتادہ علاقوں کا سفر گھوڑوں اور اونٹوں سے طے ہوتا، جس سے لوگ گھبراتے تھے۔ ایک تو سفر کی مشکلات، پھر ڈاکوؤں کا خطرہ۔ مگر قلیچ کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ رکھ رکھاؤ میں نہیں پڑتا تھا۔ اس نے نہر کنارے ایک کچے مکان میں آنکھ کھولی تھی۔ عسرت میں پلا بڑھا۔ حقیقی مسلمان کی طرح تکلفات سے اجتناب کیا کرتا تھا۔ صحرا، پہاڑی سلسلہ یا پھر دلدلی علاقہ، جہاں کہیں جانا ہوتا اللہ کا نام لے کر نکل جاتا اور اپنی ذمے داریاں پوری کر کے لوٹتا۔ کچھ کتابوں میں ایسے قصے بھی ملتے ہیں کہ دوران سفر اس کے قافلے کو ڈاکوؤں نے آن لیا مگر جب انہیں پتا چلا کہ وہ مرزا قلیچ بیگ ہے، تو احترام سے سلام کیا اور پلٹ گئے۔

کوئی مشکل، کوئی پریشانی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی مگر پھر... بڑھتی عمر صحت کو متاثر کرنے لگی۔ وہ بیمار رہنے لگا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ہر کوشش ناکام گئی۔ ہاں، بذلہ بنجی قائم رہی۔ جب کوئی صحت پوچھتا، تو وہ کھٹ سے کہتا "پروردگار کا کرم ہے۔ آپ سنائیں، کیسی طبیعت ہے۔ بال بچے کیسے ہیں؟"

مگر بذلہ بنجی وقت کے فیصلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حویلی اب چپ رہنے لگی تھی۔ اور چراغوں کا دھواں کتب خانے سے غائب ہوگیا۔ جو کتاب پڑھنی ہوتی، بستر کے سرہانے دھری رہتی۔ مگر اب مطالعہ بھی کم ہوگیا تھا۔ نظر جو کمزور ہوگئی تھی۔

سرما کی ایک صبح جب سورج کی پہلی کرن نے دھند کو منور کیا اور نہر کے مشرقی کنارے پر واقع مسجد کا مؤذن اذان دینے کھڑا ہوا، بستر پر پڑے بوڑھے کے کان میں سرگوشی ہوئی۔ "قلیچ۔"

بخار کا بوجھ پرے کرتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر دروازے پر روشنی ابھر رہی تھی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ کون تھا وہ؟

اس کا باپ؟ یا پھر اس کا بھائی یا پھر...

"قلیچ۔" سرگوشی ہوئی۔

اس نے سنہری نور پر نگاہ کی اور جان گیا کہ دریا اُس کے لیے گا رہا ہے۔ لہراتے درخت سلامی دیتے ہیں۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ کلمہ پڑھا۔

دروازے پر ظاہر ہوتی روشنی کچھ دکی اور دھرتی کا یہ عظیم سپوت ایک ایسے سفر پر روانہ ہوگیا، جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

مدر ٹریسا کی کلکتہ آمد اور بریڈمین کی پہلی ٹیسٹ سنچری کے چند ماہ بعد 1929ء کے وسط میں ایک ستارہ ٹوٹا۔ درویش نے آنکھیں موند لیں۔

اب وہ اُس دریا کے گیتوں کی طرح امر ہوگیا تھا جن کے سفید جھاگ اڑاتے شفاف پانی کرشاتی گھوڑوں کی طرح تیز و تند تھے۔

اُس کے انتقال کے اٹھارہ برس بعد اس کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی... انگریز ہندوستان سے لوٹ گئے۔

ماخذات

وکی پیڈیا، مرزا قلیچ بیگ از شہناز شورو، مرزا قلیچ بیگ از فہمیدہ ریاض

پراسرار قلمکار

مریم کے خان

اس کے قلم میں پچھلے پہر جیسی گداز و کیف سحر آفرینی ہوتی۔ ہر سطر پر گمان ہوتا کہ پلکوں پر سجے اشکوں کے شبنمی تار جھلملا رہے ہیں جن کی سحر آفرینی قاری کو دم بخود کیے رکھتی اور اختتام پر قاری چونک چونک جاتا۔ اس کی یہی جادو بیانی اسے عالمی شہرت کے معراج پر پہنچانے کا سبب بنی۔

عالمی شہرت کے حامل قلمکار کا زندگی نامہ

13 اکتوبر 1849 کو بالٹی مور، میری لینڈ، پارک کی اس بینچ پر صبح کے ابتدائی وقت میں بیٹھا ہوا وہ شخص یوں لرز رہا تھا جیسے اسے سخت سردی لگ رہی ہو۔ حالانکہ اس نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے اور موسم بہت زیادہ سرد بھی نہیں تھا۔ وہ سیدھا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔ صبح کا کہرا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ پارک کے بیشتر درخت خزاں کے ہاتھوں اپنے پتوں سے محروم ہو گئے تھے اور ان کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر کرخت

آوازوں والے کوے براجمان تھے۔ کچھ کوے اڑے اور انہوں نے کراہتی آوازیں نکالیں تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے سر کے عین اوپر پورا چاند تھا اور یہ سنہری کی بجائے چاندی جیسا ہو رہا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا مگر وہ چاند دیکھتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں یخ بستہ پانی ہو اور اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکل رہی ہو۔ وہ شدید اذیت میں تھا۔ مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ اس بنچ تک کیسے آیا اسے یہ بھی یاد نہیں تھا مگر اسے ایک چیز بہت واضح محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔

تبھی ایک بوڑھا آدمی پارک میں داخل ہوا۔ اس نے گرم کوٹ کے ساتھ مفلر لے رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چاندی کے منہ والی چھڑی تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا بنچ تک آیا اور پھر اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ چند لمحے اپنی بوڑھی آنکھوں پر زور دیتا رہا اور پھر اس نے حیرت سے کہا۔ ”مسٹر ایڈگر ایلن پو...... یہ تم ہو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھا گھبرا اٹھا اور مدد کے لیے پکارتا ہوا پارک سے باہر دوڑ گیا۔

ایلن پو تھا کون اگر آپ نے اس کا نام نہیں سنا ہے تو آیئے اس کے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

وہ مختلف قسم کا بچہ تھا، اسے بچوں والے کھیلوں، کھلونوں اور چیزوں سے دل چسپی نہیں تھی۔ وہ ایسی چیزوں میں دل چسپی لیتا تھا جن میں عام طور سے بڑے بھی دل چسپی نہیں لیتے ہیں۔ اسے کوّوں سے دل چسپی تھی۔ وہ گھنٹوں باغ کی بنچ پر بیٹھا آس پاس اڑتے اور درختوں پر بیٹھے کوّوں کو تکتا رہتا تھا۔ وہ گھاس اور پودوں میں رینگنے والے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کا پیچھا کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ وہ کہاں سے آتے ہیں اور ان کا طرزِ زندگی کیا ہے؟ اسے سرجری کے اوزار اچھے لگتے تھے۔ اس نے ایک دوربین، ایک خوردبین اور کپاس رکھا ہوا تھا۔ یہ اس کے کھلونے تھے۔ جاسوسی ادب کے بانی کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر جان اور فرانس ایلن سمجھتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ مشکل سے ایک سال کا تھا جب انہوں نے اسے گود لیا۔ اس کا باپ خاندان کو چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا اور اس کی ماں سانس اور دل کی بیماری میں زندگی ہار گئی تھی۔

جان ایلن رچمونڈ ورجینیا کا ایک دولت مند اسکاٹش نژاد امریکی تاجر تھا۔ وہ بہت سی اشیا کی تجارت کرتا تھا جیسے تمباکو، کپڑے، گندم اور غلام۔ اس کے پاس ایک عالی شان گھر تھا اور اس گھر میں سہولت کی ہر چیز تھی۔ مگر وہ اولاد سے محروم تھا۔ اس لیے وہ اور اس کی بیوی کسی بچے کی تلاش میں تھے جسے وہ گود لے سکیں اور انہیں ایڈگر مل گیا۔ ایڈگر کا تعلق ایک آئرش خاندان سے تھا۔ اس کا دادا ڈیوڈ پو سینئر کاوان آئرلینڈ سے 1750 کے آس پاس میں ترکِ وطن کر کے امریکا آبسا تھا۔ اس وقت آئرلینڈ برطانیہ کے زیرِ تسلط تھا اور آئرش بڑی تیزی سے ترک وطن کر رہے تھے۔ وہ ریاست میساچوسٹس کے شہر بوسٹن میں آبسا۔ اس نے یہیں شادی کی اور اس کے بیٹے ڈیوڈ پو جونیئر نے یہیں جنم لیا۔ اس وقت بوسٹن ایک ترقی کرتا ہوا اور ابھرتا ہوا صنعتی شہر تھا۔ کارخانوں کی چمنیاں سر اٹھا رہی تھیں اور چاروں طرف سے مزدور روزگار کی تلاش میں یہاں کا رخ کر رہے تھے۔

مگر ڈیوڈ پو جونیئر نے مزدور یا کلرک کی بجائے اداکار بننا پسند کیا اور اس نے شادی بھی ایک اداکارہ الزبتھ آرنلڈ ہوپکنز سے کی۔ محبت کی شادی کے باوجود ان کی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ ان میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے اور پہلے بچے کی پیدائش نے انہیں فوری طور پر الگ ہونے سے روکا تھا۔ اس بیٹے کا نام انہوں نے ولیم ہنری لیونارڈ پو رکھا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دونوں میاں بیوی ولیم شیکسپیئر کے مداح تھے۔ جب ان کا دوسرا بیٹا ہوا تو ممکنہ طور پر اسے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے ”کنگ لیئر“ کے کردار ایڈگر سے متاثر ہو کر یہ نام دیا گیا۔ اس وقت اس کا نام ایڈگر پو تھا۔ مگر جب اسے جان ایلن نے گود لیا تو اس نے رواج کے مطابق اس کے نام میں اپنے خاندانی نام ایلن کا اضافہ کر دیا اور یوں وہ ایڈگر ایلن پو ہو گیا۔ آج دنیا اس عظیم مصنف کو اسی نام سے جانتی ہے۔

تقریباً ہر بڑے آدمی نے بہت مصائب کے ساتھ زندگی کا آغاز کیا اور پھر کامیابی نے ان کے قدم چومے لیکن کچھ بڑے آدمی ایسے بھی گزرے جن کی ساری زندگی ہی مصائب کے ساتھ گزری۔ وہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ایڈگر بھی ایسے افراد میں سے ایک تھا۔ وہ 19 جنوری 1809 کو بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال اس کی چھوٹی اور واحد بہن روزلی دنیا میں آئی اور اسی سال اس کا باپ ڈیوڈ پو جونیئر اپنے خاندان کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یقیناً یہ خودغرضانہ سفاکی تھی کہ وہ اپنے تین بچے، ایک بیمار بیوی کے پاس چھوڑ کر خود کہیں غائب ہو گیا اور پھر ایڈگر یا اس کے بہن بھائی نے کبھی

اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ الزبتھ سانس کی مریضہ تھی اور اسے دل کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ اگر چہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر بیماری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مشکل سے تیس سال کی عمر میں دنیا سے گزر گئی تھی۔ ایڈگر کو اپنی ماں اور باپ بالکل یاد نہیں تھے۔ اس نے صرف تصویروں میں انہیں دیکھا۔

الزبتھ کے مرنے کے بعد اس کے بچے بٹ گئے تھے اور انہیں مختلف گھرانوں نے گود لے لیا۔ اس وقت آئرش کمیونٹی کے طور پر منظم ہو گئے تھے اور وہ اپنی کمیونٹی کے غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کا خیال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایڈگر خوش قسمت تھا کہ اس نے ایک دولت مند گھرانے میں ہوش سنبھالا۔ اگر چہ وہ جان اور فرانسس کی اولاد نہیں تھا مگر اس گھر میں اسے اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ جان ایلین کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ضرور تھا مگر اس کی رگوں میں آئرش خون بھی تھا اس لیے وہ آئرش کمیونٹی کا حصہ بھی تھا۔ 1812 میں اسے اس خاندان کے ایپس کوپل چرچ میں بپتسمہ دے کر ایڈگر ایلین پو کا نام دیا گیا۔ بہترین رہائش، لباس اور خوراک کے ساتھ اسے اچھا اسکول بھی میسر آئے۔ مگر حیرت انگیز طور پر یہ اسکول امریکا نہیں بلکہ برطانیہ میں تھے۔ ایلین خاندان 1815 میں تجارت اور سیاحت کے غرض سے برطانیہ گیا۔ پہلے ان کا مختصر قیام کا ارادہ تھا مگر بعض معاملات ایسے سامنے آئے کہ ان کا قیام طویل ہوتا چلا گیا۔

اسکاٹ لینڈ کے شہر ارون کا گرامر اسکول ایڈگر کا پہلا اسکول تھا۔ یہاں اس نے پرائمری کلاس پڑھی۔ اتفاق سے اسی اسکول میں جان نے بھی اولین تعلیم حاصل کی تھی۔ اگلے سال ایڈگر لندن بلا لیا گیا کیونکہ جان اور فرانسس وہیں مقیم تھے۔ اس بار اسے چیلسی کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں وہ آنے والے دو سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں بھی وہ ایلین خاندان سے دور تھا۔ آخر میں اسے برطانیہ کے چند اعلیٰ ترین اسکولوں میں سے ایک اسکول ریورنڈ جان برسبائے مینر ہاؤس اسکول میں داخل کرایا گیا اور ایڈگر خاندان کی امریکا واپسی تک یہیں پڑھتا رہا تھا۔ یہ اسکول بھی لندن سے ذرا دور ایک نواحی گاؤں کے پاس واقع تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی پرائمری تعلیم برطانیہ میں ہوئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں اور شخصیت میں برطانوی رنگ ہمیشہ غالب رہا۔ وہ 1820 میں امریکا واپس آ گئے تھے۔

امریکا واپسی پر اسے رچمونڈ ہائی اسکول میں داخلہ ملا اور اسکول کی باقی تعلیم اس نے یہیں مکمل کی۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو پہلی بار اس کے منہ بولے باپ جان سے اختلافات شروع ہوئے۔ ایڈگر لاابالی اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ ایک اعلیٰ اور دولت مند گھرانے میں پرورش پانے کے باوجود اس کی شخصیت میں کھرا پن تھا اور وہ ادب و آداب کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا۔ یعنی خالص امریکی تھا۔ بعد میں آنے والے امریکی نوجوانوں نے اس کی پیروی کی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک شمال مشرقی ریاستوں میں پو اسٹائل معروف ہو گیا تھا۔ مگر اسے روایات کا باغی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ جان چاہتا تھا کہ وہ بزنس بھی سیکھے لیکن ایڈگر کو بزنس سے ذرا بھی دل چسپی نہیں تھی اور بعد میں بھی جب اس نے حالات سے مجبور ہو کر کاروبار میں ہاتھ ڈالا تو خسارہ ہی کمایا۔

1824 میں پندرہ سال کی عمر میں اسے لازمی فوجی خدمات کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ چھ مہینے تربیت کے بعد اسے فوجی ملازمت کی بجائے اعزازی گارڈ کے طور پر کام کرنے کی پیشکش ہوئی مگر ایڈگر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور اس نے یونیورسٹی آف ورجینیا میں داخلہ لے لیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ایڈگر نے بھی بہت اچھا گریڈ نہیں پایا۔ اس کے ٹیچرز کے خیال میں وہ خیالوں میں گم رہنے والا لڑکا تھا جسے عملی زندگی سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایڈگر کو روایتی تعلیم سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی وہ مشاہدے کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ البتہ اسے مطالعے کا بے پناہ شوق تھا۔ اس نے چند سال میں اسکول کی ساری لائبریری چاٹ لی تھیں جس میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ شہر کی دوسری لائبریریوں کے چکر لگاتا رہتا اور اسے جو جیب خرچ ملتا اس کا بڑا حصہ بھی کتابوں کی خرید پر لگ جاتا تھا۔ مگر فوجی تربیت کے دوران اسے ایک لت اور لگ گئی تھی جو اس کی جیب کو ہمیشہ خالی رکھنے کی سب سے بڑی بھی ثابت ہوئی تھی۔ یہ عادت جوئے کی تھی۔

بہ ظاہر تو ایڈگر کی زندگی بڑے عیش و آرام سے گزر رہی تھی۔ کیونکہ اس کا بنا ہوا باپ جان ذاتی طور پر تو دولت مند تھا ہی۔ ساتھ اسے اپنے انکل ولیم گالٹ نے ورثے میں اس کے لیے ہزاروں ایکڑ زمین چھوڑی جس کی مالیت اس زمانے میں ساڑھے سات لاکھ ڈالرز بنتی تھی۔ جان نے

اپنی دولت مندی کا جشن منانے کے لیے ایک برک مینشن خریدا اور اسے مولداویا مینشن کا نام دیا۔ ایڈگر بھی خاندان کے ہمراہ اس مینشن میں منتقل ہو گیا اور یہیں یونیورسٹی جانے سے پہلے اس کی منگنی سارہ المیر اروسٹر سے ہو گئی۔ لڑکی کا باپ ایرکسن روسٹر بالٹی مور کا ایک معروف بزنس مین اور دولت مند تھا۔ اس نے ایڈگر کو کبھی پسند نہیں کیا اور اس کی پیش گوئی تھی کہ یہ لڑکا ناکام رہے گا اور لوگ اس کا نام تک بھول جائیں گے۔ مگر قسمت کا کھیل دیکھیں۔ ایرکسن کی پیش گوئی اس لحاظ سے درست ثابت ہوئی کہ ایڈگر ہمیشہ ناکام رہا۔ مگر آج لوگ ایرکسن روسٹر کا نام صرف اس کی وجہ سے جانتے ہیں۔

ایڈگر جوانی میں بکھرے بالوں اور بے پروا حلیے والا ایک خوش شکل نوجوان تھا اور اس میں صنف مخالف کے لیے ایک خاص کشش تھی۔ اس کی گفتگو جارحانہ اور کھردری ہونے کے باوجود ایک خاص قسم کی کشش رکھتی تھی۔ اسے الفاظ اور انداز پر عبور تھا۔ بچپن سے اعلیٰ ترین طرزِ زندگی رکھنے کے بعد وہ اب اس کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہترین لباس پہنتا۔ اسے کھانے کا زیادہ شوق نہیں تھا مگر ابتدائے جوانی سے اسے شراب کی لت لگ گئی تھی اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر یہ ایسی کوئی خرابی نہیں بلکہ اس کے طبقے کا خاصہ تھا۔ یہاں نوجوان پندرہ سولہ سال کی عمر تک عادی شرابی ہو جاتے تھے۔ ایڈگر نے اسکول کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس نہیں کیا تھا مگر اس کی معلومات اور علیت اپنی عمر کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے دنیا جہان کا ادب چاٹ ڈالا تھا جو کتاب اس کی دسترس میں آئی وہ اسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ ملنے والا کوئی فرد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جان کے بعد یہ سب ایڈگر کا ہوگا۔ مگر اس موقع پر اس کی افتادِ طبع پہلی بار کھل کر سامنے آئی۔ اس نے جان کے بزنس میں شراکت کی بجائے آگے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پڑھنے اور کوئی علمی کام کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ جان کے خیال میں اس نے جتنی تعلیم حاصل کرنی تھی کر لی تھی اور اب اسے عملی زندگی میں آ جانا چاہیے تھا۔ دراصل جان اپنی ساری دولت مندی کے باوجود ایک کنجوس شخص تھا اور اسے ایڈگر کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کھل رہے تھے۔ اس نے ایڈگر سے کہا۔ ''تم کیوں رقم خرچ کرنا چاہتے ہو جب کہ اب تم اپنے وقت کو دولت میں بدل سکتے ہو۔''

''میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔'' ایڈگر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس صورت میں تم اپنی تعلیم کے اخراجات خود برداشت کرو گے۔''

ایڈگر کا خیال تھا کہ جان عارضی ناراض تھا اور جلد وہ مان جائے گا اور اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر لے گا۔ اس نے اپنی جمع پونجی سے یونیورسٹی آف ورجینیا میں داخلہ لیا۔ یہ یونیورسٹی امریکی صدر تھامس جیفرسن نے قائم کی تھی اور یہاں طلبا کے لیے خاصے سخت رول تھے۔ یہاں جوا، گھوڑے اور ہتھیار، تمباکو اور الکوحل ممنوع تھی۔ مگر ساتھ ہی جیفرسن نے ایک عجیب قانون بنایا تھا کہ طلبا کو پکڑنے کا اختیار انتظامیہ کے پاس نہیں تھا بلکہ ہر طالب علم اپنے بارے میں خود رپورٹ کرتا کہ اس نے مذکورہ قوانین کی کب کب خلاف ورزی کی اور پھر اسے سزا ملتی تھی۔ مزے کی بات ہے اپنے بارے میں رپورٹ کرنے والے طلبا کا تناسب بہت زیادہ تھا اور یہ قانون آج بھی برقرار ہے۔ ایڈگر کو یونیورسٹی سے پہلے ہی شراب اور جوئے کی لت لگ چکی تھی۔ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد بھی اس کے یہ مشاغل جاری رہے۔ مگر اسے اپنے بارے میں رپورٹ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ پہلے سمسٹر کے بعد اسے مالی مشکلات کے سبب یونیورسٹی چھوڑنا پڑی تھی۔

جان کا خیال تھا کہ ایڈگر واپس آ جائے گا اور اب اس کے ساتھ کام کرے گا۔ مگر وہ ایڈگر کی ضدی طبیعت کا درست اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ ایڈگر نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے انوکھا فیصلہ کیا اور اس نے فوج میں ملازمت کر لی۔ ہوا یوں کہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران اس کا زور غیر نصابی سرگرمیوں پر رہا اور خاص طور سے جوئے کے شوق نے اسے خاصا مقروض کر دیا۔ بعد میں ایڈگر نے اس کا الزام اپنے منہ بولے باپ کو دیا جس نے اسے اتنی رقم نہیں دی جس سے وہ فیس ادا کرتا، کتابیں اور کپڑے خرید سکتا۔ اس لیے اس نے رقم کی خاطر جوا کھیلا اور بدقسمتی سے مزید قرض چڑھا بیٹھا۔ اسے اتارنے کے لیے اس نے فوجی ملازمت کی اور یہاں اس نے ایڈگر اے پیری کے نام سے رجسٹریشن کرائی۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے قرض خواہوں کو علم ہو کہ وہ فوج میں ہے اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں چلے آئیں۔ اس نے عمر بھی غلط

لکھوائی۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا مگر اس نے بتایا کہ وہ بائیس سال کا ہے۔

فوجی ملازمت ایڈگر کا ایک غلط فیصلہ ثابت ہوئی۔ وہ کسی طرح بھی فوجی ملازمت کا اہل نہیں تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی۔ مگر وہ نازک مزاج ہونے کے ساتھ لاابالی طبیعت کا آدمی تھا جس کے لیے نظام الاوقات سے زندگی گزارنا جہنم میں رہنے کے مترادف تھا پھر یہاں شراب اور جوئے پر پابندی تھی۔ یہ دونوں کام چھپ چھپا کر ہی ممکن تھے۔ اس وقت فوجی ملازمت کرنے والوں کو کم سے کم پانچ سال ملازمت کرنا پڑتی تھی۔ اس کی اوّلین پوسٹنگ بوسٹن کے پاس فورٹ انڈی پینڈینس میں ہوئی اور اسے یہاں کارپول سارجنٹ کے طور پر تعینات کیا گیا۔ اس کی تنخواہ کل پانچ ڈالرز ماہانہ بنتی تھی۔ یہیں اس نے اپنی پہلی کتاب شائع کرائی۔ یہ نظموں کا مجموعہ ''تیمورلنگ اینڈ آدر پوئمس'' تھی۔ چالیس صفحات کی اس کتاب کی کل پچاس کاپیاں شائع ہوئیں اور اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ آج اس کی صرف ایک کاپی دستیاب ہے۔ اسی سال اس کا تبادلہ جنوبی کیرولینا کے فورٹ ملٹریا میں کر دیا گیا۔ یہاں اسے آرٹی آفیسر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ یہ عہدہ خاص طور سے جدید آرٹلری کے لیے بنایا گیا تھا اور یہاں ایڈگر کی تنخواہ دوگنی ہوگئی۔

تقریباً سوا دو سال بعد ایڈگر نے فوج سے نکلنے کا فیصلہ کیا حالانکہ اس وقت وہ سارجنٹ میجر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا جو فوج میں نان کمیشنڈ افسران کے بعد سب سے اونچا رینک تھا۔ اس کی تنخواہ پچیس ڈالرز ماہانہ ہوگئی تھی۔ اس کا بیشتر قرض اتر گیا تھا۔ مگر وہ فوجی ملازمت سے اکتا گیا تھا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادب کے میدان میں طبع آزمائی کرے گا۔ لیکن فوج چھوڑنے کی وجہ صرف یہی نہیں تھی۔ شراب اور جوئے سے متعلق اس کی بے اعتدالیاں فوج میں بھی جاری رہیں اور بالآخر اس کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ ہاورڈ نے اس کے سامنے دو آپشن رکھے کہ یا تو وہ عزت سے استعفا دے دے یا پھر احتساب کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں اسے نہ تو واجبات ملتے اور نہ ہی وہ آئندہ کسی سرکاری ملازمت کا اہل رہتا کیونکہ اس نے فوجی ملازمت کی لازمی مدت پوری نہیں کی تھی۔ ایڈگر نے پہلا آپشن اختیار کیا اور فوج سے نکل گیا۔ اس وقت فوج کی ملازمت عزت اور ناموری حاصل کرنے کا سب سے آسان ذریعہ سمجھی جاتی تھی اور فوج سے نکالنا بے عزتی کے

مترادف ہوتا تھا۔
فوج میں ملازمت کے دوران اس میں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اوّل اس کی منگیتر سارہ سے منگنی ٹوٹ گئی تھی کیونکہ وہ کسی فوجی کی بیوی نہیں بننا چاہتی تھی۔ پھر اس کے قرضوں کی وجہ سے جان اور فرانسس سے اس کے تعلقات بھی خراب ہوئے تھے اور وہ اس دوران میں صرف دو بار رچمونڈ گیا تھا۔ دونوں بار اسے جان اور فرانسس کا رویہ روکھا لگا۔ فرانسس اس سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ اس کے بے پرواہ رویے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ دوسری بار اسے معلوم ہوا کہ اس کی سابق منگیتر کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ انہیں خط لکھتا تھا مگر اسے جواب نہیں ملتا۔ پھر فرانسس بیمار ہوگئی اور ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ ایڈگر نے خط لکھ کر جان سے اس کے بارے میں پوچھا تب بھی اسے جواب نہیں ملا اور جب اسے علم ہوا کہ فرانسس آخری دموں پر ہے تب وہ فوج چھوڑ کر رچمونڈ جا رہا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو فرانسس کی تدفین ایک دن پہلے ہو چکی تھی۔ ایڈگر کے لیے یہ صدمہ تھا کیونکہ وہ جان کی نسبت فرانسس سے کہیں قریب تھا۔ اس نے شکوہ کرنا بیکار سمجھا۔
بیوی کی موت نے جان کا دل نرم کر دیا تھا اور پھر یہ خاندان کی عزت کا معاملہ تھا۔ جان نے ایڈگر کو موقع دیا کہ وہ فوج سے باعزت مستعفی ہو سکے۔ اس کے لیے اسے بقیہ مدت پوری کرنے کے لیے ویسٹ پوائنٹ بھیجا۔ ویسٹ پوائنٹ فوجی تربیت کا بنیادی ادارہ ہے۔ جان نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور ایڈگر کی مالی ضمانت دی یوں بالآخر وہ 15 اپریل 1829 کے دن دوبارہ فوج میں شامل ہوا۔ اس بار اسے کیڈٹ آفیسر کی تربیت حاصل کرنی تھی۔ ایڈگر ویسٹ پوائنٹ جانے سے پہلے وہ بالٹی مور گیا جہاں اس کی بیوہ خالہ ماریا کلین، کزن ورجینیا، اس کا بھائی ولیم اور خالہ کی ساس رہتے تھے۔ اس دوران میں ایڈگر نے اپنی دوسری کتاب "ال آراف، تیمور لنگ اینڈ آدر پوئمز" چھپوائی۔ مگر اس کا حشر بھی سابق کتاب سے مختلف نہیں ہوا۔ ایڈگر کی شاعری سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ قدیم رجحانات کے تحت شاعری کرتا تھا اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کی نظموں کا مرکز مشرق کے کردار تھے جن سے امریکیوں کو بہت کم دلچسپی تھی۔
جب وہ ویسٹ پوائنٹ میں تھا تو اسے پتا چلا کہ جان ایلن نے دوسری شادی کر لی ہے اور کچھ عرصے بعد اس کی دوسری بیوی لوئیسا نے اس کے بچے کو جنم دیا تو ایڈگر کا جان سے رہا سہا تعلق بھی ختم ہو گیا اور اس نے ایڈگر کو باقاعدہ الگ کر دیا۔ اب وہ اس کالے پالک نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی دولت سے ایڈگر کا کوئی واسطہ رہا تھا۔ ایڈگر ایلن پو کے لیے یہ ایک دھچکا تھا کیونکہ فی الحال اس کا کوئی خاص روزگار نہیں تھا۔ فوجی تربیت کے دوران جو وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ قرض میں چلا جاتا اور باقی اس کے اخراجات کے لیے ناکافی تھا۔ جان کا سہارا بھی ختم ہو گیا تھا اس لیے ایڈگر کے لیے فوجی ملازمت اب ایک بوجھ بن گئی تھی۔ جیسے ہی اس کا قرض اترا اس نے فوج سے نکلنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ وہ [illegible] ست استعفا نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنا اور سینئرز کی حکم عدولی کرنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی اس نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے کلاسز، چرچ اور مشقوں میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ ایک بار پھر فوج سے اس کی برخواستگی کی صورت میں سامنے آیا۔
اگلے سال اس نے نیویارک کا سفر کیا اور یہاں اس نے ایلم بلیس پبلشر سے اپنی تیسری کتاب شائع کرائی۔ یہ بھی نظموں کا مجموعہ تھی اور اس کا خرچ ایڈگر کے ساتھی کیڈٹس نے اٹھایا تھا انہوں نے فی کس پچھتر سینٹ اس مقصد کے لیے دیئے اور کل ایک سو ستر ڈالرز جمع ہوئے۔ اس چندے سے کتاب شائع ہوئی اور حسبِ سابق ناکام ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اس میں بھی تیمور لنگ اور ال آراف کی نظمیں موجود تھیں۔ مگر ساتھ ہی اس میں ایڈگر کی چھ ایسی نظمیں بھی تھیں جو پہلی دو کتابوں میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ کتاب کے اوّلین حصے میں ویسٹ پوائنٹ کے ان کیڈٹس کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا جنہوں نے اس کتاب کے لیے چندہ دیا تھا۔ دراصل ایڈگر اپنی ان نظموں کی وجہ سے زیرِ تربیت کیڈٹس میں نہایت مقبول تھا جو اس نے کمانڈنگ آفیسرز کے بارے میں کہیں تھیں ظاہر ہے اس نے ان کی ہجو کی تھی۔
ناکامی کی ہیٹ ٹرک کر کے دل برداشتہ ایڈگر نے ایک بار پھر خالہ کے پاس بالٹی مور کا رخ کیا۔ یہ وقت اس کے لیے نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ ان ہی دنوں ایڈگر کا بڑا بھائی ولیم الکوحل کے بے اعتدال استعمال کی وجہ سے صحت گنوا بیٹھا تھا اور آخری دموں پر تھا۔ وہ بالٹی مور کے سینی ٹوریم میں داخل تھا اور ایڈگر کے سامنے اس نے آخری سانس لیے۔ موت ایڈگر کے لیے نئی چیز نہیں تھی اگرچہ اس نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا مگر اپنے کئی ساتھیوں کو

مختلف حادثات اور بیماریوں میں مرتے دیکھا تھا۔البتہ اپنے کسی رشتے کو پہلی بار موت کے گھاٹ اترتے دیکھا۔ ایڈگر کی ولیم سے جوانی تک چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔بالٹی مور میں اوّلین قیام کے دوران وہ پہلی بار تفصیل سے ملے اور ایڈگر اپنے بھائی سے قریب ہوا تھا۔ جب وہ واپس گیا تب بھی انہوں نے خط پر رابطہ رکھا تھا۔ اس وقت ایڈگر کو خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اتنی جلدی بھائی سے محروم ہو جائے گا۔اب دنیا میں اس کا خون کا واحد رشتہ اس کی بہن رہ گئی تھی۔

ولیم میں بھی لکھنے کے جراثیم تھے اور اس نے بہت اچھی شاعری کی تھی مگر اس نے کبھی اسے شائع کرانے کی کوشش نہیں کی۔اس کی شاعری دیکھ کر ایڈگر نے سوچا کہ اگر کبھی اسے مالی فراغت نصیب ہوئی تو وہ اپنے بھائی کی شاعری شائع کرائے گا۔مگر اسے یہ فراغت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ بھائی کی موت کے بعد اس نے زیادہ شدومد سے بہ حیثیت ادیب اپنا کیریئر بنانے کی سعی شروع کر دی۔جس وقت لکھنا اور ادیب ہونا یورپ میں نفع بخش پیشہ بن گیا تھا اس وقت امریکا میں اسے صرف ایک جز وقتی پیشے کی حیثیت حاصل تھی۔کوئی امریکی مصنف صرف تحریر کے بل بوتے پر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اس کی ایک وجہ ملک میں کاپی رائٹ کے قوانین کا نہ ہونا بھی تھا۔امریکی پبلشر اور رسائل کے مالکان نہایت ڈھٹائی سے یورپ کے نامور ادیبوں کی تخلیقات نہ صرف کتابی شکل میں بلکہ رسالوں میں بھی شائع کر رہے تھے۔اس لیے انہیں نیا امریکی مصنف شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جسے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ایسے میں کون لکھاری ایسا تھا جو صرف لکھنے کو پیشہ بناتا۔یہ جرأت سب سے پہلے ایڈگر ایلن پو نے کی تھی۔

1837 میں آنے والا معاشی بحران بھی بڑی حد تک اس کا ذمے دار تھا۔اگرچہ پبلشنگ کی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور اس میں نئی ٹیکنالوجی کا اضافہ ہوا تھا مگر دگرگوں معاشی حالات کی وجہ سے پبلشر نے مصنفوں کو معاوضہ دینے یا وہ معاوضہ دینے سے انکار کر دیا جس کا وہ وعدہ کر چکے تھے۔ان سب باتوں کے باوجود اس دور میں نئے لکھنے والے امریکی نوجوانوں کی ایک کھیپ پرورش پا رہی تھی۔ان میں سے بیشتر نے آنے والے وقتوں میں خاصی کامیابی حاصل کی اور بہت سارے تو آسودگی اور دولت مندی کی منزل تک پہنچے تھے۔مگر جس شخص نے سب سے پہلے یہ کام کیا وہ ساری عمر مالی پریشانیوں کا شکار رہا اور اسے گزارا کرنے کے لیے قرض ادھار سے لے کر مدد مانگنے تک بہت سارے طریقے اپنانے پڑے تھے۔اکثر پبلشر اس سے لکھواتے ہوئے جو وعدے کرتے تھے وہ وفا نہیں ہوتے تھے۔

شاعری کے میدان میں لگاتار ناکامیوں کے بعد ایڈگر نے نثر کی طرف توجہ دی۔اس نے شاعری جاری رکھی تھی۔مگر اپنی آخری کتاب کی ناکامی کے بعد فیصلہ کر چکا تھا کہ اب شاعری کی کوئی کتاب شائع نہیں کرائے گا۔اسے نثر کی طرف آنے میں کچھ وقت لگا تھا۔اس نے فلاڈلفیا پبلی کیشنز کے ساتھ مل کر مختصر کہانیاں لکھنا شروع کیں اور ان ہی دنوں اس نے اپنا واحد ڈراما ''دی پولی ٹیشن'' (سیاست دان) لکھا۔ 1833 میں اس کی ایک چھوٹی کہانی ''مس فاؤنڈ ان بوتل'' کو انعام ملا اور اس کہانی نے ایک معروف دولت مند جان پی کینیڈی کو متوجہ کر لیا۔کینیڈی مطالعے کا شوقین تھا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔اس نے ایڈگر کو ملاقات کے لیے بلایا اور اسے تھامس ڈبلیو وائٹ سے متعارف کرایا۔تھامس رچمونڈ کے رسالے ساؤدرن لٹریری میسنجر کا ایڈیٹر تھا۔کینیڈی کی وجہ سے ایڈگر کو یہاں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی جو چند ہفتے سے زیادہ جاری نہ رہ سکی اور اسے نکال دیا گیا کیونکہ وہ اپنے باس کی شراب چرا کر پیتا ہوا پکڑا گیا تھا۔

دل برداشتہ ایڈگر بالٹی مور واپس چلا گیا اور وہاں اس نے اپنی کزن ورجینیا سے شادی کر لی۔اس وقت وہ چھبیس برس کا تھا اور ورجینیا صرف تیرہ برس کی تھی لیکن شادی کے سرٹیفکیٹ پر اس کی عمر اکیس برس لکھی تھی۔ امریکا میں شادی کی قانونی عمر لڑکیوں کی سولہ سال تھی۔قانون کی خلاف ورزی اور سزا سے بچنے کے لیے ایڈگر اور اس کی خالہ نے یہ جھوٹ بولا۔اس کے تین سال بعد ایڈگر نے رچمونڈ میں دوبارہ ورجینیا سے شادی کی اور اس بار یہ تقریب عوامی پیمانے پر ہوئی۔تب تک لوگ یہی جانتے تھے کہ ایڈگر اپنی بے سہارا خالہ اور کزن کو ساتھ رکھے ہوئے ہے۔شادی کرتے ہی اس کے حالات میں کسی قدر بہتری آئی تھی۔ معافی طلب کرنے کے بعد وائٹ نے اسے واپس رسالے میں بلا لیا اور اسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سری ادب لکھے کیونکہ اس میں اس کی صلاحیت تھی۔ایڈگر نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور یہاں آنے والے چار سالوں تک کام

کرتا رہا۔ یہ سب سے طویل عرصہ تھا جو اس نے کسی ایک جگہ کام کرتے ہوئے گزارا۔ ایڈگر کا دعویٰ تھا کہ اس کے آنے سے رسالے کی اشاعت سات سو سے بڑھ کر ساڑھے تین ہزار ہوگئی تھی۔

ان چار سالوں میں اس نے رسالے میں بے شمار نظمیں، کہانیوں پر تبصرے، تنقیدیں اور اپنی کہانیاں شائع کیں۔ رسالے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے اپنی اوّلین نثری کتاب ''دی نیریٹو آف آرتھر گورڈن پائن آف نان ٹکٹ'' شائع کرائی اور اسے وسیع پیمانے پر پڑھا اور پسند کیا گیا۔ اس زمانے میں کتابوں کے طویل نام رکھنے کا رواج تھا۔ مگر اس کتاب سے ایڈگر زیادہ مالی فائدہ حاصل نہیں کرسکا تھا۔ اس سے کئی گنا زیادہ اس پبلشر نے کمایا جس نے یہ کتاب شائع کی تھی مجبوراً ایڈگر کو واپس ملازمت کی طرف آنا پڑا اور اس بار اسے ایک فکشن میگزین ''بورٹن جنٹل مین میگزین'' میں نائب مدیر کی نوکری ملی۔ یہاں بھی اس نے بے شمار کہانیاں، تبصرے اور تنقیدیں لکھیں۔ اس کی کاٹ دار تنقید کی وجہ سے اسے مصنف سے زیادہ تنقید نگار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ حالانکہ اس نے بورٹن جنٹل مین میں اس معیار کی تنقید نہیں کی تھی۔ جو ساؤدرن لٹریری میسینجر میں اس کا خاصا رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ وہ لکھنے میں معروف رہا تھا۔ کیونکہ اگلے سال 1839 میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ ''ٹیلز آف گروٹسک اینڈ عربکس'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ شاید اس کتاب سے اسے کچھ رقم حاصل ہوئی تھی۔ مگر اسے پہلی کتاب جیسی پسندیدگی حاصل نہیں ہوئی اور اس پر خاصی تنقید بھی ہوئی تھی۔

ایڈگر کے دور میں سرّی ادب سے مراد مار دھاڑ ہوتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ اسے جاسوسی فکشن کی بجائے جاسوسی ایکشن کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کہانیوں میں ہیرو سراغ رسانی سے زیادہ مجرموں کی براہِ راست بیخ کنی کرتا تھا اور اس قسم کی کہانیاں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اگرچہ روایتی طور پر سرّی ادب کا بانی سر آرتھر کانن ڈائل کو کہا جاتا ہے جنہوں نے شرلاک ہومز جیسا شہرہ آفاق کردار تخلیق کیا۔ مگر صرف انہیں سرّی ادب کا بانی قرار دینا ایڈگر ایلن پو کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ اس نے بے شمار چھوٹی اور بڑی ایسی کہانیاں لکھیں جن میں سراغ رسانی کے سائنسی پہلوؤں کو مدِنظر رکھا گیا اور اس کی کہانیاں منطق اور حقیقت نگاری کے معیار پر پورا اترتی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ کوئی خاص کردار تخلیق کرنے میں ناکام رہا اور مزید یہ کہ وہ ناول بھی نہ لکھ سکا۔ شاید وہ زندہ رہتا تو یہ دونوں کام کر جاتا۔ ادب میں زندہ رہنے کے لیے ناول نگاری اور کردار نگاری لازمی بھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایڈگر ایلن پو نے جو لکھا وہ اسے یاد رکھنے کے لیے کافی ہے۔

ہر معروف ہوجانے والے مصنف کی طرح ایڈگر ایلن پو کے دماغ میں بھی ذاتی پبلشنگ کا سودا سمایا۔ یہ فطری خیال ہے۔ مصنف سوچتے ہیں کہ پبلشر ان کی وجہ سے کما رہے ہیں اگر وہ نہ لکھیں تو پبلشر خود سے کما نہیں سکتا اس لیے وہ پبلشر بھی بن سکتے ہیں۔ حالانکہ پبلشنگ ایک الگ میدان ہے اور ضروری نہیں ہے کہ کوئی کامیاب مصنف کامیاب پبلشر بھی بن جائے۔ اگرچہ ایسی مثالیں ہیں جب مصنفین نے اپنی کہانیاں اور کتابیں خود شائع کیں اور کمایا لیکن ایسی مثالوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جب مصنف نے پبلشر بننے کی کوشش کی اور اسے ناکامی ملی۔ بہت سے تو تحریر کے حوالے سے حاصل کی ہوئی دولت اور مقام بھی گنوا بیٹھے۔ ایڈگر نے اعلان کیا کہ وہ عنقریب ''اسٹائلس'' نامی رسالہ نکالنے والا ہے۔ جون 1840 میں فلاڈلفیا کے معروف اخبار سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ میں اس کا اشتہار بھی چھپا مگر اس میں رسالے کا نام تبدیل کرکے ''پان میگزین'' کردیا گیا۔ اشتہار کچھ یوں تھا ''ایک شاندار ماہنامہ جسے معروف مصنف اور شاعر ایڈگر اے پو کی زیرِ ادارت اور زیرِ سرپرستی شائع کیا جائے گا۔''

مگر ایڈگر کی موت تک یہ رسالہ نہ شائع ہوسکا... ایک طرف تو ایڈگر ایلن پو پبلشر بننے کی کوشش کررہا تھا دوسری طرف سرکاری حلقوں سے قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ صدر ٹیلر سے کوئی سرکاری عہدہ حاصل کرنے کی کوشش میں معروف تھا۔ اسے امید تھی کہ وگ پارٹی کا ممبر بن سکے گا۔ وگ پارٹی سے مراد صدر کے قریبی حلقے کے لوگ تھے جنہیں اس نے مشاورت اور معاونت کے لیے جمع کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ صدر ٹیلر کے بیٹے رابرٹ کی دوستی کو استعمال کررہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ وگ پارٹی کا حصہ نہ بن سکا تو کم سے کم فلاڈلفیا کسٹم ہاؤس میں کوئی نہ کوئی منصب حاصل کرلے گا۔ کسٹم ہاؤس کی اصطلاح ثقافتی مرکز کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ کسٹم ہاؤس کی صدارت پر متمکن فریڈرک تھامس سے اس کی اوّلین ملاقات نہ ہوسکی

حالانکہ اس ملاقات کے نتیجے میں اسے کوئی عہدہ ملنے کا پورا امکان تھا۔ اس نے بیماری کا بہانہ بنایا مگر تھامس کو یقین تھا کہ وہ نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ اس کے بعد بھی ہونے والے کئی اپائنٹمنٹ تکمیل تک نہ پہنچ سکے اور یوں سرکاری عہدہ حاصل کرنے کا خواب خواب ہی رہ گیا۔

ورجینیا سے شادی بہت کامیاب رہی تھی حالانکہ ایڈگر بہت غیر ذمے وار شخص تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اکثر راتوں کو دیر سے آتا تھا۔ ورجینیا اس کی حرکتوں پر صبر کرتی تھی کیونکہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ خود ایڈگر بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ 1842 میں اسے گلے اور سینے میں تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد تشخیص کیا کہ پیانو پر بیٹھنے اور گانے سے اسے یہ تکلیف ہوئی تھی کیونکہ اس کے گلے کی ایک شریان متاثر ہوئی تھی۔ علاج ہوا اور ورجینیا کو افاقہ بھی ہوا تھا مگر اس کی صحت بہت گرگئی تھی۔ اس کی فکر کی وجہ سے ایڈگر نے حد سے زیادہ شراب پینا شروع کر دی۔ اس کی اپنی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ ایسے میں ورجینیا نے اسے مشورہ دیا۔

''تم کہیں اور چلے جاؤ اگر تم میرے سامنے رہے تو فکرمند ہو کر خود کو بھی بیمار کرلو گے۔''

ورجینیا کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔ ان دنوں وہ گراہم میگزین کی ادارت کررہا تھا۔ یہ بھی فلاڈلفیا سے شائع ہونے والا ایک ادبی رسالہ تھا مگر اس میں سیاست پر بھی لکھا جاتا تھا۔ ایڈگر کی طبیعت اس سے بیزار ہو چکی تھی اس لیے اس نے میگزین کی نوکری چھوڑی اور نیویارک جانے کی تیاری کررہا تھا کہ اسے سرکاری منصب کی پیشکش ہوئی اور اس نے قبول کرلی۔ مگر مسئلہ وہی تھا جب تک وہ یہاں رہتا ورجینیا کی وجہ سے حد سے زیادہ شراب نوشی کرتا رہتا۔ اس لیے بالآخر اس نے یہ نوکری بھی چھوڑ دی اور نیویارک روانہ ہوگیا۔ یہاں اس نے پہلے ایوننگ مرر میں کچھ عرصے کام کیا اور پھر وہ براڈوے جرنل میں ایڈیٹر بن گیا۔ اس نے پہلے اس میں مالی شراکت کی اور کچھ عرصے بعد باقی شراکت داروں کے دستبردار ہونے کے بعد وہ اس رسالے کا اکیلا مالک بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسالے کا مستقبل تاریک تھا اور اس پر قرض بڑھتا جارہا تھا۔ رسالے کا مالک بنتے ہی اس کے ہاتھ میں گویا ایک ہتھیار آگیا اور اس نے معاصر ادیبوں پر کھل کر تنقید شروع کر دی۔ خاص طور سے ہنری

وڈ سورتھ لانگ فیلو اس کا نشانہ بنا اس نے اس کی تصنیف ''پلیگریزم'' پر بے تحاشہ تنقید کی اور اسے ادب پر دھبا قرار دیا۔ مگر لانگ فیلو نے اسے کبھی جواب نہیں دیا۔

1845 میں اس کی شہرہ آفاق نظم ''دی ریوان'' شائع ہوئی۔ مگر یہ نظم براڈوے جرنل کی بجائے ایوننگ مرر میں شائع ہوئی اور اس کے بدلے اسے صرف نو ڈالرز ملے تھے۔ اسی نے ایڈگر ایلن پو کا نام سارے امریکا میں پھیلا دیا۔ بعد میں اسے نام بدل کر اور کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ''دی امریکن ریویو اے وگ جرنل'' میں شائع کیا۔ اس بار اسے ''کوارلیس'' کا نام دیا گیا تھا۔ براڈوے جرنل زیادہ عرصہ شائع نہ ہوسکا اور مالی مشکلات کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا تھا۔ دل برداشتہ ہو کر ایڈگر برونکس نیویارک کے ایک کاٹیج میں منتقل ہوگیا۔ اس وقت یہاں جنگل تھا اور یہ جگہ کنگسٹن برج کے پاس ہے۔ اس نے ورجینیا کو نیویارک بلا لیا تھا۔ اس جگہ سے قریب ہی سینٹ جانس میڈیکل کالج تھا جو اب فورڈہام یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اسی کالج کے اسپتال میں ورجینیا نے اپنی زندگی کے آخری سانس لیے۔

عورتوں کے معاملے میں ایڈگر بدقسمت رہا۔ اس کی اوّلین منگیتر سارہ اس سے چھن گئی پھر اس نے کئی معاشقے کیے اور سب ناکام رہے۔ پھر ورجینیا اس کی زندگی میں آئی مگر وہ بھی چند سال بعد اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایڈگر اس سے محبت کرتا تھا اور اس نے اپنی مشہور نظم ''ڈیتھ آف اے بیوٹی فل وومین'' میں ورجینیا کو مرکزی کردار بنایا تھا۔ وہ پھر بہت زیادہ پینے لگا اور بعض اوقات صرف شراب نوشی کا قرض ادا کرنے کے لیے وہ چند ڈالرز کے عوض کہانی دے دیتا تھا۔

ورجینیا کے بعد ایڈگر نے شاعرہ سارہ ہیلن وائٹ مین سے شادی کی کوشش کی اور ان کی منگنی بھی ہوگئی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ منگنی برقرار نہ رہ سکی۔ ایڈگر کو یقین تھا کہ اس منگنی کے خاتمے میں سارہ کی ماں کا ہاتھ تھا جو اپنی خوب صورت اور دولت مند بیٹی کی شادی مفلس اور بے پروا ایڈگر سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر اس نے رچمونڈ کا رخ کیا اور اپنی اوّلین محبت سارہ روسٹر سے پھر سے تعلقات کا آغاز کیا۔ سارہ کی شادی ختم ہوگئی تھی اور وہ دوبارہ ایرکسن کے پاس آگئی تھی۔ فی الحال وہ رچمونڈ میں ہی مقیم تھی۔ اس کا باپ ایرکسن روسٹر نیویارک منتقل ہوگیا تھا اور وہ مزید دولت مند ہوگیا تھا۔ ایڈگر واپس آیا اور اس نے

سارہ سے ملاقات شروع کی تو یہ خبر ایلکسن روئسٹر سے زیادہ دیر چھپی نہیں رہی اور وہ آکر سارہ کو اپنے ساتھ نیویارک لے گیا۔

ایڈگر کی ساری زندگی شمال مشرقی امریکا کی ان ریاستوں میں گزری جو بحر اوقیانوس کے ساتھ آباد ہیں۔ وہ بوسٹن میں پیدا ہوا، رچمونڈ میں پلا بڑھا اور اس کا ادبی کیریئر فلاڈلفیا، نیویارک اور بالٹی مور میں آگے بڑھا تھا بالٹی مور میں ایڈگر کے لیے کچھ خاص نہیں تھا، سوائے اخبار بالٹی مور پیٹریاٹک کے اور اس کے ایڈیٹر ہنری سے اس کے اچھے تعلقات بھی تھے۔ وہ گزشتہ دس سال سے اس اخبار کے لیے لکھ رہا تھا۔ وہ مارچ 1849 میں بالٹی مور منتقل ہوا اور اس نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا۔ مکان کیا یہ اس کا گھر بھی تھا اور دفتر بھی کیونکہ یہیں وہ کام کرتا تھا۔ اب وہ امریکی ادب کا ایک جانا پہچانا نام تھا اور یہاں اس کے بے شمار مداح تھے۔

ان میں ایک ایملی ہملٹن بھی تھی جو بالٹی مور کے ایک نامور سیاست دان اور صنعتکار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پہلے وہ اس سے ادب کے حوالے سے ملی لیکن جلد محبت نے انہیں ایک اور رشتے میں جوڑ دیا۔ مگر یہاں بھی وہی مسئلہ ہوا۔ چارلس ہملٹن کو ایڈگر ایک آنکھ نہیں بھایا اور اس نے اسے دھمکی دی کہ وہ اس کی بیٹی سے دور رہے ورنہ وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ اس کے باوجود وہ دونوں چھپ کر ملتے رہے۔ ان کی ملاقاتیں ایڈگر کے دفتر نما مکان میں ہوتی تھیں۔ ایملی چپکے سے آتی اور چپکے سے ہی چلی جاتی تھی۔ یہاں سے ایڈگر کی زندگی کا آخری پُر اسرار دور شروع ہوا جو بالآخر اس کی پُراسرار موت پر ختم ہوا۔ تاریخ کے صفحوں میں ایڈگر ایلن پو کے حوالے سے ان واقعات کا ذکر نہیں ملے گا۔ مگر بعض دوسرے واقعات اور حالات گواہی دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

بالٹی مور پیٹریاٹک کا تازہ شمارہ دفتر میں موجود پریس میں چھپ رہا تھا۔ اس میں ایڈگر کی تازہ ترین کہانی کی اولین قسط شائع ہوئی تھی۔ ایڈگر پریس میں داخل ہوا تو پریس کے انچارج آئیوان نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''مسٹر ایڈگر دیکھو اپنی کہانی۔''

ایڈگر نے اپنی کہانی دیکھی اور اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ وہ دندناتا ہوا ہنری کے کمرے میں پہنچا اور اخبار پھاڑ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''

''جو تم نے لکھی ہے۔''

''یہ بکواس میں نے نہیں لکھی۔''

ہنری نے گہری سانس لی اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ''دیکھو ایڈگر لوگ جرم پڑھنا چاہتے ہیں انہیں خون سے دل چسپی ہے۔ انہیں اس قسم کی الجھی کہانیاں......''

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم میری تحریر کو تبدیل کرو۔''

''کیونکہ میں اس اخبار کا مدیر ہوں۔'' ہنری کا لہجہ بھی بلند ہو گیا۔ ''میں اس کا مجاز ہوں۔''

''اب تم اس کے مجاز نہیں ہو گے۔'' ایڈگر نے انگلی اٹھا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر ہنری مطمئن تھا اسے معلوم تھا کہ کل ایڈگر اگلی قسط لے آئے گا جب اسے شراب کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔

☆☆☆

بالٹی مور کے ڈاؤن ٹاؤن کی ایک کئی منزلہ عمارت کے سامنے کئی افراد جمع تھے۔ اوپر سے کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے سڑک پر پولیس کی دین نمودار ہوئی اور رکتے ہی اس سے نصف درجن پولیس والے باہر آئے۔ ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔ ''اوپر چوتھے فلور پر فلیٹ نمبر چار میں کچھ ہو رہا ہے۔''

پولیس کپتان نے دو آدمی نیچے چھوڑے اور اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اوپر روانہ ہوا۔ مگر ابھی وہ راستے میں تھے کہ انہیں اوپر سے عورت کی ایسی چیخ سنائی دی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پولیس والے ایک لمحے کو رکے تھے پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ فلیٹ نمبر چار کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کپتان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ایک ساتھ لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی اور وہ لالٹینیں آگے کیے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں داخل ہونے کا ایک دروازہ اور صرف ایک کھڑکی تھی جس کا پٹ کھلا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک ادھیڑ عمر عورت کی لاش پڑی تھی اور اس کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ کپتان نے جھک کر چیک کیا وہ مر چکی تھی مگر اسے مرے زیادہ دیر نہیں گزری تھی یقیناً اس نے آخری چیخ ماری تھی جب قاتل نے اس کا گلا کاٹا تھا۔ مگر قاتل کہاں تھا؟ وہ اس کمرے میں کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور یہاں سے باہر جانے کا

کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ان کی توجہ آتش دان کی طرف گئی اس سے کچھ گرر ہا تھا وہ آگے آئے اور سب نے اپنے ہتھیار آتش دان کی طرف کر لیے تھے اس سے اوپر سے ریت یا راکھ گر رہی تھی مگر جب وہ نزدیک آئے تو اچانک ایک انسانی ہاتھ گر کر جھولنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد ڈی ٹیکٹو ریمنڈ گرین فیلڈ وہاں پہنچا اور اس نے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ دوسری لاش جو آتش دان سے ملی تھی ایک بارہ سال بچی کی تھی جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور اس کی لاش آتش دان میں ٹھونس دی گئی تھی۔ پڑوسیوں کے مطابق وہ دونوں ماں بیٹی تھیں اور گزشتہ کچھ عرصے سے ان کے ساتھ ایک لمبے کوٹ والا شخص آ کر رہ رہا تھا مگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ عورت ریمین انجلی جسم فروش تھی۔ گرین فیلڈ کی توجہ لاشوں سے زیادہ اس بات پر مرکوز تھی کہ قاتل کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے کھڑکی کا معائنہ کیا اور اسے چاقو سے کریدا تو اسے ایک خفیہ کھٹکا مل گیا جسے دباتے ہی بہ ظاہر یہ بالکل فکس کھڑکی کھل جاتی تھی۔ قاتل اسی سے فرار ہوا تھا۔ بہ ظاہر قتل کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ ریمین مفلس عورت تھی اس کے پاس سوائے ایک بیٹی کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر قاتل نے پہلے عورت کو موقع دیا کہ وہ چیخ چلا کر آس پاس والوں کو بتا دے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور عین اس وقت جب پولیس آئی تو قاتل اس کا گلا کاٹ کر اس کھڑکی سے فرار ہو گیا۔ وہ یہ کام پہلے بھی کر سکتا تھا۔ پولیس کو پیچھے آنے سے روکنے کے لیے اس نے کھڑکی میں خفیہ کھٹکا لگا دیا تھا جسے دبائے بغیر کھڑکی کا پٹ نہیں کھلتا تھا۔

☆☆☆

ایڈگر ایلن پو بالٹی مور تھیٹر کے ایک چھوٹے ہال میں اس وقت پچاس ساٹھ خواتین کے سامنے اپنی مشہور نظم دی ریوان سنا رہا تھا۔ اس کا پُراثر لہجہ اور الفاظ کی ادائیگی اور حسن بیان نے ان خواتین کو مسحور کر رکھا تھا۔ یہ سب عورتیں اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ سب پانچ پانچ ڈالرز فیس دے کر ایڈگر کا لیکچر سننے اور اپنی شاعری پر اس کی اصلاح لینے آئی تھیں۔ تیسری قطار میں ایملی موجود تھی مگر وہ اصلاح لینے نہیں آئی تھی وہ صرف ایڈگر سے ملنے اور اسے دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور بالٹی مور پولیس اندر داخل ہوئی سب سے آگے کپتان جوزف تھا اس نے ایڈگر سے کہا۔ ''مسٹر ایڈگر ایلن پو......؟''

''ہاں میں ہوں۔''

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

نصف گھنٹے بعد ایڈگر ڈی ٹیکٹو گرین فیلڈ کے دفتر میں اس کے سامنے تھا اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''کیا مجھے گرفتار کیا گیا ہے؟''

''بیٹھو مسٹر پو۔'' گرین فیلڈ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے تمہاری کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔''

''اوہ تو تم میرے مداح ہو۔''

''میں نے کہا میں نے تمہاری کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔'' گرین فیلڈ نے تصحیح کی۔

''لیکن عین لیکچر کے دوران پولیس کے دستے کی مدد سے مجھے یہاں بلوانے کا مطلب؟''

گرین فیلڈ نے سامنے رکھا بالٹی مور پوسٹ کا تازہ شمارہ اٹھایا اور بولا۔ ''ایک طوائف اپنی نوعمر بیٹی کے ساتھ قتل کر دی جاتی ہے۔ قاتل لڑکی کی لاش آتشدان میں چھپا کر کمرے کی کھڑکی سے فرار ہوتا ہے لیکن کھڑکی بہ ظاہر فکس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خفیہ کھٹکا تھا۔ قاتل طوائف کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ کیا تم کو کچھ یاد آیا مسٹر پو؟''

''مجھے کیا یاد آنا چاہیے؟'' ایڈگر نے خشک لہجے میں پوچھا۔ پھر وہ چونکا اور بولا۔ ''میرے خدا یہ تو میری ایک کہانی ہے، لیکن یہ تخیل تھا۔''

''مجھے شک ہے ایسا نہیں ہے۔'' گرین فیلڈ نے اخبار اس کے سامنے ڈال دیا۔ ''اب یہ حقیقت بن چکا ہے۔''

ایڈگر نے خبر دیکھی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''یہ گزشتہ رات کا واقعہ ہے؟''

''رات گیارہ بجے تم کہاں تھے؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ میں شام کے وقت بندرگاہ کی طرف گیا تھا۔ میں نے پی رکھی تھی اور جب میں جاگا تو اپنے گھر میں تھا مجھے نہیں یاد کہ میں کب اور کس طرح وہاں پہنچا۔''

اسی لمحے دروازہ کھلا اور کپتان جوزف اندر آیا۔ اس نے گرین فیلڈ سے کہا۔ ''سر مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ کہہ کر اجازت کا انتظار کیے بغیر آگے آیا اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور گرین فیلڈ نے سن کر جس طرح ایڈگر کی طرف دیکھا اسے لگا کہ اسی سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آنے والی ہے۔ اس نے کہا۔

''مسٹر ایڈگر ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری ایک اور کہانی حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔''

کچھ دیر بعد ایڈگر دوسروں کے ساتھ فولاد کے اس متروک کارخانے میں تھا۔ ہنری وہاں پہلے سے موجود تھا اور الٹیاں کر رہا تھا۔ گرین فیلڈ نے ایڈگر کو دروازے پر روک دیا اور خود اندر آیا تھا۔ اس نے رومال سے منہ صاف کرتے ہنری سے کہا۔ ''تم نے اطلاع دی ہے؟''

''ہاں میں بالٹی مور پیٹریاٹ کا مدیر ہنری ہوں۔''

''میں تمہیں جانتا ہوں۔ یہ کون ہے؟'' اس نے میز پر پڑے شخص کی لاش دیکھی۔ چھت سے لٹکے فولادی پنڈولیم کے سرے پر موجود بڑے سے تیز دھار آلے نے اسے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

''ہربرٹ ریگان۔'' ہنری نے تھوک نگل کر کہا۔ ''میں اسے جانتا ہوں یہ برسوں سے میرے اخبار کے لیے لکھ رہا ہے۔''

''کیا لکھتا ہے؟''

''کہانیاں، تبصرے، تنقید۔''

''اس کی دشمنی بھی ہوگی۔''

''ممکن ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کوئی دشمنی میں اس حد تک آگے جا سکتا ہے۔''

''ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''ان میں تعلقات نہایت خراب تھے۔'' ہنری نے کہا۔ ''دونوں ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنے کے روا دار نہیں تھے کیونکہ ایڈگر نے اس پر شدید تنقید کی تھی۔''

''تب تمہارا کیا خیال ہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔''

''ایڈگر بہت اچھا مصنف ہے اس کا تخیل بہت شاندار ہے۔ وہ تحریر میں کچھ بھی کر سکتا ہے وہ برانڈی کے گلاس میں پورا طوفان بیان کر سکتا ہے لیکن جہاں تک عملی قتل کا تعلق ہے تو وہ ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں مار سکتا۔''

گرین فیلڈ نے ایڈگر کو اندر بلا لیا۔ ہنری اسے دیکھ کر چونکا۔ گرین فیلڈ نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم اسے پہچانتے ہو؟''

ایڈگر نے سر ہلایا۔ ''ریگان۔''

''تمہاری ایک کہانی میں اسی طرح ایک مصنف......؟''

''مرڈر ان دی آئی۔'' ایڈگر نے آہستہ سے کہا۔

گرین فیلڈ ہنری کی طرف آیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہاں کچھ ہوا ہے؟''

''مجھے ایک رقعہ ملا تھا۔'' ہنری نے اپنی جیب سے رقعہ نکال کر دیا جس میں بڑی خوب صورت لکھائی میں تحریر تھا۔

''مسٹر ہنری تمہارا ایک کارکن اس وقت فولاد کے متروک کارخانے میں موجود ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ وہ اخبار کی سرخی بن چکا ہے۔''

''تحریر......؟'' گرین فیلڈ نے کہنا چاہا تو ہنری نے اس کی بات کاٹی۔

''ایڈگر سے ملتی ہے لیکن یہ اس کی تحریر نہیں ہے۔''

تازہ خون اور لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے مرے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں ہوا تھا۔ گرین فیلڈ دوبارہ ایڈگر کی طرف آیا۔ ''گزشتہ دو گھنٹے میں تمہاری مصروفیات کیا رہی ہیں؟''

''سوا گھنٹے سے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اس سے پہلے دو گھنٹے تک لیکچر روم میں رہا تھا۔'' ایڈگر نے جواب دیا۔ ''آفیسر کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

گرین فیلڈ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا... پھر بولا۔ ''نہیں میرا خیال ہے کوئی جنونی اور ماہر قاتل ان واقعات کے پیچھے ہے اور وہ تمہاری کہانیوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے۔''

ایڈگر واپس گھر آتے فکر مند تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ گرین فیلڈ کو اس پر شک نہیں تھا لیکن جلد یا بدیر یہ خبر پھیل جاتی۔ ہنری کو غالباً اسی لیے رقعہ لکھ کر اطلاع دی گئی تھی کہ خبر لازی آئے۔ اس کے بعد اس کی ساکھ تو خراب ہوتی مگر ساتھ ہی اس کے بے شمار مخالفین جنہیں اس نے تنقید کے نشتر سے مشتعل کیا تھا اس کے خلاف میدان میں آ جاتے۔ ایڈگر کو ان لوگوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ اسے اصل میں ایملی کی پروا تھی کہ وہ اس بارے میں کیا سوچے گی اور اس کا باپ اسے مزید ٹیس کرے گا۔ ایملی کا خیال آیا تو اس نے رخ بدلا اور ہملٹن ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا جو شہر کے پوش ترین علاقے میں عالی شان محل نما عمارت تھی۔ کچھ دیر بعد بگھی میں چارلس ہملٹن ایملی کو لے کر نکلا تو ایڈگر نے بگھی کا راستہ روک لیا اور پھر بے تکلفی سے بگھی میں سوار ہو گیا۔ ہملٹن کا چہرہ اسے دیکھتے ہی بگڑ گیا اور اس نے غرّا کر کہا۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟''

''میں مس ہملٹن سے کچھ کہنے آیا ہوں۔'' ایڈگر نے کہا۔

"بگھی سے اتر جاؤ۔" چارلس غرایا مگر ایڈگر نے اس کی پروا کیے بغیر ایملی سے کہا۔

"تم نے بہت شاندار نظم پڑھی مگر اس کا آخری مصرع اتنا اچھا نہیں تھا۔ میری شام ہو تمہارے ساتھ، اسے یوں کر لو کہ میری آج شام ہو تمہارے ساتھ۔"

چارلس نے پستول نکال لیا۔ "اگر اب تم یہاں سے دفع نہیں ہوئے تو میں تمہارا بھیجا نکال دوں گا۔"

ایڈگر نے بے پروائی سے کہا۔ "تمہیں اپنی خوب صورت بیٹی کے خوب صورت لباس کی فکر نہیں ہے میرے بھیجے اور خون سے وہ خراب ہو جائے گا۔"

"ڈیڈی۔" ایملی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں نے برا نہیں مانا۔" ایڈگر نے کہا اور ایملی کو پیار کر کے نیچے اتر گیا۔ وہ ایملی کو پیغام دینے آیا تھا اور جانے سے پہلے ایملی نے بگھی سے سر نکال کر اسے اشارہ کیا کہ وہ آج شام آئے گی۔ وہ خوب صورت نقوش اور سنہری بالوں والی حسین لڑکی تھی۔ اس کی عمر چوبیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ عمر میں ایڈگر سے سولہ سال چھوٹی تھی۔ وہ نہایت دولت مند طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور ایڈگر کو کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اسے اگلے وقت کا کھانا ملے گا یا نہیں۔ اس کے باوجود وہ اس سے محبت کر بیٹھی تھی۔ ایڈگر گھر آیا تو اس کا پالتو نیولا بے قراری سے اس کا منتظر تھا۔ وہ بھوکا تھا۔ ایڈگر نے اسے گوشت کے چند ٹکڑے دیے اور میز پر آ گیا۔ ایملی آئی تو وہ لکھ رہا تھا۔ وہ خود دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ ایڈگر گھر کا دروازہ کبھی لاک نہیں رکھتا تھا۔ وہ کہیں جاتا تب بھی اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ایملی نے اندر آ کر کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"آج تم نے مجھے حیران کر دیا۔"

"میں ایسا ہی آدمی ہوں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تم سے بہر صورت بات کرنی تھی۔"

ایملی اس کے پاس آ بیٹھی۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"تمہارے گھر کاسٹیوم پارٹی ہونے والی ہے؟"

"ہاں دو دن بعد ہے۔"

"میں ایک مشکل میں پڑ گیا ہوں۔" ایڈگر نے کہا اور پھر اسے سب بتا دیا۔ ایملی نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں اس بات پر یقین کر لوں گی کہ تم کوئی غلط کام کر سکتے ہو؟"

"نہیں مجھے ہمارے مستقبل کے حوالے سے فکر ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو مسٹر چارلس اس خبر کو استعمال نہیں کریں گے؟"

ایملی بھی فکر مند ہو گئی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اس سے زیادہ مجھے تمہاری فکر ہے؟"

"میری فکر؟" ایملی چونکی۔ "کیسی فکر؟"

"قاتل میری کہانیوں سے پلاٹ لے کر یہ سب کر رہا ہے اور میں نے حال ہی میں ایک دولت مند آدمی کی کہانی لکھی تھی جس کی بیٹی ایک غریب مصنف سے محبت کرنے لگتی ہے۔"

"سچ میں؟" ایملی نے کہا۔

"ہاں اور پھر ایک نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے اور اسے کسی جگہ قید کر دیتا ہے۔"

"پھر کیا ہوتا ہے؟"

"ابھی اس کی ایک قسط چھپی ہے اور اس میں لڑکی کو کاسٹیوم پارٹی میں اغوا کیا جاتا ہے۔"

"میرے خدا......"

"اب تمہیں پتا چلا کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔"

"لیکن یہ ممکن نہیں ہے ہمارے گھر کی سیکیورٹی بہت سخت ہے۔"

"نفسیاتی کاسٹیوم میں چھپ کر آتا ہے اور لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔"

"میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔"

"نہیں مجھے گرین فیلڈ سے بات کرنی ہو گی۔ وہ ذہین اور اچھا پولیس آفیسر ہے، وہ زیادہ بہتر طریقے سے اس معاملے کو دیکھ سکے گا۔" ایڈگر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس پارٹی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خیال اور بھی ہے؟"

"وہ کیا؟"

ایڈگر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "ایملی میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے شادی؟"

"ہاں اب میں ہر پل تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

ایملی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے۔

☆☆☆

گرین فیلڈ بالٹی مور پیٹریاٹک کے اس شمارے

سمیت چارلس ہملٹن کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھا اور اسے کہانی پڑھ کر سنا رہا تھا۔ چارلس کو کہانیوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے وہ بار بار اپنے خادم کو جھڑک رہا تھا جو اس کے لیے کاک ٹیل ٹھیک سے مکس نہیں کر رہا تھا۔ گرین فیلڈ تحمل سے اس مداخلت کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے مکمل پیرا سنا دیا جس میں نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے۔ چارلس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''یہ بکواس سنانے کا مقصد۔''

''مسٹر ہملٹن، سچ مچ کا ایک نفسیاتی قاتل مسٹر پو کی کہانیوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے وہ دو قتل بالکل اسی طرح کر چکا ہے جیسے مسٹر پو نے اپنی کہانیوں میں بیان کیے ہیں اور اس تازہ ترین کہانی میں نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی خوب صورت بیٹی کو اغوا کر کے کہیں قید کر دیتا ہے۔ لڑکی ایک غریب مصنف سے محبت کرتی ہے۔''

چارلس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے ایڈگر کا تذکرہ برداشت کر رہا تھا۔ اس نے حقارت سے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے وہ خود ہی قاتل ہے اور اب اپنی کہانیوں کے پلاٹ پر عمل کر رہا ہے۔''

''ایڈگر کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک قتل کے وقت لیکچر روم میں تھا اور دوسرے قتل کے وقت ہمارے ساتھ تھا۔ اس لیے وہ قاتل نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے مجھے یقین ہے قاتل کاسٹیوم پارٹی میں آئے گا جیسا کہ کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔''

''ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''امکان ہے اور پولیس کے پاس موقع ہے کہ قاتل کو پکڑ سکے۔''

چارلس آگے جھکا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''یہ میری پارٹی ہے اور میں پولیس کے کسی فرد کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔''

''لیکن سیکیورٹی......؟''

''اس کے لیے میرے پاس بہترین اسٹاف ہے جو پوری سیکیورٹی کر سکتا ہے کوئی غیر متعلقہ شخص میرے گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔''

''مگر وہ مستند مجرم ہے اور اس سے پولیس ہی بہتر نمٹ سکتی ہے۔'' گرین فیلڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''مسٹر ہملٹن سوچ لیں معاملہ آپ کی بیٹی کی حفاظت کا ہے۔''

''لیکن ایڈگر......''

''آپ بتائیں آپ پولیس کو کاسٹیوم پارٹی میں آنے کی اجازت دے رہے ہیں یا نہیں۔''

چارلس چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں ذمے دار تم ہو گے۔''

''مجھے منظور ہے مسٹر ہملٹن۔''

چارلس ہملٹن کی خواہش تھی کہ ایملی اس پارٹی میں اپنی زندگی کے ساتھی کو منتخب کر لے۔ اس نے بالٹی مور کے آس پاس سے تمام ہی اعلیٰ خاندانوں کو مدعو کیا تھا اور ان میں بڑی تعداد نوجوانوں کی تھی۔ اسے اُمید تھی کہ ایک بار ایملی نے کسی اور کو پسند کر لیا تو پھر وہ اس مفلوک الحال مصنف سے منہ پھیر لے گی۔ چارلس ہملٹن سخت مزاج اور غصہ ور شخص تھا۔ بہت سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور وہ ان کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اسے صرف ایڈگر ایلن پو کی پروا تھی کیونکہ وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں ایڈگر کا جادو ایملی کے سر اتنا نہ چڑھ جائے کہ وہ اس سے شادی پر تل جائے۔ اس لیے وہ جلد از جلد ایملی کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''کہانی کے مطابق مجرم ٹھیک بارہ بجے لڑکی کو اغوا کر کے لے جائے گا۔'' گرین فیلڈ نے ایڈگر سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے مجرم اس حد تک کہانی پر عمل کرے گا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر وہ نفسیاتی بھی ہے اس لیے ہو سکتا ہے وہ ایسا ہی کرے۔'' ایڈگر نے جواب دیا۔ وہ بگھی میں ہملٹن ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔

''میں نے تحریر کے ماہرین کو مجرم کی تحریر دکھائی ہے جو اس نے ہنری کو لکھی تھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مذکورہ شخص فرانسیسی نژاد ہے۔ وہ بعض حروف جس طرح لکھ رہا ہے ایسا صرف فرانسیسی ہی لکھتے ہیں۔ کیا تمہارے حلقے میں کوئی فرانسیسی ہے؟''

''نہیں، میرے جاننے والوں میں کوئی فرانسیسی نہیں ہے۔'' ایڈگر نے کہا۔ ''تم جانتے ہو فرانسیسی وہ یورپی قوم ہے جو سب سے کم ترک وطن کر کے امریکا آئی ہے۔ چھوٹی یورپی ممالک سے تعلق رکھنے والی افراد کی کمیونٹی بھی فرانسیسی کمیونٹی سے بڑی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی انگریزوں اور انگریزی سے نفرت ہے۔ وہ یہاں آئیں گے

تو لازمی کچھ نسلوں بعد وہ فرانسیسی کی بجائے انگریزی بولنا شروع کر دیں گے اور انگریزی بولنا انہیں کسی صورت گوارہ نہیں ہے۔"

گرین فیلڈ کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی کہ فرانسیسی کیوں ترک وطن کر کے امریکا نہیں آئے؟ اسے دل چسپی تھی کہ قاتل پکڑا جائے۔ سوا دس بجے وہ ہملٹن ہاؤس میں داخل ہوئے تھے کہ چارلس ہملٹن ایڈگر کو اس کے ساتھ دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور بولا۔ "یہ شخص یہاں کیوں آیا ہے؟"

"مسٹر ہملٹن، یہ اس معاملے کا اہم ترین کردار ہے۔" گرین فیلڈ نے کہا۔ "مسٹر پو کی یہاں موجودگی لازمی ہے۔"

چارلس اپنے ہونٹ کاٹنے لگا تھا پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن کل کے بعد مجھے یہ اپنے گھر میں نظر نہ آئے۔ اور ہاں یہ میری بیٹی سے بھی دور رہے گا۔"

چارلس مڑ کر چلا گیا۔ گرین فیلڈ کے آدمی پہلے ہی آ چکے تھے اور ان کا انچارج نوجوان سارجنٹ جان سینٹرل تھا۔ گرین فیلڈ ان کو ہدایات دینے لگا۔ ایک درجن پولیس والے پورے ہملٹن ہاؤس کی نگرانی کرتے اور گرین فیلڈ بذاتِ خود تقریب والے ہال میں موجود رہتا۔ جان سینٹرل داخلی دروازے پر تھا اور ہر آنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گرین فیلڈ کو بتایا کہ اب تک صرف نامور اور جانے پہچانے افراد آئے ہیں جن کی شناخت ہملٹن ہاؤس کے عملے نے کی ہے۔ ایک بھی اجنبی فرد اس وقت تقریب میں موجود نہیں ہے۔ ایڈگر ہال کے چاروں طرف بنی اوپری منزل کی راہداری میں آ گیا۔ یہاں سے وہ ہر طرف دیکھ سکتا تھا۔ اسے ایملی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شاید اندر تیار ہو رہی تھی۔ ساڑھے دس بجتے ہی پارٹی شروع ہوئی اور خواتین وحضرات نے مختلف قسم کے نقاب پہن لیے۔ بہت سے کاسٹیوم لباس میں بھی تھے۔ سازندے ساز بجانے لگے اور جوڑے وسط ہال میں آ گئے۔ رقص کا آغاز ہو گیا تھا۔

ایملی اندر اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھی اور اس کی خادمہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ ایملی کا ذہن منتشر تھا کیونکہ ایک طرف تو اسے ماں باپ نے بتا دیا تھا کہ اس پارٹی میں اسے لازمی اپنا جیون ساتھی چن لینا تھا ورنہ وہ خود اس کے لیے کوئی مناسب شوہر دیکھیں گے اور دوسرے نفسیاتی قاتل کا خوف تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایڈگر کے ساتھ رہے گی۔ جب رات بارہ بجے تک کا وقت خیریت سے گزر جائے گا تو وہ ایڈگر سے کہے گی کہ اسے پروپوز کرے اور وہ سب کے سامنے اس کا پروپوزل قبول کر لے گی۔ اس کے بعد اس کے ماں باپ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تیار ہو کر وہ باہر آئی اور اس نے چہرے پر ایک نقاب لگایا تھا جو چاندی سے بنا ہوا تھا اور تاج کی طرح اس کے سر تک جا رہا تھا۔ ہال کی سیڑھیوں پر اس کی بچپن کی سہیلی ماریا اس کی منتظر تھی اور وہ اس سے بات کرتی نیچے آئی تھی کہ ایک سیاہ انسانی چہرے کے خول میں چھپے شخص نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایملی نے دیکھے بغیر کہا۔

"سوری میں کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔"

مگر ہاتھ اس کی طرف دراز ہی رہا تو اس نے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ اس نے ہاتھ تھام لیا اور اس کی بانہوں میں آ گئی۔ وہ ایڈگر تھا۔ دونوں رقص کرتے ہوئے ہال کے وسط کی طرف جانے لگے۔ ایملی نے سرگوشی میں کہا۔ "تم آ گئے مجھے تمہارا انتظار تھا۔"

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے

میں شامل ایک شعر کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ فیض احمد فیض نے یہ غزل 29 جنوری 1954ء کو منٹگمری جیل (ساہیوال) میں لکھی تھی۔ بعد میں یہ غزل مہدی حسن صاحب نے فلم سرفروش کے لیے ریکارڈ کروائی اس غزل کو علاؤالدین مرحوم پر فلمایا گیا اسی فلم سے یہ غزل اتنی مشہور ہوئی کہ مہدی حسن صاحب کی پہچان بن گئی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے جو فیض کے چاہنے والوں میں سے تھے انہوں اسی غزل پر پوری ایک نئی غزل لکھی اور دو شعر بطور خاص مہدی حسن صاحب کو دیے جنہوں نے یہ شعر فیض صاحب کی: گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے: میں شامل کر لیے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہوا،

ہوا جو تیرِ نظر نیم کش تو کیا حاصل
مزا تو جب ہے کہ سینے کے آر پار چلے

باوجود اس کے کہ خود مہدی حسن صاحب نے کئی دفعہ وضاحت کی کہ یہ شعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا ہے فیض صاحب کا نہیں، کئی قابلِ احترام ادیب، دانشور، اس شعر کو فیض احمد فیض سے منسوب کرتے ہیں۔

(ذرہ حیدر آبادی کے مضمون سے اقتباس)

''میں تو کب سے آیا ہوا ہوں۔'' ایڈگر نے بھی سرگوشی میں کہا اس کی آواز کچھ بھاری ہو رہی تھی۔

''ڈیڈی اور مام چاہتے ہیں کہ میں اس تقریب میں کسی لڑکے کو پسند کرلوں۔''

''ہوں۔'' ایڈگر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک طرف موجو چارلس نے اسے دیکھ لیا اور وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔ دوسری طرف گرین فیلڈ بھی صورتِ حال بھانپ کران کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک ہال کی ایک کھڑکی ٹوٹی اور اس سے ایک نقاب پوش شخص اندر آیا اور اسے دیکھتے ہی عورتیں چیختی ہوئی بھاگی تھیں۔ چاروں طرف سے پولیس والے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ نقاب پوش آگے بڑھا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ الٹ کر گرا اور چیخنے دھاڑنے لگا۔ فائر گرین فیلڈ نے کیا تھا وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور پستول کا رخ اس کے چہرے کی طرف کر کے کہا۔

''نقاب ہٹاؤ اپنے چہرے سے قاتل۔''

''میں قاتل نہیں ہوں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا اور چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ ایک ڈراما ہوگا جو مسٹر ایڈگر کی مرضی سے ہو رہا ہے۔''

''ایڈگر کہاں ہے؟'' چارلس دھاڑا۔ ''میں اسے گولی ماردوں گا۔''

مگر گرین فیلڈ دیکھ رہا تھا کہ وہاں نہ تو ایڈگر تھا اور نہ ہی ایملی نظر آرہی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''جان دیکھو ایڈگر اور ایملی کہاں ہیں۔''

جان اور دوسرے سپاہی ان دونوں کو تلاش کرنے لگے۔ زخمی نوجوان نے ایک رقعہ گرین فیلڈ کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''اس نے کہا تھا کہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو میں یہ رقعہ دکھا دوں۔''

گرین فیلڈ نے رقعہ لے کر کھولا تو اس میں چند سطریں لکھی تھیں۔ ''تم نے جو لکھا وہ میں نے پورا کردیا...... میرے دوست کہانی آگے بڑھنے کا انحصار تم پر ہے تم اپنے تخیل سے جو لکھو گے میں ویسا ہی کروں گا...... لیکن خیال رہے تمہاری سوچ میرے ارادے سے متصادم نہ ہو...... ایملی کے پاس وقت کم ہے اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے اسے تلاش کرلو۔''

اسی لمحے گھڑیال کے گجر نے بارہ بجائے اور گرین فیلڈ نے بے ساختہ گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ اوپر سے ایڈگر اترتا دکھائی دیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا کہ گڑبڑ ہے وہ چلّایا۔ ''کیا ہوا ایملی کہاں ہے؟''

گرین فیلڈ اس کے پاس آیا۔ ''وہ تمہارے ساتھ رقص کررہی تھی۔''

''میرے ساتھ رقص کررہی تھی؟'' ایڈگر نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو اوپر تھا۔''

''میرے خدا۔'' گرین فیلڈ بولا۔ ''وہ اسے لے گیا ہے۔ باہر جانے والے سارے راستے بند کردو۔''

پولیس والے اور چارلس کے گارڈز چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ ایڈگر ان کے ساتھ تھا اور انہوں نے کچھ دیر میں ہملٹن ہاؤس کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ ایملی غائب تھی۔ عمارت کے عقب میں واقع جنگل میں ایک جگہ گھوڑے کے قدموں کے نشان تھے جو باہر کی طرف جارہے تھے۔

☆☆☆

ایڈگر سکتے کی حالت میں پولیس آفس کے میٹنگ روم میں ایک طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی سی میز سے لگا ہوا تھا اور گرین فیلڈ اپنے آدمیوں سے بات کررہا تھا۔ ''سب سے پہلے ہمیں بالٹی مور کی ہر گلی چیک کرنا ہوگی۔ جس پر ذرا شبہ ہو اسے گرفتار کرلو۔''

''بیکار ہے۔'' ایڈگر نے زیرِ لب کہا۔ ''وہ کامیاب رہا ہے۔ اس نے کہانی کے مطابق ایملی کو کسی جگہ بند کردیا ہے جہاں سے وہ آزاد نہیں ہوسکتی۔''

گرین فیلڈ اس کی طرف آیا۔ ''سنو ایڈگر مجھے اسی وجہ سے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قاتل نے تمہیں چیلنج کیا ہے کہ اب تم کہانی جس طرح آگے بڑھاؤ گے وہ ویسا ہی کرے گا۔''

ایڈگر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میری کہانی اس کی سوچ سے متصادم نہ ہو۔ اس صورت میں نقصان ایملی کو ہوگا اور اس کے پاس وقت پہلے ہی کم ہے۔''

اچانک میٹنگ ہال کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور چارلس ہملٹن اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر آیا۔ گرین فیلڈ اس کی طرف بڑھا۔ چارلس نے گرج کر کہا۔ ''لیفٹیننٹ میری بیٹی کہاں ہے۔ وہ تمہارے سامنے غائب ہوئی اور تم نے اس کی ذمے داری لی تھی۔''

''آپ نے ٹھیک کہا لیکن آپ کے آدمیوں نے بھی کوتاہی کی ہے۔''

''میرے آدمیوں نے؟'' چارلس کا چہرہ سرخ ہوگیا

پھر اس کی نظر ایڈگر پر گئی اور وہ غرا کر اس کی طرف بڑھا۔ ''یہ ذلیل شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟''

اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا اس نے آگے بڑھ کر ایڈگر کو گھونسا مارا اور وہ بینچ سے نیچے گر گیا۔ وار بہت قوت والا تھا اور ایڈگر بے خبر تھا اس لیے چند لمحے کے لیے اس کے حواس گم ہو گئے۔ جب وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو چارلس کو دو پولیس والوں نے جکڑ رکھا تھا اور گرین فیلڈ اس پر گرج برس رہا تھا۔ چارلس بکتا جھکتا وہاں سے رخصت ہو گیا اور گرین فیلڈ نے اس سے معذرت کی لیکن ایڈگر نے ہاتھ اٹھایا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اور مسٹر چارلس کا غصہ بھی بجا ہے۔ وہ متاثر آدمی ہیں۔''

گرین فیلڈ نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا وہ سب وہاں سے چلے گئے۔ اس نے کہا۔ ''اب تم کیا کرو گے؟''

''مجھے سوچنا پڑے گا۔'' ایڈگر نے کہا۔ ''یہ چیلنج صرف میرے لیے نہیں ہے۔ اس وقت ایملی کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہے۔'' ایڈگر نے اپنی ٹوپی پہنی۔ ''مجھے سوچنا ہوگا کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟''

☆☆☆

ایملی کو ہوش آیا تو وہ کسی تنگ و تاریک جگہ تھی۔ بالکل کسی تابوت کی طرح تنگ اور تاریک۔ اس کا دل خوف اور بے چینی سے بھر گیا۔ اس نے بے تابی سے ہاتھ مارے اور چلانے لگی۔ ''کوئی ہے مجھے یہاں سے نکالو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

وہ بار بار اوپری تختے پر ہاتھ مارتی رہی اور چلاتی رہی۔ اسے جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ تابوت کے سائز کا لکڑی کا بکس تھا۔ اچانک بکس پر رکھا ہوا دوسرا تختہ سرکا اور اس کی اوپری درازوں سے روشنی جھلکنے لگی۔ پھر اس سے ایک آنکھ ظاہر ہوئی اور کسی نے سرگوشی میں کہا۔ ''اپنا منہ تم خود بند کر لو ورنہ مجھے بند کرنا ہوگا۔''

ایملی کی آواز رک گئی پھر اس نے بہ مشکل کہا۔ ''پلیز میں اب نہیں چیخوں گی۔''

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' آدمی نے کہا اور اچانک ہی بکس سرکا، وہ ترچھا ہوا نیچے گیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ ایملی اندر ہل کر رہ گئی تھی مگر اس بند بکس میں الٹنے پلٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ بکس سیدھا ہوا اور پھر اس پر دوسرا تختہ آن گرا اور ہتھوڑے سے کیل ٹھونکنے کی آواز آنے لگی۔ ایملی پھر ہاتھ مارنے لگی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ مگر آدمی رکا نہیں۔ کیلیں ٹھونکنے کے بعد اس نے اوپر سے بکس پر مٹی گرانی شروع کی تھی۔ سائیڈوں کے رخنوں سے مٹی اندر آ رہی تھی۔ چند منٹ میں وہ زمین میں دفن کر دی گئی تھی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس بند جگہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ دم گھٹ کر مر جائے گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ مگر اسے یقین تھا یہ وہی جنونی قاتل تھا جو ایڈگر کی کہانیوں کو عملی صورت دے رہا تھا۔ اب اس نے اسے زندہ دفن کر دیا تھا۔

ایملی اپنے خیال میں ایڈگر کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ جب کھڑکی توڑ کر نقاب پوش اندر آیا تو ایڈگر اسے کھینچ کر وہاں سے لے جانے لگا اور ایملی نے بھی اس خیال سے اس کا پورا ساتھ دیا کہ شاید نقاب پوش وہی قاتل تھا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے ہملٹن ہاؤس کے عقبی حصے میں آئے اور جب ایڈگر اسے لے کر جنگل میں داخل ہوا تو ایملی نے پوچھا۔ ''ایڈگر تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''کیونکہ میں ایڈگر نہیں ہوں۔'' اس نے کہا تو ایملی اچھل پڑی تھی اور پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر نقاب پوش نے اسے جکڑ لیا اور اس نے چلانے کی کوشش کی تو اس کے چہرے پر ایک رومال آ کر جم گیا۔ اس سے اٹھتی تیز بو ایملی کے دماغ پر چڑھنے لگی اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ایڈگر کاغذ قلم لے کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا ذہن اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی کہانیوں کو اتنی صفائی سے عملی صورت دینے والا شخص صرف نفسیاتی مریض نہیں تھا بلکہ وہ ایک الگ طرح کی ذہانت اور جسمانی صلاحیتوں کا حامل بھی تھا۔ ایڈگر سوچوں میں اس کا شخصی تجزیہ کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں ایسا شخص جو اپنے میدان میں نظر انداز کیا گیا ہو اور بہ ظاہر وہ معمولی سا دکھائی دیتا ہو۔ اس کی محروی نے اسے نفسیاتی بنایا اور جن لوگوں کو وہ اس کا ذمے دار سمجھتا تھا وہ ان کے خلاف مصروف عمل ہو گیا۔ اس کے شکار ہونے والے تینوں افراد غیر متعلق تھے۔ وہ صرف ایڈگر کی کہانیوں کو عملی شکل دینے کی وجہ سے اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ البتہ ایملی اس سے تعلق رکھتی تھی۔ ایڈگر نے خود سے پوچھا۔ ''اسے مجھ سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے۔''

ایڈگر کے خیال میں اس میں ایک ہی صلاحیت تھی جس سے کوئی دوسرا فرد حسد کر سکتا تھا۔ اس کے لکھنے کی

صلاحیت۔ گرین فیلڈ کے پولیس ماہرین نے اس کی دوسری تحریر پر بھی کام کیا تھا اور ان کے خیال میں مذکورہ شخص نہ صرف اعلیٰ تخیلاتی صلاحیت رکھتا تھا بلکہ ادب اور دوسرے علوم پر اس کی معلومات بھی بہت زیادہ تھیں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ایڈگر کو خیال آیا کہ وہ اب ایملی کی قید کا احوال بیان کرے گا۔ اس نے قلم اٹھایا انک میں ڈبویا اور لکھنے لگا۔ وہ کہانی کی تکمیل میں اتنا مگن ہو گیا کہ اسے دروازے پر ہونے والی دستک بھی سنائی نہیں دی اور جب اندر سے جواب نہیں ملا تو گرین فیلڈ اپنا پستول نکال کر اندر آ گیا۔ اس نے ایڈگر کو صحیح سلامت میز کے دوسری طرف پا کر اطمینان کا سانس لیا اور پستول واپس کوٹ میں رکھ لیا۔

''سوری مسٹر پو میں نے تم کو پریشان کیا لیکن میں نے سوچا کہ تم سے بات کروں۔''

''کیسی بات؟'' ایڈگر نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا تم نے کبھی کسی ملاح کی کہانی لکھی ہے؟''

''نہیں؟''

''کسی کہانی میں ملاح کا ذکر ہے؟''

ایڈگر اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اس نے بے بسی سے گرین فیلڈ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے یاد نہیں، شاید میں نے ایسا کیا ہو لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''قاتل نے جو رقعہ لکھا ہے وہ کاغذ عام طور سے ملاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ کسی قدر چکنا ہوتا ہے جو پانی سے جلدی متاثر نہیں ہوتا۔''

''اگر اس نے ایسا کاغذ استعمال کیا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملاح ہے؟''

''ثابت کچھ نہیں ہوتا ہم مفروضوں پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔'' گرین فیلڈ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''کیا تم نے اپنے تخیل کو استعمال کیا؟''

''میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔'' ایڈگر نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

☆☆☆

ایڈگر بالٹی مور پیٹریاٹک کے دفتر میں ہنری کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ہنری اس کی کہانی پڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر جوش کے تاثرات بڑھ رہے تھے آخر میں اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ ''یہ میں یہی چاہتا ہوں کہ تم قارئین کو جکڑ لینے والے انداز میں لکھو ان کو حقائق میں الجھاؤ بہ نسبت جاسوسی طریقوں کے۔'' ہنری نے کہتے ہوئے آئیوان کو آواز دی اور بولا۔ ''لیکن اس قسط کا عنوان......''

''کہانی کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔'' ایڈگر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''او کے۔'' ہنری نے ٹھنڈی سانس لی اور لمبا سا کاغذ آئیوان کو پکڑا دیا۔ ایڈگر کی عادت تھی کہ وہ ایک صفحے پر لکھتا تھا اور اسے رول کرتا جاتا۔ یعنی وہ اصل میں رول پر لکھتا تھا جہاں تک پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی وہاں کاغذ رول سے کاٹ کر اس کی نکی سی بنا لیتا تھا۔ یہ اس کا منفرد اور مخصوص انداز تھا۔ اس کے علاوہ شاذ ہی کسی مصنف نے اس طرح لکھا ہو۔ ایڈگر آئیوان کے ساتھ پریس والے حصے میں آیا کیونکہ یہاں اس کی پسندیدہ چیز کا اسٹاک تھا اس نے میز کے نیچے سے بوتل نکالی اور آئیوان سے کہا۔

''اسے سب سے اوپر والے حصے میں ذرا نمایاں کر کے لگانا۔''

''آپ بے فکر رہیں مسٹر پو، میں آپ کی تحریر ہمیشہ نمایاں کر کے لگاتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کا مداح ہوں۔''

ایڈگر نے اس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ آخر وہ نامعلوم قاتل اس سے کیا چاہتا تھا یہ تو طے تھا کہ وہ ایملی کو آزاد نہیں کرے گا کیونکہ اس طرح خود اس کی شخصیت کھل جائے گی پھر وہ اسے چیلنج بھی کر رہا تھا کہ وہ ایملی کو آزاد کرا لے۔ اگلے دن بالٹی مور پیٹریاٹک میں اس کی کہانی کی اگلی قسط نمایاں طور پر شائع ہوئی جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ ایملی نے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی اور پھر سے پکڑی گئی۔ اس دوران میں گرین فیلڈ کے آدمی شہر بھر میں ایسی ویران جگہوں کو کھوجتے پھر رہے تھے جہاں کسی کو خفیہ طور پر چھپایا جا سکتا تھا۔ سارا دن مصروف رہنے کے بعد گرین فیلڈ واپس گھر آیا تو خادمہ نے اسے ایک چھوٹا سا بکس دیا۔ گرین فیلڈ نے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے آیا؟''

''پتا نہیں سر، میں نے اسے دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر رکھے پایا۔ کوئی شام چھ بجے کے بعد رکھ گیا ہے۔''

گرین فیلڈ نے بکس ذرا سا کھول کر دیکھا اور فوری بند کرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایڈگر کے گھر میں اس کے سامنے تھا۔ اس نے بکس میز پر رکھا اور بولا۔ ''یہ میرے گھر آیا ہے۔''

ایڈگر نے کھول کر دیکھا اور چونک گیا۔ بکس میں ایک گوشت کا ٹکڑا رکھا تھا اور یہ کسی انسان کی زبان تھی۔ اس نے چٹی سے اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''یہ کم سے کم دو دن پرانی ہے۔''

''ایملی کو غائب ہوئے اتنا ہی وقت ہو گیا ہے۔'' گرین فیلڈ نے کہا۔ بکس کے نیچے ایک چھوٹا سا رقعہ تھا اس پر ایڈگر کی ایک نظم کے دو مصرے تحریر تھے۔

وہ جو تاریک سرنگوں میں رہتے ہیں
وہ جنہوں نے روشنی کبھی نہیں دیکھی

گرین فیلڈ ایڈگر سے ملا اور اس کے سامنے رقعہ رکھ دیا۔ ایڈگر نے رقعہ دیکھا اور گرین فیلڈ سے پوچھا۔ ''کیا شہر میں کہیں سرنگیں ہیں؟''

''بالکل نئے شہر کے نیچے سرنگیں ہیں جو کسی زمانے میں پرانے شہر کی گلیاں ہوتی تھیں پھر ان کو پکا کر کے اور ان پر چھت تعمیر کر کے انہیں بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔''

''ایملی وہیں کہیں ہے۔'' ایڈگر بولا۔ ''اپنے آدمیوں کو بلا لو اور کھدائی کے اوزار بھی منگوالو۔''

شام ہونے سے پہلے وہ ان سرنگوں میں پہنچ گئے تھے جو نصف مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور انہیں سرخ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ وہ سب ان سرنگوں میں پھیل گئے اور کسی ایسی جگہ کو تلاش کرنے لگے جہاں کسی کو چھپایا جا سکتا ہو۔ ساتھ ہی وہ چلا چلا کر ایملی کو آواز دے رہے تھے۔ ایڈگر الگ تھا وہ ایک کھدال کے ساتھ سرنگوں کی دیوار چیک کر رہا تھا۔ وہ کھدال کا دستہ مار کر دیکھ رہا تھا کہ دیوار ٹھوس ہے یا اس کے پیچھے کوئی خلا ہے؟ ایک جگہ اسے محسوس ہوا کہ دوسری طرف خلا ہے اور اس نے اس پر کھدال چلانی شروع کر دی۔ چند منٹ میں اس نے پہلی اینٹ نکال دی اور اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ چند اینٹیں نکال کر اس نے لالٹین کی روشنی میں اندر جھانکا تو اسے ایک بہت پرانا خستہ حال فرنیچر والا کمرا نظر آیا۔ ایملی یہاں نہیں تھی۔ اسی لمحے اسے کہیں دور کھدال چلنے کی آواز آئی۔ وہ لالٹین اٹھا کر اس طرف دوڑا اور جب وہاں پہنچا تو گرین فیلڈ ٹوٹی دیوار سے اینٹیں نکال رہا تھا۔ اس جگہ کی نشان دہی جان نے کی تھی کہ یہاں دیوار پر اینٹوں کا رنگ ہلکا تھا۔ جیسے ہی خلا ذرا بڑا ہوا انہوں نے لالٹین اٹھا کر اندر دیکھا اور انہیں سنہرے بالوں کی جھلک دکھائی۔ ایڈگر نے بے تابی سے کہا۔

''ایملی......''

''وہ نہیں ہے۔'' گرین فیلڈ نے کہا۔ ''اس کا لباس دیکھو، ایملی نے ایسا لباس نہیں پہنا تھا۔ قاتل یہیں ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔''

گرین فیلڈ تیزی سے آگے آیا۔ وہ سرنگوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایک سرنگ کے سرے پر اسے کسی کا سایا نظر آیا اور اس نے آواز دی۔ ''کون ہے۔''

اس پر سایا تیزی سے آگے بڑھا تو گرین فیلڈ بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ سائے نے لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا اور گرین فیلڈ کو یاد آیا کہ ریمین کے پڑوسیوں نے قاتل کا حلیہ جو بیان کیا تھا اس میں لمبا کوٹ نمایاں تھا۔ گرین فیلڈ نے سیٹی بجائی اور اس کے پیچھے لگا رہا۔ ایک جگہ وہ صاف دکھائی دیا اور گرین فیلڈ نے اس پر فائر کیا مگر وہ بچ گیا۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا اور جب گرین فیلڈ اس جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سیڑھیاں اوپر جا رہی ہیں اور کوٹ والا باہر نکل گیا تھا بس اس کی آخری جھلک دکھائی دی تھی۔ گرین فیلڈ بھی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور اس نے سر باہر نکالا تھا کہ سامنے سے ایک بگھی آتی دکھائی دی۔ سوراخ عین سڑک کے درمیان میں نکل رہا تھا۔ وہ بے ساختہ نیچے ہوا اور اس کے ہاتھ سے سیڑھی نکل گئی وہ تقریباً پندرہ فٹ کی بلندی سے نیچے آ گرا۔ چند لمحے بعد وہ کراہتا ہوا اٹھا تو اسے چوٹ خاص نہیں آئی تھی مگر قاتل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسی لمحے اس کے آدمی آ گئے اور انہوں نے بتایا کہ نکالی جانے والی لاش ایملی کی نہیں تھی بلکہ کسی اور لڑکی کی تھی۔

☆☆☆

بالٹی مور اسپتال کے مردہ خانے کی میز پر لڑکی کی لاش پڑی تھی اور گرین فیلڈ اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ لڑکی کے ہونٹ چوہوں نے کھا لیے تھے مگر اس کے دانت سلامت تھے۔ لڑکی کی موت گلے میں رسی کا پھندا پڑنے سے ہوئی تھی۔ گرین فیلڈ نے ایڈگر کی طرف دیکھا۔

''یہ بھی تمہاری کوئی کہانی ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''دی گرل مسنگ ان شیڈوز۔''

گرین فیلڈ نے گلے میں پھنسی رسی کاٹ کر الگ کی تو ایڈگر نے بے ساختہ کہا۔ ''کورناٹ...... میں نے کہانی میں اسی گرہ کا ذکر کیا ہے۔''

''کتیا کا بچہ۔'' گرین فیلڈ نے غصے سے کہا۔ ''وہ بہت مکار اور تیز آدمی ہے۔ قسمت بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ میرے سامنے سے نکل گیا۔''

ایڈگر نے اس کا منہ کھولا تو اندر سے زبان غائب تھی مگر اس کی جگہ ایک زنجیر والی گھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سونے کی چین بھی منسلک تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سات بج کر بیالیس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ ایڈگر چونکا۔

"یہ نشان وہی ہے؟"

"کس کی؟"

"شاید جگہ کی، یہ ارض البلد اور طول البلد کی چھوٹی اکائیاں ہیں۔ ہمیں اس علاقے کے تفصیلی نقشے کی ضرورت ہے۔"

"ایسا نقشہ کہاں ملے گا؟"

"میں جانتا ہوں کہاں ملے گا میرے ساتھ آؤ۔"

کچھ دیر بعد وہ ہملٹن ہاؤس میں تھے۔ چارلس ہملٹن سابق جہاز راں تھا اور وہ بحری جہازوں پر کپتان بھی رہا تھا۔ اس کے پاس بہترین اور تفصیلی نقشے تھے۔ حسب معمول اسے دیکھ کر چارلس کا چہرہ بگڑا تھا مگر جب اسے پتا چلا کہ وہ ایملی کے جائے قید کے بارے میں مدد کے لیے اس کے پاس آئے ہیں تو وہ فوراً تیار ہو گیا اور انہیں اپنی اسٹڈی میں لے آیا۔ ایڈگر اسے نقشوں کے بارے میں بتانے لگا اور چارلس حیران ہوا۔ "تم نقشوں کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

"میں مصنف ہوں میرا کام ہی جاننا ہے۔ ورنہ میں لکھوں گا کیسے؟"

"کون سا نقشہ چاہیے؟"

چارلس کے پاس دو بائی دو فٹ سائز میں عرض البلد اور طول البلد کے تفصیلی نقشے تھے۔ ایڈگر نے بالٹی مور کا نقشہ لیا اور اس پر سات بیالیس تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "یہ ہے۔"

"یہاں قبرستان ہے۔" گرین فیلڈ نے کہا۔

"ہمیں فوراً جانا ہوگا۔" چارلس نے بے چینی سے کہا۔

گرین فیلڈ اور جان کے ساتھ ایڈگر، چارلس اور اس کے آدمی بھی تھے۔ وہ قبرستان پہنچے تو موسم ابر آلود تھا اور جنگل کی طرف سے دھند نمودار ہو رہی تھی۔ قبرستان کا ایک حصہ بالٹی مور کے نامور مارٹل خاندان کے لیے مخصوص تھا اور انہوں نے یہاں ایک بہت بڑی عمارت بنوائی تھی ان کے مردے اسی عمارت میں رکھے یا دفن کیے جاتے تھے۔ یہی ایک جگہ ہو سکتی تھی جہاں کسی زندہ انسان کو چھپایا جا سکتا تھا۔ وہ اس عمارت کے چاروں طرف پھیل گئے۔ ایڈگر دروازوں کو دیکھ رہا تھا۔ جان ایک طرف عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اسے ایک دروازے کی طرف سے ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا اور وہ پستول سیدھا کیے اس کی طرف آیا کہ اسے اوپر سے آہٹ سنائی دی اور جب اس نے اوپر دیکھا تو ایک سایا سا اس کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ دھات کی چمک لہرائی اور جان کا گلا کٹ گیا۔ اس نے فائر کیا مگر گولی کہیں اور گئی تھی۔ وہ گلا تھام کر نیچے گر گیا اور تب اس نے قاتل کا چہرہ دیکھا تھا۔ قاتل نے آرام سے جھک کر اس کے ہاتھ سے پستول نکالا اور ایک طرف غائب ہو گیا۔ اسی لمحے فائر کی آواز سن کر گرین فیلڈ دوڑتا ہوا وہاں آیا اور جان کو دم توڑتے دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا مفلر اتار کر اس کے گلے پر رکھا اور بولا۔

"جان یہ کیا ہوا ہے؟"

جان نے لرزتے ہاتھوں سے اس سمت اشارہ کیا جس طرف قاتل گیا تھا اور اسی لمحے جنگل کی طرف سے چلائی جانے والی گولی آ کر گرین فیلڈ کے سینے میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کر گرا تھا۔ ایڈگر بھی دوڑتا ہوا وہاں آیا اس کے پیچھے چارلس اور اس کے آدمی تھے۔ گرین فیلڈ نے اپنا پستول ایڈگر کی طرف بڑھایا۔ "اس کے پیچھے جاؤ میرا گھوڑا لے جاؤ۔"

ایڈگر نے گرین فیلڈ کا گھوڑا پکڑا اور آگے بڑھا دیا۔ جنگل سے ٹاپوں کی آواز بتا رہی تھی کہ قاتل فرار ہو رہا ہے۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے ایڈگر گھوڑے کی ٹاپوں پر پیچھا کرنے لگا مگر چند فرلانگ آگے نکلنے کے بعد ٹاپوں کی آواز رک گئی۔ ایڈگر بھی رک گیا تھا۔ اچانک سامنے سے گولی آئی اور گھوڑے کی گردن میں اتر گئی۔ اس نے ہنہنا کر اگلے پاؤں اٹھائے تو ایڈگر الٹ کر پیچھے گرا اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ ایڈگر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور اس نے پستول نکال لیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ قاتل کہاں ہو سکتا ہے۔ اچانک سامنے سے پھر فائر ہوا اور اس بار ایڈگر نے سمت دیکھ لی اس نے لگاتار دو فائر کیے اور چلا کر بولا۔

"بزدل سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا اور پھر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگیں۔ قاتل فرار ہو رہا تھا۔ ایڈگر نے اس سمت میں پستول کی باقی ساری گولیاں چلا دیں مگر وہ قاتل کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ جب وہ واپس پہنچا تو قبرستان پولیس

والوں سے بھرا ہوا تھا۔ جان کی لاش اور زخمی گرین فیلڈ کو لے جایا گیا تھا۔ چارلس وہاں موجود تھا اور پہلی بار ایڈگر کو اس میں نرمی نظر آئی۔ وہ تھکا اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایڈگر سے اپنے رویے پر معذرت کی تھی۔

ایڈگر گرین فیلڈ کے گھر پہنچا جہاں ڈاکٹر نے اس کا آپریشن کر کے گولی نکال دی تھی اور اس کی حالت بہتر تھی۔ مگر جان کے مارے جانے کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس نے ایڈگر سے کہا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“

”ابھی تو وہ بہت چالاک اور ہر موقع پر ہم سے تیز ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ہمیں کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہمارے سامنے سے نکل جاتا ہے۔“

”اتفاقات اسے بچا رہے ہیں۔“

”نہیں یہ اس کے اندر کی شیطانی قوت ہے۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”وہ شیطان کا پرتو ہے۔ وہ عام مجرم نہیں ہے۔“

”وہ ایک انسان ہے۔“ گرین فیلڈ نے نرمی سے کہا۔

”نہیں وہ شیطان ہے۔“ ایڈگر نے یقین سے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اسے اس کہانی کا اگلا حصہ لکھنا تھا۔ اس نے ساری رات جاگ کر اس کا اگلا حصہ لکھا اور اسے لے کر ہنری کے پاس گیا۔ اس میں اس نے بیان کیا کہ قاتل نے غلطی کی اور ایملی اس کی قید سے نکل گئی۔ اس کے بعد قاتل نے زہر پی کر خودکشی کر لی کیونکہ اس کا راز فاش ہونے والا تھا اور اسے قانون کے ساتھ ذلت کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ ہنری نے یہ قسط دیکھی اور اسے میز پر پھینک دیا۔

”بکواس یہ نہیں چلے گی۔“

”کیوں؟“ ایڈگر نے بے قابو ہو کر کہا۔

”کیونکہ اب میں جان گیا ہوں تم میرے اخبار کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہو۔“

”میں یہ کام رقم کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں اسے شائع کرنا ہوگا۔“ ایڈگر نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ آئیوان درمیان میں آیا اور اس نے بہ مشکل ہنری کو ایڈگر سے چھڑایا۔ ہنری ہانپنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا۔

”تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔“

”اور میں تمہیں جہنم بھیج دوں گا اگر تم نے میری کہانی شائع نہ کی۔“

ہنری نے کہانی کا رول اس کے منہ پر دے مارا۔ ”اسے لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اگر آئیوان نہ پکڑتا تو ایڈگر پھر ہنری کا گلا دبوچ لیتا۔ وہ اسے کھینچ کر باہر لے گیا اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے شراب کا گلاس پیش کیا۔ یہ ایسی چیز تھی جس سے ایڈگر کسی صورت انکار نہیں کر سکتا تھا اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کیا اور آئیوان سے کہا۔ ”تم دیکھ لینا اگر میں لکھنا بند کر دوں تو یہ چیتھڑا کوئی ردی کے بھاؤ بھی نہ لے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر پو۔“ آئیوان نے ادب سے کہا۔ ”آپ اور مسٹر ہنری دونوں غصے میں ہیں آپ کل آئیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہنری کے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ہنری نے جھانک کر کہا۔ ”اسے کہو اب یہاں آنے کی زحمت نہ کرے۔ یہ اخبار اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ جلد اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔“

اس نے کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔ ایڈگر وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ سارا دن بالٹی مور کی سڑکیں ناپتا رہا اور جب شام کے وقت گھر پہنچا تو اس کا گھر شعلے اگل رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ۔ ہینڈ پمپ اور بالٹیوں میں پانی کی مدد سے آگ بجھا رہا تھا مگر شعلوں سے لگ رہا تھا اس کا سارا اثاثہ راکھ ہو گیا تھا۔ اس میں اس کے ہاتھ سے لکھے مسودے بھی شامل تھے۔ فائر فائٹر چیف نے اسے بتایا کہ کسی نے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر آگ لگائی۔ امکان تھا کہ شراب کی بوتل کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اسے آگ دکھا کر اندر پھینکا گیا تھا اسی لیے آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ جب تک فائر بریگیڈ والے آتے اندر سب راکھ ہو چکا تھا اب وہ صرف آگ بجھا رہے تھے۔ بچنے والی واحد چیز ایڈگر کا نیولا تھا جو پنجرے میں بند تھا۔ وہ ایڈگر کے حوالے کر دیا گیا۔ آج اس کے لیے صدموں کا دن تھا۔ ایملی کی زندگی کی امید ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہنری نے اس کی کہانی شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اب اس کی ساری کہانیاں اور کتابیں جل گئی تھیں۔ اگرچہ یہ کہانیاں رسالوں، اخبارات اور کتابوں کی صورت میں موجود تھیں مگر اس کے ہاتھ کی تحریر میں اب باقی نہیں رہی تھیں۔ وہ نیولے کا پنجرہ لیے شکستہ قدموں سے وہاں سے رخصت ہوا۔ بہت دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو گرین فیلڈ کے گھر کے سامنے پایا۔ دستک کے جواب میں

اس کی ملازمہ نے دروازہ کھولا اور بولی۔

''مسٹر گرین فیلڈ سو رہے ہیں؟''

''میں اسے ڈسٹرب نہیں کروں گا۔'' ایڈگر نے آہستہ سے کہا۔ ''میں صرف یہ رکھوانے آیا ہوں۔'' اس نے پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرا پالتو نیولا ہے۔''

''ضرور مسٹر پو۔'' خادمہ نے پنجرہ لے لیا۔ ایڈگر جانے لگا تھا کہ خادمہ نے کہا۔ ''ایک منٹ مسٹر پو آپ کے لیے ایک لفافہ آیا ہے۔''

اس نے لفافہ لا کر دیا اور ایڈگر نے کھولا تو اس میں ہنری کی تحریر میں لکھا تھا۔ ''تم ہار گئے ایڈگر...... ہنری۔''

ایڈگر نے کاغذ توڑ مروڑ کر نیچے پھینک دیا۔ وہ مڑا اور روانہ ہو گئے۔ جب وہ بالٹی مور پیٹریاٹک کی عمارت میں داخل ہوا تو رات کا آخری پہر تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد صبح ہو جاتی۔ ایڈگر اندر آیا اور ہنری کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایڈگر نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا اور بولا۔ ''ایملی کہاں ہے؟''

ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے جسم میں حرکت بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایڈگر غصے سے بے قابو ہو کر آگے آیا تھا۔ ''ذلیل شخص جواب دو ایملی کہاں ہے؟''

پھر ایڈگر رک گیا۔ کیونکہ ہنری کے دونوں ہاتھ میز پر کیلوں سے ٹھوکے ہوئے تھے اور اس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ ایڈگر چوکنا ہو گیا۔ قاتل نے ایک بار پھر اسے چکما دیا تھا۔ وہ ہنری کو قاتل سمجھ کر آیا تھا اور وہ خود قاتل کا شکار نکلا تھا۔ اچانک ایڈگر کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ وہ جان گیا کہ قاتل کون تھا۔ وہ پریس والے حصے میں آیا جہاں آئیوان موجود تھا۔ ایڈگر نے عقب سے اس پر پستول تان لیا۔ ''آئیوان؟''

آئیوان نے دونوں ہاتھ اوپر کیے اور پھر اس کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل گئے تھے اور وہ نہایت شاطرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ''حیران ہوئے...... ہے نا مسٹر پو؟''

''ایملی کہاں ہے؟''

''وہ مرنے والی ہے۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''میری توقع سے زیادہ تیزی سے۔ بہرحال تم جان گئے ہو کہ میں تمہارا اب سے بڑا فین ہوں۔''

''فین......؟''

''ڈرنک۔'' آئیوان نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا اور میز کے دوسری طرف آیا اور اس نے نیچے سے بوتل اور دو گلاس نکال کر میز پر رکھے پھر بوتل کھول کر دونوں گلاسوں میں شراب ڈالی۔ ''کوئی ماسک نہیں ہے اور کوئی پردہ نہیں ہے۔ دو فن کار آمنے سامنے بات کریں گے۔''

''دو فن کار؟''

''ہاں کیونکہ اس کہانی کا آخری باب مجھے لکھنا ہے۔'' اس نے ایک گلاس ایڈگر کی طرف سرکا دیا۔ ایڈگر کو لگا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اسے شراب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

''تم دیوانے ہو۔''

''سچ سچ مسٹر پو؟ تم ایک دیوانے سے بات کرنا چاہتے تھے۔''

''ایملی کہاں ہے؟''

''ایملی کہاں ہے؟'' آئیوان نے اس کی بات دہرائی۔ ''کوئی تیکھا جملہ نہیں...... کوئی مصرع نہیں...... ایسا مصنف جو تاریکیوں کا مزاج شناس ہے جو پیروں تلے موجود اسرار جانتا ہے...... اس سے اس سادہ جملے کی توقع نہیں تھی۔''

ایڈگر نے اچانک پستول اس کے کان کے پاس کرتے ہوئے فائر کیا اور چلا کر بولا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

دھماکے نے آئیوان کا کان سن کر دیا تھا اور وہ اسے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا۔ ''تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے مسٹر پو، حقیقت فکشن سے کہیں زیادہ تلخ ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے تم ایملی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو پستول مجھے دے دو۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔

ایڈگر کا پستول والا ہاتھ کانپنے لگا تھا اسے لگا جیسے اس کے اندر کچھ کٹ رہا ہو۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ آئیوان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''مسٹر پو تم تاخیر کر رہے ہو تم جانتے ہو آگے کیا ہو گا؟...... تم ٹریگر دباؤ گے۔ مجھے اور ایملی کو قتل کر دو گے یا پھر تم مجھے پستول دے رہے ہو؟''

''وہ زندہ رہے گی؟''

''یہی ایک حل ہے۔''

ایڈگر نے سوچا اور پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور اندر اذیت بڑھ رہی تھی۔ آئیوان نے پستول لے کر پیچھے رکھا اور ایک چھوٹی شیشی نکالتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر پو تمہارے تاثرات سے لگ رہا ہے تم کسی ننھے بچے کی طرح رونا چاہتے ہو۔'' اس نے چھوٹی شیشی ایڈگر کو دکھائی۔ ''یہ تریاق ہے۔ تم جانتے ہو تریاق

میرے باپ کی ایجاد ہے۔ ہر زہر کا توڑ ہے۔"
"زہر۔" ایڈگر نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔
"ہاں میرے باپ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ جب کہیں کچھ کھانے پینے جاؤ تو اسے ہمیشہ ساتھ رکھا کرو۔ ممکن ہے کہیں تمہیں زہر دے دیا جائے۔" اس نے کہتے ہوئے چھوٹی شیشی ایڈگر کے گلاس میں انڈیل دی۔ "میں یہ تریاق اپنے وقت کے عظیم ترین مصنف کو پیش کر رہا ہوں۔ جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔"
"میرے ساتھ کام؟"
"ہاں میں نے تمہارے بعض آئیڈیاز کو عملی صورت دی ہے مسٹر پو۔"
"نہیں مسٹر آئیوان، تم نے صرف ایک نفسیاتی قاتل کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ کوئی تخلیق نہیں ہے۔ کسی کو قتل کر دینا کوئی تخلیق نہیں ہے۔"
آئیوان کا چہرہ سخت ہو گیا۔ "میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں تمہارے ماسٹر پیس کا ایک حصہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اسے کون مکمل کرے گا میں یا تم...... لیکن یہ ہو گا ماسٹر پیس ہی۔" اس نے تریاق کا گلاس ایڈگر کی طرف سرکایا۔ "ممکن ہے یہ تریاق ہو یا ممکن ہے یہ مہلک زہر ہو جو ایک لمحے میں تمہارا کام تمام کر دے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ تم ایک خطرناک زہر پی چکے ہو۔"
یہ بات ایڈگر بھی محسوس کر رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس کا جگر اندر سے کٹ رہا ہو۔ اس نے سوچا اور گلاس اٹھا کر حلق میں انڈیل لیا۔ اسے لگا جیسے اس کے حلق سے آگ کی ایک لکیر اندر تک چلی گئی ہو۔ آئیوان نے اس کا لکھا ہوا صفحہ اٹھایا اور اس کا آخری حصہ پڑھا۔
"ایملی بے سدھ اور بے حرکت تھی۔ میں نے اسے سینے سے لگایا۔ اس سے التجا کی، وہ آنکھیں کھولے اور مجھے دیکھے۔" آئیوان نے کاغذ واپس رکھ دیا۔ "خوب صورت لائنیں ہیں۔"
"وہ کہاں ہے؟"
"میں بتا چکا ہوں مسٹر پو۔" آئیوان نے اپنا کوٹ پہنا۔ "ممکن ہے تم زندہ رہو اور ممکن ہے نہ رہو لیکن یہ بات یقینی ہے میں یہاں نہیں ہوں۔"
"مسٹر رینالڈ بھی آگئی ہے۔" باہر سے کسی نے پکار کر کہا۔
"میں آ رہا ہوں۔" آئیوان نے کہا اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ایڈگر کا سر چکرا رہا تھا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر آئیوان کا راستہ روک سکتا۔ اسے ایملی کی فکر تھی کہ وہ کہاں تھی۔ ایڈگر نے اپنا سر تھام لیا۔ اچانک اسے آئیوان کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور نیچے گر گیا۔ اس نے اٹھنے کی بجائے فرش ٹٹولنا شروع کیا اور پھر میز کے نیچے لگے اوزاروں والے تختے سے ایک ہتھوڑی اٹھا کر فرش بجانے لگا۔ ایک جگہ اسے کھوکھلی آواز آئی تو وہ اس پر ہتھوڑی چلانے لگا۔ یہ جگہ میز کے نیچے تھی۔ اس نے بھاری میز سرکانا چاہی مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے دیوار سے پشت لگا کر دونوں پاؤں میز کے سرے پر جمائے اور زور لگا کر اسے الٹ دیا۔ پھر اس نے ہتھوڑی سے اوپری پلائی توڑ دی اور پھر نیچے موجود تختے کی بلیاں توڑیں۔ یہاں فرش میں ایک تختہ الگ سے تھا اس نے اسے اٹھایا تو سیڑھیاں ظاہر ہوئیں۔
اس نے لالٹین اٹھائی اور نیچے اتر گیا۔ عمارت کے نیچے پرانے کمرے تھے جو اب چھپ گئے تھے وہاں مٹی اور جالے تھے وہ ایک سرنگ سے گزر کر ایک کمرے تک آیا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ ہو بہو اس کے گھر کا سیٹ تھا۔ بالکل ویسی ہی میز، کرسی، بینگیٹھی، شیلف جن میں کتابیں اور اس کے ہاتھ کے لکھے مسودے ترتیب سے رول کی صورت میں رکھے تھے۔ یہ سب وہی چیزیں تھیں جو اس کے جل جانے والے گھر میں تھیں۔ ایڈگر کو لگا کہ اس کی عقل خبط ہو جائے گی۔ آئیوان کس قسم کا آدمی تھا۔ پھر اسے ایملی کا خیال آیا اور وہ اسے تلاش کرنے لگا۔ اس کی نظر ایک طرف موجود کچے فرش پر گئی اور اس نے بے تابی سے اس کی مٹی ہٹائی۔ نیچے ایک تختہ ظاہر ہوا۔ اس نے ہتھوڑی سے اس کی بلیاں توڑ دیں اور اسے کھولا تو اندر ایملی ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بے تابی سے اسے بکس سے نکالا اور گود میں لے کر اس کا چہرہ تھپکنے لگا۔
"ایملی آنکھیں کھولو، پلیز آنکھیں کھولو۔"
وہ اسے مسلسل پکارتا رہا اور بالآخر ایملی کی پلکوں میں جنبش ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "ایڈگر یہ خواب ہے یا تم میرے سامنے ہو؟"
"یہ سچ ہے میں تمہارے پاس ہوں۔" ایڈگر نے اسے سینے سے لگا لیا پھر وہ اسے اٹھائے اوپر کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

گرین فیلڈ کی آنکھ کھلی تو اسے ایڈگر اور ایملی کا خیال

آیا وہ بے ہوش گیا اور اس نے خادمہ کو آواز دی۔ وہ فوراً آگئی۔ ”یس ماسٹر؟“

”کیا مسٹر پو یہاں آئے تھے؟“

”یس ماسٹر وہ اپنا ناول رکھوا کر گئے ہیں اور ان کے لیے ایک خط آیا تھا جو میں نے ان کو دے دیا۔“

”خط کیسا خط؟“

”وہ اسے یہیں پھینک کر کہیں چلے۔“ خادمہ نے لباس سے رقعہ نکال کر گرین فیلڈ کی طرف بڑھایا۔ گرین فیلڈ نے اسے لے کر پڑھا اور بستر سے اتر آیا۔ خادمہ نے پریشان ہو کر اسے روکنا چاہا مگر وہ کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ اس کی بگھی کا رخ بالٹی مور پیٹریاٹک کے دفتر کی طرف تھا اور جب وہاں پہنچا تو صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ ایمبولینس کے ساتھ طبی عملہ وہاں آچکا تھا اور چارلس ہملٹن اسٹریچر پر بیٹی ایملی کے ساتھ باہر آرہا تھا۔ گرین فیلڈ نے چارلس سے پوچھا۔

”مسٹر پو کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں۔“ چارلس نے جواب دیا۔ اسے ایملی کو ایمبولینس تک پہنچانے کی جلدی تھی تاکہ اسے اسپتال لے جایا جا سکے۔ تین دن تک مسلسل بھوکے پیاسے رہنے سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اسے خوراک اور پانی کے ساتھ باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ گرین فیلڈ دیوانوں کی طرح ایڈگر کو تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ پولیس آچکی تھی اور ہنری کی لاش کا معائنہ ہو رہا تھا۔ اپنی اشاعت کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب بالٹی پیٹریاٹک شائع نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

تین دن بعد گرین فیلڈ اسپتال میں ڈاکٹر کالبرٹ کے سامنے تھا۔ وہ گرین فیلڈ سے کہہ رہا تھا۔ ”موت کی ممکنہ وجہ، برین ہیمرج، دل کی شریانوں کا کام چھوڑ دینا اور جگر کی خرابی ہو سکتی ہے۔“

”اسے ہوش نہیں آیا؟“

”تین دن سے وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا اور اس دوران میں اس نے کئی بار ایک ہی جملہ کہا کہ اس کا آخری نام رینالڈ تھا۔“

”رینالڈ۔“ گرین فیلڈ نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر کہ وہ ہذیانی کیفیت میں تھا۔“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہذیانی کیفیت میں آدمی لایعنی اور مختلف باتیں کرتا ہے وہ ایک ہی بات بار بار نہیں کرتا۔“

گرین فیلڈ نے ایڈگر ایلن پو کی لاش کی طرف دیکھا جس کا آج صبح ہی انتقال ہوا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے چہرے پر سکون تھا۔ گرین فیلڈ غیر جذباتی آدمی تھا اور بے شمار لاشیں دیکھ چکا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات تھے۔ پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”تمہارے تعاون کا شکریہ ڈاکٹر۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد گرین فیلڈ نے ایڈگر ایلن پو کی لاش کے پاس آکر آہستہ سے کہا۔ ”دوست میں نے تم سے وعدہ کیا تھا میں اسے ضرور پورا کروں گا۔“

ایڈگر ایلن پو کی تدفین بالٹی مور کے قبرستان میں کی گئی۔ جس میں اس کی بہن کے ساتھ ہملٹن خاندان اور اس کے کچھ دوست و واقف کار شریک تھے۔ بعد میں اس کی قبر پر چوکور کتبہ لگایا گیا جس کے وسط میں اس کی شبیہ بھی ہے۔ اس پر تحریر ہے۔ ”یہاں مصنف اور شاعر ایڈگر ایلن پو محو خواب ہے۔ اس کی زندگی کی طرح اس کی موت بھی پر اسرار تھی۔“

☆☆☆

تین مہینے بعد پیرس کے مرکزی ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے آئیوان اترا۔ اس کا اصل نام آرتھر رینالڈ تھا۔ ایک پورٹر نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ باہر موجود اپنے لیے منتظر بگھی تک آیا۔ مگر جیسے ہی وہ اندر گھسا اس نے دیکھا ایک پستول کی نال اس کی طرف مرکوز ہے اور اس کے پیچھے گرین فیلڈ موجود تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ہیلو مسٹر رینالڈ۔“

آرتھر رینالڈ نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی اور ایک فائر کی آواز نے آس پاس دانہ چگتے کبوتروں کو اڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کہانی کا آخری کردار بھی انجام کو پہنچا تھا۔ آرتھر رینالڈ کے مرنے کے بعد گرین فیلڈ کو اس کے سامان سے کئی مسودے اور ایک ڈائری ملی جس میں اس نے کہانی کے انداز میں یہ سارے واقعات تفصیل سے لکھے تھے۔ مگر وہ اس وقت آئیوان روزبرگ تھا۔ جب کہ اس کا اصل نام آرتھر رینالڈ تھا۔ اس نے اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا اس لیے گرین فیلڈ اور بالٹی مور کی پولیس یہ کیس ختم کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ایڈگر ایلن پو کی موت کا تمام ریکارڈ ضائع ہو چکا ہے اور آج کی دنیا میں کوئی واضح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ آخری چند دنوں میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

شہرِ ستم گراں

شیراز خان

دنیا بھر میں ایسے لاتعداد شہر ہیں جو سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں مگر سیاحوں کے لیے وہاں ہر گلی ہر کوچے میں صیاد بھی دام پھیلائے منتظر رہتے ہیں. ایسے شہر کہاں کہاں واقع ہیں اور کن وجوہات کی بنا پر بدنام ہیں اس پر ایک ہلکی سی نظر.

دنیا بھر کے بدنام شہروں کا ذکر

شہر کسی بھی ملک کی ترقی کی نشانیاں ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں ایسے بے شمار شہر ہیں جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جب کہ ایسے شہروں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جنہیں دنیا کے خراب ترین شہروں میں رکھا گیا ہے۔

ان کی خرابی کی ریٹنگ، ٹریفک کے خراب نظام، جرائم، صحت اور صفائی کے ناقص انتظامات اور اسی قسم کی دیگر خرابیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پوری دنیا میں سروے کے ذریعے اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے تو آئیں ایسے چند
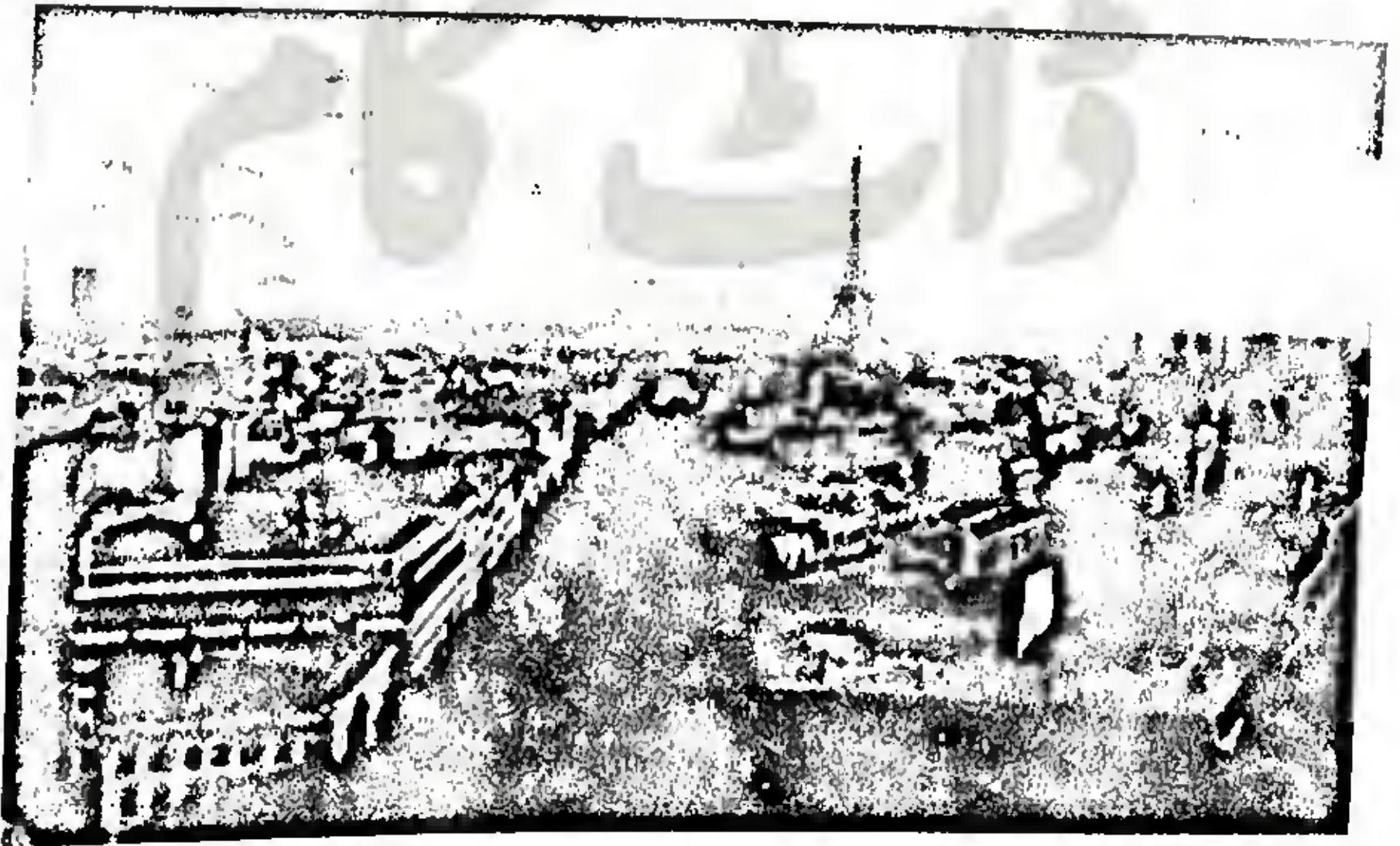
شہروں کے بارے میں جانتے ہیں۔

آبد جان۔ کوٹ ڈی ویلورے کا شہر۔ دسویں نمبر پر دنیا کا خراب ترین شہر ہے۔ (کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم اس سے متفق بھی ہوں لیکن یہ ڈیلی گراف کی رپورٹنگ ہے)۔

کیمرون کا شہر ڈاوَلا۔ انتہائی خراب، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، جگہ جگہ گندگی، امن وامان کی ناقص صورتِ حال، بے ہنگم ٹریفک۔ یہ سب مل کر اس شہر کو دنیا کے خراب ترین شہروں میں شامل کررہی ہیں۔

لیبیا کا شہر ٹریپولی۔ یہ شہر بھی بہت خراب ہے۔ یہاں زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جارہی ہے۔

ڈیلی ٹیلی گراف کی رپورٹنگ کے مطابق ہمارا کراچی بھی اس فہرست میں شامل ہے اور کراچی میں جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے سامنے ہی ہے۔

الجیریا کا شہر الجیرس بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہاں بھی زندگی عذاب بنی رہتی ہے۔

زمبابوے کا شہر ہرارے۔ دیکھنے میں خوب صورت لیکن برتنے میں بہت مشکل۔

نائیجریا کا شہر لاگوس بھی۔ اسی فہرست میں شامل ہے۔

پاپوانیوگنی کا شہر پورٹ ماروش۔ دنیا بھر میں خراب ترین شہروں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے۔

بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکا کو دنیا کا سب سے خراب شہر بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ وہاں کی بے ہنگم آبادی ہے۔ ہر جگہ جھونپڑیاں نظر آتی ہیں اور ٹریفک کا نظام بھی بہت بدتر ہے۔

ایک اور سروے بھی کیا گیا ہے جس کے مطابق دنیا میں بہت سے ایسے شہر ہیں جو سیاحوں کے لیے خطرناک ہیں۔ ان کا خطرناک ہونا بے شمار وجوہات کی وجہ سے ہے جیسے گینگ وار منشیات کا گڑھ، فرقہ وارانہ فسادات، اسٹریٹ کرائم، دھوکا دہی، لوٹ مار اور ٹارگٹ کلنگ وغیرہ۔

آئیں ان شہروں کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

ہنڈراس کا شہر San pedro sula، اس شہر کو بہت خطرناک قرار دیا گیا ہے۔ اسلحے کی اسمگلنگ ایک عام سی بات ہے۔ شہر پر قبضے کے لیے کئی گینگز ہیں جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ خون ریزی ایک عام سی بات ہے۔ منشیات کا بھی یہ ایک بڑا گڑھ ہے۔

سیاسی بدامنی اور فرقہ واریت کی وجہ سے کراچی بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ ٹارگٹ کلنگ، بم دھماکے، گینگ وارز، اسلحے اور منشیات کی وجہ سے ہمارا یہ شہر خطرناک شہروں کی فہرست میں آگیا ہے۔ (خدا وہ دن بھی دکھائے جب یہ شہر دنیا کے پُرسکون شہروں کی فہرست میں اوّل نمبر پر ہو)۔

کابل۔ خطرناک شہروں میں اس شہر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ بم دھماکے عام سی بات ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی بدامنی اور بے چینی بھی بہت زیادہ ہے۔ سیاحوں کو منع کیا جاتا ہے کہ اوّل تو نہ جائیں اگر کسی سبب سے جانا بھی پڑ جائے تو اپنے ہوٹل سے باہر نہ نکلیں۔

بدقسمتی سے کسی زمانے میں اس شہر کو علم کا شہر کہا جاتا تھا۔ کیا کیا نہیں تھا یہاں۔ بڑے بڑے مدرسے، دانش گاہیں، فلاسفرز اور اس شہر بے مثال کی داستانیں۔ یعنی ذکر ہے بغداد کا جواب بدامنی اور خانہ جنگی کا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ آئے دن بم دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات بھی انتہا کو ہیں۔ سینکڑوں لوگ مارے جاچکے ہیں۔ اسی لیے یہ شہر سیاحوں کے لیے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

میکسیکو کا شہر Aca pulko۔ انتہائی خطرناک، اس شہر میں مرڈر ریٹنگ دنیا کے بہت سے شہروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ منشیات کا گڑھ، گینگ وارز اور اسلحے کی بھرمار ہے۔ یہاں سے اسلحے کی اسمگلنگ بھی ہوا کرتی ہے۔ یہاں آنے والے سیاحوں کو بے شمار ہدایات دی جاتی ہیں۔ کہاں جائیں کہاں نہ جائیں۔ شام کے وقت ہوٹلز سے باہر نہ جائیں۔ زیادہ تر وارداتیں شہر کے مضافات میں ہوا کرتی ہیں۔

گوئٹے مالاسٹی۔ حالانکہ پورا ملک بہت خوب صورت ہے۔ سیاحوں کے لیے قابلِ دید مقامات ہیں لیکن کیا کیا جائے اس شہر میں ہونے والے جرائم نے اس شہر کو غیر محفوظ کردیا ہے۔ سیاحوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے گوئٹے مالا کا پروگرام بنا ہی لیا ہے تو اس ملک کے کسی اور شہر چلے جائیں گوئٹے مالاسٹی نہ جائیں تو بہتر ہے۔

ریوڈی جنرو۔ برازیل کا خوب صورت شہر، حالانکہ یہ شہر سیاحوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔ لاکھوں سیاح یہاں آتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس شہر میں جرائم کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ سیاحوں سے کہا جاتا ہے کہ آپ جا تو رہے ہیں لیکن اپنے رسک پر جائیں۔

کیپ ٹاؤن۔ جنوبی افریقا کا مشہور شہر، ایک جدید شہر ہے۔ سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے اس کے باوجود یہ ایک

خطرناک شہر ہے۔

Ciudad jaurez ۔میکسیکو کا شہر، یہ شہر لوٹ مار اور تشدد کے لیے بہت مشہور ہے۔ سیاحوں کو اغوا کر کے ان سے بھاری رقومات وصول کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی خطرناک گینگز ہیں جو شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔

صومالیہ کا شہر موغادیشو۔ القاعدہ نے یہاں قدم جما رکھے ہیں۔ اس شہر میں مختلف فرقوں کے درمیان گھمسان کی جنگ چھڑی رہتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس میں بچوں کو بھی جنگ کے میدان میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ اس شہر سے یو این او اور اس قسم کی دیگر تنظیموں کے دفاتر ہٹا دیے گئے ہیں۔

یمن کا شہر صنعا بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ یہاں بھی القاعدہ کا اثر ہے۔ اس شہر میں بھی بم دھماکے عام ہیں۔ خود یہاں کے رہنے والے بھی شہر چھوڑ کر فرار ہو رہے ہیں۔

پاکستان کے شہر پشاور کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہاں ہونے والے آئے دن کے بم دھماکوں نے اس شہر کو غیر محفوظ کر دیا ہے۔ (پچھلے دنوں ہونے والے اسکول کے حادثے نے اس کی ساکھ اور خراب کر دی ہے)۔

نیروبی۔ مسلح جتھے اس شہر میں بھی موجود ہیں اور یہ شہر مسلسل ہنگاموں کی زد پر رہتا ہے۔

اب ذرا ان شہروں کی طرف آئیں جو سیاحوں کی جنت کہے جاتے ہیں۔ جی ہاں اس فہرست میں دنیا کے مشہور اور خوب صورت ترین شہر شامل ہیں۔

ان شہروں میں تشدد اور ہنگامے وغیرہ تو نہیں ہوتے لیکن یہاں ایک دوسری قسم کا خطرہ سروں پر منڈلاتا رہتا ہے اور وہ ہے جیب کتروں کا۔ بس نگاہ چوکی اور مال دوسروں کا۔ دنیا کے انتہائی شاطر قسم کے جیب کترے ان شہروں میں اپنے ہنر دکھاتے رہتے ہیں۔ سیاحوں کو بہت تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ہوشیار رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ جب کوئی تاریخی عمارت دیکھ رہے ہوں تو اس دوران آپ خود تماشا بن کر رہ جائیں۔

آئیں ذرا ان شہروں کو بھی دیکھ لیں۔

ایتھنز۔ دنیا بھر میں بیش بہا تاریخی اثاثہ رکھنے والا واحد شہر۔ جس کے ہر کوچے میں تاریخ دکھائی دیتی ہے۔ قدیم یونان اپنی پوری جلوہ گری اور شان کے ساتھ آپ کے سامنے آجاتا ہے۔

سیاح یہاں آتے ہیں اور تاریخ کو دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور یہاں کے جیب کترے آپ کی اسی بے خودی کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ جیب کترے ہر اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں سیاحوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور اسی دوران آپ کی جیب بھی چھل جاتی ہے۔

ویت نام کا ہنوئی۔ یہ شہر ویت نام کا کیپٹل بھی ہے اور ایشیا بھر میں جیب کتروں کی جنت بھی۔ اس شہر میں ہر وقت شور ہوتا رہتا ہے۔ ہزاروں ٹیکسیاں، گاڑیاں، رکشے، موٹر سائیکلیں۔ اس پر سے لوگوں کا بے تحاشا ہجوم۔ ان سبھوں نے مل کر اس شہر کو جیب کتروں کے دھندے کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا سیاح ہو جو بے چارہ اپنے پاسپورٹ اور نقدی کی شکایت لے کر پولیس اسٹیشن نہ گیا ہو۔

ہالینڈ کا شہر ایمسٹرڈیم۔ جی ہاں، ایک طرف تو یہ شہر سیاحوں کے لیے بہت دلکشی رکھتا ہے۔ یہاں کے خوب

منفرد شعر و منفرد الفاظ

شکر بتراز وی وزارت برکش
شو ہمرہ بلبل بلب ہر مہوش

فارسی کا یہ شعر، سلطان الشعرا حضرت امیر خسروؒ کا ہے اور اس شعر کی انفرادیت یہ ہے کہ اسے سیدھا پڑھیں یا الٹا۔ دونوں طرف سے وہی الفاظ بنتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں یہ خوبی ہے اور یہ کوئی عام بات نہیں اور ہر شاعر کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔ ذیل میں اردو کے وہ الفاظ لکھے جا رہے ہیں جو سیدھے اور الٹے دونوں طرف سے یکساں لفظ بنتے ہوں۔

اَبا۔ ادا۔ اڈا۔ اَنا (اگر مد کو شمار میں نہ لائیں تو یہ الفاظ بھی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ آٹا، آپا۔ آرا، آغا، آقا، آہا، آیا) باب، بالب، پاپ، پیپ، تحت، تخت، ٹاٹ، چھاچھ، درد، دید، درد، ساس، داماد، کاک، کوک، کیک، کرک، کسک، کمک، گھاگھ، لال، لعل، لیل، مام، میم، موم، مادام، نان، نین، نون، ایشیا، شاباش، چیچ، تبت، مہم۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مے لنڈن

صورت گرجا گھر اور پورے شہر کی مجموعی خوب صورتی آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ وہیں دوسری طرف اس شہر کے شاطر چور بھی آپ کو ویلکم کہنے کے لیے بے چین ہیں۔ آپ ذرا ایک بار جا کر تو دیکھیں۔

فلورنس۔ اٹلی کا بے مثال شہر، جس نے پوری دنیا کو نہ جانے کتنے باکمال مصور، سنگ تراش اور شاعر دیے ہیں۔ دوسری طرف یہی شہر آپ کو باکمال جیب کترے بھی دے رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ بے چارے اتنے مشہور نہ ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کام تو چل رہا ہے نا۔

بیونس آئرش۔ ساؤتھ امریکا کا سب سے دولت مند شہر اور یہی دولت لٹیروں اور جیب کتروں کو یہاں کھینچ لاتی ہے۔ اس شہر میں ٹھگ بھی ہیں۔ گروہ کا کوئی آدمی آپ کو کسی بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ آپ تو سیاح ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اسی وقت گروہ کا دوسرا آدمی آپ کا ہمدرد۔ بن کر آپ کو اس پرابلم سے نجات دلا دیتا ہے اور آپ بری طرح لٹ جاتے ہیں۔

پیرس۔ رنگوں، خوشبوؤں، پیار اور گیتوں کا سب سے دلکش شہر۔ یہ شہر اتنی دلچسپیاں رکھتا ہے کہ سیاح یہاں آ کر سحر زدہ ہو جاتے ہیں اور یہاں کے جیب کترے آپ کی اسی کیفیت کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہاں کی ٹرین اتنی بھری ہوئی ہوتی ہے اور لوگ اس طرح ایک دوسرے سے چپک کر کھڑے ہوتے ہیں کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کس کا ہاتھ کس کی جیب میں ہے۔

میڈرڈ۔ اسپین کا شہر میڈرڈ، جو بل فائٹنگ کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ خود اندازہ لگا لیں کہ جب اس کھیل کو دیکھنے کے شوقین ایک دوسرے پر گر... پڑ رہے ہیں تو ایسا کون سا بدقسمت جیب کترا ہوگا جو اس موقع کو ہاتھ سے جانے دے گا۔ لہٰذا یہ شہر بھی جیب کتروں کی کمائی کا بہت بڑا مرکز ہے۔

روم۔ اب آ جائیں روم کی طرف، کیا شہر ہے اور کیا تاریخ ہے اس کی اور کیسے جیب کترے ہیں جو اپنے ہنر میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ اپنی جیب کو سنبھالتے رہ جاتے ہیں اور آپ کا اثاثہ ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

پیراگوے۔ یورپ کے خوب صورت ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس شہر کا بدصورت پہلو اس کے جیب کترے ہیں۔

اسپین کے شہر بارسلونا کی بھی ایسی ہی شہرت ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ سروے کرنے والوں نے دنیا کے صرف ان شہروں کا سروے کیا ہو جہاں جرائم ہیں۔ بدامنی ہے۔ لوٹ مار ہے بلکہ ان ملکوں کا بھی سروے کیا ہے جو دنیا کے محفوظ ترین اور امن پسند ممالک سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب پورا ملک ہی امن پسند ہوگا تو اس کے شہر بھی ایسے ہی ہوں گے۔ آئیں ان ممالک کی فہرست کا جائزہ لے لیں۔

ماریشس۔ افریقا کا ایک امن پسند ملک۔ جی پی آئی کی سروے رپورٹ کے مطابق یہ ملک اپنی ایک امن پسندانہ شہرت رکھتا ہے۔

گلوبل پیس انڈیکس (جی پی آئی) کے مطابق قطر مشرقِ وسطیٰ کا سب سے زیادہ امن پسند ملک ہے۔ یہاں تشدد کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی طرح یہاں جرائم کی شرح بھی بہت کم ہے۔ یہ ملک اسی لیے بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

پرتگال۔ یورپ کا خوب صورت اور امن پسند پُرسکون ملک ہے۔ یہاں بھی جرائم کی شرح کم ہے۔ اسی لیے سیاح یہاں جانا پسند کرتے ہیں۔

بھوٹان۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ دولت ہی سکون اور خوشی کی ضمانت ہو۔ بلکہ ذہنی اور روحانی سکون بھی خوشی دیتا ہے۔ بھوٹان انڈیا اور چین کے درمیان ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹا سا ملک ہے اور یہاں سکون اور اطمینان کی شرح بہت زیادہ ہے۔

سنگاپور۔ سیاحوں کی جنت کے ساتھ ساتھ دنیا کے منظم ترین ملکوں کی فہرست میں اوّل نمبر پر ہے۔ ماحولیات، تعلیم اور صحت کی سہولیات کے ساتھ ساتھ یہ اتنا پُرسکون ہے کہ آپ بہ آسانی جا سکتے ہیں۔

آسٹریلیا۔ یہاں کیا نہیں ہے؟ خوب صورت شہر، ہرے بھرے میدان، آنکھوں کو موہ لینے والے مناظر، صاف شفاف ہوائیں۔ اسی لیے اس ملک میں اوسط عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تعلیم و ترقی کا ایک مضبوط سسٹم اور اس کے ساتھ جرائم کی شرح بہت کم اور جینے کو کیا چاہیے۔

جرمنی۔ دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک۔ بے مثال شہر، گڑیوں کے گھروں جیسے گھر، تعلیم اور صحت کے وسائل کی فراوانی ان سب کے ساتھ امن اور سکون جس نے جرمنی کو ایک محفوظ ترین ملک بنا دیا ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں تو پھر وہیں رہ جانے کو دل چاہتا ہے۔

زیچ ریپبلک۔ موسیقی کے رسیا لوگ، پیار کرنے والے، مصوری پر جان دینے والے اور اس کے ساتھ بے انتہا پُرامن لوگ۔ اسی لیے اس کو دنیا کے پُرسکون ملکوں میں شمار کیا گیا۔

سلووینیا۔ یورپ کا ایک خوب صورت ملک۔ زندگی یہاں بھی بہت آرام اور اطمینان سے گزر جاتی ہے اسی سے اندازہ کرلیں کہ یہاں کی جیلوں میں مشکل سے ہزار کے قریب قیدی ہوں گے۔

آئرلینڈ۔ ایک خوب صورت ملک، یہاں کے رہنے والوں کی حسِ مزاح بہت زیادہ ہے۔ یہاں آپ کو دنیا کے بہترین گولف کورس کے ساتھ لاجواب کھانے بھی ملیں گے اس کے ساتھ سکون بھی۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک فلاحی ریاست ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات، بہترین حکومتی انتظامات جس کی وجہ سے جیل میں آپ کو بہت کم لوگ ملیں گے۔ یہاں کا سلوگن ہے کہ آپ ملک کے جس حصے میں جائیں وہاں آپ کو سکون ملے گا۔

بیلجیم۔ کیا خوب صورتی ہے، کیا روایات ہیں، قدیم طرزِ تعمیر کے شہر، پل، اینٹوں سے بنی محرابیں، اس کے عجائب گھر دیکھنے والوں کو مبہوت کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے پُرسکون حالات۔ جرائم کی شرح بہت کم۔ آپ بے دھڑک کہیں بھی جاسکتے ہیں، رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ بارشوں کا لطف لینے والوں میں سے ہیں تو یہ آپ کے لیے اور بھی زبردست ہے۔

اسکنڈے نیوین ملکوں کا ایک اور ملک سویڈن۔ بلاشبہ ایک فلاحی ریاست، موسم سرما یہاں اپنے عروج پر اور بہت طویل ہوتا ہے۔ حکومت اپنی عوام کا بہت خیال رکھتی ہے کیوں کہ یہاں کا سسٹم ہی ایسا ہے۔

کینیڈا۔ دنیا کے بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جہاں سالانہ اوسط آمدنی صرف پچاس یا ساٹھ ڈالرز ہے۔ جب کہ کینیڈا کا اندازہ لگائیں یہاں کی آمدنی ہزار ڈالر فی کس ہے۔ آنکھوں کو موہ لینے والے مناظر اور میرٹ کی بنیاد پر ترقی کے مواقع دینے والا یہ ملک دنیا کے پُرسکون ملکوں کی فہرست میں بہت بلند درجے پر ہے۔

فن لینڈ۔ اگر آپ طویل ترین موسم سرما سے پریشان نہیں ہوتے ہیں تو یہ ملک بے مثال ہے۔ دنیا کا بہترین تعلیمی نظام اس ملک میں قائم ہے۔

جاپان۔ اگر آپ جاپان جائیں تو آپ کو یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ فلاں ہوٹل میں صفائی وغیرہ کا کیسا انتظام ہے۔ بلاشبہ پورا جاپان بے داغ ہے۔ اس کے علاوہ بلند معیارِ تعلیم، لوگوں کے رویے، لاجواب معاشی ترقی۔ ان سب کے ساتھ جرائم کی بہت کم شرح۔ ان سب نے مل کر اس ملک کو دیکھنے اور رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔

سوئٹزرلینڈ۔ قدرتی مناظر میں بے مثال، اس ملک کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ تو کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا۔ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا ملک۔ جہاں ہر طرح کی سہولیات حاصل ہیں۔ صحت، صفائی، تعلیم اور عدل کا نظام۔ اسی لیے یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ معاشی لحاظ سے بہت مضبوط۔ اس ملک کا بینکنگ سسٹم سب سے زیادہ محفوظ ہے۔

آسٹریا۔ اس ملک میں صرف سولہ برس میں ووٹ دینے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن شراب نہیں خرید سکتے۔ جب تک عمر کے ایک خاص معیار تک نہ پہنچ جائیں۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہت خوب صورت مناظر سے بھرا ہوا ہے۔ ٹرانسپورٹ کا لاجواب نظام۔ یہ سب آپ کو اس ملک میں ملے گا۔

نیوزی لینڈ۔ دنیا کے بہت کم آبادی والے ملکوں میں سے ایک۔ گرد و غبار اور کثافت سے بہت حد تک محفوظ ملک یہاں بہت بڑی تعداد میں مہاجر آباد ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک انتہائی پُرسکون ملک ہے۔ یہاں کے باشندے ایک پُرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

ڈنمارک۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ہیں۔ صاف ستھرا ماحول، زندگی کی بہترین سہولیات اور ایک فلاحی ریاست۔ وہ سب کچھ جس کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حسین مناظر۔ سب کچھ اس ملک میں موجود ہے۔

آئس لینڈ۔ یہاں کے نظارے قدرت کے شاہکار ہیں۔ ایک تو یہ وجہ ہے اور دوسری بات یہاں کی پُرسکون زندگی ہے۔ اسی لیے اس ملک کو دنیا کا سب سے پُرسکون ملک کہا جاتا ہے۔ آبادی بہت کم لیکن شرح خواندگی سو فیصد۔ یعنی سب کے سب پڑھے لکھے۔ اسی لیے جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ تھا ایک جائزہ دنیا کے ملکوں اور شہروں کا۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے ملک کو کیسا دیکھنا یا بنانا چاہتے ہیں۔

آہ علی سفیان آفاقی

علی سفیان آفاقی ایک نابغہ روزگار شخصیت، سرگزشت کی جان سمجھے جانے والے 27 جنوری 2015ء کو ہم سب سے جدا ہو گئے۔ وہ 22 اگست 1933ء کو بھارتی صوبہ مدھیہ پردیش کے شہر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آ گئے اور ماڈل ٹاؤن میں رہائش اختیار کی۔ (لیکن چھ سات سال قبل انہوں نے یہ مکان چھوڑ دیا اور دوسرے مکان میں آ گئے تھے) حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے اس کی سن تعمیر بھی 1933ء ہے۔ گویا اپنے ہم عمر مکان میں رہ رہے تھے۔ اس مکان کے سیدھے ہاتھ پر واقع ایک کمرے میں بیٹھ کر وہ لکھائی پڑھائی کرتے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ان کے قلم کی حکمرانی رہی۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر انہوں نے ہٹ فلموں کی کہانیاں لکھیں، مقبول عام مضامین تصنیف ہوئیں۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر معراج رسول صاحب کی فرمائش پر فلمی الف لیلہ شروع کی جو جلد ہی مقبولیت کے معراج پر نظر آنے لگی۔ اس لیے کہ پاکستانی فلموں کی تاریخ میں کسی ایسی شخصیت نے جو فلمی صنعت میں بھی مقام رکھتا ہو فلموں یا فلمی شخصیت پر یا خود اپنی روداد نہیں لکھی۔ فلمی الف لیلہ نہ صرف ان کی آپ بیتی تھی بلکہ جگ بیتی بھی تھی۔ اسی میں ہالی ووڈ، بالی ووڈ اور لالی ووڈ کے بے شمار فلمی ادبی اور سیاسی شخصیات کی سرگزشت شامل ہوتی رہیں۔ ماہنامہ سرگزشت سے ان کا رشتہ 1990ء میں جڑا۔ ابتدا میں یہ طے پایا تھا کہ سفرنامہ وہ اپنے نام سے اور فلمی شخصیات کے قصے فرضی نام سے لکھیں گے۔ فرضی نام ”آشنا کے قلم سے“ تجویز ہوا۔ سرگزشت کا پہلا شمارہ دسمبر 1990ء میں آیا۔ اس میں انہوں نے اداکارہ رانی کی روداد کرداروں کے نام بدل کر لکھی۔ مثلاً رانی کا نام شہزادی رکھا لیکن بعد میں وہ ہر ایک کی روداد پر اصل نام دینے لگے۔ بنیادی طور پر وہ ایک شفیق ہستی تھے۔ نئے لکھنے والوں کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ایک سینئر لکھاری ہیں جس کی وجہ سے نئے لکھنے والے کا قلم رواں ہو جاتا۔ وہ مذہبی سوچ کے حامل تھے۔ پنج وقتہ نمازی، محب وطن پاکستانی تھے۔ گو کہ انہوں نے صحافتی کیریئر کا آغاز جماعت اسلامی کے پرچے ”ترجمان القرآن“ سے کیا تھا لیکن یہ وابستگی بہت مختصر عرصے پر محیط رہی اور 1951ء میں وہ روزنامہ چٹان سے منسلک ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریر میں بھی کبھی شورش کاشمیری کی گرم لہر در آتی۔ آغا شورش کاشمیری کے بارے میں انہوں نے سرگزشت میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ پھر وہ چٹان سے روزنامہ نوائے وقت میں آ گئے۔ حمید نظامی، مجید نظامی اور ریاض نظامی کے ساتھ کام کیا۔ مرحوم حمید نظامی کے چاہنے کے باوجود وہ نوائے وقت میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے اور روزنامہ آفاق میں چلے گئے۔ روزنامہ آفاق اس زمانے کا پہلا اخبار تھا جس میں باقاعدہ فلمی صفحہ شروع کیا گیا تھا اور اس کی ابتدا انہوں نے ہی کی تھی۔ فلمی صفحے کی ادارت نے انہیں فلمی دنیا سے قریب کر دیا۔ فلمی دنیا کی چکا چوند انہیں اس وقت بھی بھا رہی تھیں جب وہ کم سن تھے اور میرٹھ میں رہائش تھی۔ اسی وجہ سے وہ فلمی دنیا سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

1957ء میں انہوں نے شباب کیرانوی کی شراکت میں فلم ”ٹھنڈی سڑک“ بنائی اور پہلی بار فلم کی کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے لکھا۔ فلمی دنیا انہیں اتنی پسند آ گئی کہ 1958ء میں وہ کل وقتی طور پر فلم سے وابستہ ہو گئے اور فلم جنگلی کا منظر نامہ لکھا۔ 1965ء میں فلم سازی کی ابتداء کی اور فلم کنیز بنا دی۔ اس فلم نے کئی ریکارڈ توڑ دیے۔ 1972ء میں فلم سازی کے ساتھ ہدایت کاری میں بھی اپنا ہنر دکھایا اور فلم آس بنائی۔ مزید کئی کامیاب فلمیں بنا کر پوری طرح ثابت کر دیا کہ نہ صرف وہ ایک بہترین لکھاری ہیں بلکہ کامیاب ہدایت کار بھی ہیں۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک شام کا اخبار بھی نکالا۔ گو کہ ”نوروز“ نے صرف ایک سال کی عمر پائی مگر اس کے کئی اداریے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ 1990ء میں وہ دوبارہ ادارہ نوائے وقت میں لوٹ آئے۔ اس بار انہوں نے ہفت روزہ فیملی کی ادارت سنبھال لی تھی۔ سفر آخرت پر روانہ ہونے تک وہ اس پرچے کے مدیر رہے۔ الف لیلہ بھی 1990ء میں سرگزشت کے لیے لکھنا شروع کی تھی جس کی آخری قسط اس ماہ شامل ہے۔ کہتے ہیں فلمی دنیا کوئلے کی کوٹھری ہے۔ پھر بھی ان کے دامن پر کبھی کوئی داغ نہ لگا۔ کبھی کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔ کیوں کہ انہیں ادب اور صحافت سے عشق تھا۔ فلم سازی، ہدایت کاری اور کہانی نویسی پر نگار ایوارڈز، گریجویٹ ایوارڈز، فلم کریٹکس ایوارڈ، نگار ملینیم ایوارڈز سمیت کئی قومی ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ وہ الفا کیورٹ فلم ایوارڈ کی جیوری کے رکن رہے۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ انسٹی ٹیوٹ امریکا ہوائی کے رکن رہے۔ پاکستان فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین رہے۔ پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے وائس چیئرمین رہے۔ پاکستان فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن، پاکستان فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن اور لاہور پریس کلب کے تاحیات رکن رہے۔ ان کی 30 کے قریب تصانیف ہیں۔ ایک ایسے ہمہ جہت شخص کو کھو دینے کا غم ہم سب کے لیے ناقابل برداشت ہے مگر مشیت ایزدی سے مفر ممکن نہیں۔ آئیے سب مل کر دعا کریں کہ رب العزت جملہ مسلمان مرحومین کے ساتھ آفاقی صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

قسط نمبر: 237

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں، جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درد داستاں سرگزشت

پچھلے دنوں ہم کراچی گئے تو سڑکوں پر ایک نیا منظر دیکھا ایک ٹرک یا ٹرک نما گاڑی یا کرین نما چیز ایک کار کو ناک سے پکڑے گھسیٹے لیے جا رہی ہے اور وہ بے زبان خاموشی سے ''فسانۂ عبرت'' بنی چپ چاپ چلی جا رہی ہے۔ پوچھنے سے پتا چلا کہ کراچی بھی اب ماشاء اللہ دنیا کے ترقی یافتہ اور ماڈرن شہروں میں شمار ہونے لگا ہے۔ کم از کم

ٹریفک کے محکمے نے یہ ضرور تہیہ کرلیا ہے کہ کراچی کو غلط پارکنگ کے جرمانوں کی حد تک یورپ اور امریکا کا ہم پلہ ضرور بنائیں گے۔ دوسرے ملکوں میں ہوتا یہ ہے کہ سڑکوں پر، بازاروں میں، شاپنگ سینٹرز پر، سنیما گھروں کے سامنے، پارکوں میں۔ غرض یہ کہ ہر جگہ کاروں کو پارک کرنے کے لیے وسیع اور کشادہ جگہیں مخصوص ہوتی ہیں۔ معروف اور گنجان آباد شہروں میں پارکنگ کے لیے زیرزمین جگہ حاصل کی جاتی ہے۔ کئی کئی منزلہ سربہ فلک عمارتیں بھی کار پارکنگ کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دفاتر میں یہ سہولت دفتر کی طرف سے مہیا کی جاتی ہے۔ عمارتوں میں رہنے والوں کے لیے عمارت کے مالک یہ آسانی فراہم کرتے ہیں۔

شاپنگ سینٹرز میں دکانوں والے اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر بلدیہ کی جانب سے نشانات لگائے گئے ہیں جن کے سوا کسی اور جگہ کار پارک نہیں کی جاسکتی۔ کاروں کو مناسب مقام پر کھڑا کرنے کے لیے پرائیویٹ پارکنگ ادارے بھی مصروف عمل ہیں۔ بڑے بڑے معروف شہروں میں جابجا پارکنگ کا بندوبست ہے جہاں فیس ادا کرنے کے بعد کوئی بھی اپنی کار کھڑی کرسکتا ہے۔ معروف شاہراہوں پر تو سرے سے پارکنگ کی اجازت ہی نہیں ہے لیکن دوسری سڑکوں پر بھی پارکنگ کے لیے مخصوص مقامات مقرر ہیں اور ان جگہوں پر مقررہ اوقات ہی میں کار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ ورنہ ''ٹکٹ'' مل جاتا ہے۔ یعنی پولیس جرمانے کی پرچی کار پر لگا جاتی ہے جس کی ادائیگی ایک لازمی امر ہے۔ کاروں کو باندھ کر اور گھسیٹ کر لے جانے والی سزا شاذونادر ہی دی جاتی ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ بالکل ممنوعہ علاقے میں آپ کار پارک کردیں یا بعض مخصوص مقامات پر وقت مقررہ کے بعد کار پارک کردیں۔ ان حالات میں ''مجرم کار'' کو ایک شائستہ اور معقول شکل کی گاڑی نہایت احتیاط سے اٹھا کر اپنے ساتھ منسلک کرلیتی ہے اور کار کو اپنے ساتھ باندھ کر لے جاتی ہے۔ اس کو Tow کرنا کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسی وغیرہ سے باندھ کر کھینچنا۔ کشتی کو رسی سے باندھ کر کھینچنے کو بھی Tow کہتے ہیں۔

Tow کرنا ایسی سزا ہے جو کسی کار کو انتہائی سنگین ''جرم'' پر دی جاتی ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ کراچی میں معمولی سے ''جرم'' میں ملوث کاریں بھی ٹرک کے ساتھ ہتھکڑی لگا کر لے جائی جارہی تھیں۔ کراچی کی دیکھا دیکھی اب لاہور اور دوسرے ماڈرن شہروں میں بھی یہی طریقہ رائج ہوچکا ہے، ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے ملک میں ہر ماڈرن رواج پر بہت خوش ہوتے ہیں بلکہ فخر کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے جدید ترقی کا ایک اور نمونہ آگیا۔

مگر ہوا یہ کہ دوسرے ہی دن ہم کراچی کے ایک فیشن ایبل علاقے سے گزر رہے تھے کہ ہمیں ''ملزمہ کار'' نظر آگئی جسے ایک ٹرک کے ساتھ آہنی زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا اور بے چاری کار خاصی بے آرام اور بیکل پوزیشن میں تھی۔ ہمارے سامنے ایک غیر ملکی بھی کھڑے دیکھ رہے تھے چند لمحے انہوں نے یہ منظر دیکھا اور پھر ہم سے انگریزی میں پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کوئی ایگزی بیشن وغیرہ کی ریہرسل ہورہی ہے؟''

ہم نے ان کی لاعلمی پر حقارت سے انہیں گھورا اور کہا ''آپ نہیں جانتے؟ یہ کار ہے جسے Tow کرکے لے جایا جارہا ہے۔''

''اس طرح؟ مگر کس جرم کی پاداش میں؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

ہم حیران رہ گئے کہ کوئی انگریز اتنا بےخبر اور علم سے کورا بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اپنی قابلیت بگھارنے کے لیے کہا۔ ''دیکھیے جب کوئی شخص غلط پارکنگ کرتا ہے تو محکمہ سزا کے طور پر اس کی کار کو Tow کرکے لے جاتا ہے۔ یورپ، امریکا میں تو یہ بات عام ہے؟ کیا آپ کبھی ان ملکوں میں نہیں رہے؟''

وہ مسکرائے اور بولے۔ ''میں پیدا ہی شکاگو میں ہوا تھا۔''

''اچھا'' ہم نے کہا۔ ''تو کیا وہاں کاروں کو Tow نہیں کیا جاتا؟''

''کیوں نہیں؟ مگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔''

ہم سمجھ گئے کہ کسی انتہائی سڑیل اور جرح کرنے والے امریکی سے پالا پڑگیا ہے۔ چنانچہ طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وجہ یہ کم ہے کہ اس نے ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کی ہے؟''

''اچھا تمہارے ہاں ٹریفک رولز بھی ہوتے ہیں؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا۔ مارے غصے کے ہمارے تو کان لال ہوگئے۔ یہ کس قسم کے امریکی سے واسطہ پڑگیا جو ہمارے ملک کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا؟ ہم ''جواب

جاہلاں باشد خموشی“ کے مطابق خاموش رہے اور آگے چل پڑے۔

وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اچانک بولا۔ ”پارکنگ کی جگہ کہاں ہے؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ کوئی پارکنگ لاٹ نظر آیا، نہ ہی سڑکوں پر پارکنگ میٹر ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پارکنگ کے لیے جو نشانات ہوتے ہیں وہ بھی نہیں ہیں۔ تو پھر غلط پارکنگ کہاں ہوتی ہے؟“

اب ہم اس کی باتوں میں چھپا ہوا طنز سمجھ چکے تھے اس لیے دوبارہ خاموشی اختیار کی۔ دراصل اب اس کے مزید سوالات کا جواب دینے کے لیے کم از کم ڈی آئی جی ٹریفک کے رینک کے کسی شخص کی ضرورت تھی جو فی الحال میسر نہیں آسکتا تھا۔ شکاگو میں پیدا ہونے والا امریکی تو چلا گیا مگر ہمیں اس الجھن کا شکار کر گیا کہ واقعی جب پارکنگ کا مناسب بندوبست ہی کہیں نہیں ہے تو پھر غلط پارکنگ پر جرمانہ اور سزا کیسی؟ ابھی ہم یہ معما حل نہیں کر پائے تھے کہ لاہور کے اخباروں میں ایک خبر نظر سے گزری جس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب کی صوبائی حکومت نے کمپیوٹر کے ذریعے ٹریفک چالانوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک ”ٹریفک ٹوکن فائن اسکیم“ کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ طریقہ دنیا کے جدید ترین شہروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب ”مجرم کار“ پر ٹوکن لگایا جائے گا تو ہاتھ کے ہاتھ نقد جرمانہ بھی وصول کر لیا جائے گا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے والوں کے کاغذات پولیس اپنے قبضے میں لے لے گی اور وہ دفتر جاکر جرمانہ ادا کرنے کے بعد ہی کاغذات واپس لے سکیں گے۔ گویا جرمانہ ادا کرنے والا تو گیا کام سے۔ جب تک وہ غریب دو چار دن دھکے نہیں کھائے گا کاغذات اس کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔ واقعی اتنا جدید ترین اور ”ایذا رساں ترین“ طریقہ بھلا دنیا کے کسی اور شہر میں کہاں رائج ہوگا؟

اخبار میں ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جرمانے کے ریٹ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ابھی تازہ بھاؤ ہیں۔ آگے چل کر ان میں کتنا اضافہ ہوگا؟ یہ اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ فی الحال بونی کے طور پر ٹریفک لائٹس کی خلاف ورزی کرنے کا جرمانہ ڈیڑھ سو روپے ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہر قسم کی سواری کے لیے جرمانے کی رقم مختلف ہے۔ اسی طرح خلاف ورزیوں کی سنگینی کے مطابق جرمانے کے بھاؤ بھی چڑھے ہوئے ہیں۔

فلسفہ

جب زندگی کو اپنے دل کے گیت سنانے کے لیے گانے والا نہیں ملتا تو وہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے فلسفی پیدا کر دیتی ہے۔ (خلیل جبران)

فلسفہ کا مقصد زندگی کی تشریح کرنا نہیں بلکہ اسے بدلنا ہے۔ (رادھا کرشن)

تھوڑا سا فلسفہ انسان کو دہریت کی طرف لے جاتا ہے لیکن فلسفہ کی اتھاہ گہرائی اسے مذہب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ (بیکسن)

ہم ایسے فلسفی ہیں کہ ایک دوسرے کی بربادی ہی میں اپنی خوش حالی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ (لوئس بلاک)

مرسلہ: اویس شیخ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

یہ خبر پڑھ کر ہمیں یہ خیال آیا کہ ہماری ٹریفک پولیس آج تک لوگوں کو ٹریفک اصولوں کی الف۔ ب تک تو سکھا نہیں سکی مگر جرمانے وصول کرنے کے لیے اس نے کمپیوٹر کی خدمات حاصل کر لیں۔ واقعی کیا مستعدی اور کارکردگی ہے کہ جو ٹریفک پولیس ٹیکسی اور رکشا کے میٹر درست نہ کرا سکی۔ ٹریفک کی لائٹس درست نہیں رکھ سکی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے رکنے کے لیے نشانات نہیں لگوا سکی۔ کاروں کو فل لائٹ سے بغیر چلنا نہ سکھا سکی۔ سائیکل، تانگے اور ریڑھے میں گھنٹی، ہارن لالٹین، روشنی یہاں تک کہ رات کو چمکنے والی کوئی شے تک نہیں لگوا سکی۔ جو ٹریفک پولیس ون وے پر دو طرفہ چلنے والوں کی روک ٹوک نہ کر سکی۔ ویگنوں اور بسوں کو مویشیوں کی طرح بھرنے سے نہیں روک سکی۔ قانون کی موجودگی کے باوجود ویگنوں اور بسوں میں بے ہودہ ریکارڈنگ بند نہ کرا سکی۔ انہیں سڑک پر جب اور جس جگہ چاہیں اچانک اشارہ دیے بغیر کھڑے ہو جانے سے نہیں روک سکی۔ غلیظ دھواں بکھیرنے والی گاڑیوں کا زہر اور بغیر سائیلنسر والی موٹر سائیکلوں اور کاروں کا شور کم نہ کرا سکی۔ پیدل چلنے والوں کو سڑک عبور کرنے کا طریقہ اور بسوں، ٹرک اور موٹروں والوں کو پیدل چلنے والوں کے حقوق کا احساس نہ

دلاسکی۔ غرض یہ کہ ٹریفک کے ابتدائی اصول و ضوابط تک نافذ نہ کراسکی اگر وہ لوگوں سے جرمانے وصول کرنے کے لیے کمپیوٹر استعمال کرنے لگے تو پھر اسے ایٹم بم سے چوہا مارنے کا تجربہ کرنے کے سوا اور کیا قرار دیا جاسکتا ہے۔

دراصل اگر آپ غور فرمائیں تو ہمارا چاہے کوئی محکمہ ہو اس کے طرزِ عمل اور کارکردگی کے بارے میں ایک قدر مشترک آپ کو نظر آئے گی اور وہ یہ ہے کہ عوام کو سزائیں دینا۔ ان پر جرمانے کرنا۔ ان کے استعمال کی اشیا کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کرنا۔ ان پر کسی نہ کسی بہانے ٹیکس عائد کرنا اور پھر لطف یہ کہ ان سب جرمانوں اور گرانیوں کے باوجود عوام بے چاروں کی کسی سہولت، آسائش اور ضرورت کا مطلق خیال نہ کرنا۔ محض پولیس اور ٹریفک کے محکمے ہی تک محدود نہیں ہے۔ یہ اندازِ فکر ہر جگہ اور ہر محکمے میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس پر طرہ دفتری کارروائیوں کی طوالت اور سرخ فیتے کی کارستانیوں جس کے سامنے خود بیوروکریٹس بھی مہر بہ لب نظر آتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کسی بہت بڑے افسر سے شکایت کریں کہ دفتری کارروائی بہت طویل اور اذیت رساں ہے تو جواب میں وہ بھی بے بسی سے کاندھے اچکا کر کہیں گے۔ ''ارے صاحب! کیا کریں؟ سسٹم ہی ایسا ہے، دراصل یہ سارا دفتری نظام ہی تبدیل کرنے والا ہے، فی الحال تو یوں ہی کام چلے گا۔'' گویا وہ خود بھی اس کی خامیوں اور کوتاہیوں بلکہ ضرر رسانیوں سے آگاہ ہیں۔ وہ واقعہ تو آپ نے ضرور سن رکھا ہوگا جب ہائی کورٹ کے ایک جج (انگریزی حکومت کے عہد میں) اپنے تمام جاہ و جلال اور اختیارات کے باوجود ایک پٹواری سے ہار مان کر سرنڈر کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ یہ انگریزی عہد کا واقعہ ہے آج کل کیا عالم ہوگا یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پرابلم یہ ہے کہ ہمارے اربابِ انتظام آج تک یہ معمولی سی بنیادی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ سارے محکمے اور سارے حکومت کے نظام دراصل لوگوں کی خدمت، سہولت اور فائدے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یعنی محکمے پر محکمہ جو قائم کیا جارہا ہے اس کا مقصد محض کچھ لوگوں کو افسری اور باقی کو نوکریاں دینا نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اس غرض سے کیا جارہا ہے کہ لوگوں کے لیے زیادہ سہولت فراہم کی جائے۔ لیکن اگر عملی طور پر دیکھیے تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جتنے محکمے، افسر اور دفتر بڑھ رہے ہیں اسی قدر لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہورہا ہے۔ ہر نیا محکمہ اور ہر نیا افسران کے لیے ایک نیا عذاب اور اذیت بن کر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹریفک پولیس ہی کو دیکھ لیجیے۔ آپ ساری دنیا میں پھر آیئے۔ اس قدر ناقص ٹریفک کا نظام کہیں نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ ہمارے شہروں میں تو شاید ٹریفک کا کوئی قانون سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو پھر اتنے درجنوں ڈی آئی جی، ایس پی، ڈی ایس پی اور درجہ بدرجہ دوسرے افسر اور ہزاروں ٹریفک کے سپاہی آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ بقول غالب

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یعنی ہماری ٹریفک پولیس ایک زمانے میں سہولتوں کی شکایت کیا کرتی تھی مگر اب دیکھیے تو قریب قریب تمام جدید ذرائع انہیں میسر ہیں۔ پیٹرول کاریں بھی ہیں۔ سائرن بجاتی ہوئی اور روشنیاں چمکاتی ہوئی نئی کاریں بھی ہیں۔ خوب صورت وردیاں بھی ہیں اور امریکی طرز کی موٹر سائیکلیں بھی ہیں جو وائرلیس سے مزین ہیں۔ دفتروں میں جاکر دیکھیے تو ائرکنڈیشنڈ ہیں۔ افسروں کو دیکھیے تو مطمئن ہیں۔ سپاہیوں کو دیکھیے تو آسودہ حال ہیں۔ تو پھر ٹریفک کا یہ حال کیوں ہے اور بے چارے عوام بدحال بلکہ حال سے بے حال کیوں ہیں؟

☆......☆

''ہماری ایک ہی زبان ہونی چاہیے۔ بس اس کے بغیر ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔''

ایک پڑھے لکھے پروفیسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایم مسعود کھدر پوش کو بہت حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا۔ ''یہ آپ بہت خطرناک بات کہہ رہے ہیں' اگر ایسا ہی ہے تو ہم اقوام متحدہ کے رکن کیسے بن گئے ہیں؟'' ایم مسعود صاحب کی اس حیرت پر ہمیں حیرت اس لیے ہورہی ہے کہ اوّل تو اقوام متحدہ کا رکن بننے کے لیے کسی ملک یا قوم کی زبان ''مشروط'' نہیں ہے۔ دوسرے ایم مسعود صاحب شاید یہ بھول رہے تھے کہ جس وقت پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بنا تھا اس وقت پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان ایک اور صرف ایک تھی کیوں کہ قیام پاکستان سے قبل ہی قائداعظم نے اعلان کردیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اردو ہوگی۔ یہی زبان ہے جسے متحدہ ہندوستان کے ہندوؤں نے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اچھوت اور ملیچھ قرار دے دیا تھا اور آج تک ان کی یہ نفرت قائم ہے۔ حالانکہ یہ وہ زبان ہے جس میں ہندی اور برصغیر کی مختلف

علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن ہندوؤں کو اس زبان سے اس لیے دشمنی تھی کہ

1۔ یہ راس کماری سے کشمیر تک تمام مسلمان بولتے تھے۔

2۔ ہندی اور علاقائی زبانوں کی بھرمار کے باوجود اس میں مسلمانوں کی عربی اور فارسی زبان کی آمیزش تھی اور یہ اسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

اردو کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس میں تحریکِ پاکستان کی جنگ لڑی گئی۔ کانگریس اور مہا سبھائی اخبارات جو پاکستان کے شدید مخالف تھے وہ بھی پاکستان کی مخالفت کرنے کے لیے اسی ہندوستان گیر زبان کا سہارا لینے کے محتاج تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ زبان جس پر آج بھی بھارت میں مسلمانوں کی زبان کا ٹھپا لگا ہوا ہے اور اسی بنا پر اس کو برادری سے خارج کر دیا گیا خود پاکستان میں اپنا مقام حاصل نہیں کرسکی۔

ایم مسعود صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک قوم ایک زبان کا ''گمراہ کن نظریہ'' مشرقی پاکستان پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ بنگالیوں نے اس کے خلاف مزاحمت کی اور بالآخر قوم کو 1971ء میں ایک قوم ایک زبان جیسے ''گمراہ کن نظریے'' کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ایم مسعود صاحب کی اس منطق کی رو سے دیکھا جائے تو پھر سرے سے پاکستان ہی کو ''گمراہ کن نظریہ'' قرار دینے میں کیا قباحت ہے۔ پاکستان کا تو قیام ہی ایک قوم اور ایک زبان کے نام پر عمل میں آیا تھا۔ بنگالیوں نے ''ایک زبان'' کے گمراہ کن نظریہ'' کے خلاف جنگ نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں وہ اسی نعرے کو اپنا کر پاکستان کی جنگ لڑ چکے تھے۔ جو قوم ملک کے ایک حصے کو گنوانے کے بعد بھی آج تک یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکی کہ ہم نے یہ بھاری قیمت کس وجہ سے اور کس کی وجہ سے ادا کی ہے۔ اس کے دانشوروں اور اہلِ سیاست کے ساتھ اظہار ہمدردی کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ ہمارے ان دانشوروں کو شاید یاد نہیں کہ ہمسایہ ملک بھارت نے جب آزادی کی جنگ کا آغاز کیا تھا تو ہندو قوم کو کسی لیڈر نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آزاد بھارت کی صرف ایک قومی اور سرکاری زبان ہوگی اور وہ ''ہندی'' ہوگی لیکن آزادی کے بعد بھارت کے رہنماؤں نے ایک شمالی صوبے میں محدود پیمانے پر بولی جانے والی زبان کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا اور

مسعود کھدر پوش

ہندی کی نہایت ٹھیٹ اور مشکل سنسکرت آمیز شکل کو سارے ملک میں رائج کر دیا۔ جنوبی ہند میں احتجاجی مظاہرے ہوئے، توڑ پھوڑ بھی ہوئی مگر یہ ملک آج بھی قائم ہے اور ہندی سارے ملک کی واحد اور قومی زبان ہے۔ یہ مت بھولیے کہ بھارت میں 22 سے زیادہ زبانیں موجود ہیں۔ ان میں گجراتی، مرہٹی، بنگالی، تلگیو، تامل اور گورمکھی پنجابی جیسی انتہائی ترقی یافتہ زبانیں بھی موجود ہیں اور وسیع علاقوں میں بولی جاتی ہیں ان زبانوں کا لٹریچر انتہائی ترقی یافتہ اور علوم وفنون کے ذخیروں سے مالا مال ہے۔ اس کے باوجود ہندی جیسی غیر معروف اور غیر ترقی یافتہ زبان کو بھارت کی قومی زبان کا درجہ دیا گیا آخر کیوں؟

ایم مسعود صاحب نے دنیا کے لگ بھگ ڈیڑھ سو سے زائد ملکوں کی فہرست میں سے چند ملکوں کے نام بھی گنوائے ہیں جہاں ایک سے زائد قومی زبانیں رائج ہیں مثلاً سوئٹزرلینڈ، کینیڈا، سری لنکا، افغانستان اور لبنان وغیرہ۔ یوں تو لوگ اپنے موقف کی تائید میں قرآن حکیم اور احادیث سے بھی مطلب کی دلیلیں لے آتے ہیں لیکن اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو مذکورہ بالا مثالیں ایم مسعود صاحب کے موقف کو تقویت نہیں پہنچاتیں۔ اسے کمزور کرتی ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کی مثال ہمارے دانشور ہر سانس کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ ملک دنیا کا انوکھا اور

عجیب ملک ہے۔ یہ فرانس، اٹلی اور جرمنی کی نسلوں پر مشتمل ہے۔ ان تین ممالک کے حصے کاٹ کر سوئٹزرلینڈ کا قیام عمل میں آیا ہے اور نسلی اور لسانی طور تینوں علیحدہ اور مختلف اقوام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر قوم نے اپنی قومی زبان کو اپنانے پر اصرار کیا اور یہ تمام زبانیں سوئٹزرلینڈ کی قومی زبانیں قرار دے دی گئیں لیکن یہ بھی نہ بھولیے کہ ہر اعتبار سے سوئٹزرلینڈ دنیا کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ تعلیم اور ٹیکنیکی علوم میں وہ پاکستان تو کیا دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں سے بھی آگے ہے۔ لوگوں میں رواداری بھی ہے اور قوت برداشت بھی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے لوگوں میں جو شعور اور آگہی پائی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی ترقی پذیر ملکوں میں نہیں ہے۔ کوئی مثال پیش کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ وہاں کے حالات، تمدن، تہذیب، مزاج اور پس منظر کے ساتھ ساتھ قومی اور انفرادی شعور کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ یہ وہ ملک ہے جو انتہائی مختصر اور محدود ہونے کے باوجود دوسری عالمگیر جنگ کی آگ سے محفوظ رہا۔ اس چھوٹے سے ملک میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ اس نے اپنی غیر جانب دار حیثیت متحارب طاقتوں سے منوائی اور اس کا احترام کرایا۔ پاکستان کے مسائل کا تقابل اور موازنہ سوئٹزرلینڈ جیسے ملک سے کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ کیا ایسے ملک سے ہم اپنے پسماندہ اور ہر اعتبار سے ترقی پذیر ملک کا موازنہ کر سکتے ہیں؟

دوسرا ملک کینیڈا ہے۔ امریکا کی طرح یہ بھی ایک نیا ملک ہے۔ مگر ہوا یہ کہ جب گوری اقوام نے کینیڈا میں آباد ہونا شروع کیا تو آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جو فرانس کے باشندوں پر مشتمل تھا۔ صوبہ کیوبیک میں آباد ہو گیا۔ فرانسیسی زبان اور کلچر کے معاملے میں انتہائی متعصب ہیں اور انگریزوں اور انگریزی سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر ہے چنانچہ ان مخصوص حالات کے تحت انہوں نے فرانسیسی کو بھی قومی زبان بنانے پر اصرار کیا۔ خود ان کے صوبے کیوبیک سے انہوں نے انگریزی (اور انگریزوں کو) تقریباً جلاوطن کر دیا ہے۔ یہ وہ صوبہ ہے جو سولہا سال سے فرانس سے الحاق کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور صدر ڈیگال کے دورِ حکومت میں تو جب انہوں نے کیوبیک کا دورہ کیا تو کینیڈا نے رسمی طور پر بھی فرانس کی حکومت سے ان کی فرانس نواز سرگرمیوں پر احتجاج کیا تھا۔ گویا کینیڈا جیسے ترقی یافتہ اور باشعور ملک میں بھی زبان اور کلچر کے اس مسئلے نے ایک مسلسل آویزش اور کشمکش کی فضا پیدا کر رکھی ہے اور سیاسی مبصرین کا اندازہ ہے کہ زود یا بدیر یہ صوبہ کینیڈا سے علیحدہ ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اس ملک کی علاقائی زبانیں نہیں ہیں۔ یہ دو علیحدہ اقوام کی زبانیں ہیں اور اس ملک میں دو مسلمہ مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ پاکستان کے حالات سے ان حالات کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

اب سری لنکا کی بھی سن لیجیے۔ یہاں سنہالی اور تامل دو زبانیں قومی زبانیں ہیں۔ نسلی لسانی اور تمدنی اعتبار سے یہ دونوں یکسر مختلف اقوام ہیں اور ان کی باہمی آویزش اور کشیدگی گزشتہ دنوں جس انتہا کو پہنچ گئی تھی اس کا تماشا ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ یہ دو مختلف اقوام آج بھی برسرِ پیکار ہیں اور عام خیال یہی ہے کہ سری لنکا کے تامل اکثریت کے علاقے بھارت کے ساتھ الحاق کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہیں بھارتی حکومت اور رہنماؤں کی آشیر واد بھی حاصل ہے اس پس منظر میں سری لنکا کی مثال ہمارے لیے باعثِ عبرت ہے، نا کہ قابلِ تقلید۔

اس کے بعد ذرا اسرائیل کی طرف نظر ڈالیے۔ یہ ملک دنیا بھر کی اقوام کا ملغوبہ ہے۔ یورپ اور ایشیا کے ہر ملک سے یہودی نقل وطن کر کے اپنے نئے ملک میں آباد ہوئے ہیں۔ پاکستان کے بعد یہ دوسرا ملک ہے جو مذہب کے نام پر قائم ہوا ہے، جس ملک اور قوم کے لوگ اسرائیل پہنچے وہ اپنی زبان اور کلچر ساتھ لے کر گئے مگر اسرائیل نے اپنی قومی اور سرکاری زبان کے طور پر ''عبرانی'' کو منتخب کیا جو موجودہ عہد میں ایک ''مردہ'' زبان ہے۔ کتب خانوں اور مذہبی صحیفوں کے سوا اس زبان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ یہ انتہائی مشکل اور ناقابلِ فہم زبان ہے مگر اس کو اسرائیل جیسی ترقی یافتہ اور جدید مملکت کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے ہمسایوں کے ٹکڑے کر کے اپنی جغرافیائی سرحدیں بڑھا رہا ہے۔

افغانستان میں پشتو اور فارسی بولنے والوں کی آبادی ہے لیکن عملی طور پر (اور سرکاری طور پر بھی) فارسی زبان کو قومی زبان کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حالانکہ پشتو بذاتِ خود ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور آبادی کی بہت بڑی تعداد پشتو بولتی ہے۔ لبنان کی مثال بھی ایم مسعود صاحب نے پیش کی ہے مگر یہ فراموش کر بیٹھے کہ لبنان میں قومی زبانیں

شیکسپیئر

ایک سے زائد ہیں مگر اقوام اور نسلیں بھی ایک سے زائد ہیں اور ان کے اختلافات اور تعصبات جس انتہا کو پہنچ چکے ہیں ان کا ثبوت ساری دنیا کے سامنے ہے۔ یہ بدقسمت ملک آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہے۔ حالانکہ بقول مسعود صاحب، یہاں کے داناؤں نے ایک قومی زبان رائج کرنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ مسعود صاحب نے یہ دلیل دی ہے کہ محض جغرافیائی تقسیم کی بنا پر زبان مختلف نہیں ہوسکتی۔ مثلاً عرب ممالک کی سرحدیں علیحدہ ہیں مگر زبان ایک ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عرب ممالک کی یہ تقسیم مصنوعی ہے جو سامراجی طاقتوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کی تھی ورنہ درحقیقت عرب ایک ہی قوم ہیں اس لیے ان کی زبان اور تہذیب بھی بنیادی طور پر ایک ہی جیسی ہے۔

اب ذرا اس کے برعکس چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ امریکا کی نئی دنیا دریافت ہوئی تو یورپ اور دنیا کے گوشے گوشے سے لوگوں نے وہاں کا رخ کیا۔ ہسپانوی، اطالوی، فرانسیسی، جرمن، انگریز، ڈچ غرض یہ کہ ہر جگہ کے لوگ وہاں آباد ہوئے۔ اس کے باوجود وہاں کی قومی زبان ایک ہے جب کہ تہذیبیں اور اقوام مختلف ہیں لیکن شاید ابراہم لنکن اور جارج واشنگٹن اتنے بڑے دانشور نہیں تھے کہ مختلف قومی زبانیں اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے۔ ہسپانوی دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں سے ہے، اطالوی بھی ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود امریکا کی قومی زبان صرف ایک ہے یعنی انگریزی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید یہ ملک ریاست ہائے متحدہ نہ رہتا اور اس کا شیرازہ بکھر چکا ہوتا۔ انگلستان ہمارے دانشوروں کے لیے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے مگر اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ اور ویلز کی زبانوں کی موجودگی میں وہاں انگریزی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور آج بھی انگریزی ہی وہاں کی قومی اور سرکاری زبان ہے مگر اس کے باوجود یہ ملک آج بھی "یونائیٹڈ کنگ ڈم" ہے اور ایک زبان ٹھونسنے کے باوجود اس کے ٹکڑے نہیں ہوئے۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقا میں یورپ کی تمام اقوام نے ڈیرہ جمایا مگر وہاں کی قومی زبان محض ایک ہے۔ انگریزی مگر کیا بات ہے کہ دوسری اقوام اور دوسری زبانیں بولنے والوں کو ان ملکوں میں احساسِ محرومی پیدا نہیں ہوا؟ سب سے زیادہ حیرت امریکا کے رہنے والوں پر ہے۔ ہسپانوی کو غیر رسمی طور پر امریکا کی دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ جنوبی امریکا کی زبانیں بولنے والے بھی بہت بڑی تعداد میں یہاں آباد ہیں۔ وہ آج بھی اپنی زبان بولتے ہیں۔ اپنے کلچر پر فخر کرتے ہیں۔ اپنی رسوم پر کاربند ہیں۔ شادی بیاہ بھی اپنے آبائی ملکوں میں جاکر کرتے ہیں مگر قومی زبان کے طور پر انگریزی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں امریکا میں ایسے ہسپانوی اور اطالوی لوگوں سے بھی ملا ہوں جو بیس بائیس سال سے امریکی ہیں مگر انگریزی زبان سے نابلد۔ ان کی نئی نسلیں انگریزی بولتی ہیں اور اپنے بزرگوں کے لیے مترجم کے طور پر فرائض ادا کرتی ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دلیل کہ اپنی زبان ترک کر کے کسی اور مشترک زبان کو اپنانے کا مطالبہ "چاند کو زمین پر اتارنے کی ناکام کوشش کے مترادف ہے" غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک قومی زبان

اختیار کرنے سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ علاقائی زبانوں کا وجود ختم کردیا جائے۔ اس کے برعکس علاقائی زبانوں کی ترویج اور ترقی کے لیے موثر اور منظم کوشش کرنی چاہیے، جو لوگ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا گیا ہے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستان میں تو حکمرانوں نے آج تک قومی اور سرکاری زبان اردو کے ساتھ بھی وہی بلکہ اس سے بدتر سلوک روا رکھا ہے۔ احساس محرومی کسی ایک زبان کو رائج کرنے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتا (جب کہ اس زبان کو باقاعدہ، باضابطہ اور موثر طور پر رائج بھی نہیں کیا گیا) یہ رہنماؤں کی بے عملی، حکمرانوں کی بے تدبیری اور دانشوروں کی خود غرضی کے سبب نشوونما پاتا ہے۔ ہاں جو لوگ پاکستان کو مختلف قوموں کا ملک سمجھتے اور قرار دیتے ہیں انہیں چاہیے کہ زبان اور تہذیب کے پردے میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ لوگ ماضی قریب میں تحریکِ پاکستان کے مقاصد کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر تاریخ کے صفحات میں ابھی یہ تحریر دھندلی نہیں ہوئی ہے کہ قیام پاکستان کے لیے دلیل ہی یہ پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو قومیں آباد ہیں اور مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جن کا مذہب، تہذیب، تمدن اور زبان ایک ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی اکثریت نے اس مطالبے کی تائید کی تھی یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور پاکستان حاصل کرلیا۔ اگر یہ فلسفہ اور نظریہ درست نہیں تھا تو پھر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پنجابی، بلوچی، سندھی اور پختون تو غیر منقسم ہندوستان میں بھی تھے۔

انگلستان میں، جہاں قومی زبان اردو نہیں ہے اگر کوئی چوتھی یا پانچویں جماعت کا بچہ آپ سے غالب اور میر کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تو آپ کیا سوچیں گے؟ غالب اردو ادب میں کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں کے نصاب میں غالب کو پڑھانے پر وہ زور نہیں دیا جاتا جو شیکسپیئر کو پڑھانے پر دیا جاتا ہے۔ کولمبو میں ایک پانچویں جماعت کی بچی نے جھنجلا کر اپنی ہوم ورک کی کاپی سے سر اٹھایا اور پوچھنے لگی۔

”انکل! کیا آپ کے ملک میں بھی شیکسپیئر ہوتا ہے؟“

غالباً مراد اس کی یہ تھی کہ کیا آپ کے ملک میں بھی نصاب میں شیکسپیئر پڑھایا جاتا ہے؟ چنانچہ ہم نے فخریہ انداز میں کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہمارے ہاں تو بچہ بچہ شیکسپیئر کا نام جانتا ہے۔ دیکھو بیٹے، ولیم شیکسپیئر بہت بڑا ڈراما نگار تھا۔ اس کی عظمت میں تو کلام ہی نہیں ہے۔“

”واقعی آپ سچ کہتے ہیں۔ اگر اتنا بڑا ڈراما نگار نہ ہوتا تو ہماری چھٹی کلاس کے سلیبس میں نہ شامل ہوتا۔“ پھر ایک لمحہ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”انکل آپ نے شیکسپیئر کو پڑھا ہے؟“

”کبھی جو شخص انگریزی پڑھتا ہے وہ شیکسپیئر کو ضرور پڑھتا ہے۔“

”تو پھر بتایئے! کیا وہ آپ کو اچھا لگتا تھا۔ آپ شوق سے اس کے ڈرامے پڑھا کرتے تھے؟“

یہ سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ سچ پوچھیے تو دل بہلاوے کی خاطر پڑھنے کی غرض سے ہمیں کبھی شیکسپیئر اچھا نہیں لگا مگر اس کے بارے میں لکھوائے گئے نوٹس ہمیں بڑی پابندی اور دلجمعی سے یاد کرنے پڑتے تھے۔ بہرحال لڑکی کا دل بہلانے کے لیے ہم نے مختصر سا جواب دے دیا۔ ”ہاں! ہمیں اچھا لگتا تھا اور تمہیں؟“

چھوٹی لڑکی نے برا سا منہ بنایا۔ ناک سکیڑی اور شانے اچکا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس ایک واقعے نے ہمیں شیکسپیئر کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا کردیا۔ آخر شیکسپیئر میں وہ کیا خاص بات ہے کہ ہم تیسری دنیا کے ایشیائی ملکوں میں شیکسپیئر کو گھوٹ کر پلا دیا جاتا ہے مگر کیا اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے؟ شیکسپیئر کے ڈرامے، شیکسپیئر کے کردار، شیکسپیئر کی ٹریجیڈیز، یہ سب آگے چل کر ہماری روز مرہ کی زندگی پر کیا اثر ڈالتی ہیں؟

ہم واپس لاہور آئے تو ہماری بیٹی ساتویں جماعت کا کورس لیے بیٹھی تھی اور سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھ دیکھ کر برے برے منہ بنا رہی تھی۔

”کیا کوئی سوال سمجھ میں نہیں آرہا؟“ ہم نے اخلاقی ہمدردی کے خیال سے پوچھا۔

”نہیں پاپا۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”ہم شیکسپیئر کے بارے میں نوٹس یاد کررہے ہیں۔“

لیجیے پھر وہی شیکسپیئر یہاں بھی آگیا۔ تیسری دنیا کے وہ تمام ممالک جہاں انگریزوں کا راج رہا ہے وہاں آج بھی شیکسپیئر کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان میں خواہ پاکستان ہو،

انتظار حسین

بھارت ہو، سری لنکا ہو یا بنگلہ دیش۔ ہر ملک کے طالب علموں کو ابتدائی کلاسوں ہی سے شیکسپیئر رٹانا شروع کر دیا جاتا ہے پھر آگے چل کر وہ دور آتا ہے جب انہیں اسٹیج پر شیکسپیئر کے ڈرامے قدیم زمانے کے فرسودہ لباس پہن کر قدیم انداز کے لب و لہجے میں انگریزی بول کر پیش کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ڈرامے محض برائے ڈراما ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کام کرنے والے ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور نہ دیکھنے والے۔ ہاں ان معدودے چند ''دانشوروں'' کی بات اور ہے جو شیکسپیئر کا نام سنتے ہی آنکھیں موند کر کسی ماورائی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے کچھ معلومات اپنی بچی سے حاصل کرنی چاہئیں۔ ''یہ بتاؤ۔ شیکسپیئر تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

اس نے خاموشی سے شانے ہلا دیے۔

''تم نے پہلی بار شیکسپیئر کب پڑھا تھا؟''

جواب ملا۔ ''پانچویں جماعت میں شیکسپیئر کی تین کہانیاں ہمارے کورس میں شامل تھیں۔''

''وہ کہانیاں تمہیں اچھی لگی تھیں؟''

''بالکل نہیں۔'' پھر اس نے مزید معلومات فراہم کیں۔ ''پاپا شیکسپیئر کے ڈرامے اور ٹریجیڈیز کے بارے میں ہمیں اتنا کچھ بتایا جاتا ہے مگر ہمارے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو اس زمانے کے رسم و رواج اور آداب بتائے جاتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا واسطہ؟ پھر وہ زبان پڑھائی جاتی ہے جو اب دنیا میں کہیں نہیں بولی جاتی۔ خود شیکسپیئر بھی آج زندہ ہوتا تو یہ زبان استعمال نہ کرتا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ شیکسپیئر تو انسانی جذبات کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ انسانیت کا پیامبر ہے اس کی ٹریجیڈیز۔''

''ٹریجیڈیز؟'' وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''کنگ لیئر بھی کوئی ٹریجیڈی ہے۔ ہمیں تو اس پر ذرا بھی رونا نہیں آتا اور پاپا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ لوگوں کو مار مار کر ٹریجیڈی پیدا کرو۔ ہمیں تو ان کہانیوں پر ہنسی آتی ہے نہ رونا۔''

''فضول خیالات کا اظہار مت کرو۔ جانتی ہو کہ شیکسپیئر رہتی دنیا تک باقی رہنے والی شخصیت ہے۔ تمہارے نہ سمجھنے سے اس کا کیا بگڑ سکتا ہے؟''

''پاپا ناراض نہ ہوں۔ چند ٹیچرز کے سوا اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ پھر بھی اس کا کیا بگڑتا ہے، وہ ہر کورس کی کتاب میں موجود ہے۔''

''یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔'' ہم نے کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہیں شیکسپیئر کے بارے میں کیا نوٹس لکھوائے گئے ہیں۔''

''شیکسپیئر کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ ابھی تو مس ہمیں اس زمانے کے انگلستان کے بارے میں نوٹس لکھوا رہی ہیں جن دنوں شیکسپیئر لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے کے طور طریقے، لباس، رہن سہن، انگریزوں کی عادتیں اور خصلتیں۔ پاپا کیا ایک شیکسپیئر کو پڑھنے کے لیے ساری انگلش ہسٹری پڑھنی ضروری ہے؟''

ہمارے ماہرین تعلیم تو خیر کبھی ان مسائل پر کیا سوچتے ہوں گے مگر بچے اور ان کے والدین یقیناً اس بات پر غور کرنے پر مجبور ہیں کہ اسکول کی چھوٹی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اونچی کلاس تک ہمارے ہاں نصاب کے ذریعے شیکسپیئر گھول کر طلبہ کو پلایا جاتا ہے۔ اس کی عظمت ان کے ذہنوں پر بٹھائی جاتی ہے تو آخر عملی زندگی میں انہیں اس سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ صرف شیکسپیئر ہی نہیں۔ دوسرے انگریزی کے لکھنے والوں کے بارے میں ہماری نسل جو کچھ سیکھتی اور پڑھتی ہے۔ اسکول اور کالج سے باہر نکلتے ہی اسے فراموش کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں روزمرہ کی زندگی میں ان کے لیے بے کار ہیں۔ سیزر، ہیلمٹ، میکبتھ، لیئر ان سب کا آج کے پاکستانی نوجوان کی زندگی سے کیا تعلق اور واسطہ ہے اور ان کو پڑھ کر ہماری نئی نسل آخر کیا

حاصل کرسکتی ہے؟ حالت یہ ہے کہ اسکول اور کالجوں میں شیکسپیئر گھوٹ گھوٹ کر پلایا جاتا ہے اس کی تحریروں کے اعلیٰ نکات سمجھائے جاتے ہیں مگر ذرا ایمان سے سوچیے کہ کتنے لوگ ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد وقت گزاری یا محض دلچسپی کے لیے بھی شیکسپیئر کو پڑھتے ہیں؟ انگریزی کے بے شمار مقبول مصنف ہیں جنہیں انگریزی داں دلچسپی سے پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان میں رومانٹک رائٹر بھی ہیں اور جرائم کی کہانیاں لکھنے والے بھی لیکن جیمز ہیڈلے چیز کو جس بڑے پیمانے پر اور جس قدر دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ کیا شیکسپیئر کے بارے میں بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ شیکسپیئر کو زبردستی اعصاب اور دماغ پر نازل کیا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے بعد یہ نقش بالکل معدوم ہوجاتا ہے۔

شیکسپیئر کے بارے میں گزشتہ سالوں میں تحقیقات کے بعد بہت سے انکشافات بھی کیے گئے۔ اکثر دوسرے مصنفین کے ڈراموں سے اس کا موضوع ٹکراتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شیکسپیئر نے اپنے تمام ڈراموں کے لیے خیالات دوسری جگہوں سے مستعار لیے تھے بلکہ ایک محقق نے تو یہ بھی ثابت کردیا کہ شیکسپیئر نامی کسی شخصیت کا وجود نہیں تھا۔ یہ محض ایک قلمی نام ہے اس کے باوجود انگریز نہ تو خود اپنے ذہنوں سے شیکسپیئر کی عظمت کا خول اتارنا چاہتے ہیں اور نہ ہم ایشیائیوں کے ماہرین تعلیم شیکسپیئر کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔

بعض پرستار کہتے ہیں کہ شیکسپیئر کے ڈرامے محض پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ دوسرے کہتے ہیں کہ شیکسپیئر کا ڈراما اسٹیج پر سحر طاری کردیتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم نے خود لندن میں بھی شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھے ہیں۔ تماشائی منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے مرعوب بیٹھے دیکھتے رہے۔ قسم لے لو جو کسی نے واقعی Injoy کیا ہو۔ ہمارے ملکوں میں بھی شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھنے والوں کی تعداد مٹھی بھر ہے۔ ان میں سے بھی اکثریت خاموش بت بنی دیکھتی رہتی ہے۔ ڈراما دیکھنے کا یہ انداز تو نہیں ہوتا؟ لیکن وجہ یہ ہے کہ کیوں کہ بچپن ہی سے ہمیں شیکسپیئر کی عظمت اور خوبیاں زبانی یاد کرادی جاتی ہیں اس لیے کسی میں یہ اخلاقی جرأت نہیں کہ اظہار ناپسندیدگی کرسکے۔ ڈراما دراصل جیتے جاگتے کرداروں کا مظہر ہونا چاہیے۔ نا کہ ہزاروں سال پرانی تہذیب کا نوحہ معلوم ہو۔ کردار بے جان، الفاظ زندگی کی حرارت سے خالی۔ البتہ تیکنیکی خوبیاں آپ ان میں چاہے جتنی تلاش کرلیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شیکسپیئر کا ڈراما دیکھنے کے لیے بمشکل ایک سو آدمی آتے ہیں اور وہ بھی ڈرامے کے دوران میں جمائیاں لیتے رہتے ہیں مگر ڈرامے کے اختتام پر بڑے زور و شور سے اس کے فنی پہلوؤں پر بات چیت کرتے ہیں۔

ایک دانشور نے یہ سوال برمحل اٹھایا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم انگریزی زبان کے گڑے مُردوں کو اکھاڑ کر اپنے نونہالوں کے ذہنوں میں دفن کردیں جب کہ اس سے انہیں حاصل کچھ نہ ہوگا۔ انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اپنی ہر چیز کی طرح اپنے ادب کو بھی عالمگیر بنادیا تھا مگر آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر مصنف اور تصنیفات محض لائبریریوں کی زینت بن کر رہ جائیں گی۔ زندگی بہت تیزی سے رواں دواں ہے۔ 1884ء کے چارلس ڈکنس سے آج کے پاکستانی بچے کو بھلا کیا واسطہ ہوسکتا ہے؟ Great Expectations تو شاید وہ ہضم کرلے مگر پک وک پیپرز اس کے حلق سے کیونکر اتریں گے مگر اصرار یہ ہے کہ یہ کلاسیکی ادب ہے جو لوگ محض تفریح یا دل بستگی کے لیے پڑھتے ہیں ان کے نزدیک مذکورہ مصنف قصۂ پارینہ بن چکے ہیں مگر ہمارے نصاب کی کتابوں میں آج بھی بچے ان کو پڑھنے پر مجبور ہیں مگر کیا یہ جائز ہے؟

☆......☆

زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ آج کے نوجوان کل کے جوان اور تجربہ کار بوڑھے کہلاتے ہیں۔ آج بھی جب میں اخبارات میں بعض صحافیوں اور سیاستدانوں کے لیے بزرگ سیاستدان یا بزرگ صحافی کے خطابات پڑھتا ہوں تو ہنستا ہوں۔ ان لوگوں پر نہیں بلکہ زمانے کی نیرنگی پر یہ ہمارے ہمعصر ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے سینئرز ہیں مگر جب ہم نے انہیں پہلے پہل دیکھا تو یہ نوجوان تھے۔ کامیابیوں کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے، ہر شعبے میں بے شمار نوآموز اور ناتجربہ کار داخلے کی راہیں تلاش کررہے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اب وہ ادھیڑ عمر یا بوڑھے ہوچکے ہیں۔ آج کی نسل کے لیے وہ بزرگ ہیں مگر اپنے ہمعصروں کے نزدیک ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مثلاً جب میں اپنے صحافی اور اہلِ قلم دوستوں کو دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ بات بات پر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے والا لَبّے پر دانس

سابق صدر پرویز مشرف اور فضل نورد

کھلنڈرا نوجوان ایک دن پنجابی اور اردو شاعری کا بزرگ ستون بن جائے گا۔ میری مراد منیر نیازی سے ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ منیر نیازی کبھی سعادت حسن منٹو، کبھی ابراہیم جلیس، کبھی شاد امرتسری اور نصیر انور کے ساتھ آفاق کے دفتر میں آکر گھنٹوں چائے پیتا اور لطیفے سناتا تھا مگر اب وہ جہاں دیدہ اور قابلِ احترام بزرگ شاعر ہے۔ انتظار حسین کو دیکھ لیجیے لڑکے سے لگتے تھے۔ آفاق میں میرے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ان کی ادبی عظمت کو کبھی ان کے سامنے ہم نے تسلیم کر کے نہیں دیا۔ کبھی ان کے محاوروں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کبھی الزام ہے کہ انتظار صاحب تو ٹکسالی زبان نہیں بلکہ باپوڑا اور خواجہ کی مقامی زبان لکھتے ہیں۔ جنہیں اہلِ پنجاب مرعوب ہو کر ''شستہ اردو'' سمجھ لیتے ہیں۔ انتظار حسین بڑے مرنجا مرنج نوجوان تھے۔ ہاں ادبی بحث شروع ہو جائے تو ان کے گلے میں نہ جانے کہاں سے لاؤڈ اسپیکر فٹ ہو جاتا ہے ورنہ بہت دھیمی آواز میں بولنے والے زیرِ لب مسکرانے والے۔ اپنی زبان کی غلطیوں کی نشاندہی پر بھی مسکرا کر محض یہ کہہ کر رہ جاتے تم کیا جانو زبان کیا ہوتی ہے؟'' اب وہ ثقہ ادبی شخصیت ہیں، بزرگ ادیب۔ صحافیوں میں بہت سے صحافی جو آج اخبارات کے صفحات پر دندنا رہے ہیں اس وقت صحافت میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے جب ہم نے صحافت کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں ہمارے ساتھ کام کرنے والے حبیب اللہ اوج، جمیل الزماں، عبدالسلام خورشید، ظہور عالم شہید، خالد لطیف، زاہد چودھری، سردار فضلی، ہدایت اللہ آضر، بشیر احمد، ارشد ابو صالح اصلاحی (مرحوم)، میاں محمد شفیع، ممتاز احمد خاں، امجد حسین، احمد بشیر، ظہیر بابر، خورشید الاسلام، حمید ہاشمی مرحوم، عبداللہ ملک، افتخار احمد وغیرہ تھے۔ آج ان میں کتنے ہی فوت ہو گئے

مجید نظامی

ہیں۔ باقی ماندہ ''بزرگ صحافی'' بن گئے ہیں۔ آج کے ضیاء الاسلام انصاری، عبدالقادر حسن وغیرہ ہمارے کچھ بعد وارد ہوئے اور ان کے بعد آنے والے تو اور بھی نوعمر ہیں۔ مجید نظامی نوائے وقت کے مدیر اور متین ایڈیٹر ہیں۔ میں نوائے وقت میں تھا تو مجید نظامی ابھی اخبار سے وابستہ بھی نہیں ہوئے تھے بعد میں ایک صحافی وفد سندھ شمالی علاقوں کے دورے پر گیا تھا مجید نظامی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ آج کے زرعی کالم لکھنے والے سیلانی ان دنوں جونیئر انفارمیشن آفیسر تھے۔ مجید صاحب شروع سے ہی کم گو ہیں مگر اب تو غالباً ''کمترین گو'' ہو گئے ہیں مگر مجھے جب ان کا خیال آتا ہے وہی مسکراتی ہوئی تصویر نگاہوں میں ابھرتی ہے جو سات آٹھ دن کی ہمسفری کے دوران میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔ ذکی الدین پال نوائے وقت میں رپورٹر تھے اور قانون کے طالب علم بھی، بہت دردمند اور ذمے دار نوجوان تھے۔ ایک بار رات کو ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے میں نے ایک کامن پن نگل لی۔ یار لوگوں نے بہت الٹا لٹکا کر دبایا جھٹکے دیے مگر پن نہ نکلی۔ ایک کاتب نے بتایا کہ یہ تو خون کی رگ میں جاکر خون میں شامل ہو جائے گی اور کسی بھی جگہ اٹک کر مصیبت ڈال دے گی۔ یہ خبر سن کر میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھ سے زیادہ ہوش ظہور عالم شہید کے اڑے جو نیوز ایڈیٹر انچارج تھے۔ فوراً تانگہ لایا گیا اور ذکی الدین پال کی سربراہی میں چند لوگ ہمیں بے ہوشی کے عالم میں لے کر میو اسپتال گئے۔ وہاں دو روز تک کیا ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے مگر میں ڈر کے مارے بار بار ہوش میں آتا اور بار بار بے ہوش ہوتا۔ جب ہوش میں آتا ذکی الدین پال میرے پاس بیٹھے نظر آتے۔ اگلے دن ڈاکٹر عالم نے ایکسرے لے لیا

اور کہا کہ پن جسم میں موجود نہیں ہے مگر میں اپنے گلے، دل، جگر اور نہ جانے جسم کے کن کن حصوں میں سوئی کی خیالی چبھن محسوس کرتا اور شور مچاتا کہ نہیں پن ابھی جسم میں موجود ہے۔ اسپتال سے واپس آنے کے دو دن بعد ایک روز کھانا کھا رہا تھا کہ نوالے میں کوئی چیز چبھی دیکھا تو ایک زنگ آلود پن تھی۔ یہ معما آج تک حل نہیں ہوا کہ یہ پن وہی تھی جو میں نے نگلی تھی؟ اور اگر وہی تھی تو اتنے دن تک کہاں غائب رہی۔ بہرحال یہ واقعہ بعد میں لطیفہ بن گیا اور ضرب المثل کے طور پر نوائے وقت میں کام کرنے والے ہر نووارد سب ایڈیٹر کو سنایا جاتا رہا۔

ذکی الدین پال نے بعد میں زور شور سے وکالت کی اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ زور شور سے پنجاب ہائی کورٹ کے جج رہے اس عرصے میں ایک بار بھی میری ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک بار میں اپنی شادی کے بعد مری گیا تو ایک ہوٹل میں دور سے ذکی الدین پال صاحب نظر آئے۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ جج صاحب ہمارے بے تکلف ساتھی تھے تو جج صاحب کی سنجیدگی اور متانت دیکھ کر اسے یقین نہ آیا۔ ذکی صاحب دور چند لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے اس وقت ملاقات کو نامناسب سمجھا مگر آج تک کوئی موقع غنیمت نہ ملا کہ ذکی صاحب سے ملاقات ہوتی۔

☆......☆

فضل محمود کا ایک ریکارڈ عمران خان نے توڑ دیا تھا۔ آج کی نسل کے لیے عمران خان ہی آئیڈیل ہے اور سچ بھی یہ ہے کہ عمران خان نے پاکستان میں کرکٹ کو ایک رومانٹک امیج دینے میں بہت مدد کی ہے۔ قیامت کے باؤلر اور آفت سے بھرے ہوئے بیٹسمین تھے مگر میرے دھیان کی گلیوں میں فضل محمود گھوم رہے ہیں۔ عمران تو اگلی نسل ہیں۔ نسل اسی وقت اچھی ہوتی ہے جب پچھلے اہلِ خاندان کا شجرہ اور کارنامے یاد ہوں۔ فضل محمود اور حنیف محمد کا عروج ہماری آنکھوں دیکھتے ہوا' یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں گھر گھر کرکٹ کو پہنچانے میں ان دونوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یوں تو کاردار بھی تھے' امتیاز، وقار، نذر محمد، خان محمد، محمود حسنین، صادق بھی تھے گویا ایک لمبی قطار ہے۔ جنہوں نے کرکٹ کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے خدمات سرانجام دیں مگر گھر گھر اس کھیل کو مقبول کرنے کا سہرا فضل محمود اور حنیف محمد کے سر ہے۔ جسے دیکھیے فضل یا حنیف بننے کی کوشش کررہا ہے۔ ضرب المثل کے طور پر اب یہ فقرہ متروک ہوگیا تھا کہ ''تم کون سے بریڈمین یا ملر ہو۔'' اس کی جگہ عام ہوگیا تھا۔

''کیا اپنے آپ کو حنیف اور فضل سمجھتے ہو؟''

حنیف پر فضل کو جو فوقیت حاصل تھی۔ وہ ان کی شخصیت تھی، ایسا بانکا سجیلا گورا، سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقش کا مالک، نیلی آنکھیں، شربتی بال، قد و قامت مثالی اس پر گفتار الٰہی میٹھی اور بے تکلف۔ اگر یہی شخص ''اودل'' کا ہیرو بھی ہوتو سمجھیے کہ قیامت آگئی۔ فلمی اداکاروں پر وہ ہجوم اور پروانہ وار یورش نہیں دیکھی جو فضل محمود کے مقدر میں تھی۔ ہندوستان کے دورے پر گئے تو کروڑوں دلوں کو دھڑکتا چھوڑ آئے۔ انگلستان گئے تو حسینانِ فرنگ کو لوٹ لیا۔ ''اودل'' کی فتح کے بعد جب ایک شام پاکستانی پولیس کی وردی میں ملبوس ایک اسمارٹ اور خوش رو نوجوان لندن کے ایک سینما میں داخل ہوا تو چاروں طرف تہلکہ مچ گیا۔ ''فضل...... فضل۔'' انگریز قوم جو بہت منظم اور مہذب ہے (اور اس زمانے میں واقعی ہوا کرتی تھی) چوکڑی بھول گئی۔ جسے دیکھیے فضل پر ٹوٹا ہوا ہے۔ بڑے سے بڑے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے دل میں فضل سے ملنے کی خواہش تھی اور لڑکیاں تو شاید اس زمانے میں خواب میں اودل کے ہیرو کو دیکھا کرتی تھیں۔ ان میں ہر ملک کی لڑکیاں شامل کر لیجیے۔

فضل فلمی حلقوں میں بھی ہیروز سے زیادہ مقبول اور ہردلعزیز تھے۔ ہیروئن آگے پیچھے پھر رہی ہیں۔ فلم ساز کام کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر ایک بات میں فضل محمود کی تعریف میں ضرور کروں گا۔ خدا نے فضل محمود کو جو شخصیت جو شہرت اور عروج عنایت کیا تھا اس کا ایک چوتھائی بھی کسی اور کو ملتا تو دماغی توازن کھو بیٹھتا۔ مگر فضل ہمیشہ ایک متوازن اور نارمل انسان رہے۔ بعد میں یہی خوبی میں نے عمران خان میں پائی۔ یہ خدا کا بندہ بھی تعریف شہرت حسن و جمال کسی بات پر نازاں نہیں رہا۔ خدا خوش رکھے اور اسی طرح کامیاب و کامراں رکھے۔ یہ لوگ جو کچھ پاچکے ہیں اس کے مستحق ہیں اور جو انہیں اب تک نہیں ملا وہ بھی ان کا حق ہے۔

ہاں تو بات فضل محمود کی ہورہی تھی۔ ہوٹل کے کمروں میں دوستوں کے دفتروں میں فضل محمود بے تکلفی سے آجاتے، نان کباب کھائے جارہے ہیں، گپیں ہورہی ہیں مگر فضل کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی تعریف اور اپنے

کارناموں کا زیادہ بیان نہیں کرتے تھے۔ البتہ لطیفے کے طور پر کچھ واقعات ضرور سنا دیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار جب وہ پولیس کی ڈیوٹی کے سلسلے میں ایک علاقے میں متعین تھے، دیکھا کہ ایک دیہاتی ہٹا کٹا چور مالِ غنیمت لے کر بھاگ رہا ہے۔ انہوں نے جیپ میں پیچھا کرنا چاہا مگر راستہ دشوار گزار تھا۔ جھٹ جیپ سے کود کر پیدل دوڑنے لگے۔ میل ہا میل تک دونوں آگے پیچھے دوڑتے گئے۔ وہ دیہات کا پلا ہوا چور بھاگنے میں طاق۔ یہ اوول کے ہیرو اور اسپورٹس مین دوڑنے میں کب ہار مان سکتے تھے۔ کئی میل کا سفر طے ہو گیا مگر نہ چور بھاگنے سے باز آیا نہ فضل محمود تعاقب کرنے سے۔ آخر ایک جگہ چور تھک ہار کر کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ فضل محمود بھی جا کر پاس ہی دراز ہو گئے اور سانس درست کرنے لگے۔ دونوں کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو چور نے بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تھانیدار جی میں نے تمہارے جیسا جوان پولیس میں نہیں دیکھا۔

فضل مسکرائے اور بولے مگر کرکٹ کے میدان میں تو دیکھا ہوگا۔ بعد میں انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ چور نے کرکٹ کبھی نہیں کھیلی تھی۔ نہ کبھی میچ دیکھا تھا مگر فضل محمود کا نام جانتا تھا فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا اور کہا۔ ''اجی پہلے بتا دیا ہوتا کہ تو فحلا ہے۔''

فضل نے بہت فتوحات حاصل کیں مگر آخر ایک دن ریٹائر ہونا تھا۔ کچھ عرصے بعد صوفیت کی طرف مائل ہو گئے۔ داڑھی رکھ لی۔ پانچوں وقت کی نماز، روزے، وظائف اور اسلامی موضوعات پر تحریریں۔ یہ فضل محمود کا دوسرا روپ تھا۔ کئی سال وہ مذہب اور روحانیت کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان تمام ادوار میں وہ بطور پولیس افسر بھی اپنی ذمے داریاں نبھاتے رہے۔ پھر وہ ''بزرگ کھلاڑی'' بنے اور نوجوانوں کو مشورے دیتے رہے مگر میری نگاہوں میں ان کی وہی نجیلی، خوب صورت، ہنس مکھ اور نوجوان شخصیت تصویر لگائے بیٹھی رہی۔ شاید میں بذاتِ خود ذہنی طور پر اپنے آپ کو ''بزرگ'' تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا؟

آج کے نوجوان کل کے بزرگ ہوں گے اور اس طرح یہ تجربے مشاہدے نسل در نسل منتقل ہوتے رہیں گے۔ آنے والی نسل گزری ہوئی نسل کے کارناموں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

ایک بار قصہ یہ ہوا کہ جب کرکٹ کنٹرول بورڈ اور ''باغی گروپ'' کی خبریں اخبارات میں عام ہونے لگیں تو میں نے دیکھا کہ حامیوں اور مخالفوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ میاں داد کی حمایت میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ ماجد، سرفراز ہیں کیا۔ ان کے بغیر پاکستان میں کرکٹ زیادہ کامیاب رہے گی۔ دوسری طرف ایک گروہ تھا جو کہہ رہا تھا کہ جاوید میاں داد کا کھیل اب بس ہو گیا۔ ایک نوعمر اور غیر ذمہ دار کھلاڑی کی خاطر اتنے بہت سے اچھے کھلاڑیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جاوید کو اب کرکٹ سے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ یہی رویہ سری لنکا کے ساتھ میچوں کے دوران دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ جاوید میاں داد کی حمایت میں نعرے لگا رہے ہیں۔ بہت سے تماشائی ماجد، عمران، سرفراز اور ظہیر کی حمایت میں چلا رہے ہیں اور دوسرے گروہ کے لیے ''مردہ باد'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ انہیں تو آپ عوام، نوجوان اور جذباتی مداح کہہ کر شاید نظر انداز کر دیں مگر اخبارات کے مراسلات کے کالموں میں بھی یہی طرزِ گفتگو رہا اور تو اور صحافتی کالم نگاروں، اسپورٹس اور رپورٹروں نے بھی کسی ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت شروع کر دی تو تشویش پیدا ہونے لگی۔ کتنی بد نصیبی ہے ہماری کہ ہم جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور خود اپنے ہی ایک عضو کی دوسرے عضو پر برتری یا کمتری ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خود اپنے جسم کے ایک حصے کو ناکارہ قرار دے کر اسے کاٹ کر پھینک دینے پر زور دیتے ہیں۔ یہ رویہ زندہ قوموں کی شان کے شایان نہیں ہے۔ دراصل ہم ابھی یہ شعور پیدا نہیں کر پائے ہیں کہ اس ملک کی جو بھی چیز یا جو بھی شخصیت ہے وہ ہماری ہے جس طرح ایک خاندان کے فرد اور ان کی جایداد ہوتی ہے۔ معمولی سی بحث یا اختلاف پر کسی خاندان کے افراد میں کاٹ چھانٹ تو نہیں شروع ہو جاتی۔ سارے فنکار، سارے کھلاڑی، سارے شاعر اور ادیب ہمارے ہیں۔ ہمیں ان سب پر فخر ہونا چاہیے۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے اپنے آپ کو بالاتر رکھنا چاہیے۔ جب عمران میدان میں وکٹ کی طرف دوڑتا تھا تو ہمارا دل شیر کا ہو جاتا تھا۔ سرفراز نواز، اقبال قاسم، مدثر نذر جو بھی وکٹ لیتا تھا ہمیں فخر کا احساس ہوتا ہے۔ جاوید میاں داد، ظہیر عباس، ماجد، مدثر یہ سب ہماری آنکھوں کے تارے ہیں۔ پاکستان کرکٹ ٹیم کا ہر کھلاڑی ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ ہماری دعائیں اور تعریفیں ان سب کے لیے ہیں اس لیے کہ یہ پاکستان کے ہیں۔

☆......☆

ماداموُر جہاں کی جہاں کہیں عزت افزائی اور آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ہم سمجھتے کہ یہ ہماری ذاتی عزت افزائی ہے۔ ہمارے ملک کی عزت افزائی ہے۔ فیض، جوش، احمد فراز، منیر نیازی، جمیل الدین عالی۔ قتیل شفائی۔ احمد ندیم قاسمی جہاں کہیں اپنی شاعرانہ عظمت کے جھنڈے گاڑتے ہیں ہم سمجھتے کہ وہ ہماری فتح ہے۔ جہاں ہماری خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ان میں بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہمارے دل ان سب کے لیے یکساں دھڑکتے ہیں۔ اب بھی میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ جب تک یہ رویہ عام نہ ہوگا۔ ہم اپنے مایہ ناز فرزند کی دل شکنی کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ ان کی ناقدری کا جرم سرزد کرتے رہیں گے۔ دیکھیے ناں اگر آپ سرفراز یا ماجد کو پست کرتے ہیں اور جاوید میانداد کو بلندی پر لے جاتے ہیں تو نقصان تو ہمارے پاکستان کا ہے۔ وطن کی سرزمین کے یہ بیٹے اپنی ماں کی نظروں میں یکساں عزیز اور محبوب ہیں۔

☆......☆

سندھ کا مشہور و معروف ڈاکو پرو چانڈیو اپنی زندگی میں بھی خبروں کا موضوع بنا رہا، مرنے کے بعد بھی پرو چانڈیو کے تذکرے ختم نہیں ہوئے تھے۔ اخباری نامہ نگار اس بارے میں خصوصی جائزہ شائع کر رہے تھے اور اس کی زندگی پر ایک کتاب بھی شائع کی تھی جس میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر ہلاکت تک کے واقعات تفصیل سے درج تھے۔ پرو چانڈیو ڈاکو کیوں بنا؟ اس کے اسباب قریب قریب وہی ہیں جو برصغیر میں پیدا ہونے والے تمام قابلِ ذکر اور ناقابلِ ذکر ڈاکوؤں کے ہوتے ہیں یعنی سماجی انصاف سے محرومی، جاگیرداروں اور وڈیروں کا استحصال، پولیس کی بے اعتنائی، انصاف کا عدم حصول، معاشی لوٹ کھسوٹ، طبقہ وارانہ نشیب و فراز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بے حسی۔ اس کے بعد نوبت آتی ہے عدالتی انصاف کی۔ عدالتیں انصاف کرنے کے لیے کوائف و شواہد کی محتاج ہوتی ہیں اور ابتدائی رپورٹوں اور دوسرے واقعات کی ترتیب دینے میں پولیس اور جھوٹی گواہیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مرحلے پر بھی ایک بے نوا اور بے زر آدمی کو انصاف میسر نہیں آتا پھر ہمارے عدالتی طریقہ کار کی طوالت بھی ایک مرحلہ ہے۔ مقدمات اتنی طوالت اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر بشرط محال کسی کو انصاف حاصل ہو بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس دوران میں ملزم ایک بھیانک مجرمانہ ماحول میں مصائب کی زندگی گزارتا ہے اور ہماری جیلوں کا ماحول ایسا ہے کہ کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد انسان یا تو تارک الدنیا ہو جاتا ہے یا عادی مجرم۔

پرو چانڈیو ہو یا کوئی دوسرا ڈاکو۔ ہر ایک کی زندگی کو ان ہی مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے اور آج جو پرو چانڈیو سوسائٹی میں موجود ہیں انہیں بھی بعینہ وہی حالات درپیش ہیں۔ جو لوگ ڈاکو بن چکے، وہ تو اب واپسی کا سفر اختیار کرنے سے معذور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرے میں مستقبل کے جو پرو چانڈیو جنم لے رہے ہیں یا جنم لینے والے ہیں ان کی روک تھام کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ بھارت میں بھی ڈاکوؤں کی کوئی کمی نہیں ہے، نہ تھی۔ یہ اور بات ہے

پرو چانڈیو

کہ اگر ملک کی وسعت اور آبادی کے تناسب کو دیکھا جائے تو غالباً ہمارے ہاں ڈاکوؤں کی پرورش اور تعداد کہیں زیادہ ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سماجی اور انتظامی نظام تو بھارت میں بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوا۔ نہ ہی سماجی ناانصافیوں اور معاشی ناہمواریوں کا ازالہ ہو سکا۔ طبقہ وارانہ منافرت بھی اس معاشرے میں ہم سے کہیں زیادہ ہے اس کے باوجود سماجی بنیادوں پر ڈاکوؤں کو راہِ راست پر لانے کے لیے وہاں کئی تحریکیں چلائی گئیں جنھیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ڈاکوؤں کی عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ تائب ہونے کی صورت میں وعدہ کیا گیا کہ انہیں معمولی سزاؤں کے بعد معاشرے میں نئے سرے سے باعزت شہریوں کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح ایک محدود پیمانے پر ہی سہی مگر بھارت میں ڈاکوؤں کو ختم کرنے کی ایک شعوری اور سماجی کوشش ضرور کی گئی جب کہ ہمارے ہاں درجنوں سماجی انجمنوں اور مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے دعویداروں کی طرف سے اس اہم مسئلے کو حل کرنے

کی کوئی تدبیر اور کوشش نہیں کی گئی۔

پروچانڈیو کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور اس کے بعد آئے دن منظر عام پر نمودار ہونے والے ڈاکوؤں کے حالاتِ زندگی پڑھیے (جو عموماً اخباری کالموں کی زینت بنتے رہتے ہیں) تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا وجوہ آپ کو ہر ڈاکو کے معاملے میں کارفرما نظر آئیں گی۔ اسباب وعلل قریب قریب وہی ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے (یا ان کو خراب تر کرنے) کے طریقے بھی وہی ہیں۔ چلیے ایک شہری جائز یا ناجائز شکایات کی بنا پر ڈاکو بن گیا یا بنا دیا گیا مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مرحلہ بھی اپنی جگہ انتہائی قابلِ غور اور تشویش ناک ہے۔ ڈاکوؤں سے لے کر عام بدمعاشوں تک کے واقعات دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ابتدائی جرائم میں یا تو وہ پکڑا ہی نہیں گیا یا بہ آسانی ضمانت پر رہا ہو گیا۔ انتہا یہ کہ ایک قاتل بھی جیل جانے سے بچ گیا یا پھر مختصر سزا کاٹ کر دوبارہ سنگین تر جرائم کرنے کے لیے تازہ دم اور تربیت یافتہ ہو کر جیل سے باہر آ گیا۔ گویا سنگین جرائم میں ہلکی اور برائے نام سزائیں اور اکثر حالات میں سزاؤں سے محفوظ رہنا بھی اس رجحان کو بڑھانے میں نمایاں ہے۔ اگر کوئی شخص قابو میں آ ہی گیا تو اس نے دو راستے اختیار کیے۔ سپاہیوں یا جیل کے حکام سے مراعات حاصل کرنے کے بعد موقع پا کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل بھاگا یا مردانہ وار جیل توڑ کر فرار ہو گیا اور اس طرح پہلے سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین جرائم کا مرتکب ہوا۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ جب تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مؤثر نہ بنایا جائے اور قانون وانصاف کی فراہمی کی سہولتیں ہر خاص وعام کے لیے یکساں، آسان اور فراواں میسر نہ کی جائیں انتظامی طور پر اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں ہے اور یہ تو اس مسئلے کا سرے سے کوئی حل ہی نہیں کہ پہلے تو ڈاکو بنائے جائیں اور پھر پولیس مقابلے میں انہیں ہلاک کیا جائے اور اس سلسلے میں سینکڑوں پولیس والے بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ایسی کہانیوں میں سو فیصد آپ کو ایسے شواہد ملیں گے کہ سماجی ناانصافی اور زبردست مظالم سے تنگ آ کر ایک شخص نے جب پولیس چوکی کے دروازے کھٹکھٹائے تو اسے تحفظ کی بجائے بے حسی اور سرد مہری ہی نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے دل ودماغ میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ یہ معاشرہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے فلسفے پر عامل ہے اور جب تک وہ خود قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا اس کو انصاف نہیں مل سکے گا۔ ہر ڈاکو، بدمعاش اور مجرم کے حالاتِ زندگی میں یہ نکتہ آپ کو مشترک نظر آئے گا۔

دریں حالات اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کب تک اور کتنے ڈاکوؤں کو ماریں گے اور اس کا فائدہ کیا ہوگا جب کہ ان کی جگہ دوسرے اور اکثر حالات میں ان سے زیادہ تعداد میں ڈاکو پیدا ہو جائیں گے؟ دوسرے لفظوں میں جب تک ڈاکو ساز نرسریاں اور اسکول ختم نہ ہوں گے ڈاکوؤں کی پیدائش، نشوونما اور پرورش ختم نہ ہو سکے گی۔

وہ لوگ جو جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لیے فلموں، خصوصاً پنجابی فلموں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں ان کے لیے بھی یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ پنجابی فلموں میں ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھانے والے مظلوم کو ہیرو کا نام دیا جاتا ہے جو معمول کے مطابق انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان میں دوسرا موضوع باہمی دشمنیاں اور انتقام کی آگ کو بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور آئے دن اخبارات میں شائع ہونے والے روح فرسا اور سنگین واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری پنجابی فلمیں کسی حد تک ہمارے دیہاتی معاشرے کی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں جب کہ دوسری فلموں میں گل وبلبل کے رومانی قصوں اور جرم وسزا کے مغربی تصورات کے سوا دوسرے موضوعات کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی پنجابی فلموں کے قبولِ عام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ دیہاتی معاشرے میں عام کسان کی زندگی کے شب وروز جس ناانصافی کے ماحول میں بسر ہوتے ہیں اور حصول انصاف سے محروم رہنے کے باوجود اس کے دل میں جو جذبات اور آتش فشاں ابلتے رہتے ہیں اس کے نتیجے میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص پروچانڈیو بن جائے مگر جب کوئی پروچانڈیو بن جاتا ہے تو اس کے کارناموں میں ہر شخص اپنی دبی ہوئی خواہشوں اور سسکتی ہوئی آرزوؤں کا نظارہ کر لیتا ہے اور اس طرح مجرموں کو ان کے نزدیک ہیرو کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ ایک انتہائی خوفناک اور تشویش ناک صورتِ حال ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے مگر ہم اس آگ کو بجھانے کی تدبیر تو کیا اس کے متعلق سنجیدگی

سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔

مغرب میں رابن ہڈ ایک ایسا ہی کردار تھا، یہ مغرب کے استحصالی معاشرے میں انصاف کا علمبردار اور غریبوں اور مظلوموں کا حمایتی تھا۔ رابن ہڈ امیروں کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کردیا کرتا تھا۔ غریبوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہوکر امیروں کے سامنے آہنی چٹان بن کر کھڑا ہوجاتا تھا مگر آپ نے بھی غور کیا کہ آج کے مغربی معاشرے میں کوئی رابن ہڈ کیوں نہیں جنم لیتا۔ وہ مغربی بچے جو کسی زمانے میں رابن ہڈ کی کہانیوں کو حفظ جاں بنا کر رکھتے تھے۔ اب ان کے لیے رابن ہڈ ایک خیالی کردار بن کر رہ گیا ہے اور اس کردار میں بھی اب ان کے لیے کوئی خاص دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہے۔ مغرب کا بچہ اب سائنس فکشن اور ایٹمی دور میں سانس لینے والے کرداروں کی خیالی کہانیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اب وہاں رابن ہڈ پیدا ہونا بند ہوگئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں سائنٹیفک انداز میں۔ بینک لوٹنے، فراڈ کرنے والے، لوٹ مار کرنے والے اور دوسرے جرائم کرنے والے لوگ تو موجود ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ معاشرہ اب رابن ہڈ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ سماجی ناہمواری، انصاف کا عدم حصول، قانونی عمل کی سست رفتاری اور مائٹ از رائٹ کا اس معاشرے میں کوئی وجود باقی نہیں ہے مگر کیا ہمارے معاشرے میں بھی اس کا کوئی امکان ہے؟ خاص طور ایسی صورت میں جب کہ ہم ایک مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے دعویدار بھی ہیں؟

☆......☆

آزادی سے پہلے کسی بھی محکمے کے سربراہ کو کسی بھی معاملے میں درخواست دینے کے لیے کچھ اس قسم کی عبارت مخصوص تھی۔

بحضور فیض گنجور صاحب...... صاحب بہادر......

جناب والا۔ گزارش کمترین کی یہ ہے کہ...... اس کے بعد کمترین نہایت عاجزی سے اپنی گزارشات پیش کرنے کے بعد آخر میں صاحب بہادر کی شان میں کچھ اور قصیدے اور اس اُمید پر دعائیں درج کرتا تھا کہ شاید اس کی درخواست کی پذیرائی ہوجائے۔ درخواست کا اختتام کچھ اس طرح ہوا کرتا تھا۔

آپ کا نیازمند۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوا یہ کہ جب انگریز حاکم نے برصغیر سے اپنا بوریا بستر گول کیا اور اس خطے کے عوام کو غلامی کے دور سے نجات حاصل ہوگئی اس کے بعد بھی سالہا سال تک محکمانہ عرضیوں کے لیے یہی طرزِ نگارش مخصوص رہی۔ یہی نہیں بلکہ ہر محکمے کے باہر جس بورڈ پر متعلقہ محکمے کے افسر کا نام درج ہوا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی بے شمار القاب بھی درج ہوا کرتے تھے۔ مثلاً صاحب بہادر ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ فلاں۔ پھر اخبارات میں متعلقہ محکموں کی جانب سے جو ٹینڈر نوٹس یا اشتہارات شائع ہوا کرتے تھے ان کے آخر میں بھی جناب صاحب بہادر کے تمام القاب درج کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا گویا سیاسی طور پر تو ہم لوگوں نے آزادی حاصل کرلی تھی لیکن جہاں تک دفتری آزادی کا تعلق ہے اس سے محروم تھے اور فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے غلامی انگریز کے بیورو کریٹ کی تھی اور اب پاکستانی بیورو کریٹ کی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود کسی محکمے کے سربراہ یا بیورو کریٹ اعظم کو بھی اس صورتِ حال کا احساس نہیں ہوا، وہ بدستور اپنی افسری کی شان میں مگن تھے اور عوام بدستور فدویانہ کمتری کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے کافی عرصے بعد کچھ اخبار نویسوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ غیر ضروری القاب و آداب آزادی کے بعد بھی کیوں اور کس لیے استعمال کیے جاتے ہیں؟ بلکہ درحقیقت ان درخواستوں کا اندازِ تحریر اس قدر فدویانہ ہوا کرتا تھا اور درخواست گزار اس میں اپنی کمتری اور احقری کے اظہار میں اتنا فراغ دل ہوا کرتا تھا کہ ان درخواستوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی کراہیت آتی تھی۔ حیرت ہے کہ درخواستیں پڑھنے والوں کو بھی یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ بنی نوع انسان کو کس قدر ذلیل کررہے ہیں اور انسانی عظمت کی اہانت کے مرتکب ہورہے ہیں۔

بہر حال، اخبارات میں شور دغل ہوا۔ کچھ حکومتیں ایسی آئیں جنہیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب اس قسم کے القاب و آداب کو متروک کردینا چاہیے اس لیے کہ آزاد ملکوں میں سرکاری افسر عوام کے حاکم نہیں بلکہ ملازم اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ درخواستوں کا لب و لہجہ بدلنے لگا مگر دفاتر کے باہر لکھے ہوئے آداب و القاب میں کوئی فرق نہ آیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس مسئلے پر بھی توجہ دی گئی اور غالباً سرکاری افسروں نے بذاتِ خود ہی احساس کسر نفسی سے مجبور ہوکر اپنے القاب کو مختصر کردیا۔ اب جہاں تک دفتروں کا تعلق ہے یہ القاب دیکھنے میں نہیں آتے۔ نہ

ہی اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کے آخر میں جناب صاحب بہادر قسم کے الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں لیکن یہ انقلاب یا تبدیلی محض تحریر کی حد تک ہوتی ہے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے افسروں کا رویہ بدستور ویسا ہی تحکمانہ ہے اور درخواست گزار کی لجاجت اور کمتری میں عملی طور پر کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس موضوع پر اخبارات کے کالموں میں بہت کچھ لکھا گیا عالموں نے مقالات لکھے۔ فاضلوں نے تحقیق کا جال بچھایا اور یہ دور کی کوڑی لائے کہ دراصل یہ ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے۔ اس کے لیے دانشوروں نے ایک اصطلاح بھی واضح کرلی ہے جسے عرف عام میں ''غلامانہ ذہنیت'' کہا جاتا ہے۔

غلامانہ ذہنیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کیوں کہ ہم نے سالہا سال انگریز کی غلامی کی ہے اس لیے ہم ذہنی طور پر اب تک غلامی کے ان اثرات سے نجات حاصل نہیں کرسکے جو ہمارے ذہنوں اور رگ و ریشے میں سرایت کر چکے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت ہی کا کرشمہ ہے کہ اس معاشرے میں جو بھی اور جہاں بھی قدرے صاحب اختیار ہے اس کا فرض ہے کہ دوسروں کو ڈرائے دھمکائے۔ اپنے سے کمتر جانے' ان سے بدسلوکی کرے۔ ان صاحب اختیار لوگوں میں اعلیٰ سرکاری حاکم سے لے کر محکمہ کا چپراسی تک سبھی شامل ہیں بلکہ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ایسے مقامات پر بھی اس غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے جہاں عوام کو کسی ''صاحب اختیار'' کی نظر کرم کا امیدوار ہونا پڑتا ہے۔ وہاں ضروری ہے کہ عام التجا کریں اور جس سے ان کا واسطہ پڑا ہے یا جان کا حاجت روا ہے وہ ان کو گمرکیاں دے، جھڑکے اور ضرورت پڑے تو انہیں برا بھلا کہے۔ کئی جگہ پر تو آپ نے عوام کو پولیس اور انتظامیہ کے ڈنڈے کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ عوام یہ ڈنڈے نہایت صبر و تحمل سے کھاتے ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ نہ ہی ڈنڈے مارنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو وہ ڈنڈے رسید کر رہے ہیں دراصل وہ آزاد ملک کے معزز شہری ہیں۔ ساری دنیا میں گاہکوں سے جو سلوک کیا جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور آزاد ملکوں کے معزز شہری جن مراعات اور جس عزت و احترام کے مستحق ہیں اس سے بھی اب بھی واقف ہو چکے ہیں مگر ہماری غلامانہ ذہنیت نے ہماری فہم اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کرلیا ہے اس لیے ہم یہ نہیں غور کرتے کہ ہم کس اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی بلکہ قانونی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ہے اس قسم کے مظاہروں کے لیے کسی سرکاری دفتر میں جانا ضروری نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی بھی قسم کے اختیار کا مالک ہے اپنے سے نچلے لوگوں سے بدسلوکی کرتا ہے اور اپنے سے اونچے درجے کے افراد کے سامنے گھگھیاتا ہے۔ ہاتھ باندھ کر التماس کرتا ہے۔ آسان زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ شاید ہم لوگوں کو ''عزتِ نفس'' کا پاس نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں خودداری سے محروم ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبال کے کلام کو بھی ہم لہک لہک کر پڑھتے ہیں اور علامہ کے فلسفۂ خودی کے حد درجے معترف ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر نصاب کی ہر کتاب میں شامل ہے اور ہر وہ شخص جو اردو پڑھتا ہے وہ یہ شعر بھی زبانی یاد رکھتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے یہ پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

یعنی ایک طرف خودی کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اللہ میاں سے بھی طلب گار ہیں کہ ہماری عزتِ نفس کا خیال رکھا جائے اور دوسری طرف خودی کی پستی کا یہ عالم ہے کہ محکمے کے چپراسی کے آگے بھی ہاتھ باندھے، سر جھکائے کھڑے ہیں۔ داناؤں نے بتایا ہے کہ یہ دراصل ہماری غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

ہم تو تقدیر کے اس فیصلے کو غلامانہ ذہنیت کا لازمی جز تسلیم کرکے راضی برضا تھے مگر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پچھلے دنوں جب ہم امریکا گئے تو ہمیں ان سیاہ فام لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو کچھ عرصے پہلے سچ مچ کے غلام تھے یعنی جن کے آباؤ اجداد کو خرید کر دور دراز علاقوں سے لایا گیا اور پھر انہیں امریکا کے سفید فام مالکوں کے ہاتھ فروخت کردیا گیا جیسا کہ آپ نے امریکی تاریخ میں پڑھا ہوگا غلام کے جسم و جان کا مالک اس کا آقا ہوا کرتا تھا۔ امریکا میں بھی کالے غلاموں پر ان کے آقاؤں کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا۔ انہیں انسانی حقوق تو کیا انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا بھی اختیار نہیں تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کالوں کی افزائشِ نسل بھی مویشیوں کی طرح کی جاتی تھی۔ یعنی تندرست اور توانا مرد اور محنت کش خوش شکل اور مضبوط عورتوں کو محض نسل بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اس ضمن میں یہ تمیز بھی نہیں رکھی جاتی تھی کہ ان کا آپس میں کوئی خون کا رشتہ تو نہیں ہے؟ گویا امریکا کے کالے صحیح معنوں میں غلام تھے۔ ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم۔

جب دنیا بھر میں آزادی کا غلغلہ بپا ہوا اور خود امریکا آزادی کی تحریک کا چیمپئن بن گیا تو وہاں بھی کالوں کے انسانی حقوق بحال کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج سے چند دہائی پہلے تک امریکا کے بہت سے شہروں اور علاقوں میں کالے لوگ سفید فام لوگوں کے ساتھ بس میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ہوٹلوں میں نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ گوروں کے اسکولوں میں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا لیکن کالوں نے اپنے حقوق کے لیے قربانیاں دیں گوروں کی آبادی کے ایک معقول عنصر نے بھی ان کے مطالبات کی حمایت کی غرض یہ کہ سالہا سال کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد کالوں نے گوروں کے مساوی حقوق حاصل کر لیے۔ اب عملی طور پر صورتِ حال یہ ہے کہ کالوں کو آبادی کے تناسب سے نوکریاں حاصل ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی امریکا کا دارالحکومت ہے جہاں کالوں کی آبادی تقریباً 75 فیصد ہے۔ منتخب اداروں کے علاوہ سرکاری دفاتر میں بھی ہر جگہ آپ کو اسی تناسب سے کالے نظر آئیں کے گوروں کے افسر بھی کالے ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی کا میئر کالا ہے۔ پولیس کمشنر، اٹارنی جنرل، چیف جج سب کالے ہیں اور سب نام کے افسر نہیں ہیں۔ انہیں مکمل اختیارات بھی حاصل ہیں لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کالوں میں غلامی کا احساس اب زائل ہو چکا ہے۔ وہ غلامانہ ذہنیت کے شکار نہیں ہیں۔ وہ بڑی بے تکلفی سے گوروں سے میل جول رکھتے ہیں۔ برابری کے تعلقات ہیں بلکہ ایک لحاظ سے وہ اپنے آپ کو گوروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کالوں نے گوروں کے فیشن اور ان کا کلچر اختیار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ امریکا میں کالوں کے فیشن مختلف ہیں۔ ماڈرن سیاہ فام عورتیں بھی بالوں کے اسٹائل مختلف بناتی ہیں جو کالوں کے مخصوص انداز سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کے لباس گوری عورتوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ انہوں نے رہن سہن بھی گوروں سے الگ اختیار کیا ہے مگر جو بات سب سے زیادہ حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالکل برابری سے گوروں سے بات کرتے ہیں نہ ان کے سامنے گھگھیاتے ہیں، نہ خوشامد کرتے ہیں، نہ کسی قسم کے احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ کالے غلامانہ ذہنیت سے کیونکر محفوظ ہیں؟ بلکہ دیکھا جائے تو غریبی اور پسماندگی کے باوجود ان میں ایک احساسِ تفاخر اور رعب داب کا عنصر موجود ہے۔ مثال کے طور پر گورا کچھ مانگے گا تو اخلاق اور لجاجت سے مگر کالا اپنا حق سمجھ کر۔ ایک دن فٹ پاتھ پر ایک ہٹے کٹے کالے سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے تکلفی سے میری طرف بڑھا اور نہایت دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ جو سگار پی رہے ہیں ایسا دوسرا سگار ہو تو مجھے دے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس دوسرا سگار نہیں ہے۔“ کہنے لگے۔ ”تو پھر یہی دے دیں۔ یہ میرا پسندیدہ سگار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا بھی پسندیدہ سگار ہے اور صرف ایک ہے۔“ اس نے سر کھجایا اور بولا۔ ”ایک ڈالر ہوگا؟“ میں نے ایک ڈالر ان کے حوالے کیا۔ وہ ”تھینک یو“ کہہ کر اپنی راہ چل دیے۔ نہ سر کہہ کر مخاطب کیا نہ ملتجیانہ لہجہ اختیار کیا۔ حد تو یہ ہے کہ بھیک مانگتے وقت بھی میں نے کالوں کو فدویانہ انداز اختیار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک دن ہم اپنے ایک پاکستانی دوست کے ریسٹورنٹ میں گئے۔ پتا چلا کہ وہاں کچھ امریکی ملازم ہیں۔ کچھ عرب ایک سیاہ فام لڑکی کیرن گرے اور ایک پاکستانی صاحب مسٹر شفیع۔ پاکستانی کی یہ شہرت تھی کہ وہ ریسٹورنٹ کے عرب اسسٹنٹ منیجر سے بھی سر کے بغیر بات نہیں کرتے تھے اور نہایت فدویانہ اور احقرانہ انداز اختیار کیے رکھتے تھے، کوئی مطالبہ کرتے تو گھگھیا کر یہاں تک کہ چھٹی کی درخواست بھی کرتے تو پہلے اپنی کسی فرضی بیماری کا تذکرہ کرتے اور پھر ایک دن کی چھٹی طلب کرتے۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ ایک دن کیرن گرے نے مجھ سے پوچھا۔ ”مسٹر آفاقی! یہ پاکستانی ہم سب سے مختلف ہے، یہ اتنی خوشامد کیوں کرتا ہے۔ میں نے دوسرے پاکستانی لوگوں کو بھی اسی طرح التجائیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

ہمیں کوئی جواب نہیں سوجھا مگر پھر فوراً دماغ نے کام کیا اور ہم نے کہا۔ ”کیرن! دراصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ انگریزوں کے غلام رہے ہیں۔ ہماری ذہنیت ہی غلامانہ ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اس سے نجات ملے گی۔“

وہ کہنے لگی۔ ”آپ کو آزاد ہوئے تو 34 سال ہو گئے ہیں پھر بھی آپ لوگوں کی ذہنیت نہیں بدلی۔“ ہم لاجواب ہو کر کوئی عذر تلاش کر ہی رہے تھے کہ اس نے کہا۔ ”میں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے، مسلمانوں نے تقریباً نو سو سال ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ غلامی کا آغاز 1057ء سے ہوا۔ 1947ء میں آپ لوگ آزاد ہو گئے میں حیران

ہوں کہ صرف 90 سال میں آپ کی ذہنیت غلامانہ ہوگئی مگر نو سو سال کی حکمرانی کا اثر آپ میں کیوں باقی نہ رہا۔''

کیرن گرے کے اس سوال کا جواب نہ ہمیں اس وقت سوجھا تھا نہ اب ہمارے پاس اس کا کوئی معقول جواب ہے۔ کسی صاحب کے پاس ہو تو بتائیں۔

☆......☆

فن موسیقی میں مسلمانوں میں پہلا نام مشہور صوفی بزرگ حضرت امیر خسروؒ کا ہے جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید خاص تھے۔ آپ کو موسیقی کی تمام شاخوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس وقت کے سب سے بڑے ہندو موسیقار نائیک گوپال کو گائیکی کے مقابلے میں شکست دی۔ برصغیر کے فن موسیقی پر امیر خسروؒ کے بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے خیال، ترانہ، نقش اور کئی دوسری اصناف موسیقی ایجاد کیں۔

قرون وسطیٰ میں حضرت امیر خسروؒ کے بعد دوسرا بڑا نام جو مسلمان موسیقاروں میں آتا ہے وہ نعمت خان صدا رنگ المعروف میاں تان سین (1535ء سے 1592ء) کا ہے۔ میاں تان سین کو مشرقی کلاسیکل موسیقی کا عظیم ترین گائیک تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی راگ ایجاد کیے۔ میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی اور دوسرے کئی راگ تان سین کی تخلیق ہیں۔ وہ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ وہ دیپک راگ گا کر دیے جلاتے اور ملہار گا کر بارش کے ذریعے انہیں بجھا دیا کرتے، اب بھی فن موسیقی کے طالب علم میاں تان سین کی قبر کے سرہانے بیری کے درخت کا ایک پتا کھا کر یہ سمجھتے ہیں کہ راگوں کا سمندر ان کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے گا۔ اورنگزیب عالمگیر کے علاوہ دیگر مغل شہنشاہ موسیقاروں کی سرپرستی کیا کرتے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہندو راجوں اور مسلمان نوابوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اسی اثنا میں موسیقی کے کئی گھرانے وجود میں آچکے تھے۔ جن میں زیادہ مشہور پٹیالہ، شام چوراسی، کیرانہ، گوالیار، دہلی، آگرہ یا رنگیلا، جے پور، اترالی وغیرہ شامل ہیں۔ ان گھرانوں کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں، کوئی تان پر زیادہ دھیان دیتا ہے تو کوئی الفاظ کی ادائیگی کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ نوابوں اور مہاراجوں کے دور میں کئی عظیم مسلم موسیقاروں نے جنم لیا۔ ماضی قریب کے بہترین گائیکوں میں ایک نام استاد فیاض خان کا ہے جنہیں آفتاب موسیقی کہا جاتا ہے۔ ان کا تعلق آگرہ گھرانے سے تھا۔ خاندانی پس منظر بہترین تربیت اور بے پناہ ذہنی استعداد نے انہیں اپنے دور کا عظیم ترین فنکار بنا دیا۔ ان کے نانا غلام عباس خان نے انہیں اپنے گھرانے کی گائیکی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے بعد دوسرے گھرانوں کے اساتذہ کے پاس بھیجا

جس سے خان صاحب نے اکتسابِ فن کیا۔

24 سال کی عمر میں استاد فیاض خان کو ایک محفل میں گانے کا موقع ملا جس میں پٹیالہ گھرانے کا مشہور گائیک میاں جان خان بھی موجود تھے۔ میاں جان خان نے نوجوان گلوکار کی پرفارمنس دیکھ کر کہا ''اصل استاد تو تم ہو'' اس دور کے بڑے گلوکار کردار کے اعتبار سے بھی عظیم تھے۔ فن موسیقی پر استاد فیاض خان کی گرفت کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جو استاد امراؤ بندو خان نے بیان کیا۔ ایک محفل میں خان صاحب نے تان چھیڑی تو ایک پنڈت' جو پاس بیٹھے تھے بولے ''استاد صاحب! آپ نے غلط سُر لگایا ہے۔'' فیاض خان نے مسکرا کر پوچھا ''کیسے؟'' پنڈت نے کہا کہ شاستر میں اس طرح لکھا ہے۔ استاد نے پاس دھری شاستر سے کان لگادیے۔ تھوڑی دیر بعد کہا ''پنڈت صاحب! یہ تو کچھ نہیں بولتی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بولے گی۔ تھوڑی اسے کھول کر دیکھیے کہ اس میں لکھا کیا ہے؟ استاد فیاض نے کہا'' اس میں جس طریقے سے لکھا ہے' آپ اس طریقے سے گا کر دکھادیجیے۔'' یہ سن کر ہندو پنڈت حیران رہ گیا اور اس کی بولتی بند ہوگئی۔ خان صاحب نے 1950ء میں وفات پائی۔

استاد بڑے غلام علی خان پٹیالہ گھرانے سے تعلق رکھنے والا بہت بڑا نام ہے۔ خان صاحب کیم شحیم شخص تھے، خوراک پہلوانوں کے برابر تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں' چلنے کا شاہانہ انداز۔ نہایت متاثر کن شخصیت کے مالک شخص کو دیکھ کر یہ ماننا مشکل ہوتا تھا کہ اس آدمی کی آواز نہایت ہی مدھر اور رسیلی ہے۔ وہ فن موسیقی کے محقق اساتذہ میں سے تھے جن کی ایک ایک پہلو پر گہری نظر تھی۔ استاد صاحب کی گائی ہوئی ٹھمریاں مثلاً یاد پیا کی آئی' کٹے نہ برہا کی رات' پریم کے پھندے میں آکر تجنی' ترچھی نظریا کے بین وغیرہ ابھی تک سننے والوں میں مقبول ہیں اور ان کے ریکارڈ ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے۔ استاد بڑے غلام علی خان کے چھوٹے بھائی استاد برکت علی خان بھی عظیم گائیکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی آواز کی حلاوت کبھی کبھی تو بڑے غلام علی خان سے بھی بڑھ جایا کرتی۔ باغوں میں پڑے جھولے' دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے' اک ستم اور لاکھ ادائیں وغیرہ ایسے آئٹم ہیں جنہوں نے استاد برکت علی خاں کے نام کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنادیا۔

موسیقی کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام استاد علاؤالدین خان کا ہے جنہیں ''بابا'' کہا جاتا ہے۔ بنگال کے ایک معزز گھرانے میں جنم لینے والے علاؤالدین کو موسیقی سیکھنے کے شوق نے گھر سے بھاگنے پر مجبور کردیا۔ انہوں نے گائیکی کے علاوہ سازوں کی موسیقی میں بھی بہت مہارت حاصل کی۔ وائلن' پیانو' کلارنٹ' شہنائی کے علاوہ ایسے سازوں کی تعداد سو سے زائد ہے جنہیں بجانے میں بابا علاؤالدین کو مہارت تھی۔ انہوں نے مسٹر رابرٹ لوبو سے مغربی کلاسیکی موسیقی بھی سیکھی۔ تان سین گھرانے کے استاد

مظہر امراؤ بندو خان

وزیر خان نے علاؤالدین خان کو چالیس سال تک سرود' رباب' سرسنگھار کے علاوہ دوسرے ساز بجانے سکھائے اور دھرپد کے ساتھ ساتھ موسیقی کی دیگر اصناف کا بھی ماہر بنادیا۔ بابا علاؤالدین خان نے کئی راگ ایجاد کیے۔ ان میں وہ جملہ اوصاف موجود تھے جو تان سین گھرانے کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ ویسے انہوں نے مختلف گھرانوں کے پانچ سو سے زائد اساتذہ سے فن موسیقی کی باریکیاں سیکھیں یوں انہیں اس پر عبور حاصل ہوگیا۔

کسی فرد کے گھرانے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس نے کس استاد سے سب سے طویل عرصے تک تعلیم حاصل کی اور وہ اس کے انداز میں موجود خوبیوں کو کتنے بہتر انداز سے ادا کرسکتا ہے۔ یہ فرق نہایت واضح تھے اور انہی

کی بناپر گھرانوں کی حد بندیاں کی گئیں لیکن قدیم اساتذہ میں ایک دوسرے کا احترام لازم سمجھا جاتا تھا۔ استاد اللہ دیا خان کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب ایک گائیک نے ان کے سامنے دوسرے کا مذاق اڑایا تو استاد صاحب نے اسے سختی سے ڈانٹا اور کہا ”ایسی بات مت کرو اور کسی کو بھی الزام نہ دو۔ ہر کسی کے گانے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔“

استاد اور گھرانے کی گائیکی کئی امور میں نہایت فائدہ مند بھی ہے کہ اس سے گائیک میں پختگی آتی ہے۔ یہ چیز موسیقی کے جدید اسکولوں میں سیکھنے والوں کے لیے نہایت مشکل ہے۔ ایک مرتبہ مشہور مغنیہ سدھیش وری دیوی نے کہا تھا ”کون سا اسکول استاد کا متبادل ہوسکتا ہے۔ میرے استاد نے مجھے توڑی راگ کے 18 انداز سکھائے۔ کس اسکول میں فن اس گہرائی تک سکھایا جاتا ہے۔ یہ تو سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا دور ہے 'فن سیکھنے کا نہیں۔'“

اساتذہ فن میں ایک بہت بڑا نام استاد امیر خان کا ہے جو جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آواز میں جادو کا سا اثر تھا۔ ایک مصنف کے بقول خان صاحب کا گایا ہوا میگھ اور لالیت راگ انسان کو گردوپیش کی دنیا سے بے نیاز کردیتے ہیں۔ امیر خان نے باقاعدہ طور پر کسی بھی گھرانے کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی اس لیے ان کی گائیکی میں کئی گھرانوں کی خصوصیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ اپنے انداز گائیکی کو ”اندور گھرانا“ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ فن موسیقی کی تمام تر اصناف میں مہارت کے باوجود وہ عوامی اجتماعات میں ٹھمری نہیں گایا کرتے تھے کیونکہ وہ استاد بڑے غلام علی خان کو ٹھمری کا اپنے سے بہتر گائیک مانتے تھے۔ مشہور ہندو گائیک پنڈت گوکلا تھ ساؤجی نے ہوبہو استاد امیر خان کا انداز اپنایا۔ ایک مرتبہ بھارتی ریڈیو پر پنڈت جی نے استاد امیر خان کی گائی ہوئی غزل گائی۔ دونوں کی آواز میں اس حد تک مشابہت ہے کہ پاکستان سے بہت لوگوں نے بھارتی ریڈیو کو خط لکھے کہ استاد امیر خان مرحوم کی غزل کسی دوسرے کے نام سے چلادی گئی۔ پنڈت امرناتھ کے مطابق موجودہ موسیقاروں میں سے 60 فی صد استاد امیر خان کے انداز سے متاثر ہیں۔ ان کا انتقال 1974ء میں ایک ٹریفک حادثے میں ہوا۔

مسلمان گائیکوں میں ایک اور نام استاد ولایت خان کا ہے۔ ان کا شجرۂ نسب میاں تان سین سے ملتا ہے۔ انہیں موجودہ عہد کے عظیم ترین گلوکاروں میں سے ایک کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے میوزک فیسٹیول بمبئی میں پہلی پبلک پرفارمنس دی تو بمبئی کے ایک تھیٹر نے ان کا شور کھ دیا۔ تھیٹر میں لوگ بھر جانے کے بعد لاؤڈ اسپیکر لگائے گئے اور تھیٹر کے باہر 10 ہزار لوگوں نے استاد ولایت خان کو گاتے ہوئے سنا۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ملکہ برطانیہ نے بکنگھم پیلس میں مدعو کرکے ان کی گائیکی سنی۔ اپنے فن سے خلوص کا یہ عالم تھا کہ بھارتی حکومت نے انہیں 1964ء میں پدما شری اور 1968ء میں پدما بھوشن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا جو بھارت کے سب سے بڑے اعزاز ہیں تو انہوں نے یہ ایوارڈ لینے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کمیٹی میں شامل افراد کی فنی اہلیت اتنی نہیں کہ وہ میرے فن کو پرکھ سکیں۔ استاد ولایت خان نے ستار نوازی کو ایک نیا انداز دیا اور ستار کے تار 7 سے کم کرکے 6 کردیے اور اس پر بہترین پرفارمنس دی۔ 2004ء میں انہوں نے وفات پائی۔ فن گائیکی کے علاوہ مختلف سازوں کے بجانے میں بھی مسلمان فنکاروں نے اپنا آپ منوایا۔ استاد بسم اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شہنائی کو کلاسیکی موسیقی کا حصہ بنادیا۔ وہ شہرت کو ناپسند کرتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فنکار کو صرف سنا جانا چاہیے۔ وہ ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک کا دورہ کرکے اپنے فن کا مظاہرہ کرچکے ہیں۔ موسیقی کے گھرانوں میں بعض بھائیوں کی جوڑیاں بہت مقبول ہوئیں جو مل کر گاتے اور شائقین سے اپنے فن کی داد وصول کرتے۔ استاد امانت علی خان اور فتح علی خان ایسی ہی ایک جوڑی تھی جن کا تعلق پٹیالہ گھرانے سے تھا۔ سلامت علی خان اور نزاکت علی خان بھی بہت مقبول ہیں جو شام چوراسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر برادران بھی مل کر اپنے فن کا جادو جگاتے ہیں۔ یہ استاد ظہیر الدین خان اور فیاض الدین خان ہیں۔

مسلمان خواتین گلوکاراؤں نے بھی موسیقی میں اپنا لوہا منوایا۔ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کو گزشتہ صدی کی سب سے بڑی گلوکارہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ فن کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ اور آگرہ گھرانے کے انداز میں اعلیٰ ترین معیار کی گائیکی پیش کرنے پر قادر تھیں۔ پھر ملکہ پکھراج ' اختری بائی انبالے والی، بیگم اختر خواتین کا وہ ٹیکا ہیں جو کلاسیکل موسیقی میں منفرد مقام رکھتی ہیں اور ان کے ذکر کے بغیر اس فن کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔

نئی دنیا کی تلاش میں سینکڑوں جہاں گرد اپنی جان گنوا بیٹھے۔ صرف چند ایک مہم جو کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انہی خوش قسمت مہم جو میں ایک بڑا نام سیموئل ڈی چیمپ لین ہے۔ اس نے کس طرح کینیڈا کو دریافت کیا اسے جاننے کے لیے لکھا گیا ایک مختصر اہم مضمون۔

نئی دنیا

طارق عزیز خان

نئی سرزمین تلاش کرنے والے مہم جو کا تذکرہ

سرزمین کینیڈا کی دریافت کے حوالے سے فرانسیسی جغرافیہ داں اور مہم جو، سیموئل ڈی چیمپ لین (Samuel de Champlain) کی مہمات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے 1608ء میں کیوبک کے علاقے میں نیو فرانس (New France) کے نام سے پہلی فرنچ نوآبادی سلطنت کی بنیاد رکھی جو اگلے 150 سال تک قائم رہی۔ وہ 1612ء سے اپنی وفات (1635ء) تک نیو فرانس کا پہلا وائسرے رہا۔ چیمپ لین کے اقدامات کے نتیجے میں امریکا اور کینیڈا کی سرحد پر واقع عظیم جھیلوں (Great Lakes) کے علاقے کا سروے ممکن ہوا۔

برّاعظم شمالی امریکا کا سب سے بڑا ملک کینیڈا رقبے کے لحاظ سے رشین فیڈریشن (رقبہ 17,075,200) کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ کینیڈا کا کل زمینی رقبہ 99 لاکھ 70 ہزار 6 سو 10 مربع کلومیٹر اور موجودہ (2011ء) آبادی 4 کروڑ کے قریب ہے۔ کینیڈا کے شمال میں بحیرہ منجمد شمالی پر مشتمل قطب شمالی کا علاقہ ہے جبکہ جنوب میں ریاست ہائے متحدہ امریکا، مشرق میں شمالی بحر اوقیانوس، شمال مشرق میں خلیج بیفن، مغرب میں شمالی بحرالکاہل اور شمال مغرب میں الاسکا واقع ہیں۔ کینیڈا کی سرزمین پر یورپین کے قدم سن 1000ء میں پہنچے جب ناروے سے تعلق رکھنے والے بحری قذاق لیف ایرکسن نے شمالی بحر اوقیانوس کو پار کر کے نیوفاؤنڈ لینڈ کے علاقے کو دریافت کیا۔ دریافتوں کے دور میں کینیڈا کی سرزمین تک رسائی کی پہلی باقاعدہ کوشش 1497ء میں ہوئی جب اطالوی نژاد برطانوی مہم جو، جان کیبوٹ نے مشرقی کینیڈا سے

متصل نووا اسکوٹیا اور نیوفاؤنڈ لینڈ کو دریافت کیا۔ 16ویں صدی کی دوسری دہائی میں فرانس بھی دریافتوں کی دوڑ میں شامل ہوگیا۔ 1524ء میں فرانسیسی حکومت نے اطالوی نژاد مہم جو، گیووانی ڈا ویرازانو کو شمال مغرب کی طرف سے چین تک رسائی کی مہم پر روانہ کیا۔ اس مہم کے نتیجے میں ورازانو نے امریکا کی مشرقی ساحلی پٹی کو دریافت کیا، تاہم وہ مزید شمال میں جانے کی بجائے یورپ واپس چلا آیا۔ 36-1534ء کے دوران فرانسیسی مہم جو، جیکوئس کارٹیر (Jacques Cartier) نے شمالی بحراوقیانوس کو پار کر کے کینیڈا کی مرکزی سرزمین کو دریافت کیا اور اسے اس کا موجودہ نام دیا۔ کارٹیر کی مہمات کے نتیجے میں فرانس کے بادشاہ فرانسس اول (1494-1547) نے کینیڈا کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ فرانسیسی حکومت نے کینیڈا میں پہلی فرنچ کالونی کی بنیاد رکھنے کی منصوبہ بندی کی۔ تاہم اگلے کئی عشروں تک یہ منصوبہ بار آور نہ ہوسکا۔

17ویں صدی کے آغاز پر فرانسیسی مہم جو، سیموئل چیمپ لین نے کارٹیر کے قدموں کے نشان پر سفر کرتے ہوئے کینیڈا میں قدم رکھا۔ اس نے مشرقی کینیڈا کے علاقوں میں فرنچ خاندانوں کو آباد کرنے کے ایک جامع پروگرام کو شروع کیا جس کے نتیجے میں شمالی امریکا کی سرزمین پر "نیو فرانس" کے نام سے ایک نئے نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا۔

سیموئل ڈی چیمپ لین 1567ء میں مغربی فرانس میں خلیج بسکے کے کنارے واقع قصبے بروایج (Brouage) میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤاجداد پیشہ ور ملاح تھے۔ اس کا بچپن اپنے باپ اور چچا کے ساتھ خلیج بسکے کی بندرگاہوں کے تجارتی سفر کرتے ہوئے گزرا۔ اس نے لڑکپن میں نقشے پڑھنے اور جہاز رانی کے آلات کے استعمال میں مہارت حاصل کی۔ 1597ء میں چیمپ لین ایک تجارتی بحری جہاز کا کپتان مقرر ہوا۔ اس نے 1598ء میں اپنے چچا کے بحری جہاز سینٹ جولین (Saint Julien) میں جنوبی اسپین کی بندرگاہوں کا تجارتی سفر کیا۔ وہ 1601ء میں دارالحکومت پیرس چلا آیا اور بادشاہ ہنری چہارم (1553-1610) کے دربار سے بطور جغرافیہ دان وابستہ ہوگیا۔ پیرس میں قیام کے دوران چیمپ لین کی فرانسیسی مہم جو، جیکوئس کارٹیر کی مہمات کے تحریری ریکارڈ تک رسائی ممکن ہوئی۔ اس نے ان مہمات سے متعلق مواد کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور فرانس کی حکومت کے لیے شمالی امریکا کے نقشے تیار کیے۔ اس دوران چیمپ لین کو فرانسیسی تاجر، فرینکوئس گریوڈوپونٹ (Faneois Grave Du Pont) کی مہم سے وابستہ ہوکر بحراوقیانوس پار کرنے کا پہلا موقع ملا۔

فرینکوئس کے چار بحری جہازوں نے فروری 1603ء کی شروعات میں شمالی فرانس سے مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے اگلے پانچ ہفتوں کے دوران شمالی بحراوقیانوس کو پار کر کے مشرقی کینیڈا میں نیوفاؤنڈ لینڈ اور جزیرہ نما نووا سکوٹیا (Nova Scotia) کے درمیان واقع خلیج سینٹ لارنس (Gulf of St Lawrence) میں رسائی حاصل کی۔ وہ خلیج کو پار کر کے اس کے مغربی حصے میں واقع دریائے سینٹ لارنس کے چوڑے دہانے کے اندر داخل ہوئے۔ فرانسیسی بیڑے نے 15 مارچ کے دن دریائے سینٹ لارنس اور دریائے سیکونائے (Saquenay) کے سنگم پر واقع ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج ٹاڈوساک (Tadoussac) کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔

خشکی پر قدم رکھتے ہی مقامیوں کی ایک بھیڑ نے یورپین کو گھیر لیا۔ ان کے قد لمبے، رنگ سرخی مائل سفید اور جسم مضبوط تھے۔ انہوں نے سر پر بندھی پٹی سے پرندوں کے پر اڑسے ہوئے تھے اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ مشرقی کینیڈا میں آباد مونٹیگ نیس (Montagnais) قبائلی تھے۔ ان کے سردار بیگوراٹ (Begourat) نے فرانسیسیوں کو اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہا اور ان سے سمور (Fur) کی تجارت پر آمادگی ظاہر کی۔

چیمپ لین نے فرینکوئس کو مقامی شکاریوں کے ساتھ لین دین میں مصروف دیکھ کر چھوٹی کشتیوں کے سہارے دریائے سینٹ لارنس کی سیاحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دریا کے شفاف اور ٹھہرے ہوئے پانی میں جنوب کی طرف مہم کا آغاز کیا۔ وہ خط استواء سے 46 ڈگری شمال کے خط پر دریائے سینٹ لارنس سے آکر ملنے والے ایک دریا کے دہانے پر پہنچا۔ چیمپ لین اسے ری چیلی یو (Rechelieu) کا نام دیا۔ اس نے سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ وہ خط استواء سے 45.35 ڈگری شمال کے خط پر دریائے سینٹ لارنس اور دریائے اوٹاوا (Ottawa) کے سنگم پر واقع مونٹریال کے موجودہ جزیرے تک پہنچ گیا۔

یاد رہے کہ مونٹریال کے جزیرے کو جیکوئس کارٹیر نے 2 اکتوبر 1535ء کے دن دریافت کیا تھا۔ جہاں اس زمانے میں شکاریوں کی ایک بستی آباد تھی۔ کارٹیر نے جزیرے پر واقع پہاڑی ٹیلے کو ماؤنٹ رائل (Mont-Royal) کا

نام دیا جو آگے چل کر مونٹریال سے تبدیل ہوگیا۔ چیمپ لین، مونٹریال کے جزیرے پر آباد مقامی انڈینز سے گھل مل گیا۔ اس نے مقامیوں کی بات چیت سے اندازہ لگایا کہ دریائے سینٹ لارنس وہاں سے 250 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع میٹھے پانی کی ایک بڑی جھیل سے نکلتا ہے۔ مقامیوں نے انکشاف کیا کہ اس جھیل کے مغرب میں عظیم جھیلوں کا ایک سلسلہ واقع تھا۔ چیمپ لین نے خیال کیا کہ یہ جھیلیں اس براعظم کے مغرب میں واقع سمندر تک رسائی کا ذریعہ ہوسکتی تھیں۔ چیمپ لین نے مونٹریال سمیت قرب وجوار کے علاقے کا نقشہ تیار کیا۔ وہ عظیم جھیلوں کے علاقے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھیوں نے واپسی کا مطالبہ کیا۔ چیمپ لین نے فرینکوس کی قیادت میں یورپ واپسی کا سفر شروع کیا اور ان کے بحری جہاز 20 ستمبر 1603ء کو شمالی فرانس کے ساحلوں پر پہنچ گئے۔

سیموئل چیمپ لین نے پیرس میں بادشاہ ہنری چہارم سے ملاقات کے دوران اپنے سفر کی روداد پر روشنی ڈالی۔ اس نے بادشاہ کی تحریک پر اپنی مہم سے متعلق سفرنامہ تحریر کیا، جس میں شمالی بحراوقیانوس میں کینیڈا تک رسائی کے آسان بحری راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نے وسائل سے بھرپور کینیڈا کی سرزمین خاص کر دریائے سینٹ لارنس کے زرخیز کناروں کو فرانسیسی آبادکاروں کے لیے ایک مثالی مقام قرار دیا۔ چیمپ لین کے ترغیب دلانے پر فرانسیسی مہم تاجروں نے بحراوقیانوس کو پار کرنے کی مہمات ترتیب دیں۔

سیموئل چیمپ لین نے مارچ 1604ء میں فرانسیسی تاجر پیرے ڈوگا ڈی مونٹس (Pierre Dugua de Monts) کی قیادت میں دوسری بار کینیڈا کا سفر اختیار کیا۔ ان کے دو بحری جہاز مئی کے آغاز میں مشرقی کینیڈا سے متصل جزیرہ نما نووا سکوشیا کے قریب پہنچے۔ انہوں نے کینیڈا کی مرکزی سرزمین تک رسائی کے لیے جزیرہ نما کے شمال میں واقع خلیج سینٹ لارنس کی بجائے جنوب میں واقع خلیج مین (Gulf of Maine) کا انتخاب کیا۔ چیمپ لین کی راہنمائی میں دونوں بحری جہازوں نے خلیج مین اور خلیج فنڈے (Gulf of Fundy) کے سنگم پر خط استواء سے 45 ڈگری شمال اور 67 ڈگری مغرب کے خط پر واقع دریائے سینٹ کروکس (St Croix River) کے دہانے کے قریب لنگر گرائے۔ لگ بھگ 200 کلومیٹر لمبا دریائے سینٹ کروکس، امریکا اور کینیڈا کی سرحد پر واقع جھیل سپیڈنک (Lake Spednik) سے نکلتا ہے۔ یہ خلیج فنڈے میں سمائے جانے سے پہلے کینیڈا کے صوبے نیو برنس وک اور امریکی ریاست مین کی سرحد کا کام دیتا ہے۔ دریا کا بیسن میٹھے پانی کی چھوٹی بڑی جھیلوں سے اٹا ایک سرسبز علاقہ ہے۔ فرانسیسی مہم جوؤں کی آمد کے وقت یہاں ایل گون کوئن (Algonquian) زبان بولنے والے شکاری قبائل آباد تھے۔

چیمپ لین اور اس کے ساتھیوں نے موسم گرما کے دوران قرب وجوار کے علاقے کی سیاحت کی اور وہاں بس رہے مقامیوں سے جانوروں کی کھالوں کا لین دین کیا۔ انہوں نے سردیاں گزارنے کے لیے دریا کے کنارے لکڑی کے تین کیبن تیار کیے۔ موسم سرما کے عروج پر پورا علاقہ شدید دھند اور برفانی طوفانوں کی زد میں رہا۔ دریائے کروکس اور خلیج کا بیشتر حصہ منجمد ہوگیا اور قرب و جوار کی سرزمین کئی کئی فٹ برف کی تہہ کے نیچے دب گئی۔ جان لیوا ٹھنڈ اور خوراک کی کمی کی وجہ سے فرانسیسیوں کے 79 میں سے 44 لوگ ہلاک ہوگئے۔ 1605ء کے موسم گرما کے دوران چیمپ لین نے خلیج مین کے مغرب میں واقع نیو برنس وک سمیت امریکی ریاست مین، نیو ہیم شائر اور میساچوسٹس میں کیپ گوڈ (Cape God) تک کے ساحلی علاقے کا نقشہ تیار کیا۔ اس نے نئے علاقے کو ”آکیڈیا“ (Acadia) کا نیا نام دیا اور اس کی تحریک پر تین درجن فرانسیسیوں نے ڈوگا ڈی مونٹس کو آکیڈیا کا پہلا گورنر منتخب کرلیا۔ انہوں نے اگلے دو سال خلیج مین کے ساحلوں پر گزارے اور 1607ء کی گرمیوں کے دوران فرانس واپس پہنچ گئے۔ فرانسیسی بادشاہ ہنری چہارم نے چیمپ لین کی مہم کو سراہا۔ اس نے مشرقی کینیڈا اور شمال مشرقی امریکا پر مشتمل آکیڈیا کی ملکیت کا دعویٰ اور وہاں پہلی فرنچ کالونی کی بنیاد رکھنے کے اقدامات شروع کردیے۔

1608ء کے موسم بہار میں سیموئل چیمپ لین نے فرانسیسی حکومت کی سرپرستی اور ڈوگا ڈی مونٹس کے مالی تعاون سے کینیڈا تک رسائی کی تیسری مہم کا آغاز کیا۔ فرانسیسی بیڑہ فلیگ شپ Don-de-Dieu (خدا کا تحفہ) اور Levrier (شکاری کتا) نام کے دو بڑے بحری جہازوں پر مشتمل تھا۔ جہازوں پر سوار 150 سے زیادہ افراد میں آبادکاری کے لیے چند فرانسیسی خاندان بھی شامل تھے۔

دونوں بحری جہازوں نے بحراوقیانوس پار کیا اور اپریل کے آخر میں خلیج سینٹ لارنس سے ہوتے ہوئے

دریائے سینٹ لارنس میں داخل ہوئے۔ چیمپ لین نے 3 جولائی 1608ء کے دن خط استواء سے 47.50 ڈگری شمال اور 71.13 ڈگری مغرب کے خط پر دریائے سینٹ لارنس کے کنارے کیوبک (Quebec) شہر کی بنیاد رکھی جسے موجودہ کینیڈا کی حدود میں قائم ہونے والی پہلی یورپین کالونی کا اعزاز حاصل ہے۔ چیمپ لین نے کینیڈا کے علاقوں کو ''نیوفرانس'' کا نیا نام دیا۔

مئی 1610ء میں ہنری چہارم کے قتل کے بعد چیمپ لین کو فرانس واپس آنا پڑا۔ اس نے نو سالہ بادشاہ Louis XIII کی سرپرست ملکہ میری ڈی میڈیسی (Marie de Medici) سے ملاقات کی۔ اس نے ملکہ کو نیوفرانس میں فرانسیسیوں کی آبادکاری سے متعلق اعتماد میں لیا۔ میڈیسی نے چیمپ لین کو نیوفرانس کا پہلا وائسرائے مقرر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کینیڈا تک رسائی کے لیے مزید مہمات روانہ کرنے کا اعلان کیا۔

چیمپ لین نے 27 دسمبر 1610ء کو پیرس میں ایک دولت مند خاتون سے شادی کی۔ وہ اپریل 1611ء میں نئے وسائل کے ساتھ واپس کینیڈا پہنچا۔ اس نے 1612ء میں باقاعدہ طور پر نیوفرانس کے پہلے وائسرائے کا حلف اٹھایا۔ چیمپ لین کی زندگی کے اگلے 23 سال مشرقی کینیڈا پر فرانس کے قبضے کو مستحکم بنانے کے لیے ایک طویل جدوجہد سے عبارت ہیں۔ اس نے اس قلیل عرصے میں وسائل جمع کرنے لیے فرانس اور کینیڈا کے درمیان ایک درجن سے زیادہ بار بحراوقیانوس کو پار کیا۔ اس نے دریائے سینٹ لارنس کے کنارے فوجی قلعے تعمیر کروائے اور نیوفاؤنڈلینڈ، نیوبرنس ویک اور کیوبک کے علاقوں میں آباد مقامی انڈینز قبائل کو فرانسیسی بادشاہ کے تابع کرنے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ چیمپ لین نے مقامی انڈینز کو فرانسیسی فوج میں بھرتی کرنے کا پروگرام شروع کیا اور انھیں یورپین طرز معاشرت اپنانے کے آداب سکھائے۔ اس نیکیوبک اور اونٹاریو کی حدود میں عیسائی مشنریوں کے وفد روانہ کیے۔ اس کی تحریک پر عظیم جھیلوں کے علاقے میں متعدد دریافتیں ممکن ہوئیں۔ جن میں جھیل ہورن (Lake Huron)، جھیل اونٹاریو (Lake Ontario)، جھیل سپیریئر (Lake Superior)، جھیل مشی گن (Lake Michigan)، جھیل ایری (Lake Erie) اور جھیل چیمپ لین نمایاں ہیں۔

چیمپ لین 1633ء میں فرانس کے آخری دورے کے بعد کینیڈا واپس پہنچا۔ وہ 1634ء میں کیوبک شہر میں مقیم تھا اور نیوفرانس کے نام سے لگائے اپنے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے 1635ء کے موسم بہار میں عیسائی مشنریوں کے ایک وفد کو دریائے سینٹ لارنس میں مونٹریال کے جزیرے پر روانہ کیا۔ وہ جزیرے پر نیا شہر بسانے کا آرزومند تھا، تاہم چیمپ لین کی یہ خواہش اس کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی اور 25 دسمبر 1635ء کو اس کا کیوبک میں انتقال ہوگیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ چیمپ لین کی وفات کے بعد 1640ء میں چالیس فرانسیسی آبادکاروں نے مونٹریال کے جزیرے پر پہلی فرنچ کالونی کی بنیاد رکھی اور مقامی لوگوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔ یہ چیمپ لین کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج 45 لاکھ کی آبادی پر مشتمل مونٹریال، کینیڈا کا سب سے بڑا اور پیرس کے بعد فرنچ زبان بولنے والا دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

ایک اندازے کے مطابق سیموئل چیمپ لین نے 1603ء سے 1612ء کے دوران فرانس سے کینیڈا تک رسائی کی تین نمایاں مہمات کے دوران مجموعی طور پر 50 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس نے مشرقی کینیڈا اور شمال مشرقی امریکا کے لگ بھگ 15 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے کو دریافت کیا۔ چیمپ لین نے 1608ء میں نیوفرانس کی نوآباد سلطنت قائم کی جو 1763ء تک قائم رہی۔ 1750ء کی دہائی میں اپنے دور عروج پر یہ سلطنت کینیڈا اور امریکا کے 60 لاکھ مربع کلومیٹر کے قریب رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں عظیم جھیلوں سمیت دریائے سینٹ لارنس اور دریائے مسی سپی کے بیسن کا پورا علاقہ نیوفرانس کی سلطنت کا حصہ تھا۔

18 ویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے کینیڈا کو فتح کرنے کے لیے مہمات ترتیب دیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں فرانس کی عملداری کیوبک تک محدود ہوگئی جبکہ کینیڈا کے 90 فیصد کے قریب علاقے پر برطانیہ کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ 4 جولائی 1776ء کو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے اعلان آزادی کے بعد کینیڈا کے عوام نے بھی غیر ملکی قبضے کے خلاف جنگ آزادی شروع کردی۔ کینیڈا کی آزادی کا یہ سفر اگلے سو سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ یکم جولائی 1867ء کو کینیڈا نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ جس کے بعد آنیوالے سالوں میں فرانس بھی کینیڈا کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے کیوبک اور ملحقہ علاقوں کی ملکیت سے دستبردار ہوگیا۔

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص

سنا ہے ایک زمانے میں نجران کا علاقہ جو اب سعودی عرب میں ہے، یمن کا حصہ ہوتا تھا۔ یمن پر سعودی عرب کا ایک طرح سے کنٹرول تھا۔

یمن ائرلائنز کے B-737 جہاز بھی سعودی عرب نے ہی دلوائے تھے اور اب انجن کے اس کنٹریکٹ کی باری تھی۔

میں نے کنٹریکٹ کا تجزیہ کر کے رپورٹ چھٹی سے پہلے عدنان کو بھجوادی۔ آج کا قصہ میری حد تک ختم ہو چکا تھا۔ JT8D انجن کی سہ ماہی میٹنگ کے بعد میں مائٹریال سے واپس آچکا تھا کوئی تین ہفتہ قبل۔

عدنان کے دفتر سے بلاوا آیا۔

وہاں پہنچا تو ایک صاحب سے تعارف ہوا۔ ”یہ یمنیہ کے ٹیکنیکل کے سربراہ ہیں۔ یمنیہ کو ایک A300 جہاز خریدنا ہے۔ ان صاحب کے ساتھ اس کے مواصفات پر تم کو کام کرنا ہے۔“ انکار کی گنجائش نہ تھی نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

میں ان کے ساتھ اپنے دفتر لوٹ آیا۔ ابتدائی کام شروع کرنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاز خریدنے کے لیے جو بنیادی معلومات تھیں وہ تک ان کے پاس نہیں تھیں۔ طے پایا کہ جیسے ہی مجھے کچھ فرصت ملے گی میں صنعاء جا کر ان کے ساتھ یہ کام مکمل کروں گا۔ اس دوران میں وہ ان تمام معلومات کو اکٹھا کریں گے جن کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ میرا یمن کا پہلا اور آخری سفر تھا۔

صنعاء اپنی نوعیت کا شاید ایک ہی شہر ہے۔ جہاں ہر چیز مختصر پیمانے پر بنی ہوئی تھی سوائے نئی پارلیمنٹ بلڈنگ کے۔ لوگ چھوٹے، دکانیں چھوٹی، مکان چھوٹے مگر بلند۔

مکان یہاں چھوٹے سے پلاٹ پر بنائے گئے تھے۔ زیادہ تر میں ایک منزل پر ایک ہی کمرا بعض میں دو۔ ہر عمارت

تین چار یا پانچ منزلہ۔ ایک منزل پر ملاقات کا کمرا دوسری پر کھانے پکانے اور کھانے کا اہتمام اس کے اوپر خواب گاہ وغیرہ وغیرہ۔

یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ اب میں آزاد تھا۔ یمن کی بیڑی پاؤں میں نہ تھی۔

زیادہ تر عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ پتھر مقامی طور پر دستیاب تھے۔ اور کئی رنگوں میں تھے جو قدرتی تھے ان پر رنگ وروغن کی ضرورت نہ تھی۔ ان پتھروں کا رنگ ان دھاتوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے جو اس میں شامل ہوتی ہیں۔ یمن کا پتھر خانہ کعبہ میں بھی بہت استعمال ہوا ہے۔

کام دو تین دن میں ختم ہو چکا تھا ممکنہ مواصفات تیار ہو چکے تھے۔ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ یمنیہ نے مجھے تائز گھمانے کی پیشکش کی جو مجھے منظور تھی۔ میں اور میرے ساتھی یمنیہ کے دو افسروں اور ڈرائیور کے ساتھ تائز کے لیے روانہ ہو گئے۔ تائز پہاڑی علاقہ ہے۔ بہت پُر فضا۔ سعودی عرب کے علاقے نجران سے متصل۔

راستے میں ڈرائیور نے کہا۔ ”اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہم کات کے بازار سے ہوتے ہوئے چلیں بارہ بجنے والے ہیں۔ ایک دو گھنٹے بعد یہ بازار بند ہو جائے گا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کات ایک قسم کا پتہ ہوتا ہے جس میں خمار یا ہلکا نشہ ہوتا ہے۔ یہ یمن کی تہذیب کا جز لازم ہے۔ خاص خاص جگہوں پر اس کے باقاعدہ بازار لگتے ہیں جہاں کات کی کاشت کرنے والے اس کو لا لا کر بیچتے ہیں۔ یہ بازار دس بجے صبح سے لے کر تقریباً دو بجے تک چلتے ہیں۔“

بازار میں پہنچ کر دیکھا تو کات کے پتے کچھ نیم کے پتوں کی طرح دکھائی دیے۔ جب لوگ اپنی ضرورت کے مطابق کات خرید لیتے ہیں تو پھر کات کی محفل جمتی ہے۔ جس میں لوگ کات کی کونپل پتیوں کو منہ میں جمع کر کے اس کا رس حلق سے اتارتے ہیں جس سے ان کو سرور ملتا ہے۔

☆......☆

ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیور نے کات کا گٹھا اٹھایا۔ دونوں افسروں نے ہم سے دو گھنٹے بعد ملنے کا وعدہ کیا اور کات کی محفل جمانے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے یمنیہ کے کنٹریکٹ منیجر کو کنٹریکٹ کے اسرار و رموز سے شناسائی کروانی تھی۔ مجھے شرعی کے دفتر کا دس بارہ سال پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب L-1011 کے کنٹریکٹ کی میری رپورٹ دیکھ کر شرعی کا نظام صوتی کلام کا متحمل نہ رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشاروں سے مجھے اپنے دفتر سے دفع ہو جانے کا عندیہ مرحمت فرمایا تھا۔

RB-211 انجن کا کنٹریکٹ BA کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ نیا کنٹریکٹ Qantas کے ساتھ طے پایا۔ اس وقت سعودیہ کے پاس سو سے زیادہ RB-211 انجن تھے۔ دس انجن کا کنٹریکٹ بھی ایک بڑا کنٹریکٹ ہوتا ہے۔ RB-211 انجن کا کنٹریکٹ بہت ہی بڑا کنٹریکٹ تھا۔ Qantas نے اپنے پاور پلانٹ کے منیجر مسٹر روس بارکلا کو مستقل طور پر جدہ میں تعینات کر دیا تھا تاکہ Qantas بہترین طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ Qantas کے لیے سب سے بڑا منفی مسئلہ سڈنی اور جدہ کے درمیان کا فاصلہ تھا۔ روس کو یقینی بنانا تھا کہ اس مسئلے کے باوجود سعودیہ کو بروقت انجن یا اس کے پرزہ جات لانے لے جانے میں کوئی کوتاہی نہ ہو ورنہ یہ گاڑی زیادہ دور نہ چل سکتی تھی۔

روس ایک قابل انجینئر اور منیجر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ شریف النفس، دھیمی طبیعت، ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ۔

سڈنی کی پہلی کارکردگی کی سہ ماہی میٹنگ میں کرٹ نے شرکت کی تھی۔ دوسری میٹنگ میں مجھے جانا تھا۔ میں سڈنی پہلی دفعہ جا رہا تھا۔ میں نے میٹنگ سے متصل ہفتہ دار چھٹی کے ساتھ تین دن مزید چھٹی لے لی۔ تاکہ راستے میں دو دن تھائی لینڈ بھی رک سکوں۔ میرے ساتھ انجن شاپ کے زین الدین کو بھی جانا تھا مگر ان کی فلائٹ الگ دن تھی۔ ہم دونوں کو مقررہ دن سڈنی میں ہوٹل میں ملنا تھا۔ بینکاک میں میرا قیام نہ تھا۔ مجھے پھوکیٹ جانا تھا پھر وہاں سے جیمز بونڈ آئی لینڈ۔ وقت کم تھا۔

بالی کے بعد پھوکیٹ میرا پسندیدہ جزیرہ تھا جہاں میں چھٹیاں گزارنے جاتا تھا۔ بے حد خوب صورت جگہ لوگ بہت ملنسار۔

پھوکیٹ پہنچا تو سفر کی تکان تھی۔ کھانا کھا کر سو گیا' باہر جانے کا موقع نہ ملا۔ دوسرے دن صبح صبح جیمز بونڈ آئی لینڈ جانا تھا۔

راستے کا پانی بہت اتھلا تھا۔ بعض جگہ تو پانی کی اتنی کمی تھی کہ کشتی کو چپو کی بجائے بانس سے کھینچنا پڑتا تھا۔ آخر کار منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

اس جزیرے کا نام پہلے کچھ اور ہوتا تھا مگر یہاں پر جیمز بونڈ کی ایک فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی جس کے بعد سے اس

کا نام جیمز بونڈ آئی لینڈ پڑ گیا۔ آئی لینڈ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اتنا خاص نہ تھا جتنا اس کا شہرہ تھا۔ دوپہر کو واپسی تھی۔ کھانا ٹور میں شامل تھا۔ کھانے کے لیے راستے میں ایک جگہ رکنا تھا۔ یہ جگہ پہاڑی کے دامن پر بنائی ہوئی ایک مچھیروں کی بستی تھی۔ اونچے اونچے بانسوں پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے بچھا کر یہ بستی بنائی گئی تھی۔ تمام گھر لکڑی کے بنے ہوئے تھے' سوائے ایک عمارت کے۔ یہ عمارت ایک مسجد تھی۔ بستی کے رہنے والے مسلمان تھے اور اسی مسجد میں عبادت کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنے گائیڈ سے آدھا گھنٹا مسجد میں گزارنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا جلدی آجانا کھانا کسی کا انتظار نہیں کرے گا۔ ''تم کو ایسا سی فوڈ پورے تھائی لینڈ میں نہیں ملے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔

مسجد کے مؤذن صاحب مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کو پاکستان کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہ تھی بس یہ معلوم تھا کہ یہ ایک بڑا اسلامی ملک ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی سے بھی ملوایا۔ زیادہ وقت نہ تھا میں کھانے کی جگہ واپس آگیا۔ کھانا ایک لمبے اور پتلے کمرے میں لمبی لمبی تین میزوں پر سجا ہوا تھا۔ ان میزوں پر جس جس قسم کا سی فوڈ آپ کے ذہن میں آسکتا تھا موجود تھا۔ مچھلی، جھینگے، اسکویڈ، کیکڑے، گھونگے، سیپیاں اور بہت کچھ۔ گائیڈ کا کہنا صحیح تھا کہ اتنی انواع میں اور اس وافر تعداد میں سی فوڈ پورے تھائی لینڈ میں ملنا مشکل تھا حالانکہ بینکاک میں بھی بہت اعلیٰ سی فوڈ ریسٹورنٹ ہیں۔

کھانا کھا کر واپس پھوکیٹ۔ شام کی فلائٹ سے بینکاک۔ پھر سڈنی۔ سڈنی میں میٹنگ سے دو دن پہلے پہنچا تھا تاکہ میں سڈنی شہر اور اس کے اڑوس پڑوس میں گھوم سکوں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہوٹل پہنچا تو تیز بخار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دوپہر کو طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میرے ساتھی زین ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ مجھے فون کیا۔ ''سڈنی میں کیا کیا دیکھ لیا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ابھی تو صرف ہوٹل کا کمرا اور باتھ روم دیکھا ہے۔ جب سے آیا ہوں بخار نے جکڑ رکھا ہے۔''

''اگر اب بہتر ہو تو بونڈائی بیچ چلتے ہیں۔'' بونڈائی سڈنی کا مشہور بیچ ہے۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دو گھنٹے بعد۔''

بیچ پر تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد میں اور زین شہر گھومنے نکل گئے۔ سڈنی میں مجھے محسوس ہوا کہ یہاں پر انگریزوں کی تہذیب کا کافی حد تک اثر موجود ہے۔ گو کہ آسٹریلیا، برطانیہ کی کالونی تھا لیکن پہلا یورپ کا باشندہ جس نے آسٹریلیا میں قدم رکھا اس کا نام ولیم جانسزون تھا جس کا تعلق نیدرلینڈ سے تھا۔ یہ 1606ء میں آسٹریلیا گئے تھے۔ برطانیہ کے جیمز کک بہت بعد میں 1770ء میں بوٹنی بے پر اترے۔ بوٹنی بے آج کے سڈنی کا پرانا نام ہے۔ 1788ء میں انگلستان نے بوٹنی بے کو باقاعدہ اپنی کالونی بنا لیا۔ یہاں پر انگلستان کے معزول مجرموں کو سزا کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ آج کے اکثر گورے آسٹریلین انہی مجرموں کی اولادیں ہیں۔ بعد میں بہت سے لوگ آسٹریلیا آکر آباد ہو گئے۔ یہاں تقریباً دنیا کے دو سو ملکوں سے آکر لوگ آباد ہوئے ہیں۔ آسٹریلیا کی آبادی تقریباً کراچی کی آبادی کے برابر ہے۔ آسٹریلیا جزیرہ ہے۔ زیادہ تر آبادی جزیرہ کے چاروں طرف ساحلوں پر ہے۔ جزیرے کا اندرونی حصہ بہت کم آباد ہے جہاں زیادہ تر ایبوریجنی لوگ رہتے ہیں جو پہلے نیم وحشیوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ پچاس ساٹھ ہزار سال پہلے انڈونیشیا سے آکر بوٹنی بے وغیرہ کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کا رنگ بہت کالا اور ناک بے تحاشا پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔

☆......☆

Qantas کے ساتھ میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ جن لوگوں نے اس تحریر کو یہاں تک پڑھنے کی ہمت کی ہے ان کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میٹنگ کا اہم ترین جز چائے کا دور ہوتا ہے۔ جب یہ اہم کام سرانجام پا چکا تو انجن کا کام زیر بحث آیا۔ اس کی تفصیل نیند کی گولیوں کا کام دے گی۔ اس سے اجتناب سب کے حق میں بہتر ہوگا۔ میٹنگ کے دوران کا اہم جز تو چائے ہے مگر میٹنگ کے بعد اہم ترین موضوع رات کے کھانے کا ہوتا ہے۔ فرانس میں کسی کسی دن ہم لوگوں کو چائے اور کھانے کے درمیان کام کا بھی موقع مل جاتا تھا لیکن سڈنی تولوس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ سڈنی میں کام زیادہ اور پیٹ پوجا کم۔

رات کا کھانا سڈنی ہاربر میں ایک کشتی میں تھا۔ مقررہ وقت پر لوگ اس بہت بڑی کشتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کشتی ساحل چھوڑ دیتی اور اگلے تین گھنٹے سڈنی ہاربر کے گرد چکر لگاتی۔ اس کشتی میں کھانے کے کمرے اس

طرح بنائے گئے تھے کہ ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ لوگ کھانا بھی کھاتے جاتے اور ہاربر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ سڈنی کا مشہور و معروف آپرا ہاؤس بھی سڈنی ہاربر پر ہے۔ اس کا کشتی کے بادبانوں جیسا ڈیزائن اپنی نظیر آپ ہے۔ بلاشبہ بے نظیر۔ اس کا ڈیزائن ڈنمارک کے آرکیٹیک یورن اتزان کا بنایا ہوا ہے۔ یہ ایک انعام یافتہ ڈیزائن تھا جو یورن نے سخت بین الاقوامی مقابلے کے بعد 1957ء میں جیتا تھا۔ رات کے وقت سڈنی آپرا قابلِ دید ہوتا ہے۔ سڈنی ہاربر میں دوسری قابلِ دید چیز یہاں کا پل ہے جو سڈنی ہاربر برج کہلاتا ہے۔ یہ ایک محراب کی شکل کا اسٹیل کا بنا ہوا پل ہے۔ اس پر سے ٹرین، گاڑیاں، سائیکلیں اور پیدل چلنے والے سب گزرتے ہیں۔ یہ پل سڈنی کے کاروباری مرکز کو شمالی سڈنی سے ملاتا ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا سب سے چوڑا پل ہے جو اتنا لمبا ہے۔ دنیا کا سب سے چوڑا لمبا پل کینیڈا کے شہر وینکوور کے پاس ہے جس کا نام پورٹ لین برج ہے۔

اس مجمع میں Qantas کے تمام افسران اعلیٰ مع اپنی بیگمات کے موجود تھے۔ روس بارکلا بھی جدہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے' ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ بعض جوڑے ایسے ہوتے ہیں جن میں میاں بیوی دونوں متاثر کن اور دل آویز شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ روس اور ان کی بیگم کا شمار بھی ان جوڑوں میں ہوتا ہے۔ وقت بہت اچھا گزرا۔ کھانے سے زیادہ ماحول اچھا تھا۔ کل میٹنگ کا دوسرا اور آخری دن تھا۔

یہ میرا آسٹریلیا کا پہلا چکر تھا لیکن آخری نہ تھا۔ چونکہ میری دو دن کی چھٹی بخار منانے میں نکل گئی تھی۔ روس (Ross) نے وعدہ کیا کہ وہ اس زیادتی کا مداوا کریں گے۔ میری اگلی چھٹی پر مجھے آسٹریلیا آنا ہوگا۔ ٹکٹ کی ذمہ داری Qantas کی ہوگی۔ اس ٹکٹ کا فائدہ نہ اٹھانا بھی زیادتی ہوتی۔ میری اگلی چھٹی سڈنی میں گزری۔ یہ بھی آسٹریلیا کا آخری چکر ثابت نہ ہوا چند ماہ بعد میں پھر آسٹریلیا میں تھا مگر اس بار سڈنی نہیں بلکہ ملبورن۔

B-747 کی فیوزلاج (جہاز کا دھڑ) سیکشن میں بنا ہوا ہے۔ کاک پٹ جس سیکشن میں ہے وہ سیکشن 41 کہلاتا ہے۔ پچھلے چند سال کے دوران مختلف ائرلائنوں کے سیکشن 41 کے معائنے کے دوران اس میں کریک اور دوسرے نقص پائے گئے تھے۔ یہ صورتِ حال جہاز کی سیفٹی کے نکتہ نگاہ سے خطرناک ہو سکتی تھی خاص طور سے پرانے جہازوں کے لیے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بوئنگ نے ایک مرمت (موڈی فیکشن) تیار کیا جو سیکشن 41 موڈی فیکشن کہلایا۔ یہ بڑا کام تھا کئی ہزار گھنٹے کا۔ سعودیہ کو بھی اپنے پہلی کھیپ کے B-747 پر یہ کام کروانا تھا۔ اس کے کرنے کے لیے خاص مہارت کی ضرورت تھی۔ جس کمپنی سے یہ کروایا جائے اس کی استعداد، قابلیت، مہارت اور تجربے کا جانچنا ضروری تھا۔ سعودیہ کی ٹیم جو ان کمپنیوں کا جائزہ لینے اور معائنہ کرنے گئی اس کی سربراہی میرے ذمے تھی۔

آسٹریلیا میں ایک کمپنی Asta کے نام سے تھی' ان کا ہینگر بھی دیکھنا تھا۔ یہ کمپنی پہلے آسٹریلوی حکومت کے پاس تھی پھر اس کی نج کاری کے بعد اب یہ Asta کے نام سے کام کر رہی تھی بعد میں اس کو روکول نے خرید لیا۔ اب یہ بوئنگ کی ملکیت ہے۔ Asta کا دفتر اور ہینگر ملبورن میں تھے۔ ہم ملبورن، بینکاک سے گئے تھے۔ رنگین راتوں کے علاوہ تھائی لینڈ جن چیزوں کے لیے مشہور ہے ان میں مگرمچھ اور سانپ کی کھال سے بنی ہوئی چیزیں، تھائی سلک اور جواہرات خاص طور سے شامل ہیں۔

میں نے مگرمچھ کو تو کبھی تکلیف نہیں دی لیکن ایک دفعہ سانپ کی کھال کا بنا ہوا جوتوں کا جوڑا ضرور خریدا تھا۔ ان جوتوں کے علاوہ میں تھائی سلک بھی خرید چکا تھا مگر اس دفعہ ماں کی فرمائش پر مجھے تھائی سلک ایک بار اور خریدنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک کم قیمت انگوٹھی بھی۔ تھائی سلک لینے میں تھامسن سلک کی دکان پہنچ گیا۔ یہ دکان جم تھامسن کی یادگار ہے۔ تھائی سلک کا ذکر' جم تھامسن کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ جم تھامسن کی کہانی غیر معمولی اور دلچسپ ہے ان کو ایک طرح سے تھائی سلک کی صنعت کا بانی اور محافظ کہا جا سکتا ہے۔ جم امریکی باشندے تھے ابتدائی طور پر انہوں نے بحیثیت آرکیٹکٹ کام کیا پھر دوسری جنگ عظیم کے دوران OSS میں شامل ہو گئے۔ OSS کو بعد میں توڑ کر CIA کو تشکیل کیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جم تھائی لینڈ آ گئے جہاں انہوں نے OSS کا آفس قائم کیا۔ 1946ء میں جم نے آرمی کو خیرباد کہا اور 1948ء میں تھائی لینڈ کی انحطاط پذیر سلک کی کاٹیج انڈسٹری کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور محنت وقف کر دیا۔ تھائی سلک کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی کے بنائے ہوئے تھائی سلک کے ڈیزائن یول

برائیز کی مشہور زمانہ فلم دی کنگ اینڈ آئی میں استعمال ہوئے۔ اس کے بعد سے تھامسن کی کمپنی ترقی پر ترقی کرتی گئی۔ جم کو غریب تھائی خواتین کا بہت خیال رہتا تھا۔ انہوں نے بے شمار کام کرنے والوں کو غربت کی دلدل سے نکالا۔ چند سال بعد وہ بے پناہ ہو گئے ہر طرح کی کوشش کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

تھائی سلک میں خرید چکا تھا۔ اب مجھے مسٹر بھونگ کی دکان پر جا کر ایک انگوٹھی خریدنا تھا۔ مسٹر بھونگ تقریباً میرے دوست بن چکے تھے۔ پچھلے چند برسوں میں، میں اپنے ایک سعودی ساتھی کے ہمراہ ان کی دکان پر تین چار مرتبہ جا چکا تھا۔ میرے یہ سعودی ساتھی بھونگ کے مستقل خریدار تھے، وہ اکثر بھونگ کی دکان سے جیولری خریدا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تھائی لینڈ میں جواہرات کی خریداری میں دھوکے کا بہت امکان رہتا ہے۔ یہاں زیادہ تر سیاح زندگی میں صرف ایک بار ہی آتے ہیں۔ ان سیاحوں کو اگر ناقص یا جھوٹا مال بیچ بھی دیا جائے تو وہ اس کو واپس کرنے دوبارہ تھائی لینڈ نہیں آئیں گے۔ بھونگ نہ صرف ایماندار تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی قیمتیں بھی مناسب ہوا کرتی تھیں۔ انگوٹھی میں نے پسند کی اور خرید لی لیکن شاید بھونگ مجھے اپنا مستقل گاہک بنا کر میری وفاداریوں کو یقینی بنانا چاہتے تھے گو کہ اس دن کے بعد میں ان کی دکان پر دوبارہ پھر کبھی نہیں گیا۔ انہوں نے اصرار کیا۔ ''آج رات کے کھانے پر تم میرے مہمان ہو۔ میں تم کو کوریا کا کھانا کھلاؤں گا۔'' میں نے کوریا کا کھانا پہلے کبھی نہیں کھایا تھا گو کہ بعد میں مجھے یہ شرف اس وقت حاصل ہوا جب میں چند سال بعد کوریا کے شہر سیول گیا۔

''کپڑے اچھے پہن کر آنا۔'' بھونگ نے وارننگ دی۔

کپڑوں سے کھانے کا کیا تعلق۔ کیا کوریا میں کھانا کپڑے دیکھ کر دیا جاتا ہے۔ مجھے زیادہ دماغ نہ لڑانا پڑا۔ اچھے کپڑوں کی وجہ بھونگ کے برابر آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

''کھانے پر تم کو ماریانہ لے جائے گی۔ ماریانہ کورین ہے۔''

بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ ماریانہ کو دیکھنے سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کورین ہے۔ تھائی لوگوں کے مقابلے میں کورین لوگوں کے رنگ گورے ہوتے ہیں۔ ناک تقریباً ستواں اور چہرے کے نقش مختلف۔ ماریانہ کا پورا نام ماریانہ چیونگ تھا۔ دبلی پتلی۔ لمبا قد، شکل اوسط مگر مسکراہٹ دل میں اتر جانے والی۔ ''میں آٹھ بجے آپ کو اسی جگہ ملوں گی۔'' ماریانہ نے کہا۔

''میں اس کو کھول لوں۔''

''کیوں نہیں۔ یہ کھولنے کے ہی لیے پیک کیا گیا ہے۔''

قلم پا کر ماریانہ کی آنکھوں میں بچوں جیسی خوشی کی چمک تھی۔ کھانا آ چکا تھا۔ اس میں کئی طرح کے گوشت کے پتلے پتلے کٹے ہوئے پارچے تھے۔ کچھ سبزیاں، چاول۔

کل صبح Qantas کی پرواز سے ملبورن جانا تھا۔ انگوٹھی میری جیب میں تھی۔ اس کو ہوٹل میں چھوڑنا مناسب نہ تھا۔

ملبورن ائرپورٹ پر فلائٹ رات میں پہنچی۔ Asta نے ہوٹل کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم سیدھے ہوٹل چلے گئے۔ نو دس گھنٹے کی پرواز کے بعد صرف ایک چیز سوجھتی ہے بستر، رات سونے لیٹا تو صبح کی خبر لی۔

صبح نو بجے کے قریب Asta کے ڈائریکٹر مارکیٹنگ مسٹر والٹر ہوٹل کی لابی میں موجود تھے مع اپنی گاڑی کے۔ ان کی گاڑی میں سوار ہو کر ہم Asta کے لیے روانہ ہو گئے۔ Asta کا دفتر ملبورن سے کچھ فاصلے پر تھا۔ راستے میں ہم لوگ ایک اونچے پل پر سے گزرے۔ نیچے عمیق کھائی تھی۔

سیکشن 41 موڈی فیکشن کی Asta کی تیاری قابلِ ستائش تھی۔ ساری دنیا میں B-747 کے جتنے بھی جہاز متاثر تھے ان سب کا تفصیلی ریکارڈ کمپیوٹر میں محفوظ تھے۔ سعودیہ کے جہازوں سمیت Asta کے لیے ضروری تھا کہ اگر وہ اپنی خدمات دنیا میں بیچنا چاہتے تھے تو ان کی خدمات دوسروں سے بہتر ہوں اس لیے کہ آسٹریلیا بہت سے ملکوں سے بہت دور پڑتا ہے اور جو ممالک آسٹریلیا کے قریب ہیں یعنی آٹھ گھنٹے کی پرواز کے اندر۔ ان سب کے پاس خود اپنی صلاحیتیں موجود ہیں جیسے Haeco سنگاپور ائر لائن، جاپان ائر لائن وغیرہ۔

Asta کا ہینگر بھی منفرد تھا۔ اس کی شکل گنبد نما تھی۔ اتنا بڑا گنبد نما ہینگر بنانا آسان کام نہیں۔ میٹنگ کارآمد اور کامیاب رہی۔ وقت ہمارے پاس کم تھا۔ دو ہفتے سے بھی کم وقت میں دنیا کے گرد چکر لگا کر چھ ہینگروں کا معائنہ اور ابتدائی بات چیت کرنی تھی۔ ہم یورپ، امریکا اور آسٹریلیا

آچکے تھے۔ اگلا اسٹاپ ہانگ کانگ پھر واپس جدہ۔ یہ میرا دنیا کے گرد تیسرا چکر تھا۔ شاید ایک چکر اور لگانا پڑے۔ وقت بتائے گا۔

☆......☆

کراچی میں شادی کی تقریب تھی مجھے اس میں شرکت کرنا تھا۔ اس زمانے میں جدہ سے کراچی کے لیے کسی روز دو کسی روز تین پروازیں ہوتی تھیں۔ میں نے صبح دس بجے چلنے والی پرواز کا انتخاب کیا۔ وقت مقررہ پر مسافروں کو جہاز پر سوار کروادیا گیا۔ پرواز کی اڑان کا وقت ہو چکا تھا مگر اڑنے کی تیاری کے کوئی آثار نہ تھے۔ جہاز کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ پھر وقت سے پندرہ منٹ اوپر ہو گئے۔ کپتان نے اعلان کیا کہ فنی خرابی کے باعث تاخیر ہورہی ہے۔ پندرہ بیس منٹ اور لگیں گے۔ مزید آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اعلان ہوا کہ فنی خرابی دور کرنے میں وقت لگے گا ہم آپ کو واپس لاؤنج لیے چلتے ہیں۔ لاؤنج میں دو گھنٹے انتظار کے بعد اعلان ہوا کہ یہ جہاز نہیں جاسکتا۔ دوسرا کوئی جہاز اس وقت موجود نہیں ہے۔ تین گھنٹے بعد دوسرا جہاز مسافروں کو لے کر کراچی جائے گا۔ جہاز میں خرابی کے ایسے واقعات کوئی غیر معمولی بات نہیں ہیں۔ ہوتے رہتے ہیں۔ تین گھنٹے بعد مسافر دوسرے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز فضا میں بلند ہو گیا۔

ہر ائر پورٹ پر جہازوں کے آنے اور جانے کے راستے متعین ہیں۔ آنے والے راستے Star اور جانے والے راستے Sids کہلاتے ہیں۔ جدہ سے کراچی پرواز کے لیے جہاز کو ایک خاص زاویہ سے جانا ہوتا ہے۔ تھوڑا سا سمندر کی طرف جا کر پھر مشرق کی طرف جہاز مڑتا ہے۔ ہمارا جہاز مشرق کی طرف مڑنے کی بجائے سمندر کے رخ چلا گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا میرے برابر میرے عزیز دوست ڈاکٹر یوسف کمال بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''اب ہم واپس جدہ ائر پورٹ جائیں گے۔'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ''کیسے معلوم۔'' ان کا سوال غیر متوقع نہ تھا۔ ''جہاز سمندر میں فیول ڈمپ کر رہا ہے۔ فالتو ایندھن سمندر میں پھینک رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا ہے۔ ایندھن پھینکنے کی نالی باہر نکلی ہوئی ہے۔ ایندھن گرنے کی دھار دکھائی دے رہی ہے۔''

ہوائی جہاز میں ہر طرح کے وزن احتیاط کے ساتھ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بلند ہونے اور لینڈ کرنے کے وزن کی حدیں مقرر ہوتی ہیں۔ لینڈ کرتے وقت اگر جہاز کا وزن اس حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے لینڈنگ گیئر پر اثر پڑ سکتا ہے۔ لینڈنگ گیئر ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے زائد ایندھن کو گرادیا جاتا ہے تاکہ وزن کی حد مقررہ پر جہاز کو اتارا جاسکے۔ ہمارے جہاز نے جیسے ہی اڑان پکڑی اس کے ایک انجن میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ جہاز کو واپس جدہ ائر پورٹ پر اتارنا لازمی ہو گیا تھا۔ بغیر ایندھن سمندر میں پھینکے جہاز اتر نہیں سکتا تھا۔

تیسرا جہاز جب مسافروں کو لے کر کراچی ائر پورٹ پر اترا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ شادی کی تقریب ختم ہو چکی تھی۔ دولہا دلہن تخلیہ میں تھے۔

کراچی میں جمعہ اور ہفتے کی درمیانی شب کو پہنچا تھا۔ اتوار کو مجھے زیورخ جانا تھا جہاں سوئس ائر اور پریٹ اینڈ وٹینی کے ساتھ A-300 کے انجن کے ضمن میں میٹنگ میں شرکت کرنا تھا۔ میری پرواز ائر فرانس سے تھی۔ پہلے کراچی سے پیرس پھر پیرس سے زیورخ۔

ائر فرانس کی یہ پرواز بینکاک سے کراچی آتی تھی۔ میں اس پرواز سے دو تین دفعہ کراچی آچکا تھا۔ کراچی سے مسافروں کو لے کر یہ پرواز پیرس کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ کراچی سے بہت کم مسافر سوار ہوتے تھے۔

ائر پورٹ پہنچا تو وہاں پر ایک صاحب اور ایک لڑکی کو ائر فرانس کے کاؤنٹر کے پاس کھڑا پایا۔ وہ صاحب آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ ''یہ میری بیٹی ہے۔ چند دن پہلے اس کی شادی ہوئی ہے اپنے شوہر کے پاس امریکا جارہی ہے۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔'' میں نے جواب دیا کہ ''میں صرف پیرس تک جارہا ہوں۔''

''جہاں تک آپ جارہے ہیں خیال رکھیے گا۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

لڑکی ویسی ہی دبلی پتلی سی تھی جیسی اکیس بائیس سال کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہاتھوں کی مہندی پھیکی پڑ چکی تھی مگر ابھی مٹی نہ تھی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی' کچھ کچھ اداس۔ کچھ بابل کے آنگن کی پیاس۔ کچھ ساجن سے ملنے کی آس۔ شاید یہ اداسی انہیں متضاد جذبوں کا اثر تھا۔ ایک طرف بابل کے آنگن سے بچھڑنے کا غم دوسری طرف جیون ساتھی سے ملنے

کی لگن۔ کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑی آزمائش کا مقام ہوتا ہے۔

یہ لڑکی شاید زندگی میں پہلی دفعہ ائرپورٹ آئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو کسی چیز کی کوئی معلومات نہ تھیں۔ یہ اکیلی امریکا کیسے جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

بقول امام نذیر میرا جذبہ شفقت پدرانہ یکا یک دیو بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ''یہ لڑکی تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس کو خیریت سے پہنچانا تمہارا کام ہے۔'' میرا بس چلتا تو میں امریکا جاکر اس کے ساجن کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھما کر لوٹتا لیکن شاید سعودیہ کو یہ بات پسند نہ آتی کہ میں زیورخ کی میٹنگ چھوڑ کر امریکا بھاگ نکلوں۔

پیرس پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ''آپ ٹرانزٹ لاؤنج چلی جائیں۔'' جواب ملا۔ ''وہ کیا ہوتا ہے۔'' مزید تفصیل میں جانا غیر ضروری تھا۔

میری اپنی فلائٹ میں تقریباً ایک گھنٹا رہ گیا تھا مگر اس لڑکی کو اس کے جہاز تک پہنچانا ضروری تھا۔ اگر میری فلائٹ چھوٹ بھی گئی تو میں دوسری فلائٹ سے یا ٹرین سے زیورخ جاسکتا تھا۔ اس لڑکی کو بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں جب اس کا بورڈنگ کارڈ لے کر اس کو اس کے ڈیپارچر گیٹ پر چھوڑ کر اپنی فلائٹ کی طرف آیا تو میری فلائٹ روانہ ہونے والی تھی۔ مزید پانچ منٹ کی دیر میرے لیے پریشانی کا باعث ہوتی مگر میرے جذبہ شفقت پدرانہ کو ایک گونہ سکون مل چکا تھا۔

ایسے موقعوں پر مجھے ہمیشہ مارینا یاد آجاتی ہے۔ اس کا الھڑپن، معصومیت اور بچکانہ بے نیازی۔

☆......☆

سعودیہ کے L-1011 ٹرائی اسٹار جہاز میں فرسٹ کلاس اور اکانومی کلاس کے درمیان ایک کیبن ہوتا تھا جس میں سیٹوں کی تین یا چار قطاریں ہوا کرتی تھیں چونکہ سعودیہ کا عملہ اور ملازمین بڑی تعداد میں سعودیہ کا کاروباری اور ذاتی سفر کیا کرتے تھے۔ اس کیبن میں زیادہ تر سعودیہ کے ملازمین کو ہی سیٹیں دی جاتی تھیں تاکہ دوسرے مسافروں کو ان کی وجہ سے کسی قسم کی دشواری یا تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آج مجھے بھی اس کیبن میں سیٹ ملی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ چکا تھا۔ میں سعودیہ کا دفتری کام ختم کرنے کے بعد لندن سے جدہ واپس جارہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک نوخیز نوبہار کیبن میں داخل ہوئیں۔ بورڈنگ کارڈ پر اپنا سیٹ نمبر دیکھ کر میرے برابر آکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے بند قبا کا ذکر لازمی ہے کہ یہ سارا کھیل ان کی اسی بند قبا کا ہے۔

شہر میں ان کے رنگ حنا کی بند قبا کی بات چلی

انہوں نے بغیر آستین کی بہت زیادہ نیچے گلے والی بنیان نما چیز پہن رکھی تھی۔ اس ڈھیلی ڈھالی بنیان کے اوپر سرخی مائل نارنجی رنگ کی بلاؤز زیب تن کر رکھی تھی جس کی آستینوں نے کاندھوں سے کہنی تک دونوں ہاتھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ سامنے سے بلاؤز پوری طرح سے کھلا ہوا تھا۔ کمر سے کچھ نیچے بلاؤز میں ایک ڈھیلی سی گرہ بندھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے انتہائی کسی ہوئی جینز جو پنڈلیوں تک جاکر اختتام پذیر ہوتی تھی۔ ماتھے سے اوپر بالوں پر کالی عینک۔ منہ میں چیونگم ہاتھ میں دو بیگ۔

بڑے بیگ کو اوپر بنے ہوئے سامان کے خانے میں رکھنے کے بعد انہوں نے میرے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سیٹ ان کی ہے۔ میں کھڑے ہو کر ایک طرف ہوگیا کہ وہ اپنی سیٹ تک رسائی حاصل کرسکیں۔ سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے دوسرا بیگ اٹھایا اور جھک کر اس بیگ کو اپنے سامنے والی سیٹ کے نیچے سامان کے لیے بنی ہوئی جگہ پر رکھ دیا۔

بیگ کو ٹھکانے لگانے کے کارِ خیر کے بعد جب وہ ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ پر سیدھی ہونے لگیں تو اس جھٹکے کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کی بنیان نما جامہ علم بغاوت بلند کردیا۔

محترمہ نے بنیان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچا اور اس کو ٹھیک کرنے کے بعد میری طرف مسکرا کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ''آپس کی بات ہے۔'' مجھے مجاز لکھنوی کی نظم ''نورا'' کے اختتامی شعر اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے دکھائی دیے۔

ادھر میرے دل میں تو محشر بپا تھا
مگر اس طرف حال ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر
ہنسی نہ سہی مسکراہٹ رہی سہی

محترمہ نے میری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ابھی مصافحہ ختم ہی ہوا تھا کہ وہ خواتین کے مقبول ترین مشغلے میں مشغول ہوگئیں۔ باتیں بغیر رکے لامتناہی باتیں۔

خود ہی سوال کرتیں اور خود ہی جواب دیتیں۔ مجھے بیچ بیچ میں ہوں ہاں کرنے اور سر ہلانے کی اجازت تھی۔ اپنی طرف سے بغیر کوئی سوال پوچھے ہوئے ہی۔ میرے پاس ان کی فائل مع تمام اہم کوائف کے تیار ہو چکی تھی۔

مارٹینا کا تعلق ڈنمارک سے تھا۔ عمر انیس سال چار مہینے اور ساڑھے دس دن۔ آدھے دن کا حساب یوں تھا کہ وہ رات دس بجے کی مبارک ساعت پر اس دنیا میں وارد ہوئی تھیں۔ ابھی لندن میں صبح کے صرف نو بجے تھے جو ڈنمارک میں صبح کے دس کا عمل تھا۔ ابھی ان کی پیدائش کے مہینے میں گیارہواں دن مکمل ہونے میں پورے بارہ گھنٹے باقی تھے۔ لہٰذا ابھی عمر عزیز کے بیسویں سال کے پانچویں مہینے کے صرف ساڑھے دس دن پورے ہوئے تھے۔ گیارہ نہیں۔ بات معقول نکلی۔

مارٹینا کا ایمان تھا کہ ہائی اسکول کے آگے پڑھائی جاری رکھنے سے ذہن پر مضر اثرات مرتب ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھیں۔ باتوں کی شوقین اس لیے تھیں کہ زیادہ باتیں کرنے سے ذہن کو جلا ملتی ہے۔ باتوں کے علاوہ وہ گھومنے کی شوقین تھیں۔

اپنے اس گھومنے کے شوق کو پورا کرنے کی خاطر وہ پچھلے ایک سال سے SAS ائرلائن میں بطور ائرہوسٹس کام کر رہی تھیں۔ اسی دوران ان کے کسی دوست نے ان کی توجہ سعودی ائرلائن کے اشتہار کی طرف دلائی کہ سعودی ائر لائن کو تجربہ کار ائر ہوسٹس کی ضرورت تھی۔ مارٹینا نے درخواست دی، انٹرویو ہوا۔ منتخب ہو گئیں۔ آج کی پرواز سے وہ اپنی نوکری کا آغاز کرنے کی غرض سے عازم جدہ تھیں۔ یہ ان کا جدہ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔

اب تک میں صرف سنتا رہا تھا لیکن اب میرے بولنے کا موقع آ گیا تھا۔ مارٹینا کو سعودی عرب کے رسم و رواج سے متعلق معلومات پہنچانا ضروری تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے کسی ان دیکھی مشکل میں پڑ جائے۔ میرا خیال تھا کہ یہ کام بہت آسان ہے۔ اس میں کسی قسم کی دشواری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ میں غلط تھا۔

جب میں نے مارٹینا کو سعودی عرب میں عورتوں کے لباس کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں پر زیادہ تر خواتین اپنے لباس کے اوپر عبایا بھی پہنتی ہیں تو اس کو یقین نہیں آیا۔ وہ مجھے آزادیٔ نسواں پر لیکچر دینے کو تیار ہو گئی۔ میرے لیے یہ صبر آزما وقت تھا۔ وہ مجھ سے اس بات پر بحث کر رہی تھی کہ جس پر نہ تو میرا ہی کوئی اختیار تھا اور نہ ہی اس کا۔ صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب اس کا جوش ذرا ٹھنڈا پڑا تو میں نے اس کو سہولت کے ساتھ سمجھایا کہ یہ اس ملک کا دستور اور قانون ہے۔ یہاں اس کو آزادیٔ نسواں کا کوئی حامی نہیں ملے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ میرے مشورے پر عمل کرے۔ اگر وہ سعودی عرب میں رہنا چاہتی ہے تو' ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے دیس' اپنے ماحول میں واپس چلی جائے۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر نیند نے اسے آ دبوچا۔ سوتے میں وہ انتہائی معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی معصومیت دیکھ کر مجھے فیض صاحب کا شعر یاد آ گیا۔

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

میں نے اس کے شانوں پر کمبل ڈال دیا۔ مارٹینا سوتی رہی۔ میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔

مارٹینا کا تعلق ایک ایسے ملک سے تھا کہ جہاں پورے خاندان کا بغیر کپڑوں کے ساحل سمندر پر دھوپ سینکنا۔ دوڑ بھاگ کرنا۔ روز مرہ کی عام بات تھی۔ اس ماحول میں پلنے بڑھنے والی کسی لڑکی کے لیے مختصر کپڑے پہننا یا ستر کا کھل جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کے معاشرے میں ستر کا وہ تصور نہیں ہے جو اسلام میں ہے۔ اس ماحول میں پلی ہوئی مارٹینا مجھے ایک سیدھی سادی، الہڑ اور بے ساختہ لڑکی لگی جو کم عمری میں دنیا گھومنے کا شوق پورا کر رہی تھی۔ بغیر کسی خدشے کے کہ وہ کسی خطرناک حادثے سے بھی دوچار ہو سکتی تھی۔

اس واقعے کو دہراتے ہوئے مجھے مستنصر حسین تارڑ صاحب کی لال کتھری یاد آ گئی۔ لیکن یہ تقابل مناسب نہیں۔ لال کتھری کی زندگی تو ایک تلخی کا شکار ہو گئی تھی کہ سالگرہ کے تحفے میں ملی ہوئی اسپورٹس کار چلاتے ہوئے وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور اپنی ٹانگ گنوا بیٹھی۔ مگر مارٹینا تو لالہ تھی کہ جس نے صرف بہار دیکھی تھی۔ خزاں کا تصور شاید اس کے خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔

خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا تھا
بہار نے جسے خون جگر سے پالا تھا

جدہ آچکا تھا۔ میں نے اور مارٹینا نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔

اس دن کے بعد سے میری مارٹینا سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی مڈبھیڑ حالانکہ ہم دونوں ہی سعودی ائرلائن کی مہیا کی ہوئی رہائش گاہ سعودیہ سٹی میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود جب بھی مجھے مارٹینا کا خیال آتا تو اس کا الہڑ پن اور اس کی بے ساختگی اور معصومیت یاد آجاتی اور اس کے لیے میرے دل میں ایک ہی تمنا ابھرتی۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

☆......☆

زیورخ کی میٹنگ کا تذکرہ غیر ضروری ہے کہ وہ روز مرہ کی عادی میٹنگ تھی۔ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ نہ ہوا۔ البتہ میٹنگ کے بعد کی مشغولیت کا ذکر ضروری ہے۔ یہ مشغولیت زیورخ کے ایک بڑے ہوٹل میں وقوع پذیر ہوئی۔

کھانے کی لمبی سی میز پر سترہ اٹھارہ لوگ موجود تھے۔ میزبانی سوئس ائر کی تھی۔ لطیفوں کا دور چل پڑا۔ سعودی عرب میں سو سے اوپر شہریت کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ہر شہریت والے نے دوسرے کے متعلق لطیفے بنا رکھے ہیں۔ دو تین افراد کی باری آئی اس کے بعد ورہال شاپ کے سعودی سپروائیزر نے ایک لطیفہ سنایا۔

ایک کشتی میں چار لوگ سفر کر رہے تھے۔ ایک آئرش، ایک کیوبن، ایک سعودی اور ایک پاکستانی۔ بیچ سمندر میں پہنچے تو آئرش نے وہسکی سے بھرا ہوا بکس پانی میں پھینک دیا۔ سب نے شور مچایا اتنی قیمتی وہسکی تم نے سمندر میں بہا دی۔ اس نے شان استغنیٰ سے دیکھا اور کہا۔ ”کوئی بات نہیں آئرلینڈ میں وہسکی کی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے یہاں بہت وہسکی ہوتی ہے۔“

اور تھوڑی دور گئے تو کیوبن نے ہوانا سگار کا بہت بڑا ڈبہ سمندر میں بہا دیا۔ اس کا جواب بھی وہی تھا جو آئرش کا تھا۔ ”کیوبا میں لاتعداد سگار ہوتے ہیں ہم کو ان کی کوئی پروا نہیں۔“

”جب سعودی کی باری آئی تو اس نے پاکستانی کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا کہ سعودی عرب میں پاکستانیوں کی کوئی کمی نہیں۔“ پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ میری غیرت کو للکارا گیا۔

امریکا میں پولینڈ کے باشندوں کی دانش مندی کے اتنے ہی چرچے ہیں جتنے سکھوں کی دانش مندی کے چرچے پاک و ہند میں ہیں۔ پولش لوگوں کا امریکا میں اسی طرح ذکر خیر ہوتا ہے جیسا ہمارے یہاں سکھوں کا۔

پریٹ اینڈ وٹنی نے جو اپنا مقامی انجینئر جدہ میں تعینات کیا تھا وہ بھی پولش تھا۔ اس کا نام اسٹاسکی تھا۔ وہ کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے جواب دیا۔

”سعودی میرے بھائی ہیں میں ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ پولش لوگوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں اس لیے کہ میں آپ کو پولش لوگوں کے بہت قریب محسوس کرتا ہوں اگر آپ میرے نام میں صرف ''سکی'' اضافہ کر دیں تو میں پولش بن جاؤں گا میرا نام رزاسکی ہو جائے گا اور میں اسٹاسکی کا سگا نہیں تو کم از کم سوتیلا بھائی ضرور لگوں گا۔“ اس کے بعد میں نے ایک سنا سنایا قصہ سنا دیا۔ وہ قصہ یہ تھا۔ ایک دفعہ ایک امریکی ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا۔ ”مجھے پولش بنا دو۔“ ڈاکٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا کہنے لگا۔ ”دنیا کا کوئی صحیح الدماغ آدمی پولش نہیں بننا چاہتا۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو مجھے پولش بنا دو یہ میری بچپن کی خواہش ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس کے لیے تمہارا آدھا دماغ نکالنا پڑے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”منظور۔“

آپریشن ہو گیا جب مریض ہوش میں آیا تو اس نے پوچھا کہ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایک تھوڑی سی غلطی ہو گئی ماتحت ڈاکٹر نے آدھے کی بجائے پورا دماغ نکال دیا۔

مریض نے کہا۔ ”مالش“ اور اٹھ کر چلا گیا۔

ہال ایک دفعہ پھر گونج اٹھا۔

یہ مالش چمپی تیل والا مالش نہیں تھا۔ مالش عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کوئی بات نہیں۔ امریکی پورا دماغ نکلنے کے بعد پولش نہیں بلکہ سعودی بن چکا تھا۔

میرے سعودی دوستوں کو یہ بات زیادہ نہ بھائی مگر اس کے بعد سے کسی سعودی نے مجھے پاکستانیوں کے خلاف کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔

اگلے روز جدہ واپسی تھی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

لیکن اب ہرجائی کا دل جدہ سے بھرنے لگا تھا۔

☆......☆

سعودیہ کے پاس اس وقت پانچ 100-3747

جہاز تھے اور ایک B747-SP ریاض اور جدہ سے نیویارک کی پرواز پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کا دھڑ چھوٹا ہوتا ہے۔ پیٹرول اتنا ہی ہوتا ہے جتنا B747-100 میں ہوتا ہے۔ پیٹرول اتنا ہی اور وزن کم۔ اس طرح یہ جہاز بغیر رکے جدہ سے نیویارک جاسکتا تھا۔ اس میں یہ احتیاط ضرور رکھی جاتی تھی کہ آئرلینڈ کے شہر شین میں اس کو ری ڈسپیچ کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسافروں اور سامان کے وزن کو اور ہوا کے رخ وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ جہاز میں ایندھن بچا ہے وہ نیویارک جانے کے لیے کافی ہے یا نہیں اگر ایندھن کافی نہیں ہوا تو جہاز کو شین میں اتار کر اس میں مزید ایندھن بھرا جاتا تھا۔ ایندھن لینے کے لیے جب جہاز اترتا ہے تو اس کو ٹیکنیکل لینڈنگ کہا جاتا ہے اگر جہاز ٹیکنیکل لینڈنگ کرے تو اس کو وہاں سے مزید مسافر اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

ٹیکنیکل لینڈنگ کے امکانات کو کم سے کم کرنے کے لیے سعودیہ کی خواہش تھی کہ رولس رائس اپنے RB-211 انجن کی کارکردگی کو بہتر بنانے پر غور کرے۔ B-747 کی اگلی کھیپ میں اس پر کافی زور تھا۔

یہ اگلی کھیپ چار جہازوں کی تھی تین B747-100 اور ایک B747-SP۔

اب مواصفات میری ذمہ داری نہ تھی۔ فلائیڈ اس کے ذمہ دار تھے مگر جہاز کے مواصفات سے اتنی آسانی سے رشتہ توڑنا مشکل تھا فلائیڈ بھی میرے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے مجھے مواصفات کی میٹنگ میں بھی شرکت کرنی پڑی گو کہ اب میری ذمہ داری صرف جہاز کی خریداری کے کنٹریکٹ تک محدود تھی۔

چونکہ B-747 کی پہلی کھیپ میں تمام اہم معاملات طے پاچکے تھے ان چار جہازوں کی خریداری میں کوئی خاص مسئلہ نہ ہوا۔ مواصفات میں صرف چند تبدیلیاں کی گئیں جن کا محرک سعودیہ کا ان جہازوں کے اڑانے اور مرمت کا تجربہ تھا۔ B-747 کی دوسری کھیپ کی خریداری کے کنٹریکٹ پر دستخط ہونے کے بعد موقع تھا کہ میں لمبی چھٹیاں لے سکوں۔ میں نے تین ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے دی۔

☆......☆

کالج کے زمانے میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جس میں جیک لیمن، شلی ووڈ اور ٹونی کرٹس نے کام کیا تھا۔ فلم کا نام تھا ”دنیا کے گرد اسّی دن میں“ وہ لوگ اسّی (80) دن میں دنیا کے گرد گھومے تھے۔ میں بیس دن میں دنیا کے گرد گھوموں گا۔ یہ تھا میری چھٹی کا مقصد۔

پچھلے چند سال میں، میں آسٹریلیا کے علاوہ باقی چار براعظموں میں کافی گھوم چکا تھا گو کہ چند سال بعد میرا ایک دفعہ آسٹریلیا جانے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ اب کی میں چند ایسی جگہوں پر بھی جانا چاہتا تھا جہاں پہلے کبھی نہیں گیا تھا مگر آسٹریلیا اس دورے میں شامل نہ تھا۔ کینیڈا میں بھی چند دن گزارنے تھے، میں کافی عرصے سے کینیڈا نہیں گیا تھا۔ ابتداء یورپ سے کرنا تھا۔ پہلا اسٹاپ میڈرڈ۔

میڈرڈ میں پہلے جاچکا تھا۔ اس زمانے میں جب میں برمنگھم میں پڑھائی کر رہا تھا۔ میڈرڈ کے علاوہ قرطبہ اور سیول بھی دیکھ چکا تھا۔ ٹولیڈو اور قرطبہ میڈرڈ سے سیول جاتے ہوئے راستے میں پڑتے ہیں۔ سیول میڈرڈ کے جنوب میں تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس دفعہ میں بارسلونا جانا چاہتا تھا جو میڈرڈ سے مشرق اور تھوڑا شمال میں سوا چھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میڈرڈ سے بارسلونا کا سفر بذریعہ ٹرین تھا۔

میڈرڈ سے بارسلونا کے لیے رات میں کوستا براوا ٹرین چلتی ہے جو نو یا دس گھنٹے کے سفر کے بعد صبح بارسلونا پہنچا دیتی ہے۔ اوپر نیچے دونوں برتھ پر رات کو سونے کا بندوبست ہوتا ہے۔ دو طرف ٹرین کی دیوار اور دو طرف تارپولین کے پردے۔ بیڈ روم جیسا آرام، برتھ نہایت آرام دہ۔

مجھے میڈرڈ میں ہوٹل میں نہ ٹھہرنا تھا۔ چند گھنٹے رکنا تھا۔ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں پر ایک صاحب مل گئے ان کا نام تھا آرتورو۔ یہ انگریزوں کے آرتھر کا ہم معنی ہے۔ آرتورو بارسلونا میں رہتے تھے۔ میڈرڈ کام سے آئے تھے اب گھر واپس جارہے تھے۔

”بارسلونا میں کہاں ٹھہرو گے۔“ آرتورو نے پوچھا۔

”معلوم نہیں، کوئی ہوٹل ڈھونڈوں گا۔ دو دن رکنا ہے۔“

”اگر تم میرا مشورہ مانو۔“ آرتورو نے مشورہ دینا چاہا۔ ”تو تم ہوٹل کی بجائے پنسیون میں ٹھہرو وہاں تم کو گھر کا ماحول ملے گا۔ ہوٹل والے لوٹتے ہیں اور ٹھیک سے خیال

بھی نہیں رکھتے۔"

شہر گھومنے کے لیے بھی آرتورو کے مشورے قابلِ قدر تھے۔"سگرادا فیمیلیا چرچ ضرور دیکھنا۔ ساری دنیا میں اس کی ٹکر کا کوئی چرچ نہیں۔ ساحل سمندر جانا وہاں پر مچھلی اچھی ملتی ہے اور جیسے جھینگے بارسلونا میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں مل سکتے ہم ان کو گامباس کہتے ہیں۔ سمندری نمک کے ساتھ بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں وہ سی فوڈ نہیں کھاتے۔ تم سی فوڈ کھاتے ہو؟"

"جی میں سی فوڈ کھاتا ہوں۔" میں نے اقرار کیا۔

ٹرین آچکی تھی میں اور آرتورو اپنے اپنے ڈبوں کی طرف جا رہے تھے کہ آرتورو کو کچھ یاد آگیا۔ اچانک مڑے اور کہا۔"ہاں بھنے ہوئے آکٹوپس کھانا مت بھولنا، بائی بائی۔"

اتنے تفصیلی مشورے شاید کوئی ٹریول ایجنٹ بھی مجھے نہ دیتا۔ میں نے آرتورو کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ڈبے کی طرف بڑھ گیا۔

پنسیون دراصل انگریزی زبان کا پنشن ہے۔ یہ ذاتی گھروں کے وہ ایک دو کمرے ہوتے ہیں جو وہ مقامی لوگ جو ریٹائرڈ ہو چکے ہوتے ہیں کرائے پر اٹھا کر اپنی آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ میں ایک پنسیون پہنچ گیا۔ بڑے میاں اور بڑی بی دونوں بہت محبت سے ملے۔ انگریزی سے زیادہ آشنا نہ تھے۔ دو دن واقعی اپنائیت کا پرسکون ماحول ملا۔ ناشتا بھی ملا۔

سب سے پہلے سگرادا فیمیلیا دیکھنا تھا۔ یہ واقعی قابلِ دید عمارت تھی جس کا ڈیزائن کیٹیلان کے آرکیٹکٹ انتونی گاؤڈی نے بنایا تھا۔ اس کے آٹھ اونچے اونچے مینار ہیں جن میں سے کم سے کم اونچے مینار کی اونچائی سو میٹر سے زیادہ ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر سگرادا فیمیلیا کی زیارت کا صحیح لطف اٹھانا ہے تو اس کے مینار پر چڑھ کر شہر کا نظارہ کرو۔ تین سو فٹ سیڑھیاں چڑھنے کی ہمت نہ جب تھی نہ اب ہے۔

دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی آرتورو نے کہا تھا کہ ساحل سمندر پر مچھلی نہایت لذیذ ملتی ہے۔ بیچ کا رخ کیا۔ لوگ حسبِ معمول دھوپ سینکنے اور سمندر میں نہانے کے مزے لوٹ رہے تھے مگر آگے جانے سے پہلے مجھے پیٹ پوجا کرنا تھا۔

عارضی قسم کے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ ان کے باہر میزیں لگی تھیں۔ میں کرسی کھینچ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ آواز آئی۔"کیا کھائیں گے۔" یہ جملہ اردو میں کہا گیا تھا۔ میں نے تعجب سے پلٹ کر دیکھا تو ایک پاکستانی لڑکا کھڑا تھا۔"حیران نہ ہوں سر، میں بھی پاکستانی ہوں۔ انگلستان جانا تھا۔ ایجنٹ نے یہاں تک لا کر چھوڑ دیا۔ پیٹ تو بھرنا ہے۔ میں نے یہاں بیرے کی نوکری کرلی۔ یہاں مچھلی مزیدار ہوتی ہے۔ لے آؤں۔"

"ہاں لے آؤ۔" میں نے جواب دیا۔ خدا معلوم ایسے کتنے ہی پاکستانی دنیا بھر میں ایجنٹوں کے ہاتھوں رسوا اور پریشان ہو رہے تھے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

کھانا کھا کر میں ساحل کی طرف نکل گیا۔ پنسیون پہنچا تو بڑی بی اسی طرح پریشان تھیں جس طرح گھر والے دیر سے آنے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔"سینیور (مسٹر) آپ کہاں چلے گئے تھے، دوپہر کھانے پر بھی نہیں آئے؟" میں نے بتایا کہ میں سگرادا فیمیلیا دیکھنے اور بیچ گھومنے چلا گیا تھا۔ بڑی بی نے فوراً اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ میں کمرے میں آرام کرنے چلا گیا اسپین آ کر بل فائٹ اور فلیمنکو ڈانس نہ دیکھنا اسپینرڈ کی غیرت کو للکارنے کے برابر ہے۔ رات کو فلیمنکو ڈانس دیکھنا تھا۔

اگلے دن آرکیٹکٹ انتونی گاؤڈی کی بنائی ہوئی ایک اور عمارت کازا میلا دیکھنا تھا جو لاپیڈریرا بھی کہلاتی ہے۔ لاپیڈریرا کے معنی صیدیا شکار کے ہیں۔ یہ نام شاید اس لیے پڑ گیا ہو کہ یہ عمارت ایک جوڑے روز ریسیمون اور پیرے میلا نے بنوائی تھی۔ روز یرا ایک امیر بیوہ تھی۔ میلا نے اس سے شادی کرلی تھی اور اس کے پیسے سے عیش کی زندگی گزارتا تھا۔ لوگ اس کے پیچھے پڑے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ عمارت بھی اپنے ڈیزائن میں منفرد ہے تین چار منزلہ ہر منزل پر کئی اپارٹمنٹ' الفاظ میں اس کا احاطہ کرنا صرف مستنصر حسین تارڑ کو آتا ہوگا۔ میں نہیں کرسکتا۔ اس عمارت کی کہانی صرف اس کی تصویر کی زبانی ہی سنی جاسکتی ہے۔

مچھلی میں کل کھا چکا تھا۔ گامباس کھانا باقی تھا۔ میں نے ساحل کا رخ کیا۔ ساحل سے باہر سڑک پر کئی ہوٹل موجود تھے۔ جہاں گامباس کھائے جاسکتے تھے۔ یہاں گامباس ثابت تلے جاتے ہیں۔ سمندری نمک کے ساتھ پلیٹ میں دیے جاتے ہیں۔ گامباس کے سر اور دم کو خود الگ

کرنا ہوتا ہے۔ لوگ گامباس کے سروں کو پھینکنے سے پہلے ان کو چوس رہے تھے۔ میں نے بھی ڈرتے ڈرتے کراہیت کے ساتھ ایک سر کو چوسا۔ خلافِ توقع مزے کا لگا۔ اتنے بڑے جھینگے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے نہ کھائے تھے مگر اس کے بعد بینکاک میں کھانے کا اتفاق ہوا۔ تھائی لینڈ میں بھی گامباس اسی طرح بناتے ہیں مگر وہ لوگ سمندری نمک کی بجائے اس کو تلے ہوئے لہسن کے ساتھ بناتے ہیں۔

آرتورو نے جو کھانے کی چیزیں بتائی تھیں اس میں صرف بھنے ہوئے آکٹوپس کھانا باقی تھا۔ پنسیون والی بڑی بی سے پوچھا تو انہوں نے ایک جگہ کا نام بتایا جو قریب تھی ویسے تو آکٹوپس ہر جگہ مل جاتے تھے۔ میں شام میں وہاں چلا گیا۔ یہ کئی کئی فٹ لمبے آٹھ دس پیروں والے آکٹوپس نہ تھے بلکہ ننھے ننھے آکٹوپس کے بچے تھے جن کو یہ لوگ تل کر اس طرح کھاتے تھے جیسے ہم چنے وغیرہ کھاتے ہیں۔

بارسلونا میں دیکھ چکا تھا۔ اب مجھے براستہ نیس، کانز جانا تھا جہاں سالانہ بین الاقوامی فلمی میلہ لگتا تھا۔ نیس تولوس سے تقریباً ساڑھے پانچ سو کلو میٹر مشرق کی طرف بحر میڈیٹرینین کے کنارے ہے۔ کانز وہاں سے تیس پینتیس کلو میٹر پر واقع ہے۔ نیس میں پہلے جا چکا تھا کانز بھی نیس کی طرح نکلا کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی کانز میں جان اسی وقت پڑتی ہے جب یہاں سالانہ بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوتا ہے۔ نیس سے پیرس پھر ٹورنٹو۔

کراچی کے بعد مجھے جس شہر سے لگاؤ ہے وہ ٹورنٹو ہے مگر میں یہاں تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اپنے رشتے داروں اور پرانے دوستوں سے ملنے اس کے بعد ہی لاس اینجلز سے ہوتا ہوا منیلا پہنچ گیا۔ یہ سب جگہیں میں پہلے بھی ایک سے زیادہ دفعہ دیکھ چکا تھا۔ اس دفعہ شمالی میریانہ جانا چاہتا تھا جو چند چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل تھا اور اس پر امریکا کی عملداری تھی۔ وہاں جانے کے لیے مجھے پہلے گوام جانا تھا۔

میں جزیرہ سیپ جانا چاہتا تھا مگر وہاں کی پرواز میں دو دن جگہ نہ تھی میرے پاس وقت نہ تھا میں نے جزیرہ روٹا کا ٹکٹ خریدا اور جہاز میں بیٹھ گیا۔ روٹا وہ جگہ نکلی جہاں وقت ٹھہر جاتا ہے کرنے کے لیے کچھ نہیں صرف ساحلوں پر گھومیں اور آرام کریں۔ یہ جزیرہ جاپان کے لوگوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں پر جاپانیوں نے ایک بڑا ہوٹل تیار کر رکھا ہے جس میں جاپان کے لوگ چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ اس وقت میرے علاوہ اس ہوٹل کا ہر مہمان جاپانی تھا یا تھی۔ جزیرہ گھوم کر کھانا کھانے آیا تو اسٹیک مل سکتا تھا یا جاپانی کھانا۔ میں نے جاپانی کھانا کھایا۔ کیا کھایا یہ صرف باورچی کو معلوم تھا کہ جاپانی تو ہر چیز کھا جاتے ہیں۔

شام کمرے میں لیٹا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے پر ایک جاپانی صاحب کھڑے تھے۔ دروازہ کھلا تو وہ جاپانی طریقے سے دو دفعہ رکوع میں گئے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ''آج شام ہم ایک جاپانی فیسٹیول منا رہے ہیں آپ شریک ہوں گے تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔ کھانے پر آپ ہمارے مہمان ہوں گے۔'' دیارِ غیر میں وقت گزارنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ''ضرور۔'' پھر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

وقت مقررہ پر تقریب کی جگہ پہنچا تو میرے میزبان مسٹر آکی ہیکو دوڑے ہوئے آئے اور آتے ہی رکوع میں چلے گئے۔ مجھے بھی رکوع میں جانا پڑا۔ ہم دونوں باری باری کئی دفعہ رکوع میں گئے۔ ہر رکوع کے بعد جھکاؤ میں نسبتاً کمی آتی جا رہی تھی۔ آخر کار ہم سیدھے کھڑے ہو گئے پھر ہاتھ ملایا۔ فیسٹیول میں کچھ مذہبی رنگ تھا بہت سی لائٹیں اور پٹاخے۔ پھر جاپانی دھن میں گانے۔ ہیکو صاحب نے مجھے اور لوگوں سے ملایا اور پوچھا۔ ''آپ ساکی ٹھنڈی پئیں گے کنکنی یا گرم۔'' ساکی ایک قسم کی جاپانی شراب ہے جو چاول سے بنتی ہے اور موسم اور پینے والے کے ذوق کے مطابق ٹھنڈی کنکنی یا گرم کر کے پی جاتی ہے۔ میں نے کوکا کولا پر اکتفا کیا۔ اب یہی میرا پسندیدہ مشروب بن چکا تھا۔

جاپانی موسیقی ختم ہوئی تو تیز مغربی دھنیں بجنے لگیں نوجوان جوڑے رقص کرنے میں مشغول ہو گئے۔

فیسٹیول ختم ہوا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں نے مسٹر ہیکو اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔

اب میں براستہ منیلا بینکاک پہنچ چکا تھا۔ تھائی لینڈ میرا پسندیدہ ملک ہے لیکن پسندیدہ شہر بینکاک نہیں۔ بینکاک کا ذکر میں متعدد بار کر چکا ہوں لیکن اس دفعہ بینکاک کا ذکر صرف ایک واقعے کے ضمن میں ہے۔

میں شیرٹن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جو سری وونگ روڈ پر واقع ہے۔ اس کے نزدیک ہی پیٹ پونگ روڈ ہے جو اپنی شبینہ زندگی کے لیے بدنام اور مشہور ہے۔ رات کے وقت یہ

سڑک ٹریفک کے لیے بند کردی جاتی تھی اور یہاں پر رات کا بازار لگتا تھا جہاں پر لوگ ٹھیلوں پر اپنا مال سجا کر بیچتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بار تھیں جہاں شراب اور رقص کا دور چلتا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا میں پیٹ پونگ مارکیٹ سے پینٹنگز خریدنا چاہتا تھا۔ پینٹنگز یہاں اچھی اور بہت کم داموں مل جاتی تھیں۔ میں نے دو پینٹنگز خریدیں ان کو فریم سے نکلوا کر رول کروالیا کیوں کہ جہاز میں فریم لے جانا مشکل تھا۔ یہ کام ختم کر کے میں ایک بار میں چلا گیا۔ پیاس لگ رہی تھی میں کوک پینا چاہتا تھا ایک لڑکی کوک لے آئی۔ کوک دینے کے بعد اس نے فرمائش کی کہ مجھے ایک ڈرنک خرید دو۔ میں نے خرید دیا۔

وہ ڈرنک لے کر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر فرمائش کی۔ ''میں بہت تھک گئی ہوں۔ کام نہیں کرنا چاہتی۔ تم ''ماماسین'' کو دو سو بھات دے دو وہ مجھے چھٹی دے دے گی۔ ماماسین بہت اچھی ہے۔'' اس کے بعد کی تفصیل۔ ''پھر تم مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لے چلو۔ صبح پانچ سو بھات دے دینا۔''

میں نے انکار کردیا وہ پیچھے پڑگئی۔ آخرکار میں نے کہا ٹھیک ہے چلو یہ دو سو بھات ماماسین کو دے دو۔

باہر آکر میں نے اس کو پانچ سو بھات دیئے۔ ''یہ لو اپنے پانچ سو بھات میں تم کو ہوٹل نہیں لے جاؤں گا۔''

''تم خفا ہوگئے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معافی مانگتی ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''واپس جاؤں گی تو ماماسین ناراض ہوگی۔ میں اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تم مجھے ہوٹل لے چلو۔''

میں نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہہ دیا میں ہوٹل نہیں جارہا ہوں۔ مجھے رابنسن اسٹور جاکر چیزیں خریدنی ہیں۔''

''میں بھی رابنسن چلوں گی۔'' وہ کسی طرح پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔

''اچھا چلو۔'' میں نے تنگ آکر کہا لیکن ابھی نہ میری آزمائش ختم ہوئی تھی نہ اس کی فرمائشیں۔ 'میں کپڑے بدل کر چلوں گی۔ میرا کمرا ہوٹل کے پیچھے ہے زیادہ دور نہیں تم میرے ساتھ چلو گے؟ اب میں وہی کچھ کروں گا جو یہ کہے گی۔ ''ضرور چلوں گا۔''

ہم چلتے چلتے شیرٹن کے پچھواڑے آگئے۔ اس شاندار ہوٹل کے پیچھے جو گندگی، غربت اور افلاس تھا، بیان سے باہر ہے۔ ایک دروازے کے سامنے اس نے چابی نکالی اس کو دروازے میں گھما کر دروازہ کھولا۔ چھوٹا سا کمرا۔ صرف ضرورت کی چند چیزیں ساتھ میں غسل خانہ۔

وہ دروازے کی اوٹ میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔

میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے پیچھے جانے سے پہلے اس نے کیسٹ پلیئر چلادیا تھا۔ کیسٹ سے تھائی گانوں کی بجائے ہندی گانوں کی آواز آرہی تھی۔

''تم ہندی گانے سنتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

جواب ملا۔ ''یہ میرے بابا کے گانے ہیں وہ سنتا تھا۔'' اب وہ کپڑے بدل کر آچکی تھی۔ ''میرا باپ ہندوستان سے آیا تھا۔ وہ میری ماں سے ملا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ میری ماں نے گھر والوں سے چھپ کر میرے باپ سے شادی کرلی۔ گھر والوں نے اس کے بعد میری ماں کی شکل نہیں دیکھی۔ سب نے اس کو چھوڑ دیا۔ مگر وہ میرے باپ کی اتنی دیوانی تھی کہ اسے اور کچھ نہ چاہیے تھا۔ پھر میں پیدا ہوگئی۔ میرا باپ یہیں کا ہو رہا کبھی ہندوستان واپس نہ گیا۔ میری ماں ہی اس کا سب کچھ تھی۔'' وہ سانس درست کرنے کو رکی۔ میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ ''پھر کیا ہوا۔''

''پھر۔'' اس نے کہا۔ ''میرا باپ اچانک مر گیا۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی دو مہینے بعد وہ بھی مر گئی۔ میں اکیلی رہ گئی۔'' میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔ وہ رک گئی۔ ''تم چائے پیو گے۔''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم ماماسین کے پاس کیسے پہنچ گئیں۔''

''ماماسین بہت اچھی ہے۔'' اس نے عقیدت سے کہا۔ میں نے ماماسین کو بار میں دیکھا تھا وہ خود تیس سال سے کم عمر کی رہی ہوگی۔ اس لڑکی نے بات جاری رکھی۔

''میرے کسی رشتے دار نے مجھے سہارا نہیں دیا۔ مالک مکان نے گھر سے نکال دیا۔ میں دو دن سے بھوکی تھی۔ سڑک پر غنڈے مجھے پکڑ کر لے جانا چاہتے تھے۔ ماماسین اور اس کے دو ساتھی وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بچایا۔ پھر ماماسین مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس نے مجھے دو مہینے اپنے پاس رکھا۔ میں اپنا جسم نہیں بیچنا چاہتی تھی مگر ماماسین کے پاس کب تک اس طرح رہتی۔ ماماسین بہت اچھی ہے۔ اس نے کبھی میرے ساتھ نہ ہی کوئی زیادتی کی اور نہ ہی اپنا جسم بیچنے پر مجبور کیا لیکن میں ہمیشہ کے لیے ماماسین پر بوجھ نہیں بن سکتی تھی۔ اپنی ذمہ داری

مجھے خود اٹھانی تھی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''آج میں بہت تھک گئی تھی۔ ورنہ میں ماماسین کا نقصان نہ کرتی۔ ماماسین فرشتہ ہے۔''

اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں طوائف کا جو پلید اور غلاظت بھرا تصور تھا دھل چکا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ سو بھات رکھے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

یہ لڑکی ایک ہندوستانی مرد اور ایک تھائی عورت کی لازوال محبت کا ثمر تھی جو بینکاک کے بازاروں میں بک رہی تھی۔

ہوٹل جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اصل بدکار کون تھا ماماسین جو اس لڑکی سے پیشہ کرواتی تھی یا وہ معاشرہ جس نے ایک کم عمر اور بے سہارا لڑکی کو تحفظ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا ماماسین واقعی فرشتہ تھی۔

طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ ماں یاد آ رہی تھی۔ میں نے پھوکیٹ کا پروگرام کینسل کیا اور اگلے روز کراچی پہنچ گیا۔ ماں کی مامتا میری منتظر تھی۔

باقی چھٹیاں کراچی میں گزار کر میں جدہ پہنچ چکا تھا۔

میرا دنیا کے گرد کا سفر پورا ہو چکا تھا لیکن بیس نہیں، بائیس دن میں۔ میرے سعودیہ میں شامل ہونے کے بعد سے اب تک سعودیہ تین مزید L-1011 دس B-747 اور گیارہ A-300 جہاز خرید چکی تھی۔ اب اس کو B-707 طیاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ویسے بھی یہ جہاز کافی پرانے ہو چکے تھے۔ پرانے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا خرچا بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ جہاز فالتو تھے بیچے جا سکتے تھے۔ گاہک کی تلاش تھی۔ اسی دوران سعودی حکومت نے طے کیا کہ ایک B-707 سوڈان کے صدر نمیری Numairy کو تحفتاً پیش کیا جائے۔ اس تحفے سے متعلقہ تمام تکنیکی امور کی ذمہ داری میرے سر تھی۔

جب بھی کوئی جہاز خریدا یا بیچا جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے اس کی منتقلی ایک فریق سے دوسرے فریق کو ہوتی تو یہ دستور ہے کہ اس کا C چیک کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جہاز کو مرمت اور دیکھ بھال کا پچھلے کئی سال کا ریکارڈ بھی منتقل کیا جاتا ہے۔ انجن کے ریکارڈ کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پچھلے چند سال سے بہت سے بوگس پرزے مارکیٹ میں آ گئے تھے اور کئی حادثوں کا باعث بنے تھے۔ اس لیے اب انجن کی منتقلی سے پہلے اس کے پیدائش سے آج تک کا تمام ریکارڈ ہونا لازمی قرار پایا۔

جہاز کے انجن بنیادی طور پر گیس ٹربائن ہوتے ہیں ان کو صنعت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر ان کے مواصفات سے اتنے سخت نہیں ہوتے جتنے جہاز کے استعمال کے لیے ضروری ہیں۔

ان کے پرزے جہاز میں استعمال کیے جانے والے پرزوں کی نسبت کمزور ہوتے ہیں۔ کم قیمت ہوتے ہیں۔ یہ جہاز کے انجن میں قانونی طور پر استعمال نہیں کیے جا سکتے ہیں لیکن چند بدنیت اداروں نے ان پرزوں کو ناجائز طور پر جہاز کے انجنوں میں لگانا شروع کر دیا تھا جس کے خطرناک نتائج سامنے آ چکے تھے۔ جس کی بنا پر انجن کے پرزوں کے ریکارڈ کی فراہمی لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے بغیر انجن نہیں بیچے جا سکتے تھے۔

جہاز کا چیک مکمل ہو چکا تھا۔ کل صبح یہ سوڈان جائے گا۔

جہاز کو سعودیہ کے رائل ٹرمینل کے سامنے پارک کر دیا گیا ہے۔ میرے پاس رات میں ڈکرن کا فون آیا۔

''ریڈیو لائسنس اور جہاز کا رجسٹریشن کس کے پاس ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' ڈکرن نے جواب دیا۔ ''اتارے بھی تھے یا نہیں۔'' پھر وہی جواب ملا۔ ''معلوم نہیں۔'' میں فوراً ائرپورٹ بھاگا۔ یہ دونوں دستاویزات سول ایوی ایشن میں صبح جمع کروانی تھیں۔ جہاز کا سوڈانی رجسٹریشن ہو چکا تھا۔

میں نے جہاز پر سیڑھی لگوائی اور دونوں دستاویزات گھر لے آیا۔

صبح دفتر پہنچا تو کرٹ کے پاس پیشی ہوگی۔ ''تم رات میں سوڈان والے جہاز پر گئے تھے۔''

''ہاں ریڈیو لائسنس اور رجسٹریشن اتارنے۔'' میں نے جواب دیا۔ کرٹ نے مجھے بتایا کہ میرا تعلق دنیا کے کس جانور سے ہے۔

''تم سے بڑا گدھا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس اعزاز کی وجہ کا بھی پتا چل گیا۔

''تم آخری آدمی تھے جو جہاز پر گئے تھے۔ تم سیکیورٹی رسک بن چکے ہو۔ اس فلائٹ پر سوڈان کی بہت اہم

شخصیتیں پرواز کریں گی اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ ہوا تو تم جیل جانے والے پہلے آدمی ہوگے۔''

کرٹ کی بات سو فیصد سچ تھی میں نے کام کی دھن میں اس بات پر غور ہی نہ کیا تھا کہ مجھے یہ کام سرکاری طور پر کروانا چاہیے تھا۔ جب تک جہاز خرطوم کے ایئرپورٹ پر اتر نہ گیا میں تمام مسافروں کی درازی عمر کی دعائیں مانگتا رہا۔

ایک B-707 جا چکا تھا مگر ابھی پانچ کا مسئلہ باقی تھا۔ پھر اچانک بوئنگ کے مقامی منیجر نے جو جدہ میں سعودیہ کے دفاتر میں بیٹھتا تھا رابطہ کیا کہ بوئنگ کمپنی ان جہازوں کو خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ ان کو ٹینکر میں تبدیل کریں گے۔ ظاہر ہے ٹینکر لڑاکا جہازوں کو فضا میں ایندھن پہنچانے کے لیے استعمال ہوتے۔ بوئنگ خود تو ان کو استعمال نہیں کرے گی کوئی اور ان کے ذریعے ان جہازوں کو خریدے گا۔ سعودیہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ طیارے بطور ٹینکر کسی ایسے ملک کو پہنچ جائیں جن سے سعودی عرب کو کسی قسم کا خطرہ ہو۔ یہ چیز بوئنگ پر واضح کردی گئی مذاکرات لندن میں ہوں گے سلمان کوشی اور میں مذاکرات میں شامل ہوں گے۔

عدنان ترقی ہوکر EVP آپریشنز کی خدمت پر معمور ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ سلمان کوشی VP انجینئرنگ بنا دیے گئے تھے۔ لندن کی بہت مشہور لا فرم کاورڈ چانس کے نام سے تھی جو لندن میں سعودیہ کے تمام قانونی معاملات سنبھالتی تھی۔ پہلی میٹنگ ان کے ساتھ تھی۔

میٹنگ سعودیہ کے لندن ٹاؤن آفس میں ہونی تھی۔ مقررہ وقت پر ایک لڑکی ٹاؤن آفس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دبلی، پتلی، لمبا قد، آنکھوں پر عینک گردن پر مفلر، زکام زدہ سڑسڑ کرتی ہوئی۔ ''میرا نام این ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں کاورڈ چانس میں وکیل ہوں۔ ایوی ایشن میرا فیلڈ ہے۔'' میں نے اور سلمان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نگاہوں میں مایوسی تھی مگر میٹنگ تو بہرحال کرنی تھی۔ ہم نے این کو اپنے نکات بتائے۔ این نے ان کو نوٹ کیا۔ پھر سوالات پوچھنے شروع کیے وضاحت طلب کی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ہم کو اندازہ ہوتا گیا کہ ہمارا پہلا تاثر کس قدر غلط تھا این بہت ذہین تھی۔ اگلے دن جب وہ کنٹریکٹ بنا کر لائی تو وہ سو فیصد ہماری ضروریات اور خواہشات کے مطابق تھا۔

کئی سال بعد میں اور سلمان ایک دفعہ پھر لندن میں کاورڈ چانس کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اس دفعہ B-747 کے مال بردار جہاز کی خریداری کا مسئلہ تھا۔ سلمان نے خاص طور سے این کے متعلق پوچھا اور اس کی ذہانت اور کام کی تعریف کی۔ این کسی اور پروجیکٹ پر کام کررہی تھی۔ مصروفیت کی بنا پر ہم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر اس کا کام ہمارے ذہن پر اپنے نقش چھوڑ چکا تھا۔

ہمارا قیام لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر تھا۔ ہیتھرو پر دو شیرٹن ہوٹل ہیں۔ ایک شیرٹن ہیتھرو کہلاتا ہے۔ دوسرا اسکائی لائن شیرٹن۔ ہم اسکائی لائن شیرٹن میں ٹھہرے تھے۔ سعودیہ کا آپریشنز آفس بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ اس سے پہلے یہ آفس ہیتھرو ہوٹل میں ہوا کرتا تھا اس وقت سعودیہ کے زیادہ تر لوگ بھی ہیتھرو ہوٹل میں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ ہوٹل بہت پرانا تھا اور دنیا کی تقریباً ہر ایئرلائن کے لوگ یہاں ٹھہرا کرتے تھے خاص طور سے پائلٹ وغیرہ۔ ہیتھرو ہوٹل کی بار میں ساری دنیا کے پائلٹ ایک دوسرے سے اپنے اپنے تجربات بیان کرتے تھے۔ بعد میں اس کا نام بدل کر پینٹا ہوٹل رکھ دیا گیا آج کل یہ کسی اور نام سے چلتا ہے۔

اسکائی لائن نیا ہوٹل تھا۔ اس کی خاص بات اس کا بار تھا۔ بار کے سامنے بڑا سا حوض بنا ہوا تھا۔ بار میڈ اس میں تیر کر آتی جاتی تھیں اور مہمانوں کو ان کی طلب کردہ مشروبات پہنچاتی تھیں۔

میٹنگ سے واپس آکر میں اور سلمان تازہ دم ہونے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ گھنٹے بھر بعد بار کے سامنے ملنے کا پروگرام تھا۔ ایک گھنٹا بعد ہم لوگ پول کے سامنے بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ لڑکی تیرتی ہوئی آئی اور ہماری مشروبات ہم کو تھما دیں۔ میں اپنا ٹریڈ مارک کوک پی رہا تھا۔ سلمان اپنی پسندیدہ مشروب۔ سلمان بغیر رکے۔ بلاتکان اور بلاتکلف گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ ان کا افتتاحی جملہ ہوتا تھا۔ ''میں بولتا بہت ہوں۔'' اس کے بعد وہ دو دو تین تین گھنٹے مسلسل بول کر اپنے افتتاحی جملے کو سچ ثابت کرتے تھے۔ آج بھی یہی ہوا۔

دوسرے دن بوئنگ سے میٹنگ تھی۔ جو دو دن جاری رہی۔ سارے معاملات طے ہوئے۔ کنٹریکٹ کو حتمی شکل دے دی گئی۔ تین دن بعد میں اور سلمان جدہ واپس آچکے

تھے۔

جہازوں کا چیک C شروع کروا دیا گیا۔ اس پروجیکٹ کا انچارج ڈکرن چودچیان تھا۔ قومیت لبنانی۔

B-707 کے ایک اور واقعے کا ذکر کردوں جو دو سال قبل پیش آیا تھا۔ ایک دن انسپکشن کے دوران معلوم ہوا کہ جہاز چارلی چارلی (CC) میں بہت بڑا کریک ہے۔ جہاز فوراً گراؤنڈ کردیا گیا۔ اس حالت میں اس کے اڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کریک اتنا بڑا اور گہرا تھا کہ مروجہ طریقوں سے اس کی مرمت ناممکن تھی یا تو بوئنگ کمپنی کوئی نیا طریقہ مرمت بتائے یا پھر ونگ بدلا جائے۔ بوئنگ کی ٹیکنیکل ٹیم کریک کا جائزہ لینے کے لیے جدہ آئی۔ واپس جاکر تجزیہ کر کے بوئنگ نے بتایا کہ مرمت ہو جائے گی مگر کام بہت بڑا ہے۔ بوئنگ کے اپنے آدمی کام کریں گے۔ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کتنا وقت اور کتنے آدمی لگیں گے۔ اس لیے کہ ایسا کام پہلے B-707 پر نہیں ہوا تھا۔ خرچا سات لاکھ ڈالر کے قریب اگر منظور ہو تو سعودیہ بتا دے۔

سعودیہ کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ کام ہوگیا۔ پیسے دے دیے گئے۔ چند مہینے بعد بوئنگ کے پاس سے پیغام آیا کام اندازہ سے زیادہ آسان نکلا۔ خرچا صرف پانچ لاکھ ڈالر کا ہوا ہے۔ بوئنگ کے پاس سعودیہ کے دو لاکھ ڈالر جمع ہیں۔

اسی طرح کا ایک واقع اور ہوا۔ سعودیہ نے جو آخری تین L-1011 جہاز خریدے تھے۔ اس میں ایک رعایت یہ تھی کہ لاک ہیڈ سعودیہ کو چند لاکھ ڈالر کے پرزہ جات مفت فراہم کرے گی۔ لاک ہیڈ کمپنی شہری ہوابازی سے نکل کر اب صرف ملٹری جہازوں پر توجہ دینا چاہتی تھی۔ L-1011 کے سارے معاملات بند کررہی تھی۔

یہ تین جہاز خریدے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔

ایک دن لاک ہیڈ کا خط آیا کہ ان چند لاکھ ڈالر کی رعایت سعودیہ نے استعمال میں کی ہے۔ وہ پیسے دے کر پرزہ جات خریدتے رہے ہیں۔ یہ ڈالر سعودیہ کس طرح لینا پسند کرے گی۔

ان واقعات کا ذکر صرف اس وجہ سے کیا گیا کہ جب جہاز ساز کمپنیاں مذاکرات کرتی ہیں تو ناکوں چنے چبوا دیتی ہیں۔ خاص طور سے جہاں ذمہ داریوں کا ذکر ہو تو وہ اپنے کنٹریکٹ کے متن سے ایک لفظ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتیں مگر جب کوئی بات طے ہو جائے تو پھر وہ ہر طرح سے اور پوری ایمانداری سے اس پر کاربند رہتی ہیں۔ چاہے ان کا نفع ہو یا نقصان، زبان۔ زبان ہے۔

ڈکرن نے محنت اور جانفشانی سے اپنے کام کو احسن طور پر انجام دیتے ہوئے وقت سے پہلے ہی B-707 کے چیک۔ C مکمل کرلیے تھے۔ یہ جہاز بوئنگ کو بروقت ڈیلیور کردیے گئے۔ اب سعودیہ کے بیڑے میں کوئی B-707 باقی نہ بچا تھا۔

Opec کے وجود میں آنے کے بعد ستر کی دہائی میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث مغربی ملکوں کو جو معاشی جھٹکا لگا تھا اس کے نتیجے میں ان ملکوں نے بعض اہم قدم اٹھائے تھے جس کے نتیجے میں اسی (80) کی دہائی کے شروعات سے ہی تیل کی قیمتیں گرنے لگی تھیں۔ Opec کے ملکوں کو شدید معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تیل کی قیمتیں 36 ڈالر فی بیرل سے گر کر 9 ڈالر فی بیرل تک پہنچ چکی تھیں۔ ان حالات میں سعودیہ کو مزید دس B-747 جہاز خریدنے تھے۔ اس زمانے میں B-747 کا نیا ماڈل آچکا تھا یہ ماڈل B-747-300 کہلایا۔ اس سے پہلے سعودیہ نے آٹھ B-747-100 اور دو B-747-SP خرید رکھے تھے۔

B-747-300 کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی اوپری منزل کو پیچھے کی طرف کافی بڑھا دیا گیا تھا۔ اب یہاں پر سیٹیں نصب کی جاسکتی تھیں جن پر مسافروں کو بٹھایا جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے والے جہازوں پر اوپری منزل چھوٹی سی ہوتی تھی۔ اس میں مسافروں کے لیے صوفہ نما سیٹیں تھیں جو فروخت نہیں کی جاسکتی تھیں اس لیے کہ ان میں وہ مضبوطی نہیں ہوتی تھی جو مسافروں کی سیٹ کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت ان سیٹوں کو خالی رکھنا لازمی تھا۔ ان صوفہ نما سیٹوں پر ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

B-747 کی عرفیت SUD پڑ گئی۔ اوپری منزل کی لمبائی کی وجہ سے SUD اسٹرچڈ اپر ڈیک (Stretehed upper deck) کا مخفف تھا۔

اگلے روز بوئنگ کی مواصفات کی ٹیم کے ساتھ میٹنگ تھی۔

میٹنگ کے اہم ترین جز یعنی چائے کے لوازمات

مکمل تھے۔ دودھ کے ساتھ ساتھ لیموں اور پودینے کا بھی بندوبست تھا۔ اس دور سے گزرنے کے بعد مواصفات پر توجہ دی جانی تھی۔ اب تک سعودیہ دو کمپنیوں میں دس جہاز خرید چکی تھی۔ مواصفات کا مرحلہ دو دفعہ طے کیا جاچکا تھا مگر اس دفعہ چند ایک نئی چیزیں تھیں۔

سعودیہ کی سب سے لمبی پرواز ریاض اور نیویارک کے درمیان ہوسکتی تھی جس کا دورانیہ نیویارک جاتے ہوئے پندرہ سولہ گھنٹے اور واپسی پر گیارہ بارہ گھنٹے ہوسکتا تھا۔ جانے اور آنے میں وقت کی کمی بازیادتی ہوا کے رخ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کرۂ عرض پر ہوائیں مغرب سے مشرق کے رخ چلتی ہیں۔ جاتے وقت یہ باد مخالف ہوتی ہے۔ ہیڈ ونڈ کہلاتی ہے۔ جہاز کو ہوا کے خلاف اڑنا پڑتا ہے۔ واپسی میں ہوا ایک طرح سے جہاز کو دھکا دیتی ہے جہاز کی پرواز کا وقت گھٹ جاتا ہے۔ یہ ٹیل ونڈ کہلاتی ہے۔

کسی پائلٹ کو اتنے لمبے دورانیہ کے لیے جہاز اڑانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے لمبی پرواز کے لیے ڈبل عملہ ساتھ چلتا ہے۔ ایک جتھا جہاز اڑاتا ہے۔ دوسرا آرام کرتا ہے۔ جب پہلے عملے کا وقت پورا ہوجاتا ہے تو وہ آرام کرتا ہے۔ جہاز کی کمان دوسرے عملے کو سونپ دی جاتی ہے۔

B-747-SP میں جگہ کی کمی کی وجہ سے دوسرے عملے کے لیے مسافروں کی سیٹوں کو استعمال کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان سیٹوں کا کرایہ ضائع ہوجاتا تھا۔ B-747-300 میں جگہ بہت بڑھ گئی تھیں اب جو ائرلائن چاہتیں ایسے جہازوں میں عملے کے آرام کرنے کے لیے کریو ریسٹ بنک لگواسکتی تھی جس کی قیمت تھی۔

دوسری اہم چیز ایندھن کا ذخیرہ تھا کہ جہاز میں اتنا ایندھن ڈالنے کا بندوبست ہو کہ بلا کسی پریشانی کے جہاز ریاض سے نیویارک پہنچ جائے۔ اس کا بندوبست جہاز کے کارگو کمپارٹمنٹ میں فالتو ٹینک لگا کر کیا گیا تھا۔ یہ بھی جہاز میں قیمت ادا کرکے لگوائے جاسکتے تھے۔

زائد ایندھن کے وزن کے توڑ کے لیے ایسے انجن کی ضرورت تھی جس کی کارکردگی بہتر ہوتا کہ وہ کم سے کم ایندھن استعمال کرکے منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ تمام چیزیں خالص ٹیکنیکل تھیں لیکن ایک اور اہم تبدیلی تھی جو سعودیہ کی انا کا مسئلہ تھا۔ سعودیہ کے جہازوں اور دوسری ہوا باز کمپنیوں کے جہازوں میں ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ اپنے مسافروں کے طور طریقوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سعودیہ کے جہازوں میں فرسٹ کلاس کی سیٹیں بہت زیادہ تعداد میں ہوتی تھیں۔ سعودیہ کی خواہش تھی کہ سعودیہ کے B-747-300 کا فرسٹ کلاس کا سیکشن ایسا ہو کہ دنیا کی کسی ائرلائن کا نہ ہو۔ سب سے بڑا سب سے اچھا سب سے بہتر وغیرہ کی ذہنیت کا فرما تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی سائیکل جو سوفٹ سے بھی لمبی تھی۔ جدہ کی ایک چورنگی پر نصب تھی۔

بوئنگ کی ٹیم کو سیاٹل (Seatlle) واپس جاکر ان سب امور پر کام کرنا تھا۔ اس کے بعد دوسری میٹنگ سیاٹل میں ہوگی۔ اس میٹنگ میں کافی وقت باقی تھا مگر مجھے اس سے پہلے ایک ضروری ذاتی کام کرنا تھا۔

میں آج تک براعظم جنوبی امریکا کے کسی ملک نہ گیا تھا۔ ریوڈی جنیرو کا بہت شہرہ تھا۔ مگر مشکل وہی تھی لمبی چھٹیاں نہیں مل سکتی تھیں۔ صرف چار پانچ دن۔ وہی حیدرآباد دکن کی مثل نہیں ماموں سے تلنے ماموں بہتر۔ جانا تو تھا۔

مراکش کا نام بھی بہت سن رکھا تھا لیکن کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مراکش کی ائرلائن سعودیہ کے ملازمین کو 90 فیصد رعایتی ٹکٹ بھی دیتی تھی۔ رائل ائر موراک کی پرواز مراکش کے شہر کاسابلانکا سے براستہ ڈکار ریو جاتی تھی۔ ایک پنتھ دو کاج مراکش اور ریو دونوں جگہ جایا جاسکتا مگر بہت کم عرصے کے لیے۔ سعودیہ کی فلائٹ سے میں کاسابلانکا پہنچ گیا۔ کاسابلانکا دو دن ٹھہر کر یہاں سے ریو براستہ ڈکار ائر موروک سے جانے کا پروگرام تھا۔

ساتویں صدی عیسوی میں کاسابلانکا پر بربر لوگوں کی بادشاہت تھی۔ پھر کاسابلانکا عربوں کے ہاتھ آیا پھر آخر میں پرتگالیوں اور ہسپانیہ کے ہاتھ۔ پرتگالیوں نے اس کا نام کاسابرانکا رکھا جس کے معنی سفید گھر کے ہیں۔ جب ہسپانیہ نے اس پر قبضہ کیا تو کاسابرانکا کو اس کے ہم معنی ہسپانوی زبان کے نام کاسابلانکا سے تبدیل کردیا۔ عرب کاسابلانکا کو دارالبیضہ کہتے اس کے معنی بھی سفید گھر کے ہیں۔

کاسابلانکا مراکش کا سب سے بڑا شہر ہے جس کی آج کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں شمالی افریقا کی سب سے بڑی بندرگاہ بھی ہے لیکن مجھے کاسابلانکا سے زیادہ فیض جانے کا شوق تھا۔ میں کاسابلانکا کے بازار سے گزر رہا تھا مجھے مقامی سامان آرائش

کی تلاش تھی۔ ایک دکان پر رکا تو اس نے عربی میں بات کرنا شروع کر دی۔ میں نے بتایا کہ مجھے عربی نہیں آتی۔ ''تو کیا تم تیونس کے باشندے نہیں ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''نہیں میں پاکستان سے آیا ہوں۔'' اس نے عربی انداز سے میرے گال چوم کر خوش آمدید کہا۔ ''یہ ہمارے عزت اور شرف کا مقام ہے کہ ایک پاکستانی بھائی ہمارے پاس آیا ہے۔'' میرا دل مسرت سے بھر گیا کہ مسلم امہ کا فرد ہونے کے ناطے ہر مسلمان ملک میں ہمارا استقبال محبت اور عزت سے کیا جاتا ہے۔

فیض کی جامعہ القرویین دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی مانی جاتی ہے۔ یہ 895ء میں فاطمہ الفہری نے بنوائی تھی۔ فاطمہ کا خاندان تیونس سے فیض آ کر بس گیا تھا۔ یہ دو بہنیں تھیں۔ ان کا باپ بہت امیر سوداگر تھا۔ فاطمہ کو جو دولت ورثے میں ملی تھی اس نے اس ساری دولت کو مسجد اور مدرسے کے لیے وقف کر دیا۔ شروع شروع میں یہ عمارت بہت سادہ طرز پر بنائی گئی تھی مگر پھر آنے والے حکمرانوں نے اس میں توسیع اور تزئین کا اہتمام کیا۔ دیکھنے والی جگہ ہے۔

کاسابلانکا سے پرواز براستہ ڈکر جاتی تھی۔ ایک گھنٹا کے قریب جہاز رکتا تھا۔ وہاں سے ریوڈی جنیرو، برازیل۔ براعظم جنوبی امریکا میں برازیل وہ واحد ملک ہے جہاں کی سرکاری زبان ہسپانوی نہیں ہے۔ برازیل میں پرتگالی زبان بولی جاتی ہے۔

ریوڈی جنیرو امارت اور غربت کا تضاد ہے۔ کم آمدنی والے لوگوں کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ بستیاں بہت گنجان ہیں۔ ریو میں جرائم کی بھی کثرت ہے۔ غربت بہت ہے۔ ریو کے متعلق دنیا میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ میرے مزید کچھ لکھنے یا نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں یہاں کے مشہور مقامات دیکھنے آیا تھا۔ جن میں کرائسٹ کا وہ مجسمہ شامل تھا۔ جس کے ساتھ کھڑا ہو کر آدمی اپنے آپ کو ایک چونٹی کی طرح محسوس کرتا ہے یہ مجسمہ اتنا ہی دیو قامت ہے مشہور شگر لوف چٹان بھی دیکھی مگر میرا زیادہ مقصد اپانیما بیچ دیکھنا تھا جس پر وہ گانا لکھا گیا تھا ''دی گرل فردم اپانیما''۔

میں ہوٹل سے باہر جانے لگا تو ہوٹل کے مینیجر نے کہا۔ ''سر یہاں آپ دو چیزوں کا خیال رکھیے گا پہلی چیز یہ کہ جب آپ بیچ پر جائیں تو تمام قیمتی سامان ہر وقت اپنے پاس رکھیں۔ خاص طور سے کیمرا۔ یہاں بیچ پر گھومنے والے لڑکے اس قدر تیز رفتار ہیں کہ اگر وہ آپ کا کیمرا لے کر بھاگے تو آپ ان کو نہیں پکڑ سکیں گے۔ دوسرے کسی لڑکی کو ہوٹل مت لائیے گا۔ یہ لڑکیاں اکیلی نہیں ہوتیں۔ ان کا گروہ ہوتا ہے۔ جب لڑکی کمرے میں آ جاتی ہے تو اس کے ساتھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ لڑکی دروازہ کھول دیتی ہے یہ لوگ مہمان کو لوٹ لیتے ہیں۔ اگر مہمان مزاحمت کرے تو زدوکوب کرتے ہیں۔ میرا آج رات زدوکوب ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔''

مراکش اور ریو گھومنے کا شوق پورا ہو چکا تھا۔ سیاٹل کی میٹنگ انجام پا چکی تھی۔ ایندھن کے زائد ٹینک، کریو ریسٹ بنک وغیرہ طے ہو چکے تھے۔ انجن کی کارکردگی کی ذمہ داری رولس رائس کی تھی۔ جہاز کی قیمت ادا کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی۔ فرسٹ کلاس کی سیٹوں اور قالین کی ذمہ داری سعودیہ کی تھی مگر اس سے پہلے اسپیئر انجن کا ذکر۔

سعودیہ نے دس B-747-300 خریدے تھے۔ ان دس جہازوں پر کل ملا کر چالیس انجن نصب تھے۔ سعودیہ کی پروازوں کے دورانیہ، وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ سات اسپیئر انجن کافی تھے مگر جو کنٹریکٹ رولس رائس کے ساتھ طے پایا وہ بیس اسپیئر پاور پلانٹ کا تھا۔ کم سے کم تیرہ اسپیئر انجن فالتو خریدے گئے تھے جن کی سعودیہ کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی بنیادی انجن نہیں بلکہ پاور پلانٹ جو سادے انجن کی بہ نسبت زیادہ مہنگے ہوتے ہیں۔ یہ کنٹریکٹ سعودیہ نے نہیں طے کیا تھا۔ تفصیل میں پردہ نشینوں کے نام آئیں گے۔ معذرت ہے کہ اس کا ذکر نہیں ہو سکتا۔

سعودیہ کے پاس ان انجنوں کے رکھنے کی جگہ نہ تھی یہ انجن شاپ کے باہر رکھے رہتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے تین یا چار انجن کو ڈیٹا پلیٹ کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پوری طرح سے کھول کر ان کے پرزہ جات کو بطور اسپیئر پرزہ جات استعمال کیا گیا۔ چار انجن آنے والے وقت میں B-747 کے مال بردار جہاز میں لگائے گئے مگر پھر بھی کئی انجن بچ رہے۔ ہر پاور پلانٹ کی قیمت اس وقت ساڑھے سات ملین ڈالر کے قریب تھی۔ انگلستان کے اخبار فنانشل ٹائمز نے اس سودے پر پورا ایک اخبار کے صفحے کا مضمون بھی شائع کیا جس کا آخری جملہ تھا ''مگر ہر چیز قانون کے مطابق کی گئی تھی۔'' کیس کلوزڈ۔

فرسٹ کلاس کے لیے فرانس کی کمپنی سکما کی بنائی

ہوئی سیٹیں استعمال کی گئیں جن کا نام فارس سیٹ رکھا گیا یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ آرام دہ سیٹیں تھیں۔ قالین وہ لگایا گیا جس میں پاؤں دھنس جائیں۔ سامان رکھنے والے خانوں کی پٹیاں سونے کے پانی پھیرے ہوئے دھات کی بنائی گئی تھیں۔ سگریٹ کے راکھ دان بھی سونے پھرے دھات کے بنائے گئے تھے۔ ہر جہاز پر تقریباً چھ لاکھ ڈالر کا خرچا آیا تھا مگر دنیا نے اس سے پہلے اتنا آرام دہ فرسٹ کلاس سیکشن نہ دیکھا تھا۔ وقت مقررہ پر یہ جہاز جدہ پہنچ گئے اور استعمال میں آ گئے۔

جب قاہرہ جانے والی پہلی پرواز جدہ واپس آئی تو سونے کے پانی پھرے ہوئی دھات کی ایش ٹرے غائب تھیں۔ قاہرہ کے مکینکس کو پتا چل گیا تھا کہ ان پر سونا پھرا ہوا ہے۔

قاہرہ اسٹیشن پر چوری معمول کی بات تھی۔ سعودیہ کے جہاز جب قاہرہ سے واپس آتے تھے تو پندرہ بیس ایمرجنسی کٹ سیٹوں کے نیچے سے غائب ہوتی تھیں۔ مسافر ان کو بطور سوغات لے جاتے تھے اور سمندر میں تیرنے کے لیے استعمال کرتے۔ یہ ان کا حق تھا۔ آخر کو انہوں نے ٹکٹ خریدا ہوا ہوتا تھا۔

قاہرہ کے حوالے سے ایک لطیفہ سعودیہ میں مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک مصری بدو جہاز میں داخل ہوا اس کو جو پہلی سیٹ ملی اس پر بیٹھ گیا۔ یہ فرسٹ کلاس کی سیٹ تھی۔ عملے کے ہر شخص نے اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر میں ایک مصری اسٹیورڈ آیا اس نے بدو کے کان میں کچھ کہا جس پر بدو نے اپنا پوٹلا سنبھالا اور پیچھے اکانومی کلاس میں چلا گیا۔ اسٹیورڈ نے اس بدو سے کان میں صرف یہ کہا تھا۔ ”یہ سیٹ قاہرہ نہیں جائے گی۔ قاہرہ جانے والی سیٹ پیچھے ہے۔“

ضروری نوٹ: اس کتاب کے تمام لطیفے سنے سنائے ہیں۔ ان میں میرا اپنا دماغ استعمال نہیں ہوا ہے۔

قاہرہ کی پرواز چند راکھ دانوں کی چوری کے کارن معطل نہ کی جاسکتی تھیں لیکن یہ راکھ دان عام دھات کے بنائے جاسکتے تھے۔ یہی اس مسئلے کا حل نکالا گیا۔ قاہرہ کے مکینکس کی مایوسی کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اب سعودیہ کے بیڑے میں بیس B-747 شامل تھے مگر ایک آخری B-747 اور خریدا جائے گا۔ یہ مال بردار B-747 ہوگا۔

سعودیہ کے B-747 کی پہلی کھیپ کی وصولی شروع ہو چکی تھی۔ شاید تیسرا یا چوتھا جہاز تھا۔ سعودیہ کے پائلٹ اس جہاز کو وصول کرنے سیاٹل ائرپورٹ پر اترے۔ کو پائلٹ اور فلائٹ انجینئر تو امیگریشن سے آسانی سے فارغ ہو گئے مگر کپتان کو روک لیا گیا۔ جب کپتان آ گیا تو اس نے امیگریشن والوں سے کہا کہ میں واپس جا رہا ہوں مگر نقصان تمہارا ہوگا اڑتالیس ملین ڈالر کا۔ امیگریشن آفیسر چونکے۔ ”نقصان کیسے ہوگا۔“

”میں یہاں سعودیہ کے لیے جہاز وصول کرنے آیا ہوں۔ میں واپس چلا جاؤں گا اڑتالیس ملین ڈالر بھی میرے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔“

اڑتالیس ملین ڈالر میں بہت طاقت ہوتی ہے۔

”یس سر۔“ کپتان کے پاسپورٹ پر ٹھپا لگ گیا۔

سعودیہ کو ایک مال بردار B-747 خریدنا تھا لیکن تیل کی قیمتیں جو آسمان سے باتیں کرتی تھیں اب زمین پر اتر آئی تھیں۔ اڑتالیس ملین ڈالر نقد کا رعب ختم ہو چکا تھا۔

مال بردار جہاز حاصل کرنے کی دو صورتیں تھیں یا تو کسی ایک مسافر بردار طیارے کو مال بردار میں تبدیل کروا لیا جائے جس میں خرچا کم تھا۔ یا نیا جہاز خریدا جائے۔

کارگو، انجینئرنگ اور کنٹریکٹ کی ٹیم تشکیل دی گئی جس نے آدمی دنیا چھان کر مشورہ دیا کہ نیا جہاز خریدنا بہتر ہے۔ نئے جہاز کے کنٹریکٹ پر دستخط ہو گئے۔ ایڈوانس پیسے بھی دے دیے گئے۔ اب جہاز تیار تھا باقی پیسوں کا بندوبست کرنا تھا جس کا درد سعودیہ نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔ بینک سے قرض لیا جائے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ سعودیہ نے پہلے کبھی قرض پر جہاز نہ خریدا تھا ہمیشہ نقد کا سودا کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور پیچیدگیاں بھی تھیں۔

عام طور سے جہاز کے انجن جہاز ساز کمپنی مہیا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ سعودیہ نے B-747-300 کے ساتھ بیس فالتو انجن خرید رکھے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر استعمال نہیں ہوئے تھے۔ ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ مال بردار جہاز کے انجن ان ہی فالتو انجنوں میں سے مہیا کیے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے انشورنس کی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان انجنوں کی وارنٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔

ان تمام پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے فائنانس، انشورنس، لیگل اور کنٹریکٹ کی ٹیم لندن پہنچ گئی۔ دو ہفتے کی مسلسل کوششوں کے بعد یہ معاملات حل ہو چکے تھے۔ جہاز کی وصولی کے لیے کپتان اور دوسرا عملہ سیاٹل روانہ ہو چکا

تھا۔

سعودیہ کی پوری ٹیم کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے پیسوں کو ہم میں سے کسی نے اتنا اہم نہ سمجھا تھا۔

سعودیہ کے ڈائریکٹر جنرل کیپٹن مطر نے سعودیہ کی ٹیم کے تمام شرکا کو تعریفی خطوط جاری کیے جن میں ٹیم کے شرکا کی کوششوں کو سراہا گیا تھا۔

اب جب بھی قرضہ لے کر جہاز خریدنا پڑا۔ ہماری ٹیم خدمت کے لیے تیار ملے گی۔

☆......☆

سعودیہ کے ساتھ یہ میرا آخری پروجیکٹ تھا۔ مزید چھ B-747 جہاز خریدنے تھے۔

اس سے پہلے تین کھیپ میں سعودیہ بیس B-747 مسافر بردار اور ایک B-747-F مال بردار جہاز خرید چکی تھی۔ جتنے بھی مواصفاتی، قانونی، معاشی نکات ہو سکتے تھے ان پر کئی کئی دفعہ مذاکرات ہو چکے تھے یہ کنٹرکٹ بالکل سیدھا سادا تھا۔ اس کے دستخط ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے سوچا۔ ہمیشہ کی طرح میں اس دفعہ بھی غلط تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف سلمان کوشی تھے۔ وائس پریزیڈنٹ ٹیکنیکل۔ ”میرے کمرے میں آجاؤ۔ نئے جہازوں کا کنٹریکٹ لیتے آنا۔“

”یا اللہ خیر۔“ میں نے سوچا۔

سلمان کے کمرے میں پہنچا تو ارشاد ہوا۔ ”اس کنٹریکٹ میں تبدیلیاں لاکر اس کو سعودیہ کے حق میں بہتر بنانا ہے۔“

بارہ سال پہلے کا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔

میں شرعی کے دفتر میں کھڑا تھا۔ شرعی نے مجھے L-1011 کا کنٹریکٹ تھما کر بالکل یہی بات کہی تھی جو آج سلمان مجھ سے کہہ رہے تھے۔ اس کنٹریکٹ کو سعودیہ کے حق میں بہتر بنانا ہے۔ پھر میں نے L-1011 کے کنٹریکٹ کو بہتر بنانے کے لیے جو شاندار کارنامہ انجام دیا تھا اس کے نتیجے میں شرعی بولنا بھول چکے تھے صرف ہاتھ کے اشاروں سے مجھے اپنے دفتر سے دفع کیا تھا۔

لیکن پچھلے بارہ سال میں مجھے کنٹریکٹ کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔

”اس میں ہر چیز طے ہے۔ تم کس قسم کی تبدیلی چاہتے ہو۔“ میں نے سلمان سے تفصیل جاننی چاہیں۔

سلمان چاہتے تھے کہ چند دوسری چیزوں کے علاوہ بوئنگ کی ذمہ داریوں میں بھی تبدیلی لائی جائے۔ میں نے سلمان سے کہا ”باقی چیزیں تو شاید بوئنگ کو قابل قبول ہوں مگر ذمہ داریوں میں وہ ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔ ذمہ داری کی شقیں کنٹریکٹ میں ایسے لکھی جاتی ہیں جیسے جوہری انگوٹھی میں نگینے جوڑتا ہے ایک ایک لفظ سوچا سمجھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔“ سلمان خود کنٹریکٹ کے منجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ ان کو بھی معلوم تھا لیکن بولے۔ ”تم بوئنگ کو لکھو۔ دیکھا جائے گا۔“ میں نے بوئنگ کو لکھ دیا۔ جواب وہی آیا جس کی توقع تھی۔

”یہ ایسے نہیں مانیں گے۔“ سلمان نے کہا۔ ”ان کے مقابلے پر دوسری کمپنی کو کھڑا کرنا پڑے گا۔ تم ڈگلس کو لکھو کہ ہم کو چھ MD-11 جہاز خریدنے ہیں۔“ سعودیہ کا دور دور بھی MD-11 خریدنے کا خیال نہ تھا یہ کھیل صرف سلمان اور میں کھیل رہے تھے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ڈگلس کا نہ صرف جواب آیا بلکہ ان کی مارکیٹنگ ٹیم اگلے ہفتے جدہ میں موجود تھی۔ جواب میں سعودیہ کی ٹیم بھی ڈگلس اور G.E کی فیکٹریوں کے دورے پر گئی۔

سب کچھ ہو گیا مگر ذمہ داریوں کے ضمن میں ڈگلس کا موقف بالکل وہی تھا جو بوئنگ کا تھا۔ سلمان کو اور مجھے پہلے ہی اس کا اندازہ تھا مگر سلمان ایک دفعہ کوشش کر دیکھنا چاہتے تھے۔ سعودیہ کا MD11 خریدنے کا مطلق ارادہ نہ تھا۔

میں سعودیہ کو خیرباد کہہ کر ٹورنٹو آچکا تھا۔

چند ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہ آرڈر جو چھ B-747 سے شروع ہوا تھا بڑھ چڑھ کر ساٹھ جہازوں سے بھی اوپر پہنچ چکا تھا۔ سعودیہ نے نہ صرف MD-11 بلکہ ان کے ساتھ ہی ساتھ ڈگلس کے چھوٹے جہاز MD-90 اور G.E کے انجن خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرے عزیز دوست اور G.E کے سعودی نژاد امریکی ڈائریکٹر مارکیٹنگ محمد لمدانی کو ان کے دیرینہ سوال کا جواب مل چکا تھا۔

”یا شیخ رزاقی تم میرے انجن کب خریدو گے۔“

سعودیہ۔ الوداع۔

خزانہ

منظر امام

مدفون خزانے کی تلاش صدیوں سے انسان کو صحرائوں، پہاڑوں، جنگلوں میں بھٹکاتی رہی ہے۔ کچھ لوگ کامیاب بھی ہوئے ہیں مگر زیادہ تر ناکامیابی کا زخم کھا کر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے آج بھی ایسے بے شمار سر پھرے موجود ہیں جو اپنی جان ہتھیلی پر لے کر سمندر کی گہرائی میں۔ فلک بوس برفیلی چوٹیوں پر اور جنگل بیابانوں میں مدفون خزانے تلاشتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسے بہت سے مدفون خزانے ہیں جن کی تلاش میں سر پھرے پاگلوں کی طرح بھٹک رہے ہیں۔

انسان بہت سے خوابوں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ نت نئے خواب دیکھا کرتا ہے۔ پریوں کے خواب، شہزادوں کے خواب، ایسی طاقتوں کے خواب جو اس کے کنٹرول میں آکر اس کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

ایسا ہی ایک خواب خفیہ خزانوں کا ہے۔ ہزاروں کہانیاں اس قسم کے خفیہ خزانوں پر لکھی جا چکی ہیں۔ رائیڈر ہیگرڈ کے گنج سلیمان سے لے کر زیرولینڈ تک کا خزانہ۔

کبھی پتا چلتا ہے کہ فلاں سمندر میں برسوں پہلے جو

ذیشان قریشی کے گھر میں امدادی کارکن سرنگ معائنہ کرتے ہوئے

جہاز ڈوبا تھا اس کا خزانہ آج تک محفوظ ہے اور مہم جو حضرات ان خزانوں کی تلاش میں غوطہ خوری کرنے نکلتے ہیں۔

کبھی پتا چلتا ہے کہ فلاں گم شدہ تہذیب کا خزانہ فلاں جنگل میں محفوظ ہے اور لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر خفیہ خزانے کا ایک عدد نقشہ بھی ہوتا ہے جس کی مدد سے یہ بے چارے خواب دیکھنے والے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اس موضوع پر لاجواب فلمیں بھی بن چکی ہیں جیسے رائیڈر آف دی لوسٹ آرک۔ ایسے خزانے اہرام مصر کی داستانوں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے کے ان خزانوں کو تلاش بھی کیا جاتا رہا ہے اور تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی ہے۔

خفیہ خزانے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو روایتی یا افسانوی ہوتے ہیں یعنی ان کی حقیقت کہانیوں کی ہوتی ہے۔ جو صدیوں سے سنی جاتی رہی ہیں اور دوسری قسم کے خزانے وہ ہوتے ہیں جو تصدیق شدہ ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان خزانوں کا واقعی کوئی وجود تھا اور اب وہ غائب ہو چکے ہیں۔

اس قسم کے حقیقی اور غیر حقیقی خزانے پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں بھی ہیں اور ہمارے یہاں ان کو حاصل کرنے کے لیے جعلی باباؤں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو اپنے نام نہاد عملیات کے ذریعے بتا دیتا ہے کہ جاؤ فلاں مقام پر کروڑوں کا خزانہ ہے، کھود کر حاصل کر لو۔

پچھلے دنوں ملتان میں ایسے خزانے کی تلاش کے دوران میں جو الم ناک واقعہ پیش آیا اس سے تو پورا ملک واقف ہے۔ آپ نے بھی اخبارات میں پڑھا اور ٹی وی چینلز پر دیکھا ہوگا۔ یہاں ہم آپ کو تھوڑی سی تحقیق دے کر دنیا کے دیگر ایسے علاقوں کی طرف لیے چلتے ہیں جہاں افسانوی اور حقیقی دونوں طرح کے خزانے موجود ہیں۔

ملتان کا خزانہ

ملتان کے محلہ باغ واڑہ دہلی گیٹ کے ایک مکان میں ہونے والا واقعہ بہت الم ناک اور سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم ابھی تک کن چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جعلی عامل اور بابا قسم کے لوگ کس طرح ہماری سادہ لوحی اور راتوں رات دولت مند بن جانے کے خوابوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ذیشان عالم قریشی نام تھا اس شخص کا جس کو ایک بابا نے بتایا کہ تمہارے مکان میں ایک خزانہ دفن ہے۔ عالم قریشی کی عمر 68 برس تھی۔ بے چارہ غریب انسان، جس نے کبھی اچھے دن نہیں دیکھے تھے جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ دولت کیا ہوتی ہے اور مل جائے تو زندگی کتنی خوش گوار ہو جاتی ہے۔

عالم قریشی جس مکان میں رہتا تھا وہ کسی زمانے میں ایک سکھ خاندان کی ملکیت تھا۔ وہ سکھ خاندان 1947ء میں پاکستان سے ہندوستان چلا گیا تھا۔

بابا نے بتایا کہ وہ سکھ خاندان اس مکان میں بہت سی دولت دفن کر کے گیا ہے۔ کیوں کہ وہ اتنی دولت اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔

عالم قریشی نے دریافت کیا۔ ”بابا اب وہ خزانہ میرے ہاتھ کیسے آسکتا ہے؟“

”بہت آسان ہے۔ خزانہ تیرے گھر میں دفن ہے۔ گھر تیرے قبضے میں ہے۔ بس کھدائی شروع کردے۔“

اور اس بدنصیب نے کھدائی شروع کردی۔ محلے والوں کے بیان کے مطابق عالم قریشی کے مکان سے کئی مہینوں سے کدال اور پھاوڑے چلنے کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ گڑھے کی مٹی کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس کے لیے عالم قریشی نے یہ کیا کہ آنگن میں مٹی جمع کرتا چلا گیا۔

بالآخر 13 اپریل 2014ء کو خزانے کی تلاش رنگ لائی کہ وہ سرنگ ہی بیٹھ گئی جس میں عالم قریشی کھدائی کر رہا تھا۔ اس جنونی نے پچاس فٹ گہری سرنگ بنالی تھی۔ پچاس فٹ گہری بغیر کسی سہارے کی سرنگ کا یہی انجام ہونا تھا۔ وہ اچانک بیٹھ گئی اور عالم قریشی منوں مٹی تلے دفن ہو گیا۔

سنا ہے کہ پولیس نے اس بابا کو گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کچھ دنوں بعد وہ بابا رہا ہو کر پھر کسی اور کو بے وقوف بنا رہا ہوگا۔

بہر حال یہ تو تھا ملتان کا واقعہ۔ اب ہم دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرف چل کر دیکھتے ہیں کہ کہاں کہاں واقعی خزانے ہیں یا صرف روایات ہیں۔

کوسوناگی کا خزانہ

یہ ایک روایتی خزانہ ہے۔ اس کا تعلق جاپان کی ایک قدیم کہانی سے ہے۔

کوسوناگی ایک روایتی تلوار کا نام ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے وہ تلوار جو بادلوں کو بھی کاٹ کر رکھ دے۔ ممکن ہے کہ کسی اور کے لیے اس نام اور اس تلوار کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو لیکن جاپانیوں کے لیے یہ بہت مقدس ہے اس لیے اس کی قیمت کروڑوں میں ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ قدیم زمانے میں ایک بلا تھی جس کے آٹھ سر اور آٹھ ہی دمیں تھیں۔ اتفاق سے اس بلا نے ایک غریب خاندان کو دیکھ لیا جس کی آٹھ بیٹیاں تھیں۔ اب وہ بلا ہر مہینے آتی اور اس غریب کسان کی ایک بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ اس طرح وہ اس کی سات بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب وہ آٹھویں اور آخری بیٹی کو لینے آنے والی تھی۔ اس وقت دیوتا سکہ سانو کو اس بلا کے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے اس کسان کو بچانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے معلوم کیا کہ اس بلا کو کھانے میں کیا پسند ہے۔ اس نے وہی چیز آٹھ مختلف مقامات پر زہر ملا کر رکھ دی۔ وہ بلا اپنے وقت پر آئی۔ اس نے اپنی من پسند چیز دیکھی اور ایک منہ سے کھالیا۔ زہر کھانے کی وجہ سے بلا کچھ کمزور ہوگئی۔ وہ آگے بڑھی تو اس نے دوسری جگہ بھی وہی چیز دیکھی۔ خود کو روک نہ سکی اور اس نے وہ بھی کھالیا۔ اس طرح اس نے سات مقامات سے وہ من پسند چیز کھائی لیکن آٹھویں مقام کی چیز نہیں کھائی۔ پھر دیوتا سانو باہر نکلا اور اس نے بلا کو مارنا شروع کردیا وہ اپنی تلوار سے اس کے سروں کو کاٹتا چلا گیا۔ جب تک بلا زہر کھا کر کمزور ہو چکی تھی۔ سات دم بھی کٹ گئیں۔ لیکن آٹھویں دم نہیں کٹ پائی۔ دیوتا سانو بہت حیران اور مایوس ہو رہا تھا کہ یہ دم کیوں نہیں کٹ رہی۔ پھر اس کی نگاہ بلا کے پیٹ میں رکھی ہوئی تلوار پر پڑی۔ اس نے وہ تلوار اٹھائی اور اس تلوار سے وہ دم کٹ گئی۔ یہ وہی تلوار ہے جس کو کوسوناگی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تلوار جاپان کے شاہی خزانے میں موجود تھی۔ 1185ء میں یہ کہیں غائب ہوگئی۔ اب یہ جاپان کا بہت قیمتی گم شدہ خزانہ ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ صرف ایک کہانی ہو لیکن جاپانیوں کے مطابق یہ صرف کہانی نہیں ہے بلکہ اس کی بہت اہمیت ہے۔

لانوچ کا خزانہ

یہ خزانہ روایتی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ کیوں کہ اس کے کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا خزانہ موجود ہو۔

لانوچ کے خزانے کی منتقلی

تاریخ بتاتی ہے کہ میکسیکو پر ازٹیک حکمران تھے۔ یہ بہت تہذیب یافتہ اور دولت مند قوم تھی۔ اس کے آثار میکسیکو میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ازٹیک کے آخری حکمراں کا نام میک ٹی زرما تھا۔ اس شخص کو سونا جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس سونے کے زیورات تھے، برتن تھے، سونے کا ایک تخت تھا اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

اسپین نے ازٹیک سلطنت پر حملہ کر دیا۔ بہت زبردست جنگ ہوئی تھی اور ازٹیک سلطنت کمزور پڑنے لگی۔ زرما کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اس جنگ میں شکست کھا جائے گا۔ اس نے اپنے سونے کے ذخائر میکسیکو کے ساحل پر کہیں چھپا دیے۔ وہ خزانہ آج تک معما بنا ہوا ہے کہ واقعی تھا بھی یا نہیں اور اگر تھا تو پھر کہاں ہے۔ اس کی تلاش بھی ناکام ہو چکی ہے۔

سونا ہے۔

وہ سونا ایسی قوم کا ہو سکتا تھا جو سونا ذخیرہ کرنے کی شوقین ہو۔

فارمیٹ 1960ء میں پائلٹ بن گیا۔ پائلٹ بن جانے کے بعد اس نے اپنا ایک چھوٹا جہاز خرید لیا۔ وہ ان پہاڑیوں کے اردگرد پروازیں کرتا رہتا جہاں اس نے پہلی بار سونے کا تیر دیکھا تھا۔. اس نے بیس سال اس جدوجہد میں لگا دیے۔ بالآخر 1980ء میں اس نے اعلان کیا کہ اس نے بہت کچھ پا لیا ہے لیکن وہ اپنی اس دریافت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ کیوں کہ اسے کینسر ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنا خزانہ ان پہاڑوں کے دامن میں کہیں چھپا دیا ہے۔ اس نے ٹھیک مقام کی نشاندہی نہیں کی۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے جتنا خزانہ حاصل کیا اس کی

فین کے بتائے گئے مقام کی تصویر

فارمیٹ فین

یہ ایک شخص کا نام ہے جس نے خزانہ دریافت کر لیا تھا۔ یہ ایک حقیقی خزانہ ہے۔ یعنی اس کا وجود ہے۔ اب صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے یعنی جو چاہے تلاش کر لے۔

فارمیٹ ٹیکساس میں رہتا تھا۔ جب وہ صرف نو برس کا تھا تو اس نے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں ایک تیر پڑا ہوا پایا۔ وہ تیر خالص سونے کا تھا۔ اس کے بعد سے اس پر خزانہ حاصل کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ سونے کے اس تیر کا مطلب یہ تھا کہ آس پاس اور بھی

مالیت اس زمانے میں 3 ملین ڈالر بنتی تھی۔ اس حساب سے آج کی مالیت لگا لیں۔ فارمیٹ خزانے کو چھپا کر مر گیا اور لوگ ابھی بھی اس خزانے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

کیپٹن گرانٹ کا خزانہ

یہ خزانہ بھی حقیقی ہے۔ یعنی اس خزانے کا وجود ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کی بات ہے جب لوگوں پر سونے کی تلاش کا جنون سوار تھا۔ ساحل کی ریت چھانی جاتی، دریاؤں میں ڈھونڈا جاتا، پہاڑوں میں تلاش کیا جاتا۔ یعنی جہاں جہاں سونا ملنے کے امکانات پائے جاتے لوگ وہاں بوریا بستر لے کر پہنچ جاتے۔

کیپٹن گرانٹ

کیپٹن گرانٹ مارشل ایک لانچ کا مالک تھا۔ وہ بھی اپنی لانچ لیے سونے کی تلاش میں بھٹکتا رہتا۔

کچھ لوگوں نے مونٹانا میں سونا تلاش بھی کرلیا تھا۔ سونے کے اس ذخیرے کے لیے جارج اے کسٹر اپنے فوجیوں کو لے کر پہنچ گیا اور اس نے بے شمار سونے کی سلاخیں مقامی لوگوں سے جنگ کرنے کے بعد حاصل کرلیں لیکن اس جنگ کے دوران میں اس کے بہت سے فوجی زخمی ہوگئے تھے۔ اسے یہ خبر ملی کہ کیپٹن گرانٹ کی لانچ آس پاس ہی موجود ہے تو اس نے پیغام بھیجا کہ وہ زخمی فوجیوں اور سونے کی سلاخوں کو اپنی لانچ میں بھر کر لے جائے اور حکومت کے حوالے کردے۔ کیپٹن گرانٹ کی لانچ میں فوجی اور سلاخیں بھر دی گئیں لیکن کچھ آگے سمندر میں زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ وہ لانچ ڈوب گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے لحاظ سے اس پر پونے چار لاکھ ڈالر کا سونا موجود تھا جس کا آج تک سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس کی تلاش میں بہت سے غوطہ خور ٹیمیں روانہ کی جاچکی ہیں اور خدا ہی جانے کہ وہ خزانہ کس کو ملتا ہے۔

موتی ہی موتی

یہ بھی ایک حقیقی خزانہ ہے۔ یعنی اس کا وجود ہے کیلی فورنیا کولاراڈو دریا میں ایک لانچ ڈوب گئی تھی۔ وہ لانچ اسپین کی تھی اور اس میں بے شمار موتی بھرے ہوئے تھے۔ یہ خالص موتی تھے۔ جن کی مالیت کروڑوں کی ہوسکتی تھی۔ اس خبر کے عام ہوتے ہی مہم جو حضرات نے اس ڈوبی ہوئی لانچ کی تلاش شروع کردی۔ بے شمار پارٹیاں مختلف اوقات میں ان موتیوں کی تلاش میں جاتی رہیں لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر 1870ء میں لاس اینجلس اسٹار نام کے ایک اخبار میں ایک شخص چارلی نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے وہ خزانہ تلاش کرلیا ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے کچھ موتی بھی دکھائے جو ویسے ہی تھے جیسے اس گم شدہ لانچ پر تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ لانچ سمندر کے اندر ایک بڑی پہاڑی کے درمیان پھنسی ہوئی ہے اور وہ اس مقام سے واقف ہے۔ وہ عنقریب ایک ٹیم لے کر جانے والا ہے۔ کیوں کہ اس خزانے کو نکالنا ایک اکیلے شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ لوگ بھی چاہئیں۔ لوگ

موتیوں کی تلاش جاری ہے

بھی آگئے، تیاریاں بھی شروع ہوگئیں لیکن اس دوران میں اس شخص کا انتقال ہوگیا اور وہ خزانہ آج تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

اوک آئی لینڈ کی دولت
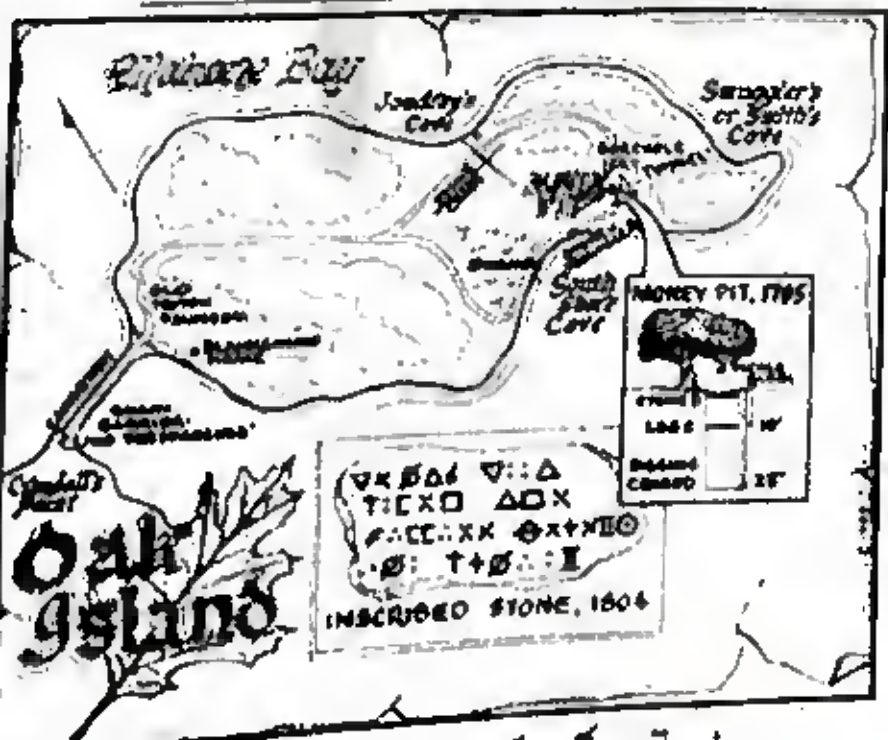
ویسے تو یہ بھی ایک روایتی دولت ہے۔ ان کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 1795ء میں گم ہو گیا تھا۔ اس خزانے کی گمشدگی کا مقام کینیڈا کا ساحل نوراا سکوشیا بتایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ خزانہ لاکھوں ملین ڈالرز کا ہے۔ یہ ملا تو نہیں ہے اس کے باوجود اس کو تلاش کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن آج تک کامیابی نہیں ملی۔

پولینڈ کا شاہی خزانہ

ایک مصدقہ خزانہ ہے۔ اس کی باقاعدہ ایک تاریخ ہے۔ یہ خزانہ بھی 1795ء میں کہیں گم ہو گیا ہے اور آج تک سراغ نہیں مل سکا۔

یہ پولینڈ کا شاہی خزانہ تھا۔ اس میں سونے اور جواہرات کے کئی تاج، تلواریں اور زیورات وغیرہ تھے۔ جرمنی کے فریڈرک ولیم (سوم) کے حکم پر لوٹا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی غائب ہو گیا اور آج تک غائب ہے۔ خزانے کی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک چیلنج بن چکا ہے۔

لیما کا خزانہ

یہ بھی ایک مصدقہ خزانہ ہے۔ یہ خزانہ 1820ء میں

لیما کے ظروف

چرا کر کوسٹاریکا کے کوز جزیرے میں کہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ مقام کی نشاندہی ہونے کے باوجود اس خزانے کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس کی مالیت 160 ملین کے قریب ہے۔

بے خاتو کا خزانہ

یہ اگرچہ ایک روایتی خزانہ ہے لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ موجود تھا۔ اس خزانے کی مالیت کا بھی تخمینہ لگا لیا گیا ہے۔ تقریباً 300 ملین ڈالرز۔ یہ خزانہ حکومت کی ملکیت تھا۔ کہیں منتقل کیا جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ کر موجودہ ملبورن کے آس پاس کہیں دفن کر دیا تھا۔ اس خزانے کے گم ہونے کی تاریخ 1821ء ہے۔ اس کو بھی ابھی تک تلاش کیا جا رہا ہے۔

کانفیڈریٹا کے سونے اور چاندی کے سکے

Confidarata gold

یہ بھی ایک مصدقہ خزانہ ہے۔ 1865ء میں گم ہوا۔ یہ سونے کی وزنی سلاخیں تھیں جو امریکا کی خانہ جنگی کے دوران میں غائب ہو گئیں اور آج تک مل نہ سکیں۔

آئرلینڈ کے شاہی زیورات

یہ بہت قیمتی زیورات تھے جو 1907ء میں ڈبلن کے قلعے سے چوری ہو گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ کون لے گئے اور کہاں لے گئے۔ اس زمانے اور اس کے بعد کئی حکومتوں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن وہ خزانہ آج تک نہیں مل سکا ہے۔

فلورینٹائن کا ہیرا

ہیرے، جواہرات اور سونا ازل سے انسان کی کمزوری چلے آرہے ہیں۔ حالانکہ یہ انسان

کے کسی جسمانی کام میں نہیں آتے۔ اس کے باوجود ان کی اہمیت اور قیمت کسی زمانے میں کم نہیں ہوئی۔

دنیا میں ایک سے ایک خوب صورت ہیرے ہیں جن کی مالیت کروڑوں تک ہے۔ ان ہیروں کی پوری ایک تاریخ ہے لیکن اس وقت ذکر ہے فلورینٹائن کے ہیرے کا۔ یہ مکمل زرد رنگ کا اپنی مثال آپ تھا۔ ایسا زرد رنگ کا ہیرا دنیا بھر میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ یہ ہیرا 1914ء میں چوری کرلیا گیا تھا اور آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس قسم کی نایاب چیزوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ آسانی سے فروخت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ یہ مشہور ہوتی ہیں اور کوئی بھی اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتا۔ پھر چرانے والے نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔

Peking Man پے کنگ کا آدمی

جی ہاں یہ بہت بڑا خزانہ ہے اور دل چسپ بات یہ

ہے کہ یہ نہ تو کوئی ہیرا ہے اور نہ ہی سونے سے بنی ہوئی کوئی چیز۔ یعنی اگر یہ آپ کے ہاتھ لگے تو آپ اسے فوراً پھینک دیں لیکن اس کی اہمیت اتنی ہے کہ آج تک کوئی اندازہ نہیں کرپایا ہے اور اس کی قیمت کروڑوں کی ہے۔

یہ ایک کھوپڑی ہے۔ جی ہاں انسانی کھوپڑی۔ بے چارہ جب زندہ ہوگا تب ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی حاکم ہو۔ پتھروں کے غار میں رہتا ہو۔ الٹے سیدھے شکار کرکے اپنا پیٹ بھرتا ہو لیکن اپنی موت کے پانچ لاکھ سال بعد اس کی کھوپڑی کی قیمت کروڑوں میں جا پہنچی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی نسل کے پہلے انسان کی کھوپڑی ہے اس لیے ماہرین کے نزدیک اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے۔ وہ اس پر ریسرچ کرتے رہے ہیں۔ انسان کی ارتقا کے مختلف ادوار اس کھوپڑی میں منجمد ہوکر رہ گئے تھے لیکن پھر 1941ء میں وہ کھوپڑی گم ہوگئی۔ اسے ایک لانچ میں کہیں پہنچایا جارہا تھا کہ بدقسمتی سے وہ لانچ ڈوب گئی اور اس کے ساتھ وہ کھوپڑی بھی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور آج تک اوجھل ہے اگر آپ میں ہمت ہے تو سمندر میں جاکر اسے تلاش کرسکتے ہیں۔

امبر روم

بادشاہوں اور ملکاؤں کے بھی کیا شوق ہوتے ہیں۔

ملکہ کیتھرین نے اپنی شب خوابی کے لیے یہ کمرا بنوایا تھا۔ آپ اس کی تصویر دیکھیں تو آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ کمرے کی دیواریں خالص سونے کی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جن میں جگہ جگہ ہیرے لگے ہوئے تھے۔ چھت پر سونے کی زردوزی کا کام تھا۔ کھڑکیوں کے فریم اور چوکھٹ سونے کے تھے۔ فرش کی ٹائلز میں جگہ جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی مالیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے۔ اس کمرے کو جرمنوں نے دوسری جنگ عظیم میں جرمن بھجوا دیا تھا۔ وہاں یہ پورا کمرا ہی غائب ہوگیا اور آج تک غائب ہے۔

یاما شیتاکا خزانہ

یہ خزانہ بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے بے مثال اور اپنی مالیت کے لحاظ سے بے اندازہ تھا۔

1945ء میں جاپان کے جنرل تومویوکی نے لوٹا اور جاپانیوں کی شکست کے آثار دیکھ کر فلپائن کی ایک پہاڑی کے مختلف غاروں میں چھپادیا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس خزانے کا آج تک پتا نہیں چل سکا ہے۔

سے بڑی چوری تھی۔ اس قسم کے چور بھی کمال کے ہوتے ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہوگا کہ یہ آنکھوں سے کاجل تک چرا لیتے ہیں۔ اسی طرح برسلز میں بھی ایک طیارے سے 50 ملین کے جواہرات چوری ہو چکے ہیں۔

یہ تو چند واقعات ہیں، چند خزانے ہیں، ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے ایسے خزانے ہوں گے جن کی حضرت انسان نے اپنی جانوں سے بڑھ کر حفاظت کی ہوگی لیکن آج وہ غائب ہو چکے ہیں یا کم از کم ان کے استعمال میں تو نہیں آرہے جنہوں نے یہ خزانے جمع کیے تھے۔

انسان سب جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اس کے کام میں نہیں آنے والی۔ اس کے باوجود وہ دولت کے انبار لگائے چلا جاتا ہے۔

ٹاپ لیز جھیل کا خزانہ

بے انتہا دولت تھی۔ سونے کی سلاخیں، زیورات، جواہرات اور نہ جانے کیا کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ سب سے بڑا مسئلہ اس خزانے کو دشمنوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ اس کے لیے طریقہ یہ سوچا گیا کہ لوہے کے صندوقوں میں بھر کر جھیل میں ڈال دیا جائے اور جنگ کے خاتمے کے بعد ان صندوقوں کو نکال لیا جائے۔

جنگ ختم بھی ہوگئی اس کے بعد جب اس خزانے کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ یا تو وہ صندوق چرا لیے گئے جو کہ بہت مشکل تھا یا پھر جھیل میں ہونے والی کسی تبدیلی کی وجہ سے غائب ہو گئے۔

انکا تہذیب کا خزانہ

انکا تہذیب جنوبی امریکا کی بہت ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انکا قوم تعمیرات، نجوم، طب وغیرہ جیسے علوم میں مہارت رکھتی تھی۔ (پچھلے دنوں انکا تہذیب کے کیلنڈر کا بہت چرچا رہا ہے)۔

اس ترقی یافتہ تہذیب کے آثار آج تک جنوبی امریکا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس قوم کے پاس بے اندازہ

آوامارو کا خزانہ

آوامارو ایک جاپانی بحری جہاز کا نام تھا۔ اس پر 5

بلین کے قریب سونا، پلاٹینم اور جواہرات وغیرہ تھے۔

آوامارو ڈوب گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خزانہ بھی ڈوب گیا اور ابھی تک دریافت نہیں ہوسکا ہے۔

پٹیالہ کا نیکلس

وہ بہت ہی قیمتی نیکلس ہندوستان میں پٹیالہ کے مہاراجا بھوپندر کے پاس تھا۔ اس نیکلس میں 2930

ہیرے لگے تھے۔ اس میں دنیا کا ساتواں بڑا ہیرا بھی تھا جس کا وزن 428 کیرٹ تھا۔

1948ء میں یہ نیکلس غائب ہوگیا۔ کہاں غائب ہوا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

لفت ہنسا کا خزانہ

لفت ہنسا جرمنی کی ایک فضائی کمپنی کا نام ہے۔

1978ء میں اس کمپنی کے ایک طیارے میں ایک صندوق رکھا گیا۔ اس صندوق میں 5 ملین ڈالرز تھے اور امریکا کے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر وہ صندوق غائب ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک وہ چوری امریکا میں نقد رقم کی سب

دولت تھی۔ ان کا ایک شہر تھا۔ Paititi۔ جب یہ تہذیب فنا ہونے لگی تو ان کا یہ خزانہ اس شہر کے آس پاس تھا لیکن برسوں گزر جانے کے بعد بھی اس خزانے کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

کن شی ہینگ کا خزانہ

یہ شخص چین کا بادشاہ تھا۔ اس کو سونے سے بہت دل چسپی تھی۔ برتن سونے کے، زیورات سونے کے، تلوار سونے کی۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے اپنی خواب گاہ کی دیواریں تک سونے کی بنوا رکھی تھیں۔ اس قیمتی خواب گاہ کے تزکرے چینی تاریخ میں ہوتے چلے آئے ہیں۔

پھر وہ پورا کمرا ہی غائب ہوگیا۔ 1974ء میں اس کی خواب گاہ کا صرف ایک حصہ دریافت ہوا لیکن بقیہ کمرا کہاں ہے اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس کمرے کی گمشدگی بھی دنیا کے پُراسرار واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے خزانے دفن ہوں جیسے ہمارے یہاں مختلف تہذیبیں گزری ہیں۔ موہن جوڈرو، ہڑپہ، ٹیکسلا اور گندھارا وغیرہ۔

کھدائی کے دوران میں چھوٹی موٹی چیزیں تو ملتی رہی ہیں لیکن کوئی بڑا خزانہ ہاتھ نہیں لگا ہے۔

اس قسم کے خزانے کی تلاش کرنے والے دو کیٹیگری کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو ریسرچ اور علم حاصل کرنے کے لیے ان خزانوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری کیٹیگری وہ ہے جو دولت کے لالچ میں ایسے خزانے تلاش کرتے ہیں۔

اتفاق سے دوسری قسم کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہمارے یہاں کے جالی عامل قسم کے لوگ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر الٹے سیدھے طریقے بتاتے رہتے ہیں۔

پوری دنیا میں حقیقی خزانے تو شاید کم ہی ہوں لیکن روایتی اور افسانوی خزانے بہت زیادہ ہیں۔ ہماری کلاسیکی کہانیاں ایسے خزانوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔

کن شی ہینگ کا خزانہ

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 95

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔اسے ان میں ایك کشش اور ایك للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ......ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرونگی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہردتی تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرونگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرونگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زیرِ پردہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا ”شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔“ میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر مارا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکا بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی جیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں جیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے حراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی ول جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر......“ مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں

بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شانے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شانے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پہاڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان بچ نکلا اب ہوگیا مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اب آگے پڑھیں

ابھی شیر خان کی رائفل سر پر موجود تھی کہ سامنے سے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پڑی تھی۔ پھر دوسری ٹارچ آن ہوئی۔ میں ہر طرف سے گھر گیا تھا۔ زینی مجھ سے ذرا دور سرک کر کھڑی ہوئی تو روشنی میں اس کی سڈول لمبی ٹانگیں نمایاں ہوئیں اور میں اس حالت میں بھی لاحول پڑھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شیر خان نے حکم دیا۔ ”ہتھیار آرام سے آگے ڈال دو جلد بازی مت کرنا۔“

”اگر میں جلد بازی کروں اور تم مجھے شوٹ کر دو تو ان لوگوں کو کیا جواب دو گے جنہوں نے مجھے زندہ سلامت لانے کو کہا ہے؟“

”انہوں نے ہم سے اپنی جان کی قیمت پر زندہ لانے کو نہیں کہا ہے۔ اگر ہمیں خطرہ ہوا تو ہم گولی چلانے میں دیر نہیں کریں گے۔“ شیر خان بولا۔ ”ہتھیار پھینک دو۔“

اس بار میں نے رائفل پھینک دی۔ ”مزید کوئی حکم؟“

”تمہارے پاس پستول بھی ہے۔“

”وہ جیکٹ میں ہے خود نکال لو۔“

شیر خان نے مجھے ٹٹولا اور جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ اس نے میری مزید تلاشی لی اور باقی سب چیزیں بھی نکال لیں۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کا دم خم قابلِ تعریف تھا۔ شاید گولی اس کے بازو کو چھوتی گزر گئی تھی۔ ورنہ وہ اتنے سکون میں نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ ”بہ قول اس خاتون کے تمہارے ساتھ اور افراد بھی ہیں تو تم نے مجھے اتنے گھٹیا انداز میں گرفتار کرنے کی کوشش کیوں کی؟“

”ہم بس چار ہی لوگ ہیں۔“ شیر خان نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں یہ غلطی کی مگر بہر حال تم قابو میں آ ہی گئے۔ اب اپنے ہاتھ پیچھے کرو۔“

میں نے ہاتھ پیچھے کیے تو اس نے پلاسٹک تار کی کس جانے والی ہتھکڑی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ شیر خان لہجے سے نہ تو قبائلی لگ رہا تھا اور نہ ہی اس طرف کا رہنے والا۔ البتہ اس نے حلیہ ضرور ایسا بنایا ہوا تھا۔ اس نے ڈھیلی شلوار قمیص اور اوپر پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے باقی دو ساتھیوں کا حلیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔ مجھے بے بس کرنے کے بعد ان میں سے ایک کہیں گیا اور چند منٹ بعد ایک پجیرو جیپ کے ساتھ نمودار ہوا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے لایا گیا اور جیپ کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ دو میرے دائیں بائیں آ گئے۔ شیر خان نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور ڈرائیونگ زینی کے حصے میں آئی جو بدستور اسی حلیے میں تھی۔ یہ لوگ مادر پدر آزاد لگ رہے تھے۔ البتہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک شال لے لی تھی۔ میرا اسلحہ اور دوسرا سامان انہوں نے میری ناکارہ ہو جانے والی جیپ میں ڈال دیا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کی بندش کی مضبوطی کا اندازہ کر رہا تھا اور جلد میں نے محسوس کر لیا کہ اسے کھولنا ممکن نہیں تھا زور لگانے سے یہ میری کلائیوں میں گڑ رہی تھی۔ اس کی بندش ویسے ہی بہت سخت تھی اور ذرا سی دیر میں خون رکنے لگا تھا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

ان کا رخ نیچے کی طرف تھا یعنی وہ میدانی علاقے کی طرف جا رہے تھے مگر کیا کہا جا سکتا تھا۔ اس دشوار گزار علاقے میں بعض اوقات شمال کی طرف جانے کے لیے کئی

بار جنوب کا رخ بھی کرنا پڑتا تھا کیونکہ سڑکیں اور راستے نایاب تھے۔ گنتی کی چند سڑکیں ہیں جو اس پورے علاقے کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم الائی سے کچھ ہی دور تھے۔ یہاں سے جیپ مغرب کی طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک مینگورہ کی طرف بھی جاتی تھی اور اگر اس پر دائیں طرف مڑ جاتے تو چترال کی طرف بھی جا سکتے تھے۔ صبح قریب تھی۔ میں ایک بجے سویا تھا اور ساڑھے تین بجے اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ چکر شروع ہوا اور اسے بھی اب ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ مشرقی افق پر سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان لوگوں کا رویہ بہت پروفیشنل لگ رہا تھا۔ ذرا دیر میں روشنی ہونے لگی۔

میں سیٹ سے سر لگائے بظاہر آرام کر رہا تھا مگر نیم وا آنکھوں سے آس پاس کے مناظر دیکھ رہا تھا تاکہ مجھے معلوم رہے کہ یہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ چھ بجے ہم اس سڑک پر آگئے جس کے ایک طرف مینگورہ تھا اور دوسری طرف چترال کو راستہ جاتا تھا۔ جیپ دوسری سمت مڑ گئی۔ گویا یہ مزید شمال کی طرف جا رہے تھے۔ میں کسی قدر مشکل میں تھا کہ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں پوری پشت نہیں لگا سکتا تھا اور نہ ہی آرام دہ طریقے سے بیٹھ سکتا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر میں میرے بازو اکڑ گئے تھے۔ ان لوگوں سے پوچھنا بیکار تھا وہ اپنی منزل پر پہنچ کر ہی رکتے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مرشد یا کوئی اور دشمن نہیں ہو سکتا تھا جو مجھے یوں اٹھواتا۔ پھر اس طرف جانے کا کیا جواز تھا۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا۔ مجھے کرنل عبدالرحمٰن کا خیال آیا۔ کیونکہ وہ ایک بار اسی علاقے میں مجھے بلوا کر بھارتیوں کے حوالے کر چکا تھا۔ مگر اس سے میرا اب کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ بلکہ آخری بار اس نے میری مدد بھی کی تھی۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے؟

بھارتیوں سے خیال آیا کہ کہیں ان لوگوں کو بھارتیوں نے ہائر تو نہیں کیا تھا۔ پڑوسی ملک میں ہمارے اس ازلی دشمن نے اپنے پنجے گاڑ لیے تھے اور اب انہیں مضبوط کر رہا تھا۔ جگہ جگہ اس کے کونسلیٹ تھے جو اصل میں را کے اڈے تھے۔ بھارتی سرگرم تھے اور میں ان کو مطلوب تھا۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں پھریری سی آگئی تھی۔ میں اس قوم اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا اور چرخ صفت قوم ہے۔ جب آپ کی زد پر آتی ہے تو قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور جب آپ کو اپنی زد میں لے لے تو رحم و مروت کرنا گناہ عظیم سمجھتی ہے۔ صرف نصف صدی کے عرصے میں اس نے پے در پے ہمیں نقصانات اور صدمات سے دوچار کیا اور اس کے باوجود ہم اتنے سادہ ہیں کہ اب بھی اسے دوست بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب کہ وہ ہمیں برباد کرنے اور پاکستان کا نام دنیا کے نقشے سے مٹانے کے لیے ذرا بھی کوتاہی سے کام نہیں لے رہا۔ پتا نہیں کب ہمیں یہ بات سمجھ آئے گی۔ خوف اس کا ہے کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔

اچانک جیپ دھچکے سے رکی تو میں چونک کر خیالوں سے نکل آیا۔ جیپ سڑک کے ساتھ ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی تھی اور شیر خان نے اتر کر لوہے کا گیٹ کھولا۔ زینی جیپ اندر لے آئی اور شیر خان نے عقب میں گیٹ بند کر دیا۔ میرے دائیں طرف موجود شخص اترا اور اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے بھی نیچے اتارا۔ دوسرا اپنی طرف سے اتر آیا۔ زینی اب اندر جا رہی تھی۔ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تم ہٹے کٹے مرد پورے لباس میں ہو اس بے چاری نے کیا قصور کیا ہے؟“

”کیپ کوائیٹ۔“ میرے ساتھ موجود نوجوان نے کہا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ وہ پہلی بار بولا تھا اب تک شیر خان یا زینی ہی بولتے آئے تھے۔ نوجوان کا لہجہ شہری اور تعلیم یافتہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہ نہیں تھے جو خود کو ظاہر کر رہے تھے۔ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے اوپری حصے میں شاید ایک ہی کمرا تھا کیونکہ اس کی چھتیں ترچھی اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں البتہ نیچے کی مکانیت زیادہ لگ رہی تھی۔ زینی نے لاک کھولا اور اندر چلی گئی۔ میں ان تینوں کے ساتھ اندر آیا۔ وہ میرے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ شیر خان نے چاقو سے میری بندشیں کاٹیں اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمرا چھوٹا تھا اور اس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک طرف دیوار گیر الماری تھی۔ فرش پر قالین اور ایک کھڑکی پر اس کے ہم رنگ پردے لٹک رہے تھے، میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کا معائنہ کیا تو اسے مضبوط گرل سے کور پایا۔

ظاہر ہے وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتے تھے کہ مجھے فرار کا راستہ عنایت کرتے۔ میں بازوؤں کو حرکت دیتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ یہاں میرا قیام مختصر تھا اور جلد یا تو میرے خریدار مجھے لینے آجاتے یا پھر یہ مجھے آگے پہنچایا جاتا۔ انہوں نے جس طرح مجھے اپنا ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ یا تو یہ ان کا عارضی ٹھکانہ

تھا۔ اس خوب صورت پہاڑی علاقے میں بے شمار ایسے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں۔ جو شہروں اور میدانوں میں رہنے والے صاحب ثروت لوگوں نے بنوا رکھی ہیں اور وہ سال میں چند مہینے یا چند ہفتے یہاں گزارتے ہیں باقی سارے سال یہ کوٹھیاں اور بنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔ چوکیدار ہوتے ہیں مگر وہ آرام سے اپنے گھر میں بیٹھ کر تنخواہ لیتے ہیں اس لیے ان جگہوں کو استعمال کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

دوسرا امکان یہ تھا کہ میری واپسی نہ ہوتی اور ان سے کوئی حساب نہیں لیتا اس لیے انہوں نے مطمئن ہو کر مجھے یہ ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا۔ ذرا آرام کے بعد میں نے اٹھ کر ہلکی پھلکی ایکسر سائز شروع کی تا کہ میرا جسم چاق و چوبند رہے۔ رات آرام کی کمی سے جو کسل مندی تھی وہ دور ہو جائے۔ دس پندرہ منٹ کی ایکسر سائز کے بعد میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ کھڑکی مشرق کی طرف تھی اس لیے دھوپ اندر آئی اور کمرا روشن ہو گیا۔ میں نے الماری کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاکڈ نکلی میں نے بلا تکلف اس کا ہینڈل پکڑ کر جھٹکا دیا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ لاک ٹوٹ گیا۔ اگر آواز باہر تک گئی تھی تب بھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مگر الماری سے کوئی ایسی چیز ملنے کی خواہش خواہش ہی رہ گئی جس سے میں آزادی حاصل کر سکتا۔ نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی ایسی کوئی چیز۔ اندر صرف مردانہ اور زنانہ کپڑے تھے۔ نچلے حصے میں جوتے رکھے تھے۔ ایک دراز میں رومال، بنیان اور مردانہ انڈر ویئر تھے۔ دوسری دراز کھولی تو اس میں سے زنانہ اشیا نکل آئیں۔ میں نے اسے بند کر کے مردانہ حصے کا جائزہ لیا۔

مردانہ کپڑے زیادہ تر مقامی ساخت تھے اور زنانہ ملبوسات بھی شریفانہ تھے۔ یعنی فیشن ایبل نہیں تھے۔ شاید میرا پہلا خیال درست تھا کہ یہ جگہ ان لوگوں کی نہیں تھی۔ یہ باقاعدگی سے زندگی گزارنے والے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ زینی جیسی عورت اس قسم کے لباس استعمال کرتی ہوگی۔ درازیں اور الماری کے پٹ بند کر کے میں واپس بیڈ پر آ بیٹھا۔ انہوں نے میری گھڑی بھی لے لی تھی۔ راستے میں مجھے جیپ کے ڈیش بورڈ پر لگی گھڑی سے وقت کا پتا چلتا رہا تھا۔ ہم تقریباً سات بجے یہاں پہنچے تھے اور مجھے بند ہوئے ایک گھنٹا مزید گزر گیا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ اگرچہ مجھے نہ تو بھوک پیاس لگ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا مسئلہ تھا مگر میں نے دروازہ بجانے میں حرج نہیں سمجھا۔ دوسری بار بجانے پر زینی کی آواز آئی۔ ''کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ فطرت کا ہے مس زینی۔'' میں نے ذرا فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''تم جانتی ہونا جب فطرت آدمی کو آواز دیتی ہے تو اسے کہاں جانا ہوتا ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''دس منٹ رکو ہم ذرا مصروف ہیں۔''

''او کے دس منٹ۔''

جب میرے خیال میں دس منٹ پورے ہو گئے تو میں نے پھر دروازہ بجانا شروع کر دیا اور اس وقت تک بجاتا رہا تھا جب تک وہ کھل نہیں گیا۔ سامنے ایک کلین شیو خوبرو نوجوان تھا جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس نے غرا کر کہا۔ ''تمہیں مسئلہ ہے؟''

''بالکل بھی نہیں کیونکہ میں اس صاف ستھرے کمرے کو باتھ روم کی جگہ استعمال کرنا نہیں چاہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تمہاری جون ہی بدل گئی ہے۔ داڑھی مونچھیں ہٹا کر بہت چکنے نکلے ہو۔''

ایک لمحے کو اس کی آنکھیں سرخ ہوئی تھیں مگر اس نے سرد لہجے میں صرف اتنا کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

نوجوان نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ باقی پارٹی ڈرائنگ روم میں تھی اور کھانے پینے سے شغل کر رہی تھی ان کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ داڑھی مونچھیں غائب تھیں اور وہ پینٹ شرٹ میں تھے۔ زینی نے بہت کسی ہوئی جینز کے ساتھ نہایت ڈھیلی موٹے نیٹ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا گلا ایک شانے سے ڈھلک کر بازو تک آ گیا تھا۔ میز پر کھانے پینے کی تیار چیزیں تھیں۔ ان کے ساتھ بیئر کی بوتلیں اور کولڈ ڈرنک کے ٹن تھے۔ نوجوان مجھے ساتھ والے کمرے کے واش روم تک لایا اور اس نے کہا۔ ''جلدی کرو جو کرنا ہے۔''

''ذرا دیر لگے گی۔'' میں نے کہا اور اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ مگر جب میں نے واش روم کا جائزہ لیا تو وہاں سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ ایک نہایت چھوٹا سا روشن دان تھا اور اس پر بھی شیشہ فکس تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور ضروریات سے فارغ ہوا۔ پھر باہر آیا تو نوجوان وہیں موجود تھا۔ وہ مجھے لے کر واپس آیا تو زینی نے آواز دی۔

''ایک منٹ اسے بھی کھانے کو دے دو، آگے طویل سفر ہے۔''

مجھے ایک ٹھنڈا چھوٹا پزا اور چند نان خطائیوں کے

ساتھ کولڈ ڈرنک کا ایک ٹن عنایت کیا گیا اور واپس بند کر دیا گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا کہ یہاں قیام عارضی تھا۔ انہیں آگے جانا تھا مگر کہاں جانا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ اس خبر نے میرے خدشات بڑھا دیئے تھے کہ کہیں مجھے پھر تو بھارتیوں کے حوالے کرنے کا کوئی پلان تو روبہ عمل نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بھارتی دو بار مجھے لے جانے کی کوشش کر چکے تھے اور انہیں دونوں کوششیں خاصی مہنگی پڑی تھیں جب انہیں اپنے ہیلی کاپٹرز اور کمانڈوز سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ یہاں سے اگرچہ افغانستان کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر خط مستقیم میں سفر کیا جائے تو فاصلہ ساٹھ کلومیٹرز بھی نہیں بنتا تھا لیکن دشوار اور پہاڑی راستوں کے گھماؤ پھراؤ کی وجہ سے یہ تین گنا بھی ہو سکتا تھا۔ شاید اسی لیے زینی نے کہا تھا کہ دور جانا ہے۔ کھانے کے دوران میں نے سوچا کہ کہیں میں کچھ زیادہ تو نہیں سوچ رہا ہوں ممکن ہے یہ مجھے یہاں سے کسی میدانی علاقے کی طرف لے جائیں۔ آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور شیر خان کے ساتھ زینی اور وہی خوبرو نوجوان موجود تھے۔ وہ مسلح اور چوکنا تھے۔ شیر خان نے کہا۔

''باہر آؤ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔''

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر پوچھا۔ ''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور کن کے حوالے کرو گے؟''

''سوال مت کرو۔'' خوبرو نوجوان غرایا۔ ''شرافت سے باہر آ جاؤ۔''

''اگر میں نہ آؤں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے گولی مار دو گے؟'' میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''ہاں تمہارے گھٹنے پر گولی ماریں گے اور پھر تمہیں کھینچ کر لے جائیں گے۔ زندہ لانے کو کہا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ سلامت بھی ہو۔'' شیر خان نے اپنی رائفل کا رخ میرے پیر کی طرف کر دیا۔ ''میرے تین تک گننے سے پہلے فیصلہ کر لو کہ کس طرح جاؤ گے؟''

''او کے۔'' میں نے اس کے تین کہنے سے پہلے ہاتھ اٹھا دیا۔ ''میں آ رہا ہوں لیکن مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کن لوگوں نے اٹھوایا ہے۔''

''جلد تمہارے سامنے آ جائے گا مسٹر شہباز۔'' زینی بولی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ لباس بھی تم پر جچ رہا ہے لیکن رات تو تم قیامت لگ رہی تھیں۔''

''شٹ اپ۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''جھوٹی تعریف مت کرو۔ میں جان گئی ہوں تم عورت سے متاثر ہونے والے آدمی نہیں ہو۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' میں نے کہا اور باہر آیا تو ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھ پشت پر پلاسٹک ڈور سے باندھے گئے۔ اس کی گرفت اور سختی اذیت ناک ہوتی ہے جو دوران خون روک دیتی ہے اور کھلنے کے بعد بھی خاصی دیر ہاتھ کسی قابل نہیں رہتے ہیں۔ وہ باہر آئے اور مجھے جیپ میں بٹھایا۔ کل رات کی طرح ڈرائیونگ زینی نے سنبھالی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی سنسنی خیز شرٹ پر ایک ہلکی جیکٹ پہن لی تھی۔ شیر خان اس کے برابر میں تھا اور اس کے دونوں ساتھی میرے دائیں بائیں تھے۔ وہ سب ہی نوجوان اور خاصے خوب صورت تھے۔ عمریں تیس کے اندر تھیں۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ''کیا میرے کچھ اور سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں؟''

''کیسے سوالات؟''

''تم لوگوں کے بارے میں۔''

''پوچھو اگر دے سکا تو دوں گا۔''

''تمہارا تعلق پاکستان سے ہے؟''

''میرا ہے۔'' شیر خان بولا۔ ''یہ تینوں باہر سے ہیں۔''

''لیکن تم چاروں ایک ٹیم ہو؟''

''ہاں ہم چاروں ایک ٹیم ہیں۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''اسی قسم کے کام کرتے ہو؟''

''ظاہر ہے۔'' شیر خان نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کافی سوالات ہو گئے ہیں۔''

''مہربانی تمہاری کہ تم نے جواب کی زحمت کی۔''

''میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں اس لیے ذرا فکر مند بھی تھا کہ تم شاید اتنی آسانی سے ہاتھ نہ آؤ جتنی آسانی سے آ گئے۔''

''میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''تمہارا مکمل بیک گراؤنڈ۔'' شیر خان بولا۔ ''سچی بات ہے میں تم سے متاثر بھی ہوا تھا؟''

''گویا اب نہیں ہو؟''

''نہیں اب بھی ہوں۔'' وہ یوں بولا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ انسان کو اپنا خیال اتنی جلدی نہیں بدلنا چاہیے ورنہ وہ اب تک بدل چکا ہوتا۔

''لگتا ہے تمہیں میرے بارے میں کچھ غلط معلومات ملی ہیں میں ایک عام آدمی ہوں بس ذرا مختلف طرزِ زندگی

گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔"

شیر خان چپ رہا۔ جیپ کا رخ میری توقع کے مطابق شمال کی طرف تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "شیر خان اور زینی کیا یہ اصل نام ہیں؟"

"میرا نام اصل ہے۔" زینی بولی۔ "لیکن یہ نک نیم ہے۔"

"وہ تو ظاہر ہے، اس کا مطلب ہے شیر خان اصل نام نہیں ہے؟"

"ہاں میرا نام کچھ اور ہے مگر تم چاہو تو مجھے شیر خان ہی کہہ سکتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے بازو کا زخم کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے گولی چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔"

وہ چاروں یقیناً کل شام سے اس مشن پر تھے انہیں اس جگہ پہنچنے اور مجھے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا ہوگا۔ پھر وہ مجھے یہاں لائے اور اس کے بعد بھی آرام نہیں کیا۔ اپنا گیٹ اپ تبدیل کیا اور کھاتے پیتے رہے۔ اس کے باوجود وہ چاروں تازہ دم لگ رہے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی دوا استعمال کی تھی۔ آج کل ایسی دوائیں عام ہو گئی ہیں جو انسان کو بہت بری حالت میں بھی یوں چاق و چوبند کر دیتی ہیں جیسے وہ بھرپور آرام کر کے اٹھا ہو۔ اگرچہ ان دواؤں کے سائیڈ ایفکٹس بھی ہوتے ہیں مگر وقفے سے استعمال کرنے سے خاص اثر نہیں پڑتا ہے۔ وسیم نے مجھے ان دواؤں کے بارے میں بتایا تھا جو وہ طویل مشن کے دوران استعمال کرتے تھے۔ یہ تھکن اور اس کے اثرات غائب کر کے انہیں چاق و چوبند کر دیتی تھیں۔ اس میدان میں جدید ایجادات کا فائدہ شیر خان جیسے لوگ زیادہ اٹھا رہے ہیں کیونکہ وہ اس سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اب دہشت گرد ایسی ادویات کا فائدہ اٹھاتے ہیں جو ان کے مشن میں کار آمد ہوں جیسے بہتے خون کو روکنے والی دوائیں، نیند اڑانے اور تھکن بھگانے والی دوائیں، اسٹرائیڈز جو کچھ دیر کے لیے انسان کو سپر مین بنا دیتے ہیں۔ اب سنا ہے حواس تیز کرنے والی دوائیں بھی میدان میں آ گئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد ہم انسان اور مشین کا ملاپ یعنی سائی بورگ بھی اپنی زندگی میں دیکھ سکیں۔

جیپ اسی سڑک پر تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ اگرچہ راستہ بہت اچھا نہیں تھا مگر جیپ کا طاقتور انجن اور بہترین ریڈیل ٹائرز کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اچھی کوالٹی کی ہائی وے پر سفر کر رہے ہوں۔ زینی اچھی ڈرائیور تھی۔ اسپیڈو میٹر کی سوئی مستقل چالیس کے آس پاس تھی مگر اس نے ایک بار بھی گاڑی کو قابو سے باہر ہونے نہیں دیا تھا۔ ورنہ یہاں بہت تنگ اور یوٹرن ٹائپ موڑ تھے۔ ایک جگہ سڑک کا تقریباً ایک کلومیٹر کا ٹکڑا بارش کی وجہ سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا صرف اسی حصے میں رفتار ذرا کم ہوئی تھی اور اس کے بعد جیپ پھر اپنی رفتار سے دوڑنے لگی۔ یہاں بلندی بھی کم زیادہ ہو رہی تھی۔ ایک مقام پر ہم نو ہزار فٹ کی بلندی سے بھی گزرے اور اکثر مقامات چھ سے سات ہزار فٹ بلند تھے۔ بلندی پر سردی بڑھ جاتی تھی اور نیچے آتے تو موسم معتدل ہو جاتا۔

راجا عمر دراز سے ملاقات کا فیصلہ مجھے مسلسل مہنگا پڑ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک مصیبت میں گرفتار ہوتا رہا اور اللہ کے فضل سے اس مصیبت سے نکلتا رہا۔ مگر اس آخری مصیبت سے چھٹکارے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جیپ کے ٹائر برسٹ ہو جانے کے بعد اگر میں تجسس میں پڑنے کی بجائے فرار کو ترجیح دیتا تو شاید اس مصیبت میں نہ پڑتا۔ بہر حال یہ مقدر میں بھی تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم گھومے اور مغرب کی طرف جانے لگے مزید آدھے گھنٹے بعد ہمارا رخ جنوب مغرب کی طرف ہو گیا یعنی اب ہم الٹی سمت میں جا رہے تھے۔ سڑک نازک اور پتلی ہوتی جا رہی تھی مگر اس پر بھی ٹریفک تھا۔ بڑے ٹرکوں سے لے کر مسافر بردار کوچز، وین اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سیزن کی وجہ سے سیاح بھی محو سفر تھے اور درے کھل جانے کی وجہ سے آنے والے سرما کے لیے ابھی سے سامانِ زندگی جمع کیا جا رہا تھا۔ سارے سال باہر رہ کر کمانے والے گرمیوں میں اپنے علاقے میں آتے جاتے تھے۔

شنگرال کے پاس رک کر جیپ کا انجن ٹھنڈا کیا گیا اور ان لوگوں نے بھی ہاتھ پاؤں کھولے مگر مجھے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ نیچے اترنے پر بھی ان میں سے ایک میرے پاس ہی رہتا تھا۔ جب شیر خان کی باری آئی تو میں نے اس سے گپ شپ شروع کر دی۔ "تم تعلیم یافتہ لگتے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کیا ہے۔"

"لیکن یہ دھندا زیادہ نفع بخش لگا ہوگا؟"

"درست کہا تم نے، دو سال ملازمت میں جھک ماری۔ اتنی تنخواہ بھی نہیں تھی کہ اپنا ہی گزارہ کر سکتا۔ اس لیے

یہ لائن پکڑلی۔''

''تم تربیت یافتہ لگ رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔''میں نے ایک سال کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔''

''کہاں سے؟''

''یہیں سے، باہر کے لوگ آئے تھے انہوں نے بے شمار لوگ ہائر کیے، ہمیں تربیت دی، کچھ کام لیے اور پھر واپس چلے۔ اب میں اور مجھ جیسے دوسرے بے شمار لوگ آزاد ہیں۔''

''نہیں وہ اب بھی غلام ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ اس ملک کو انتشار اور افراتفری کی نظر کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے بے شمار افراد کو مسلح تربیت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا روزگار گن سے وابستہ ہے۔ جیسے کہ تمہارا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق تو پڑتا ہے پہلے جرائم کم ہوتے تھے مگر اب جرائم زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سے معاشرے کا ایک مجموعی تاثر کیا جاتا ہے؟ ملک کا کوئی گوشہ تخریبی کارروائیوں سے خالی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تمہیں تربیت دی انہوں نے ساتھ ہی یہاں اسلحے کی بھرمار بھی کی ہے۔''

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔''تم کیسی باتیں کر رہے ہو کیا تم گن استعمال نہیں کرتے۔'' اس نے اپنا پٹی بندھا بازو آگے کیا۔''یہ کس نے کیا ہے؟''

''یہ میں نے اپنے دفاع میں کیا ہے۔ میں نے آج تک گن سے کوئی نفع یا مفاد نہیں کمایا۔ صرف اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا ہے۔ اگر میں تمہیں بتادوں کہ میں نے چند دن پہلے کیا چھوڑا ہے تو تم یقیناً مجھے پاگل سمجھو گے۔''

''میں بھی اپنا دفاع کر رہا ہوں بھوک اور افلاس کے خلاف۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''غلط، جب تم جاب کر رہے تھے تو بے شک تم کو کم تنخواہ مل رہی تھی مگر یہ تنخواہ ہمیشہ اتنی نہیں رہتی۔ ایک وقت آتا جب تمہیں تمہارے تجربے اور قابلیت کے مطابق تنخواہ ملتی۔ یہاں نہ ملتی تو تم بیرونِ ملک جاسکتے تھے۔ مگر تم نے آسان راستہ اختیار کیا۔''

''یہ آسان راستہ ہے؟'' اس نے ایک بار پھر اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا وہ برافروختہ نظر آیا تھا۔

میں نے سر ہلایا۔''ہاں دوسری دنیا کی طرف آسان راستہ۔ آدمی جلدی اور بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور ان سے چلنے کو کہا۔ اس بار ڈرائیونگ میرے ساتھ بیٹھے خوبرو نوجوان نے سنبھال لی اور زینی اس کی جگہ آگئی۔ وہ جان بوجھ کر مجھ سے ذرا لگ کر بیٹھی تھی۔ عورت ہونے سے قطع نظر وہ ان تینوں کے لیے صرف ایک ساتھی تھی اس لیے کسی کو نہ تو اس کے عریاں ہونے پر اعتراض ہوا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ لگ کر بیٹھنے پر۔ میں کسمسایا اور اسے نرمی سے پیچھے دھکیلا تو وہ مسکرانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چیلنج تھا کہ ایک عورت سے ڈرتے ہو اور میں نے آنکھوں میں اعتراف کیا کہ عورت سے ہی ڈرتا ہوں کیونکہ وہ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتی ہے اور بالآخر مرد کی عقل کو گھاس چرنے بھیج دیتی ہے۔ انسان کو موت سے اتنا نہیں ڈرنا چاہیے جتنا کہ بے باکی پر آمادہ عورت سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے شیر خان سے کہا۔''میرا خیال ہے ہم دیر کی طرف جا رہے ہیں۔''

''ہماری منزل اس سے آگے ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

دیر سے آگے چترال کی طرف جاتے ہوئے بہت وقت لگتا لیکن اگر ان لوگوں کی منزل افغانستان تھا تو ہم شام سے پہلے سرحد پار کر سکتے تھے۔ آج سے چند سال پہلے یہ سارا علاقہ دونوں طرف فوجوں کے اجتماع کی وجہ سے متحرک سرحد بن چکا تھا۔ آئے دن سرحد پار سے حملے اور جانی نقصان معمول کی بات تھی۔ جو پاکستان کو اتحادی کا درجہ دیتے ہیں وہ اس کی فوجی چوکیوں پر فضائی حملے کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں صرف نام کی سرحد ہوتی تھی اور دونوں طرف بسنے والے لوگ یوں سرحد پار آتے جاتے تھے جیسے ہم پنڈی سے اسلام آباد آتے جاتے ہیں۔ کاروبار سے لے کر رشتے داریاں تک سب چلتی تھیں۔ مگر فی الحال یہ سب بند تھا۔ پھر ایک بار خدشہ میرے ذہن میں سرسرانے لگا کہ مجھے بھارتیوں کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

دوبارہ روانہ ہونے کے بعد سب میں لنچ تقسیم ہوا۔ یہ خشک ہوجانے والے میٹھے روغنی نان اور کولڈ ڈرنکس پر مشتمل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کو چائے کافی کا شوق نہیں تھا۔ کیونکہ بنگلے میں بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی جب کہ وہاں چائے کافی کا سامان ہوسکتا تھا۔ انہوں نے

راستے کے لیے آسان خوراک رکھی تھی جو سادہ بھی تھی اور توانائی بخش بھی۔ ان کے پاس پانی بھی تھا مگر کولڈ ڈرنک کی بہتات تھی ایک پورا بیگ کولڈ ڈرنک ٹنوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے بیگ میں بیئر کی بوتلیں تھیں مگر ان سے صرف وہی شغل کر رہے تھے جنہوں نے ڈرائیو نہیں کرنی تھی۔ یعنی شیر خان اور میرے برابر میں بیٹھا ہوا دوسرا آدمی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے یوں لنچ کیا کہ زینی مجھے کھلاتی اور پلاتی رہی۔ انہوں نے میرے ہاتھ نہیں کھولے تھے۔ تین بجے تک ہم دیر اور چترال جانے والی سڑک پر آگئے تھے۔ دیر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا مگر چترال یہاں سے خاصا آگے تھا۔

سڑک زیادہ خراب ہو رہی تھی اور اب جھٹکے لگنے لگے تھے۔ کہیں کہیں یہ اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ مگر ایسے ٹکڑے زیادہ طویل نہیں تھے۔ عام طور سے سڑک ایسی ڈھلان پر تنگ ہوتی تھی جو بہت ترچھی ہو اور اس پر چوڑی سڑک بنانا ممکن نہ ہو۔ یہاں بہت گھنے اور آسمان سے باتیں کرتے درختوں پر مشتمل جنگلات تھے اور جنگل سے بہت انوکھی مہک اٹھ رہی تھی۔ اب یہاں کثرت سے چشمے نظر آنے لگے تھے اور بیشتر سڑک سے گزر رہے تھے۔ بعض مقامات اتنے حسین اور نظر نواز تھے کہ دل چاہتا آدمی وہیں رک جائے۔ مگر وہ رک نہیں سکتے تھے اور میں ان کا قیدی تھا۔ میں کئی بار اس سڑک پر سفر کر چکا تھا۔ دیر سے اوپر ایک راستہ افغانستان کی طرف جاتا تھا۔ اس سڑک سے یہاں بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور اسمگلنگ کی جاتی تھی۔ مگر جنگ کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ اب اس راستے کی بجائے خفیہ راستے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر اسمگلنگ پہلے جیسی کھلی نہیں رہی ہے۔ البتہ مقامی ضرورت کے تحت کی جاتی ہے اور سرحدی حکام اس سے چشم پوشی بھی کرتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کی مجبوری ہے۔

اب یہ سڑک زیادہ تر فوجی نقل و حرکت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے جب یہ سڑک گزر گئی تو میں سمجھا کہ یہ آگے چترال کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ مگر آدھے گھنٹے بعد جیپ ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جھٹکوں کا آغاز ہوا۔ جھٹکے بھی ایسے تھے کہ کبھی ہم بائیں طرف گرتے تھے اور کبھی دائیں طرف۔ آگے جانے سے روکنے کے لیے مجھے پاؤں استعمال کرنے پڑتے تھے۔ میں دوہری مصیبت میں تھا کیونکہ ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور ہر جھٹکے پر یا تو میں زینی پر گرتا تھا یا وہ مجھ پر آتی تھی اور مجھے خاصے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے بدن کے نرم و نازک حصے مجھ سے پیوست کر دیتی تھی۔ چند بار ایسا ہی ہوا تو میں نے تکلف بالائے طاق رکھ کر دونوں پاؤں اوپر کیے اور سیٹوں کی پشت پر جما دیئے اور یوں میں ایک جگہ پوز ہو گیا۔ اگرچہ یہ بھی مشکل تھا کیونکہ پیچھے بندھے بازوؤں پر زور آ رہا تھا۔ بعض مقامات پر یہ پوز بھی لڑھکنے سے نہیں بچاتا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر جیپ کا ڈھانچا بول رہا تھا اور اس کی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ جیپ کو کتنے مشکل مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بار خود کو روکنے کے باوجود زینی پر گرا تو اس نے مجھے واپس دھکیلتے ہوئے کہا۔

''تم بیکار کی کوشش کر رہے ہو۔''

''ٹھیک ہے کوشش نہیں کرتا۔'' میں نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس بار جھٹکا آیا تو میں پورے وزن سمیت اس پر گیا اور اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے مجھے برہمی سے دھکیلا۔

''یہ کیا ہے؟''

''بیکار کی کوشش نہ کرنے کا انجام۔'' میں نے جواب دیا۔ شکر ہے اسی وقت دشوار راستہ گزر گیا۔ سڑک ابھی بھی کچی ہی تھی مگر ہموار ہو گئی تھی اور اب جیپ بنا آواز کے چل رہی تھی۔ ''ہم کس طرف جا رہے ہیں؟''

میرے سوال پر شیر خان نے جیپ کا کمپاس دیکھا اور بولا۔ ''ٹھیک مغرب کی طرف۔''

''یعنی افغانستان کی طرف، کیا میرے طلب گار وہاں بیٹھے ہیں۔''

''پتا نہیں کیونکہ تمہاری ڈلیوری یہیں ہوگی۔''

''باپ رے۔''

''ڈرو مت۔'' زینی ہنسی۔ ''یہ دوسری ڈلیوری کی بات کر رہا ہے۔''

''تم سخت واہیات عورت ہو۔'' میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے تم نے عورت تسلیم کیا۔ ورنہ میں سمجھی کہ تم مجھے مرد سمجھ رہے ہو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

جیپ جس راستے پر چل رہی تھی اس کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ اس پر انسانوں اور گاڑیوں کی آمد و رفت باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ راستے میں ایک جگہ نشیب میں آبادی بھی دکھائی دی تھی مگر جیپ اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اب تک کسی انسان کی صورت نظر نہیں آئی۔ ایک بڑا جنگل آیا اور اس سے گزرنے کے بعد جیپ ایک وسیع چراگاہ

میں داخل ہوئی جو دو پہاڑوں کے درمیان تقریباً ایک کلومیٹر چوڑی پٹی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان سے بے شمار ندیاں گزر رہی تھیں اور دبیز و اونچی گھاس میں لاتعداد بھیڑیں، بکریاں اور دوسرے پالتو جانور چر رہے تھے۔ انسان یہاں بھی چند ایک ہی تھے اور انہوں نے سرسری سی نظروں سے ہمیں دیکھا تھا۔ جیپ چراگاہ سے بھی گزر کر ایک دریا کے کنارے چلنے لگی۔ موسم کی مناسبت سے دریا میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ کچھ دیر دریا کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ افغانستان اور پاکستان میں بہنے والا دریا کنہار تھا۔ جو کبھی سرحد کے اس طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بالآخر بعد میں اس کا پانی پاکستانی دریائی سسٹم میں شامل ہو جاتا ہے۔

سفر جس طرح جاری تھا صاف لگ رہا تھا کہ ان کو اپنی منزل اور وقت کا علم تھا۔ وہ کسی مرحلے میں نہ تو رکے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی سے رابطہ یا آپس میں کوئی مشورہ کیا تھا۔ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔ جیپ ایک خستہ حال پل کی طرف مڑی اور بہت احتیاط سے اسے کراس کر لیا۔ پل رسوں اور لکڑی کے موٹے تختوں کا بنا ہوا تھا اور اس سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ جب تک جیپ پل سے گزرتی رہی سب دم سادھے بیٹھے رہے اور پل کے بعد سانس میں سانس آئی تھی۔ پل کراس کرنے کے بعد ہم ایک نشیبی جنگل سے گزرنے لگے۔ اس کے چاروں طرف بلندی تھی اس لیے بارش کا پانی اس جگہ جمع ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ یہاں سبزے اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اونچے درخت بھی تھے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آبادی سے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے یہاں پرندوں کی بہتات تھی۔ خاص طور سے چکور اور بٹیر دکھائی دیئے تھے۔ پاس آبادی ہوتی تو شکاری انہیں کہاں بخشتے۔

جنگل کے بعد ایک ندی آئی اور سفر جاری رہا۔ اب سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان پر بے شمار ندیاں بہہ کر اوپر سے نیچے دریا کی طرف جا رہی تھیں مگر کوئی ندی اتنی بڑی نہیں تھی کہ رکاوٹ بنتی۔ ان لوگوں نے راستے میں جیپ میں پیٹرول بھروا لیا تھا اور پیچھے دروازے کے ساتھ تین عدد بڑے جیری کین بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں دس گیلن پیٹرول تھا۔ اس لیے وہ آرام سے سفر کر رہے تھے۔ سورج ڈوبنے تک سفر جاری رہا اور پھر انہوں نے ایک ندی کراس کی اور رک گئے۔ مغرب سمت میں اونچا ہوتا پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر برف نظر آ رہی تھی اور کئی مقامات پر آبشاریں گر رہی تھیں۔ دامن میں گھنا جنگل تھا۔ جیپ درختوں کے درمیان روک کر انہوں نے اسے جھاڑیوں اور شاخوں سے ڈھک دیا۔ وہ کیموفلاج کر رہے تھے۔ یہ علاقہ غیر تھا اور وہ یہاں بغیر اجازت کے آئے تھے اس لیے احتیاط لازمی تھی۔

ہم جس طرح سفر کرتے رہے تھے میرا اندازہ تھا کہ ہم افغانستان کی سرحد کے پاس کہیں تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی یہ لوگ احتیاط کر رہے تھے۔ انہوں نے جیپ کے عقبی حصے سے سلیپنگ بیگز نکالے۔ اترنے کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیئے تھے۔ مگر اب وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ کھانے میں وہی میٹھی روغنی روٹیاں اور کولڈ ڈرنک تھی۔ میں نے چائے کافی کا پوچھا تو جواب ملا کہ ایسی عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کھانے کے فوراً بعد مجھے سلیپنگ بیگ میں جانے کا حکم ملا۔ خود میرا تھکن اور بازوؤں میں دکھن سے حال اچھا نہیں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ جو حکیم قادس کے علاج سے بچ گیا تھا اور تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اس وقت سن ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک یہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا میں مسلسل اس کی مالش کرتا رہا تب کہیں جا کر یہ ٹھیک ہوا تھا۔

حکم ملنے پر میں سلیپنگ بیگ میں داخل گیا۔ یہ ہلکا گرم تھا اور اصل میں کھردری زمین اور کیڑے مکوڑوں سے بچاؤ کے لیے تھا۔ اس کا نصف اوپری حصہ نیٹ پر مشتمل تھا۔ نیچے دبیز تہہ کی وجہ سے جسم کو آرام ملا تھا۔ سارے سلیپنگ بیگز پاس پاس اور درختوں کے نیچے تھے۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنا قیام خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جگہ بھی ایسی منتخب کی تھی جہاں سے کسی کا گزر نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ان میں سے دو سلیپنگ بیگز میں لیٹ گئے تھے اور باقی دو پہرے پر تھے۔ وہ مجھ پر اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں لیٹا اور چند منٹ بعد سو گیا۔ پھر رات کسی پہر مثانے پر دباؤ آیا تو میں جاگ گیا۔ میں نے زپ نیچے کی تو نزدیک موجود زیٹی چونکی اور اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”کیا ہے؟“

”پھر سے...... فطرت کی پکار۔“

”ہے بڈی۔“ اس نے امریکن اسٹائل میں اپنے ساتھی کو آواز دی۔ ”اسے نیچر کال کر رہی ہے۔“

بڈی وہی خوبرو نوجوان تھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا اور اس نے زیٹی سے کہا۔ ”آواز کم رکھو۔“

میں سلیپنگ بیگ سے نکل آیا۔ نوجوان مجھے ایک طرف لے آیا اور دو درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو کرنا ہے یہیں کرو اور صرف دو منٹ میں۔''

ہم واپس آئے تو میں سلیپنگ بیگ میں جانے کی بجائے اس پر بیٹھ گیا۔ زینی نے کہا۔

''اندر جاؤ۔''

''میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں رات میں بھی ہوا نہیں چل رہی۔''

''ہوا پہاڑ کے دوسری طرف ملے گی۔'' اس نے کہا۔

''تم نہیں سوئیں؟''

''میں سو کر اٹھ گئی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی صبح کے چار بج رہے ہیں۔''

''یعنی کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے ہم سرحد کے پاس ہیں۔''

''صرف ایک کلومیٹر دور ہیں۔''

''آگے تم لوگ جاؤ گے یا دوہ آئیں گے؟''

''صبح پتا چلے گا۔ حالات دیکھ کر فیصلہ ہوگا۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا جیسے واضح جواب دینے سے گریز کر رہی ہو۔

''تم جارجین ہو اتنی دور کہاں سے آگئیں؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔

''میں آئی نہیں لائی گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جب یہاں امریکی آئے تو دوسری گندگیوں کے ساتھ یہاں جسم فروشی کا کاروبار بھی چمک اٹھا۔ ڈالرز کے لیے عورتیں خود بھی آئیں اور زبردستی لائی بھی گئیں۔''

''تم زبردستی لائی گئیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اس وقت میں صرف چودہ سال کی تھی۔ میرا کزن ہی مجھے بہکا کر لے گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ان لوگوں کا ایجنٹ تھا۔ مجھے ایک افغان وار لارڈ کو فروخت کیا گیا۔ میرے ساتھ بارہ لڑکیاں اور تھیں جن میں سے مجھ سمیت تین اس وار لارڈ کے حصے میں آئیں۔''

''اس کے چنگل سے کیسے نکلیں؟''

میں تین سال اس کے پاس رہی اور یہ میری زندگی کے بہت مشکل تین سال تھے۔ پھر میں نے پہلا قتل اسی وار لارڈ کا کیا۔ اس کے ساتھ اس کے چھ اہم ترین ساتھی بھی مارے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی کلاشنکوف کا پورا میگزین ان پر خالی کر دیا اور فرار ہوگئی۔ کچھ عرصے چھپتی رہی پھر یہاں آگئی۔ مجھے شیر خان مل گیا اس نے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔

''اب تم مطمئن ہو؟''

''انسان کسی حال میں مطمئن نہیں ہوتا ہے۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''صرف مطمئن ہونے کا دھوکا دیتا ہے۔''

''تو تم دھوکا دے رہی ہو؟''

''سب دیتے ہیں۔'' اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ''صرف میں ہی نہیں ہوں۔''

اس وقت مجھے لگا کہ اس کے ظاہری روپ سے قطع نظر اس کے اندر بہت تلخی بھری ہوئی تھی۔ شاید اس نے استحصال کا جو وقت دیکھا تھا یہ اس کا فطری ردعمل تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بھی شاکی ہو۔ عورت کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو وہ استعمال ہونا پسند نہیں کرتی ہے۔ یہ لوگ اسے استعمال کر رہے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم اپنے ساتھیوں سے خوش نہیں ہو؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

سونے (Gold) کے معیار کے پیمانے کو کیرٹ (Carat) کہا جاتا ہے۔

24 کیرٹ اصلی اور خالص

22 کیرٹ 91.67 فی صد خالص

18 کیرٹ 75 فی صد خالص

14 کیرٹ 58.3 فی صد خالص

پاکستان اور بھارت میں روایتی طور پر 22 کیرٹ کے سونے سے زیورات تیار کیے جاتے ہیں جبکہ یورپی ممالک میں عمومی طور پر 14 سے 18 کیرٹ کا سونا استعمال کیا جاتا ہے لیکن امریکا میں 10 سے 14 کیرٹ کا سونا استعمال ہوتا ہے۔

سونا اعصابی بیماریوں کے علاج میں معاون ہے۔ اگر سونے کی ''ڈلی'' کو رات کے وقت بھرے گلاس میں رکھ دیا جائے اور صبح یہ پانی پیا جائے تو اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ پانی انسانی چہرے کو خوبصورت اور پرکشش بھی بناتا ہے۔

تحقیق: سرور منیر راؤ

مرسلہ: عبدالغفور چغتائی، اٹک

''یہ تمہیں استعمال کر رہے ہیں جیسے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کیا۔''

''مگر تم ہوئے نہیں۔''

''میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ دوسرے میں جن حالات سے گزر رہا ہوں اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ورنہ تم میں اور تمہاری کوشش میں کوئی کمی نہیں تھی۔''

وہ مسکرائی۔ ''تم نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس گن ہوتی تو تم ابھی زندہ نہ ہوتے۔''

''تب مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس گن نہیں تھی۔''

باتوں کے دوران میں صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ زینی اور اس کا ساتھی رات دو بجے اٹھ گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے چھ گھنٹے تک سوتے رہے تھے اور اب ان لوگوں کی باری تھی۔ روشنی ہوئی تو زینی نے نوجوان کو بلایا اور میرے سر پر چھوڑ کر خود جیپ کی طرف گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا برنر اور دھات کی کیتلی تھی۔ اس نے پانی بھر کر کیتلی برنر پر رکھی اور جب پانی کھولنے لگا تو اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔ چند لمحے بعد فضا میں چائے کی خوشبو تیرنے لگی۔ جب زینی نے کاغذ کے مگ میں مجھے بھی چائے دی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جو اپنے بندے کی فضول عادات بھی یوں پوری کر رہا تھا۔ چائے بہت اچھی بنی تھی اگرچہ دودھ اور چینی کے بغیر تھی۔ میں چینی لیتا ہوں مگر اس وقت اس چائے نے بھی بہت مزہ دیا۔ سات بجے شیر خان اور اس کا دوسرا ساتھی اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے سلیپنگ بیگ واپس جیپ میں رکھے۔ سب نے باری باری ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھوئے۔ میں شیر خان کے ساتھ گیا۔ میٹھے روغنی نان سے ناشتا کیا گیا اور پھر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کی مگر یہ سفر پیدل تھا۔ انہوں نے اپنا اسلحہ لے لیا اور میرے ہاتھ پھر پشت پر باندھ دیئے۔ پھر وہ اس طرح آگے بڑھے کہ سب سے آگے شیر خان تھا اور پیچھے زینی۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے باقی دو تھے۔ میں ایک بار پھر مضطرب ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اب تک مجھے کوئی موقع نہیں دیا تھا لیکن میں نے سوچ لیا کہ اگر معاملہ بھارتیوں کا ہوا تو میں اپنی جان پر کھیل کر بھی فرار کی کوشش کروں گا چاہے آگے نتیجہ جو بھی نکلے۔ بھارتیوں کے ہاتھ آنا مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ پہاڑی ڈھلان کے گھنے جنگل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم ایک کھلی مگر چھوٹی وادی میں نکلے۔ شیر خان نے ہمیں روک دیا۔ اس نے کہا۔ ''بس یہیں رک جاؤ۔ ہمیں یہیں رک کر انتظار کرنا ہے۔''

میں نے شیر خان سے کہا۔ ''تم نے جو کام کیا ہے کیا اس کا معاوضہ لے لیا ہے؟''

''تمہیں اس سے کیا؟'' وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

''کیونکہ سودا میرا ہو رہا ہے۔ لیکن میرا پوچھنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ تم جس طرح مجھے زیادہ نہیں جانتے اسی طرح میرے دشمنوں سے بھی واقف نہیں ہو گے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی قسم کا معاوضہ دینے کی بجائے چند گولیاں خرچ کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر تمہیں معاوضہ نہیں ملا ہے تو ہوشیار رہو کہ ادائیگی کا طریقہ کار تمہاری توقع کے خلاف نہ ہو۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا لیکن پھر اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ درختوں میں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد زینی بولی۔ ''تم کس کی باتوں میں آ رہے ہو؟''

''احتیاط کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' شیر خان نے دانش مندی کی بات کی۔

زینی نے اختلاف جاری رکھا۔ ''یہ ہمارا قیدی ہے ہمیں کبھی ٹھیک مشورہ نہیں دے گا۔''

''تم میرے براہِ راست دشمن نہیں ہو صرف پیسوں کے لیے کام کر رہے ہو۔''

زینی مجھے گھور رہی تھی۔ حالانکہ صبح اس نے مجھ سے بہت کھل کر گفتگو کی تھی۔ مگر اس وقت اس نے میری مخالفت کی تھی۔ نو بج رہے تھے۔ شیر خان کی گھڑی پر میری نظر تھی۔ سورج بلند ہوتے ہی خنکی تیزی سے غائب ہو رہی تھی اور گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید یہ جگہ سطح سمندر سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اچانک شیر خان کے پاس سے ہلکی سی ٹون کی آواز آئی اور اس نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹا واکی ٹاکی برآمد کر کے اس کا بٹن دبایا۔ ''ہم پہنچ گئے ہیں۔''

اس نے صرف ایک ہی جملہ کہہ کر واکی ٹاکی واپس رکھ لیا۔ پھر اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ یہ اشارہ یقیناً اپنے چھپے ساتھیوں کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ زینی بھی پیچھے ہٹی اور ایک طرف درختوں میں چلی گئی۔ اب وہاں میں اور شیر خان تھے۔ ہم جس جگہ تھے اس کے تین طرف پہاڑ کی ڈھلان اور جنگل تھا صرف جنوبی سمت خالی تھی۔ چند منٹ بعد اسی سمت سے چار افراد نمودار ہوئے۔ میں چونکا کیونکہ

انہوں نے پتلون شرٹ پر بلٹ پروف پہن رکھی تھیں اور وہ پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ دور سے ان کی چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ گورے تھے۔ مگر نزدیک آنے پر پتا چلا کہ وہ مقامی تھے۔ شاید افغانی تھے۔ مگر بہت گورے چٹے تھے اس لیے دور سے سفید فام لگ رہے تھے۔ چاروں کے سر پر چھوٹے بال تھے جیسے کہ فوجیوں کے ہوتے ہیں۔ نزدیک آنے پر ان میں سے ایک آگے آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’شیر خان، اسے ہمارے حوالے کرو۔‘‘

مجھے شبہ ہوا کہ وہ پاکستانی تھا کیونکہ اس نے یہ جملہ بہت اچھی اردو میں کہا تھا۔ شیر خان نے میری طرف اشارہ کیا۔ ’’تمہارا آدمی یہ رہا لیکن پہلے مجھے معاوضہ دیا جائے۔‘‘

’’معاوضہ مل جائے گا لیکن پہلے میں تصدیق کروں گا۔‘‘ اس نے کہا اور آگے آیا۔ وہ شاید ان کا باس تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا آلہ نکالا جو سائز میں موبائل فون جتنا تھا مگر اس سے مختلف تھا اس کے اوپر حصے میں ایک چھوٹا سا لینس لگا ہوا تھا۔ اس نے لینس میری دائیں آنکھ کے سامنے کیا اور بولا۔ ’’اس میں دیکھو۔‘‘

میں نے آنکھ بند کر لی اور پوچھا۔ ’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’فکر مت کرو یہ تمہاری پتلی کی تصدیق کرے گا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اپنی آنکھ کھولو۔‘‘

میں نے آنکھ کھولی اور لینس میں دیکھا۔ چند لمحے بعد اس کے نیچے موجود سبز لائٹ آن ہو گئی اور اس نے آلہ بند کر کے واپس رکھ لیا۔ اس کے تاثرات سپاٹ تھے اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ تصدیق ہوئی ہے یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری آنکھ کی پتلی کا نقشہ کس کے پاس ہوگا۔ یہ کسی آدمی کی تصدیق کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ جس طرح ہر آدمی کے فنگر پرنٹ جدا ہوتے ہیں اسی طرح ہر آدمی کی پتلی کے اندر بنا ہوا ڈیزائن بھی مختلف ہوتا ہے۔ آج کل اس سے بھی آدمی کی تصدیق کی جاتی ہے۔ آنکھ کی پتلی بھی انسان کے بائیو میٹرکس میں شامل ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو فنگر پرنٹ لینے اور رکھنے کا نظام بھی ڈھنگ کا نہیں ہے۔ آنکھ کی پتلی سے تصدیق ابھی دور کی بات ہے۔ باس کے تین ساتھی ذرا فاصلے پر اور بہت چوکنا موجود تھے۔ اگرچہ ان کی رائفلوں کا رخ نیچے کی طرف تھا مگر ان کی انگلیاں ٹریگرز سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ باس نے شیر خان سے پوچھا۔ ’’تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟‘‘

’’تمہیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔‘‘ شیر خان بولا۔ ’’آدمی لو اور معاوضہ دو۔‘‘

اچانک ہی میرے اندر سے چھٹی حس نے اشارہ کیا اور میرا جسم سنسنا اٹھا تھا۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا۔ میری نظر ان چاروں پر تھی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا اس کی بجائے اچانک جنگل کی طرف سے تڑتڑاہٹ کی آواز آئی اور ایک مردانہ چیخ گونجی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ فوراً ہی کسی دوسری رائفل نے موت کا نغمہ گایا۔ شیر خان چونکا تھا کہ باس نے اس کے پیروں پر برسٹ مارا۔ وہ شاید اسے مارنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اوپر فائر کرتا۔ شیر خان دھاڑ کے ساتھ نیچے گرا اور باس نے آگے بڑھ کر اس کی رائفل لات مار کر دور پھینک دی پھر جھک کر اس کی بیلٹ سے بندھا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کے باقی تین ساتھی تیزی سے جنگل کی طرف بڑھے تھے جہاں اب دو رائفل رہ رہ کر گرج رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے درست خبردار کیا تھا۔ وہاں زندگی و موت کا کھیل جاری تھی اور لگ رہا تھا کہ اس کھیل میں شیر خان اینڈ کمپنی کو موت نصیب ہوگی۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ چند لمحے بعد ہی جنگل کی طرف سے دوسری چیخ سنائی دی اور یہ بھی مردانہ تھی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اب صرف زینی باقی رہ گئی تھی۔ مگر دوسری چیخ کے بعد فائرنگ رک گئی تھی۔

شیر خان کی دونوں ٹانگیں چھلنی ہو گئی تھیں۔ خاص طور سے گھٹنے چکنا چور ہو گئے تھے اور وہ شدید اذیت میں تھا۔ اگر اسے فوری طور پر کسی بہت اچھے آرتھوپیڈک سرجن کی خدمات حاصل ہو جاتیں تب بھی اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ دوبارہ پہلے کی طرح اپنے پیروں پر چل سکے۔ مگر فی الحال تو اس کی زندگی کا امکان بھی کم ہی نظر آ رہا تھا۔ باس اس کی اور میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ شیر خان ہوش میں تھا اور کراہ رہا تھا میں نے ذرا جھک کر افسوس سے کہا۔ ’’میں نے تم سے کہا تھا تم نے آسان راستہ اختیار کیا ہے انجام کی طرف۔‘‘

جواب میں اس کے منہ سے جو نکلا وہ سب ناگفتنی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کہ دم توڑتے آدمی کو کیا کہتا۔ ایک منٹ بعد درختوں کی طرف سے زینی نمودار ہوئی اور آنے والے تینوں افراد اس کے پیچھے تھے۔ ایک لمحے کو لگا کہ زینی کو ہینڈز اپ کر کے لایا جا رہا ہے۔ مگر پھر میری نظر اس کے ہاتھ میں موجود رائفل پر گئی اور وہ شکست خوردہ نہیں بلکہ فاتحانہ انداز میں آ رہی تھی۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ’’تمہاری ایک اور شکست ...... ذرا دیکھنا زینی کیسے

آ رہی ہے۔"
شیر خان نے سر گھما کر زینی کو دیکھا اور اس کی ناگفتنی کا رخ اس کی طرف مڑ گیا۔ زینی نے اس کا جواب یوں دیا کہ آتے ہی اس کے ماتھے پر گولی ماری اور شیر خان فوراً مر گیا۔ مجھے اس کی جوان مرگی کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ ایسے لوگ اسی طرح دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ میں زینی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا کوئی آج کل مطمئن نہیں ہوتا صرف دھوکا دیتا ہے۔ جیسا کہ تم نے دیا۔"

"اسے لے چلو۔" زینی نے سرد لہجے میں کہا تو ان چاروں نے مجھے گھیر لیا اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ زینی ایک طرف ہو کر الگ چل رہی تھی۔ اس کا تحکمانہ رویہ اور ان چاروں کی نیازمندی بتا رہی تھی کہ اب وہ باس تھی۔ سفر طویل نہیں تھا اور ہم آدھے گھنٹے بعد پہاڑ کی ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گئے تھے یہاں ایک باقاعدہ راستہ تھا جو صدیوں سے اس راہ پر چلنے والوں نے بنایا تھا۔ دور مجھے پاکستان کا پرچم لہراتا دکھائی دے رہا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر افغانستان کا پرچم تھا۔ گویا یہ سرحد تھی مگر ہم اس سے فاصلے پر تھے۔ ہم ڈھلان سے اترنے لگے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہم پاکستان کی حد میں تھے یا افغانستان کی حد میں داخل ہو چکے تھے۔ اوپر چڑھنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا مگر نیچے اترتے ہوئے مجھے مشکل پیش آنے لگی۔ بندھے ہاتھوں سے توازن بگڑ رہا تھا۔ بعض جگہ قدم لڑکھڑاتے تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

"میرے ہاتھ کھلوا دو ورنہ نیچے گرا تو شاید ہڈیوں اور گوشت کا ڈھیر ملے تم کو لے جانے کے لیے۔"

وہ رکی اور پھر اپنی جیکٹ سے خنجر نکال کر میری طرف آئی اور ہاتھوں کی بندشیں کاٹ دیں۔ "تھینک یو۔" میں نے ہاتھ مل کر کہا۔

ہم ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ زینی نے اب سر پر بڑی سی اونی ٹوپی پہن لی تھی جس سے اس کے سنہری بالوں کی پونی ٹیل چھپ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی نسوانی شناخت چھپانا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کی لچکتی چال ہی بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق کس صنف سے ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنی چال بدل لیتی مگر شاید وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں تھی۔ آنے والے چاروں افراد پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی زینی کی طرف متوجہ ہونے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ایسا لگ رہا تھا۔ وہ اس سے مرعوب لگ رہے تھے اور اس کے تیور بھی کچھ ایسے ہو گئے تھے جیسے وہ اس کے بہت ادنیٰ درجے کے خادم ہوں۔ ڈھلان سے اترتے ہی ایک مختصر لیکن بہت ترچھی چڑھائی آئی اور اس پر چڑھتے ہوئے صحیح معنوں میں کوہ پیمائی کرنا پڑی تھی۔ اکثر مقامات پر چاروں ہاتھوں پیروں سے اور پتھروں یا درختوں کا سہارا لے کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔

جب اوپر پہنچے تو سامنے پیالہ نما وادی نظر آئی جو آخری حصے میں جا کر دو پہاڑوں کے بیچ آ گئی تھی۔ ہم نیچے اترنے لگے اس طرف ڈھلان شریفانہ تھی اور ہم آرام سے اتر گئے اور دس منٹ بعد وادی سے نکل رہے تھے۔ وادی پھر چوڑی ہونے لگی اور اس کے دونوں طرف بلند پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ہم سیدھے جانے کی بجائے بہت گھوم پھر کر جا رہے تھے اور غالباً ایسا اس لیے کیا جا رہا تھا کہ کسی سرحدی چوکی سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ مگر وادی کے آخری حصے میں جو پہاڑ نظر آ رہا تھا وہ خاصا بلند تھا اور اس کے سب سے اوپر والے حصے میں برف کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی یعنی یہ پہاڑ کم سے کم پندرہ ہزار فٹ بلند تھا جبھی اس پر گرمیوں میں بھی برف تھی۔ ہم نے چڑھنا شروع کیا۔ اس سفر نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے جب خطرناک والی چڑھائی شروع ہوئی تو زینی نے آدھے گھنٹے کے لیے رکنے کا اعلان کیا۔

میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سائے میں خنکی تھی جب کہ دھوپ میں ذرا گرمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید ابھی ہم سات یا آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ سب کے پاس پانی کی ڈھائی لیٹر والی بوتلیں تھیں۔ اس لیے پانی کی کمی نہیں تھی۔ میں نے راستے میں آنے والی تمام ندیوں سے دل کھول کر پانی پیا تھا اس لیے پیاس نہیں تھی مگر جیسے جیسے بلندی پر جاتے پیاس لگتی۔ سب مختلف جگہوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ میں ان کے درمیان میں تھا یعنی مجھے گھیرا ہوا تھا۔ زینی ایک کسی قدر بلند چٹان سے ٹکی کھڑی تھی اس نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی پھر اس نے آدھا گھنٹا پورا ہوتے ہی کہا۔ "لیٹس موو ناؤ۔"

اس بار مجھے اس کے لہجے نے چونکا دیا کیونکہ اس نے بہت صاف اور نستعلیق انگریزی لہجے میں یہ بات کہی تھی۔ مشرقی یورپ کے رہنے والے ٹی کوٹی بولتے ہیں جب کہ اس نے ٹی ہی کہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جیسے اس کی شخصیت پرفریب نکلی تھی کیا اس کی جارجین ہونے والی بات بھی غلط تھی؟ ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا اور اس بار

چڑھائی خاصی مشکل ثابت ہوئی کیونکہ یہ ایک مسلسل چڑھائی تھی اور اس میں راستے بھی نایاب تھے۔ ہمارے قدم ان راستوں پر پڑ رہے تھے جن پر شاید پہلے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے سردی بڑھ رہی تھی اور سائے میں سے گزرتے ہوئے باقاعدہ سردی لگتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم اس پہاڑ کی اوپری حصے میں پہنچے یہاں سے ایک راستہ نشیب کی طرف جا رہا تھا اور دوسرا پہاڑ کی چوٹی تک تھا۔ ظاہر ہے ہمیں نیچے کا رخ کرنا تھا۔

اب سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور جب سانس کھینچتے تو ہوا جیسے خالی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے سینے میں کم ہوا گئی ہو۔ میرا تجربہ بتا رہا تھا کہ ہم دس ہزار فٹ کے آس پاس کہیں تھے۔ مگر اب نیچے اتر رہا تھا اور ہماری منزل دور تک نشیب میں پھیلے تہہ در تہہ پہاڑوں میں کہیں تھی۔ ذرا نیچے آئے تو ایک پگ ڈنڈی مل گئی جو انسانی قدموں سے آشنا تھی۔ اس لیے اس پر سفر آسان ثابت ہوا۔ ہم ایک اور چوٹی کے نیچے سے گزرے جس پر برف جمی تھی اور اس کی خنکی یہاں تک آ رہی تھی۔ اس شفاف برف سے بہہ کر آنے والا پانی برف سے زیادہ سرد تھا مگر اسے پی کر میں تر و تازہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر چلنے لگے جو پل صراط سے مشابہہ تھا اور اس کے دونوں طرف تا حد نگاہ ڈھلان تھی مگر یہ سیدھی ڈھلان نہیں تھی بلکہ گرنے کی صورت میں بہت سا حصہ آدمی کو ہوا میں طے کرنا پڑتا۔ جس کا لازمی نتیجہ فوتگی کی صورت میں نکلتا۔ اس لیے سب بہت محتاط ہو کر ایک قطار میں اس ڈھلان سے گزر رہے تھے۔

پل کو عبور کر کے ہم نے ایک اور ڈھلان پر قدم رکھا جس پر ایک بار پھر اونچے درخت نظر آنے لگے تھے اور ان سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک چوڑی وادی میں داخل ہوئے۔ یہ وادی اصل میں دریا کا پاٹ تھا مگر فی الحال پانی اس کے وسط میں کسی ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ تھکن سے سب کا برا حال تھا اس لیے ایک اسٹاپ آدھے گھنٹے کا اور دیا گیا اور اس دوران میں ہم نے گڑ ملے خشک چنوں سے پیٹ بھرا۔ یہ توانائی بخش کھانا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پھر سے روانہ ہوئے۔ دریائی وادی کے ساتھ چلتے ہوئے۔ ہم شام پانچ بجے کے قریب ایک کچی سڑک تک پہنچے جہاں ایک بڑی آرمی جیپ ہماری منتظر تھی۔ یہ اس قسم کی جیپ تھی جیسی امریکی فوج استعمال کرتی ہے مگر اس پر نشانات نہیں تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سویلین افغانی بیٹھا ہوا تھا۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ چاروں بھی افغانی تھے۔

یہاں آتے ہی انہوں نے اپنی بلٹ پروف جیکٹس اتار دیں اور روشن خیال افغانیوں والے حلیے میں آگئے۔ وہ سب کلین شیو تھے اور سروں پر چھوٹے بال تھے اس لیے انہیں سروں پر اڑتے ڈرون طیاروں سے خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر دوسرے خطرات تو تھے۔ پورے افغانستان میں جا بجا مزاحمتی گروپس ہیں۔ وار لارڈز اور ڈرگ لارڈز ہیں۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ گروہوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر فرد مسلح ہوتا ہے اور سامنا ہونے پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا سامنے بندوق بدست شخص جو چلا آ رہا ہے وہ کوئی ڈاکو ہے یا پھر شریف آدمی۔ چل چل کر سب کا برا حال ہو گیا تھا اس لیے گاڑی دیکھ کر مجھ سمیت سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ہم اس کے عقبی وسیع کیبن میں آگئے جس میں آمنے سامنے نشستیں لگی تھیں۔ زینی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آگئی۔ جیپ آگے بڑھی اور کچے راستے پر اس کی رفتار سست مگر ایک گھنٹے بعد ایک کسی قدر پختہ سڑک آگئی اور اس کی رفتار بڑھ گئی تھی میں نے زینی سے کہا۔ ''ہم یقیناً افغانستان میں ہیں؟''

''ہاں تم اس وقت افغانستان میں ہو۔''

''رات میں بھی سفر جاری رہے گا؟''

''نہیں آج رات ہم ایک جگہ رکیں گے۔'' زینی نے کہا۔ ''یہاں رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں ہوتا ہے۔''

جیپ سورج غروب ہونے کے بعد بھی چلتی رہی تھی۔ یہ علاقائی سڑک تھی مگر اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ امریکیوں نے آنے کے بعد سب سے پہلے ذرائع مواصلات پر توجہ دی تھی اور یہاں بننے والی سڑکیں عالمی معیار کی تھیں۔ تاریکی چھانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد جیپ ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوئی۔ یہاں اس وقت بجلی نہیں تھی مگر جنریٹرز چل رہے تھے اور روشنی کے لیے دوسرے ذرائع سے بھی کام لیا جا رہا تھا۔ یہاں خاصی چہل پہل تھی اور بازار کھلا ہوا تھا۔ جیپ ایک چھوٹے دو منزلہ ہوٹل کے سامنے رکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ انہوں نے تین کمرے لیے۔ ایک زینی کے لیے تھا اور باقی دو ہمارے لیے تھے۔ کھانا اوپر ہی طلب کیا گیا تھا۔ جب اس نے رقم دی تو مجھے پتا چلا کہ اصل مہنگائی تو یہاں تھی۔ تین کمروں اور رات کے کھانے کے چار سو امریکی ڈالرز چارج کیے گئے تھے یعنی چالیس ہزار پاکستانی روپے، اتنے میں تو پاکستان میں ہم

فائیو اسٹار نہ سہی فور اسٹار ہوٹل میں قیام کر سکتے تھے۔ امریکیوں کے بارے میں بالکل درست کہا ہے کہ یہ جہاں جاتے ہیں چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

کھانے میں دنبے کا بھنا گوشت اور خاص طریقے سے پکی ہوئی روٹی تھی۔ کھانا بے شک مہنگا تھا مگر اتنا ہی لذیذ بھی تھا۔ اس کے بعد قہوہ آیا۔ میرے لیے اسپیشل آیا تھا کیونکہ قہوہ ختم کرتے ہی میرے ذہن پر نیند نے یلغار کی تھی اور جب تک میں سوچتا کہ کیا ہوا ہے میں سو چکا تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام مجھے سکون سے سلانے کے لیے تھا تا کہ وہ بھی آرام سے سو سکیں یا آرام ہی کر لیں کیونکہ اس سفر نے سب کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ میں بے ہوشی جیسی نیند میں تھا مگر فائرنگ کی آواز نے میرے شعور کو جھنجوڑا اور میں نے محسوس کیا کہ آس پاس شور ہو رہا تھا۔ بہ مشکل میں نے آنکھ کھولی اور جھومتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ میرا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ کمرا بھی خالی تھا اور ہوٹل کے آس پاس سے رہ رہ کر فائرنگ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر تاریکی تھی یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک چھوٹا انرجی سیور روشن تھا اور دیوار گیر گھڑی صبح کے چار بجا رہی تھی۔ جاگنے کے باوجود میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت فی الحال خوابیدہ تھی۔ مگر میرا لاشعور اشارہ کر رہا تھا کہ آس پاس گڑبڑ ہے اور دراصل اسی نے مجھے بیدار کیا تھا ورنہ میری بیدار ہونے والی حالت نہیں تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور زینی اندر آئی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''چلو یہاں گڑبڑ ہے؟''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

''پتا نہیں کچھ لوگ آگئے ہیں میرے آدمی مقابلہ کر رہے ہیں مگر ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

عجیب بات تھی میرا ردِعمل تو یوں ہونا چاہیے تھا کہ میں سب سے پہلے اسے ہی دشمن سمجھتا اور قابو کرنے کی کوشش کرتا۔ یا پھر فرار کی راہ تلاش کرتا مگر اس کی بجائے میں اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم آپس میں دوست اور ساتھی ہیں۔ باہر آتے ہی اس نے ہوٹل کے اوپری حصے کا رخ کیا اور لکڑی کی میڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر آ گئے۔ آس پاس گولیوں کے شعلے چمک رہے تھے اور حملہ آور نے دو طرف سے ہوٹل کو گھیرا ہوا تھا۔ زینی کے آدمیوں کی طرف سے جوابی کارروائی جاری تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہتھیاروں سے لگ رہا تھا حملہ آوروں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ شاید اسی لیے زینی مجھے یہاں سے نکال لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ہم کس طرف جائیں یہاں تو دشمن ہیں۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ بولی اور برابر والے مکان کی طرف بڑھی۔ یہ بھی دو منزلہ تھا مگر ہوٹل سے ذرا نیچا تھا۔ زینی نے مجھ سے کہا۔ ''نیچے اتر جاؤ اور پھر سہارا دے کر مجھے اتارو۔''

میں دیوار سے لٹک کر آرام سے چھت پر اتر گیا اور پھر میں نے ہاتھ اوپر کیا تو زینی میرے بازوؤں میں آ گئی۔ میں نے اسے نیچے کیا تو اس نے پھر میرا بازو پکڑا اور زینوں کا رخ کیا۔ اس بار بھی میں نے بلا چوں چرا اس کا ساتھ دیا مگر میرے اترنے سے نیچے موجود افراد کو پتا چل گیا تھا کہ کوئی چھت پر آیا ہے۔ زینوں پر ایک نوجوان آدمی نمودار ہوا اور زینی کی رائفل کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ زینی نے آہستہ سے کہا۔ ''شور مت کرنا ہم صرف یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں پیچھے ہمارے دشمن آرہے ہیں۔ وہ آگئے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔''

نوجوان نے سر ہلایا اور بولا۔ ''تم دونوں چلے جاؤ۔''

ہم نیچے آئے تو ایک کمرے میں بستر پر ایک لڑکی چادر میں دبکی ہوئی تھی ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف آیا اور اس نے چادر مزید مضبوطی سے خود پر لپیٹ لی۔ شاید وہ اس نوجوان کی بیوی تھی۔ اس فلور پر بس دو کمرے تھے اور ان میں یہی دو افراد تھے۔ معمولی سا فرنیچر اور ساز و سامان تھا۔ ہم اسے دیکھ کر نچلے والے فلور پر آ گئے۔ یہ حصہ بند تھا صرف میڑھیوں اور باہر جانے والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اور رہتا تھا یہ مشکل سے تین سو گز رقبے پر بنا ہوا گھر تھا۔ جس میں آنے جانے کا راستہ مشترک تھا۔ زینی نے نوجوان سے کہا۔ ''اب تم جاؤ اور اپنے فلور پر رہو وہاں سے باہر مت آنا۔''

نوجوان سر ہلاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ زینی نے باہر جھانکا تو سامنے ہی دو مسلح افراد ایک کنکریٹ کی دیوار کی آڑ سے ہوٹل کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا کہ کب زینی نے پستول پر سائلنسر لگایا اور پھر اس نے ہاتھ آگے کر کے ایک فائر کیا اور دیوار کے پیچھے موجود افراد میں سے ایک غائب ہو گیا۔ دوسرا اسے دیکھنے کے لیے جھکا اور پھر اس نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر جوش میں ہوٹل کی طرف پورا برسٹ مارا اور اس کے خاتمے پر خود بھی مارا گیا۔

زینی نے اس کے سر میں گولی ماری تھی اور اس کا نشانہ بہترین تھا کوئی تیس گز کے فاصلے سے اس نے دونوں افراد کو ایک ایک گولی سے نشانہ بنایا تھا۔ پھر اس نے جھانک کر باہر دیکھا اور بولی۔ ''آؤ راستہ صاف ہے۔''

ہم باہر نکلے اور ہوٹل سے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہم جھکے ہوئے تھے اور رفتار تیز تھی۔ ایک گلی تک پہنچے تھے کہ عقب سے فائر ہوا اور ہم تیزی سے گلی میں گھس گئے۔ ہم بال بال بچے تھے کیونکہ چلائی جانے والی گولیاں ہمارے پاس سے گزری تھیں۔ عقب میں ہونے والی فائرنگ کے شور میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ گلی مڑتے ہی زینی نے دوڑنا شروع کر دیا اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میری دشمن ہے مجھے قیدی بنا کر لائی ہے اور اب میرے پاس موقع ہے کہ میں آزادی حاصل کر سکوں مگر میں بنا سوچے سمجھے اس کا ساتھ دے رہا تھا جیسے وہ کہہ رہی تھی ویسا ہی کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ مجھے فرار ہو جانا چاہیے یا اسے قابو کر لینا چاہیے۔ میں یوں اس کے ساتھ لگا ہوا تھا جیسے ہم ایک ہی ہوں اور دشمن وہ ہے جو ہمارے پیچھے آیا ہے۔ یہ گلی چوڑی تھی مگر آگے زینی جس گلی میں مڑی وہ تنگ تھی۔ ہم قصبے کی اندرونی آبادی میں گھس گئے تھے۔

یہاں دشمن نہیں تھے مگر وہ پیچھے ضرور آتے۔ اس لیے زینی تیز رفتاری سے گلیاں کراس کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس آبادی سے واقف تھی۔ یہ چھوٹا سا قصبہ پہاڑوں کے درمیان میں دریا کے کنارے تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایسی جگہوں سے گزرنے لگے جہاں مکانات فاصلے پر تھے اور درمیان میں باغات اور خالی جگہیں تھیں۔ فائرنگ کی آواز اب پیچھے رہ گئی تھی مگر رہ رہ کر آ رہی تھی۔ بھاگ دوڑ سے میری غنودگی غائب ہو گئی تھی مگر ذہن کو سن کرنے والی کیفیت برقرار تھی۔ اب بھی میں کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔ ہم جس سڑک سے آئے تھے وہ دریا کے دوسری طرف تھی اور قصبہ دریا کے اس طرف تھا اس لیے ہمیں ہائی وے تک جانے کے لیے دریا کراس کرنا پڑتا۔ درختوں اور کھیتوں کا ایک مختصر حصہ آیا اور اس کے بعد قصبے کا دوسرا حصہ سامنے آیا جو اصل میں دریا کے بالکل ساتھ تھا اور اس سے ایک سڑک نکل کر مخالف سمت میں جا رہی تھی جہاں دریا پر پل تھا اور وہاں سے اسے کراس کیا جا سکتا تھا۔ زینی نے صبح کی نمودار ہوتی روشنی میں پل کی طرف اشارہ کیا۔

''ہمیں وہاں جانا ہے۔''

''وہ دور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں گاڑی کی ضرورت ہوگی۔''

''یہاں گاڑی نہیں ہے ہمیں پیدل جانا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

ہم درختوں اور مکانوں کی آڑ میں اس طرف روانہ ہوئے۔ فاصلہ ایک کلو میٹر سے کچھ کم تھا۔ اب فائرنگ کی آوازیں تھم گئی تھیں اور اگر دشمن ہمارے پیچھے آیا تھا تو وہ ہمارا نشان کھو چکا تھا۔ جب ہم پل کے پاس پہنچے تو روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ پل پر موجود ایک گاڑی اور اس کے آس پاس موجود مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چوکنا تھے جیسے کسی کے منتظر ہوں۔ زینی نے تشویش سے کہا۔ ''یہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ان کو کیسے پتا کہ ہم یہاں آئے ہیں؟''

''اب تک ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہوگا اس لیے ان لوگوں کو اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ہمیں دریا کراس کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔''

''تب ہم پار کیسے جائیں گے؟''

''تیر کر۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں نے اس بار بھی کوئی اعتراض نہیں کیا کہ دریا کا پانی بے پناہ سرد ہوگا اور ہماری قلفی جم سکتی تھی۔ درحقیقت میں اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس وقت زینی مجھ سے کہتی کہ میں آگ کے دریا میں کود جاؤں تو میں سوچے سمجھے بغیر اس کی بات پر عمل کرتا۔ زینی ذرا پیچھے آئی اور اس نے اپنے جوتے اتار کر کمر سے باندھ لیے۔ میں نے جوتے نہیں اتارے۔ اس نے اسلحہ اپنی پشت پر بندھے بیگ میں ڈال لیا تھا اور پھر ایک چھوٹی سی رسی نکال کر اسے اپنی اور میری پتلون کی بیلٹ سے باندھ لیا تاکہ ہم دریا میں الگ نہ ہو جائیں۔ پانی میں اترنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ''تم تیرنا جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح۔'' میں نے کہا۔ مگر جب ہم دریا میں آئے اور ٹھنڈے پانی نے استقبال کیا تو اندازہ ہوا کہ میدانی دریاؤں اور پہاڑی دریاؤں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس پانی نے ہمارے جسموں کی حرارت چوسنا شروع کر دی اور جب ہم دریا کے وسط تک پہنچے تو ٹھنڈے ٹھار پڑ چکے تھے۔ جسم کی طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی اور ہمارے ہاتھ اب سلو موشن میں چل رہے تھے اور آگے جانے کی بجائے ہم دھارے کے ساتھ کھنچ رہے تھے۔ زینی کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔ اس سے یوں بھی مشکل سے تیرا جا رہا تھا کہ اس

کے پشت پر دس بارہ کلوگرام وزنی بیگ تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے غوطے کھانا شروع کر دیے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنی تیراکی کی صلاحیت کا درست اندازہ نہیں تھا۔ خاص طور سے جب واسطہ ایسے شوریدہ سر دریا سے ہو تو۔ ایک بار وہ پانی کے اندر گئی تو مجھے اس کو کھینچنا پڑا تھا اور اس کے بعد میں ہی اسے سنبھالنے لگا۔ مگر ہم تیرنے کی بجائے خود کو سطح پر برقرار رکھ رہے تھے۔ اس لیے کنارے کی طرف جانے کی بجائے دھارے کے ساتھ بہنے لگے اور اب پل کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔

''پل نزدیک آ رہا ہے۔''

''وہ...... دیکھ لیں...... گے۔'' زینی نے اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔ ''ان کی نظروں سے بچنا۔''

نیچے دریا میں ابھی نیم تاریکی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ زینی نے کسی قدر شوخ اورنج رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ پانی میں نمایاں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھما کر اپنی آڑ میں کر لیا۔ میں آگے تھا اور وہ میرے پیچھے تھی۔ میری جیکٹ مٹیالے رنگ کی تھی اور دریا کے پانی سے ہم رنگ ہو رہی تھی۔ اس کی جیکٹ مزید چھپانے کے لیے میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ یوں وہ پانی میں زیادہ اندر چلی گئی تھی اور اس کی جیکٹ چھپ گئی تھی۔ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ عجیب چویشن تھی کہ ذہنی لحاظ سے میں اس کے بس میں تھا مگر جسمانی طور پر اس نے خود کو مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم پل کے نزدیک آئے تو میں نے دیکھا ایک آدمی کنارے پر کھڑا ہوا تھا مگر وہ نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر قصبے کی طرف تھی۔ پانی پل سے کوئی تیس پینتیس فٹ نیچے تھا۔ عین اس وقت جب ہم پل کے نیچے آ رہے تھے اس آدمی نے نیچے دیکھا اور اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس کے چلّانے کی آواز آئی۔

''وہ دریا میں ہیں۔''

''گہرے سانس لو اور سانس روک لو۔'' میں نے زینی سے کہا اور خود بھی گہرے سانس لینے لگا اور پھر پھیپھڑوں میں ممکنہ حد تک ہوا بھر کر میں نے زینی سمیت پانی میں غوطہ لگایا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم پل کے دوسری طرف نکلنے تو پانی کے اندر تھے۔ مگر فوراً ہی ہمارے آس پاس گولیاں برسنے لگی تھیں۔ فائرنگ کی آواز تو نہیں آ رہی تھی مگر جب گولی پانی میں اترتی تو مرغولے دار لکیر سی کھنچ جاتی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ مزید نیچے جاؤں۔ زینی تیزی سے سانس خارج کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے مسلسل بلبلے نکل رہے تھے۔ جب

کہ میں نے اپنی سانس اب تک روک رکھی تھی۔ ہمیں پانی میں آئے ہوئے دو منٹ ہو گئے تھے اور زینی نے اپنی سانس مکمل خارج کر دی تھی اب وہ سطح پر جانے اور سانس لینے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی مگر گولیاں ہمارے آس پاس گر رہی تھیں یعنی ہم فائرنگ کی زد میں تھے۔ اس لیے میں زینی کو اوپر جانے سے روک رہا تھا۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ وہ پانی پی لے گی اس لیے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما لیا۔ وہ سانس کے لیے مچلنے لگی۔ مگر میں اس کا منہ نہیں چھوڑ سکتا تھا ورنہ پانی اس کے پھیپھڑوں میں چلا جاتا اور اس کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ تیسرے منٹ تک ہم پل سے اتنا دور نکل گئے تھے کہ اب گولیاں ہم تک نہیں آ رہی تھیں۔ اس لیے میں نے اوپر آنا مناسب سمجھا۔ زینی نے مچلنا بند کر دیا تھا اور اب ڈھیلے انداز میں تیر رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں نے دیوانہ وار سانس لیے اور پھر زینی کو ہلایا۔ مگر اس کا سانس رکا ہوا تھا۔

''اسے سانس لو۔'' میں نے اسے جھنجوڑا۔ مگر وہ ساکت رہی۔ مجبوراً میں نے اسے گھما کر سامنے کیا اور پہلے اس کے منہ سے منہ ملا کر اس کے پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور پھر اس کے سینے پر مکے مارے۔ نسوانی جسم کے نازک حصے پر یہ ضرب خاصی سخت تھی مگر مجبوری تھی۔ ایک بار مکے مارنے پر وہ بے حس رہی۔ مگر دوسری بار یہ عمل کرنے پر اس نے کھانس کر سانس لی اور پھر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس کا سر پانی سے باہر رکھا کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھی کہ از خود تیر سکتی۔ اس دوران میں ہم دریا میں بہتے جا رہے تھے اور مجھے اردگرد کی خبر نہیں تھی۔ زینی کے سانس لینے کے بعد میں نے آس پاس دیکھا تو پل پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد زینی نے آنکھیں کھول دیں اور آس پاس دیکھا۔

''ہم کہاں ہیں؟''

میں نے اسے آگاہ کیا ''پل سے آگے نکل آئے ہیں دھارے کے ساتھ جا رہے ہیں۔''

''ہم دوبارہ قصبے کی طرف جا رہے ہیں۔'' وہ مضطرب ہو گئی۔ ''ہمیں کنارے پر جانا ہے۔''

وہ رہ رہ کر کھانس رہی تھی اور میرے مکوں سے یقیناً اسے تکلیف پہنچی تھی۔ قصبے کے پاس دریا کا پاٹ چوڑا اور دھارا سست ہو گیا تھا۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا تو دور ایک گاڑی ہائی وے پر نظر آئی مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے پل پر دیکھی تھی۔ پھر ہائی وے دریا

سے دور ہونے لگی اور گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ زینی نے کہا۔ ''چلو ہمیں اس کنارے چلنا ہے۔''

''اس طرف دشمن ہے۔''

''اسی لیے تو اس طرف جانا چاہیے وہ سمجھے گا کہ ہم قصبے کی طرف جائیں گے۔''

اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں صرف منطقی اعتراض کرسکتا تھا اگر زینی کوئی بات کہہ دیتی تو اسے لازمی تسلیم کرتا چاہے وہ عقل و منطق کے بالکل ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کے ساتھ مخالف کنارے کی طرف تیرنا شروع کردیا۔ دریا کا پاٹ چوڑا ہوا تھا مگر اس کی تندی ختم ہوگئی تھی اور اب ہم آرام سے تیر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم کنارے پہنچے۔ میں اوپر چڑھا اور پھر زینی کو بھی کھینچا۔ میں بھی ہانپ رہا تھا مگر اس کی حالت بری تھی۔ وہ دیوانہ وار سانس لے رہی تھی اور بالکل ڈھیر ہوگئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا اور پھر اس سے کہا۔ ''ان جھاڑیوں تک چلو یہاں دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہے۔''

''میں نہیں جاسکتی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم مجھے لے چلو۔''

میں اٹھا اور اسے سہارا دے کر ان جھاڑیوں تک لے آیا۔ اس نے اپنا بیگ اتارا اور اس کی زپ کھولی تو اندر سب خشک تھا گویا یہ واٹر پروف بیگ تھا۔ اس نے اندر سے ایک میڈیکل پیک نکالا اور اس میں موجود چھوٹا سا انجکشن نکال کر اپنے دائیں بازو میں انجکٹ کردیا۔ اس کی رنگت نیلی ہورہی تھی اور وہ کھانس کھانس کر سانس لے رہی تھی مگر یہ انجکشن لگنے کے ایک منٹ بعد اس کی رنگت بحال ہونے لگی اور اس کی سانس بھی ہموار ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میڈیکل پیک میں اور بھی کئی انجکشن اور دوائیاں تھیں۔ مگر اس نے صرف وہی انجکشن لے کر پیک بند کیا اور اسے واپس بیگ میں رکھ لیا۔ حالت ٹھیک ہوتے ہی اس نے اٹھ کر اپنی جیکٹ اتاری۔ پھر شرٹ کے بٹن کھولنے لگی تو میں نے منہ پھیر لیا۔ وہ رکی اور اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اے میری طرف دیکھو۔''

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ بٹن کھولنے لگی تھی۔ اس نے شرٹ اتار دی۔ اس کے نیچے زیر جامہ تھا۔ پھر اس نے اپنی بھاری.... اور کسی ہوئی پتلون کسی قدر دقت سے اتاری۔ بھیگ کر وہ اور چست رہی تھی۔ نیچے بھی زیر جامہ تھا اور اب وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں تھی۔ مگر میں تو اسے اس سے بھی زیادہ کھلے ڈلے

حلیے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرے اسے یوں دیکھ کر بھی مجھے کوئی احساس نہیں ہوا جب کہ میں پہلے سنسنا گیا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے نچوڑے اور پھر ان کو جھٹک کر ممکنہ حد تک پانی نکال دیا۔ وہ بلاشبہ نہایت حسین عورت تھی۔ بعض عورتوں کے نقوش حسین ہوتے ہیں اور بعض جسمانی لحاظ سے جاذب نظر ہوتی ہیں۔ مگر زینی میں یہ دونوں خصوصیات تھیں۔ اس کے نقوش جتنے دل فریب تھے جسمانی زاویے اس سے زیادہ حسین تھے۔ اس نے دوبارہ کپڑے پہن لیے اور مجھ سے کہا۔ ''تم بھی اپنے کپڑے خشک کرلو۔''

میں ایک جھاڑی کی آڑ میں آیا اور لباس اتار کر نچوڑا۔ جوتوں میں پانی بھر گیا تھا انہیں جھٹک کر صاف کیا اور پھر پہن لیے۔ میں جھاڑی سے باہر آیا تو وہ جیکٹ پہن کر بیگ پشت پر باندھ چکی تھی مگر اس نے اسلحہ نکال لیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور پستول اس نے جیکٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا مگر اس نے اب تک اسلحے کے معاملے میں مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس اضافی اسلحہ تھا۔ دریا کے ساتھ ڈھلان تھی دراصل یہ دریا کا ہی حصہ تھا۔ کئی سالوں بعد جب سیلاب آتا ہوگا تو دریا کا پاٹ اوپر ہائی وے کے پاس پہنچ جاتا ہوگا۔ اسی وجہ سے یہاں صرف چھوٹی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ہم اوپر جانے لگے۔ مگر جھاڑیاں زیادہ نہیں تھیں اس سے اوپر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دریا نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں آبپاشی کے لیے پانی آسانی سے مل جاتا تھا۔ اس لیے سیلاب کے خطرے کے باوجود یہاں کاشت کاری کی جارہی تھی۔ ہم اوپر آئے تو ہائی وے پر ویرانی تھی۔ روشنی زیادہ ہوچکی تھی اور سورج کسی لمحے نکل سکتا تھا۔ ہائی وے کے پار بھی دور تک سیڑھی نما کھیت نظر آرہے تھے۔ زینی نے ان سے اوپر اشارہ کیا۔

''ہمیں اس طرف جانا ہے۔''

''درمیان میں لوگ مل سکتے ہیں۔''

''لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے ان دشمنوں سے پیچھا چھڑانا ہے۔''

''لوگ ان کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کہاں گئے۔''

''ہمیں ایسی جگہوں سے گزرنا چاہیے جہاں لوگ نہ ہوں۔''

زینی نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سامنے کی بات ہے لیکن اس وقت میری عقل کام نہیں کررہی ہے۔''

''ایسی عقل کا کیا فائدہ جو وقت پر کام نہ آئے۔''
میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔
''کیا مطلب؟''
''کچھ نہیں۔''
''چلو میرے ساتھ۔'' وہ بولی اور ہم ہائی وے کے متوازی چلنے لگے۔ ممکن حد تک آڑ میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زینی کر رہی تھی میں تو اس کے حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد ہم ہائی وے کے ایک ایسے حصے میں تھے جس کے پار دوسری طرف ویران پہاڑ اور کھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے ہائی وے کراس کی اور دوسری طرف پہنچ گئے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا زینی نے بیگ سے ایک نقشہ نکالا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''ہمیں یہاں پہنچنا ہے۔''
''اسد آباد۔'' میں نے غور کیا۔ ''ہم اس وقت کہاں ہیں؟''
''یہاں۔'' اس نے ایک اور جگہ انگلی رکھی۔ یہاں اسمار لکھا تھا۔ گویا اس قصبے کا نام اسمار تھا۔ یہ جگہ پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسمار سے اسد آباد تک وہی ہائی وے جا رہی تھی جو اصل میں پاکستان سے آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔
''لیکن اس علاقے سے ایک ہی ہائی وے جاتی ہے اور تمہارے دشمن تمہیں کہیں بھی روک سکتے ہیں۔''
''ہم پیدل اور ہائی وے سے ہٹ کر سفر کریں گے۔'' اس نے جواب دیا اور نقشہ تہہ کر کے واپس جیکٹ میں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''چلو ہمیں گھوم کر جانے میں بہت وقت لگے گا۔''
''ہم شام تک پہنچ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرف دریا اور سڑک کے ساتھ آبادی ہے۔''
''ہاں اسی وجہ سے مشکل ہو گی۔ مگر ہم دوسروں کی نظروں سے بچ کر سفر کر سکیں گے۔''
ہم چل پڑے۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ مجھے تجسس تک نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور زینی نے اپنے ہی ساتھیوں کو کیوں مروا دیا تھا پھر یہ کون تھے جو اس کے حکم کے غلام بنے ہوئے تھے اور اب اس کے کچھ دشمن بھی نکل آئے تھے جنہوں نے ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ علاقہ نہایت مشکل اور دشوار گزار تھا اس لیے آبادی کے پاس ہونے کے باوجود اسے استعمال میں نہیں لایا جا سکا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے راستے کی دشواری بڑھ رہی تھی مگر یہی دشواری ہمیں پیچھے آنے والوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ مگر اس مشقت سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ یخ پانی میں رہنے سے جسم کی حرارت جو زائل ہو گئی تھی دوبارہ لوٹنے لگی اور ہمارے کپڑے خشک ہونے لگے۔ سورج بلند ہونے کے بعد یہ عمل تیزی سے ہوا تھا اور ایک گھنٹے سے بھی پہلے ہمارے کپڑے خشک ہو گئے تھے۔ بلکہ اب کسی قدر گرمی لگ رہی تھی۔
ہم سیڑھی دار کھیتوں کے اوپر موجود پہاڑی سلسلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جگہ بلندی پر تھی اور یہاں سے برف پوش پہاڑ زیادہ دور نہیں لگ رہے تھے۔ دھوپ خاصی تیز تھی مگر جہاں سائے سے گزرتے تھے خنکی ایک لمحے کو کانپنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ویرانے میں سفر کر رہے تھے۔ تب پہلی بار میں نے اپنے اندر تبدیلی محسوس کی اور مجھے لگا کہ میری کیفیت بدل رہی ہے۔ میرا ذہن جو سن سا تھا اب بہتر ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں زینی کے ساتھ اتنے سکون سے سفر کیوں کر رہا تھا؟ جب کہ وہ مجھے قیدی بنا کر لائی تھی اور مجھے کسی کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر مزید ذیلی سوالات ذہن میں چکرانے لگے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا تھا اور یہاں کس چکر میں تھی؟ مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا یعنی یہ موقع نہیں ملا کہ میں زینی سے چھٹکارے کا سوچتا۔ کیونکہ اچانک زینی رک گئی اور اس نے کہا۔
''وقت ہو گیا ہے۔''
''کس چیز کا؟''
''بیٹھو۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے بیگ سے میڈیکل پیک نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹا انجکشن نکال کر مجھ سے بازو سامنے کرنے کو کہا اور میں نے بازو آگے کیا تب میں نے اس پر نس کی جگہ انجکشن کا نشان دیکھا۔ مجھے پہلے بھی انجکشن لگا تھا اور زینی نے اسی جگہ یہ انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ زرد کا تھا۔ انجکشن لگنے کے چند منٹ تک میرا سر چکراتا رہا۔ زینی نے اس دوران میں مجھے نہیں چھیڑا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے کہا۔ ''اٹھو۔''
میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اگلا حکم دیا۔ ''اس چٹان پر چڑھو اور نیچے کود جاؤ۔''
میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیچے کودنے کی صورت میں میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چٹان کی طرف

بڑھا اور اس پر چڑھ کر گنارے جا رہا تھا کہ عقب سے زینی نے کہا۔ ''رک جاؤ۔''

میں رک گیا تو اس نے حکم دیا۔ ''واپس آجاؤ۔''

میں واپس آ گیا۔ اس دوا نے مجھے اس کا غلام بنا دیا تھا۔ یہی حربہ میں بھارت میں دشمنوں پر استعمال کر چکا تھا اور اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ یعنی زینی نے میرا جوتا میرے ہی سر مارا تھا۔ اگرچہ اب ایسی ادویات کا استعمال کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن میرے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ قہوے میں نیند کی دوا دینے کے بعد مجھے انجکشن دیا گیا تھا بھی جاگنے کے بعد اور موقع ملنے پر بھی میں نے فرار کی کوشش نہیں کی بلکہ زینی کا ساتھ دیتا رہا اور اس کی جان بھی بچائی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے موت کے منہ سے کھینچ لیا تھا۔ ورنہ اس کا سانس تو رک گیا تھا۔ گویا اپنے پاؤں پر میں نے خود کلہاڑی ماری تھی۔ اگر وہ مر جاتی تو اس وقت میں آزاد ہو چکا ہوتا۔ میرے اس طرح روبوٹ بننے پر وہ خوش تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم نے دیکھا کہ میرے اشاروں پر کیسے ناچ رہے ہو؟''

میرے اندر کوئی لہر نہیں اٹھی میں سن کھڑا رہا۔ اس لیے میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے پاس آئی اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور ذرا اچک کر ہونٹ میرے ہونٹوں کے سامنے لے آئی۔ وہ اپنی من مانی کر رہی تھی اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا مگر میں کچھ محسوس بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بھی میرا سپاٹ پن محسوس کر لیا اور کسی قدر جھنجلاہٹ کے ساتھ الگ ہو گئی۔ ''تم بالکل ٹھس ہو گئے ہو میرا ساتھ دو۔''

میں نے ساتھ دیا مگر اسے مزہ نہیں آیا۔ اسی نے ٹھس کیا تھا ورنہ اتنے پاس آنے پر میں با آسانی اس کی گردن مروڑ دیتا۔ اس نے بیگ سے ایک گول دھاتی ڈبا نکالا اور اسے کھول کر اس میں سے ایک درمیانے سائز کا بسکٹ نکالا اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ پھر اسے حلق سے اتارنے کے لیے اس نے پانی کا سہارا لیا۔ اس نے ایسا ہی ایک بسکٹ مجھے بھی دیا۔ میں نے اس بدمزہ بسکٹ کو بڑی مشکل سے پانی کی مدد سے نیچے کیا۔ مگر اسے کھاتے ہی مجھے لگا جیسے میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہو۔ زینی بولی۔ ''یہ ہائی پروٹین بسکٹ ہے سمجھ لو ایک بسکٹ میں ایک وقت کے کھانے کی مکمل غذائیت ہوتی ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے لگ رہا ہے میں نے اچھی طرح کھایا ہو۔''

بیسویں صدی میں جینیاتی انجینئرنگ کی بنیاد رکھی گئی اسی صدی کے دوران انسان نے خلاؤں کو مسخر کیا' چاند پر پہلا قدم رکھا اور مریخ کی طرف قدم بڑھائے۔ مواصلاتی سیاروں نے دنیا کے فاصلوں کو مٹا ڈالا۔ کمپیوٹر اور سپر کمپیوٹر کی ایجاد نے حیات انسانی کو ترقی کی ایک نئی شاہراہ پر لا کھڑا کیا۔ کیا طب ہو یا کیمیا' طبیعیات ہو یا حیاتیات' فلکیات ہو یا ارضیات' زمین سے آسمان تک' سطح زمین سے تہ زمین تک ہر جگہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے نقش ستاروں جیسے دمکتے نظر آتے ہیں۔ جوہری ٹیکنالوجی ہو یا انفراریڈ ٹیکنالوجی' کمپیوٹر ٹیکنالوجی ہو یا بائیوٹیکنالوجی' سب ہی بیسویں صدی میں انسانی فہم وفراست کی عظمت کی دلیلیں ہیں۔

''بس اب چلو۔'' وہ کھڑی ہو گئی مگر اس بار اس نے بیگ مجھے تھما دیا اور میں نے اسے پشت پر باندھ لیا۔ یہاں ڈھلان اترنی تھی اور زینی نے دو عدد لکڑیاں تلاش کیں جن سے ہم اسٹک کا کام لے سکتے تھے۔ سہارے کے بغیر اترنا مشکل کام تھا۔ اسٹک سے یہ آسان ہو گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور اس کی تپش اب بڑھ گئی تھی۔ خاص طور سے سر جیسے براہ راست حرارت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنا رومال سر پر باندھ لیا۔ زینی کے پاس ڈھیلی اونی ٹوپی تھی اس نے وہی پہن لی۔ اگرچہ یہ گرم تھی مگر فی الحال دھوپ سے بچا رہی تھی۔ بلندی پر پانی نہیں تھا اس لیے ہمیں اسی بوتل پر گزارا کرنا تھا۔ دوپہر تک جب کہیں پانی نہیں ملا تو زینی بوتل خود استعمال کرنے لگی۔ اس نے مجھے پانی دینا بند کر دیا۔ ایک گھنٹے میں میرا حلق خشک ہو گیا اور اس میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔ یہاں گرمی سے زیادہ خشکی تھی جس نے پیاس کو ذرا سی دیر میں شدید کر دیا تھا۔ جب میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو میں نے اس سے پانی مانگا۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔''

''ابھی تمہیں پانی نہیں ملے گا۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''تب میں پانی کہاں سے لوں؟''

''دیکھو شاید راستے میں کوئی ندی یا نالا آئے گا تو پی

لینا۔“

ہم نے سفر جاری رکھا تھا مگر ہر گزرتے لمحے پیاس کی شدت بڑھ رہی تھی اور اگر جسم میں پانی ایک حد سے کم ہو جاتا تو ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت ہو جاتی۔ مجھے چکر آنے لگتے اور نظر دھندلانا شروع کر دیتی۔ مگر فی الحال صرف تشنگی تھی۔ میں چلتے ہوئے ایسی جگہوں پر جھانک رہا تھا جہاں گڑھوں میں گزشتہ بارش کے پانی کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا مگر قسمت کہ بارش کو اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ اگر پانی تھا بھی تو اب خشک ہو چکا تھا۔ ہمارا رخ نیچے کی طرف تھا اور اس کا امکان بڑھ رہا تھا کہ راستے میں کوئی ندی یا نالا مل جائے۔ سہ پہر تک ہم ایک ڈھلان عبور کر کے نیچے پہنچے تو اوپر چڑھائی منتظر تھی۔ بائیں طرف نشیب میں گہرائی تھی میں نے زینی سے کہا۔”اب مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہو رہی ہے وہاں نیچے پانی ہو سکتا ہے۔ مجھے پانی دو یا دہاں تک چلو ورنہ......“

”ورنہ کیا؟“اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مجھے ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت شروع ہو جائے گی اس وقت بھی میرا سر ہلکا سا چکرا رہا ہے۔“

اس نے سوچا اور سر ہلا کر پہلے بوتل میری طرف بڑھائی۔”اس سے دو گھونٹ لے لو۔“

میں نے دو گھونٹ لے کر بوتل اسے واپس کی اور اب میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ زینی میرے ساتھ اس نشیب کی طرف بڑھی۔ یہاں سبزہ گہرے رنگ کا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ یہاں پودوں کو زیادہ پانی ملتا تھا۔ پہاڑی علاقے پانی کے لحاظ سے صحرا سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے ہیں یعنی ان کی زمین میں پانی زیادہ دیر نہیں ٹکتا ہے۔ اس لیے پودوں کو اپنے پاس پانی محفوظ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ پہاڑوں میں بارش کہیں زیادہ ہوتی ہے اور پھر برف بھی پگھلتی ہے۔ اس لیے یہاں ہریالی پائی جاتی ہے۔ ہم ذرا نیچے آئے تھے کہ پانی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ چشمہ تھا جو زمین سے ابل رہا تھا مگر ایک ہی جگہ محدود تھا۔ میں تیزی سے پانی کی طرف بڑھا۔ پانی شفاف اور نیلگوں رنگ کا تھا اس سے نباتات کی مخصوص مہک آ رہی تھی میں نے ہتھیلی میں لے کر پہلے اسے چکھا اور صرف پانی کا ذائقہ محسوس کر کے ایک بار منہ میں لیا۔ اس بار بھی پانی میں کوئی خرابی محسوس نہیں کی اس لیے چند گھونٹ پی کر دیکھا۔ زینی میرے عقب میں موجود احتیاط پسندی کا مظاہرہ دیکھ رہی تھی اور جھنجلا رہی تھی۔

”اب جلدی کرو۔“

”چشموں کا پانی ایسے ہی نہیں پینا چاہیے۔“ میں نے کہا۔”بعض اوقات اس میں زہریلی معدنیات یا پودوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ پانی ٹھیک ہے۔“

میں نے دل بھر کر پانی پیا اور زینی نے اپنی بوتل بھی بھر لی۔ یہ ڈیڑھ لیٹر کی بوتل تھی۔ بلکہ اسے پانی اتنا اچھا لگا کہ اس نے اپنا پہلے والا پانی پھینک کر چشمے سے پانی بھر لیا۔ اس دوران میں میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے اور اپنا تپ جانے والا سر کچھ دیر کے لیے پانی میں رکھ کر ٹھنڈا کیا۔ اس ٹھنڈک نے مجھے بالکل تر و تازہ کر دیا تھا۔ سیراب ہو کر ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ زینی نے نقشہ نکال کر دیکھا اور روٹ ذرا بدل دیا۔ ہم واپس ڈھلان کی طرف جانے کی بجائے اسی چشمے سے اوپر چڑھنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا۔”اس طرف سے کیوں جا رہے ہیں؟“

”یہ شارٹ کٹ ہے۔“ وہ بولی۔

مگر شارٹ کٹ خاصا طویل ثابت ہوا کیونکہ ترچھا ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں راستہ اتنا زیادہ گھوم رہا تھا کہ اس کی بجائے اگر ہم واپس ڈھلان پر جا کر چڑھتے تو اب تک دوسری طرف پہنچ چکے ہوتے۔ زینی تھک گئی تھی اور میرا حال بھی اچھا نہیں تھا لگاتار تین دن سے پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ جب ہم اوپر پہنچے تو دوسری طرف بھی اتنی ہی مشکل اترائی تھی اور شام سر پر تھی۔ اس اترائی کے بعد ایک وسیع میدان نما پلیٹو دکھائی دے رہی تھی۔ مگر یہ بھی پہاڑوں کے اوپر تھی۔ یہاں دور ہائی وے بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے زینی سے کہا۔”اگر تم نے آج ہی اسد آباد پہنچنا ہے تو ہائی وے تک جانا ہوگا ہم کسی گاڑی میں ہی وہاں تک جا سکتے ہیں۔“

غالباً وہ بھی یہی سوچ رہی تھی اس لیے فوراً مان گئی۔”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں ہائی وے کی طرف جانا چاہیے۔“

اس دشوار ڈھلان سے کسی نہ کسی طرح نیچے آئے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ ہم نے شاید دس کلومیٹرز کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا اور سارا دن گزر گیا تھا۔ میدان سے ہوتے ہوئے ہم ہائی وے کے پاس آئے۔ اس پر ٹریفک گزر رہا تھا مگر اس طرح کہ چند منٹ بعد کوئی گاڑی آتی یا جاتی نظر آتی تھی۔ ہم ہائی وے کے نزدیک آئے تو خود کو چھپانے لگے۔ اس کا امکان تھا کہ پیچھا کرنے والے یہاں بھی ہوں۔ ایک موزوں جگہ ہم نے

قیام کیا۔ یہاں سے ہم ہائی وے پر دونوں طرف نظر رکھ سکتے تھے اور کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ہوا میں خنکی محسوس کی جا سکتی تھی۔ مگر مجھے بھوک لگ رہی تھی عام حالات میں' میں کبھی اپنے دشمن سے اس طرح کھانے کا سوال نہیں کر سکتا تھا مگر میں جس کیفیت میں تھا میں نے آرام سے زینی سے کہہ دیا۔ ''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''کچھ دیر صبر کر لو اگر گاڑی مل گئی تو ہم کھانا بھی کھا سکیں گے۔ یہ انرجی بسکٹ ہنگامی حالات کے لیے ہیں۔''

''ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں؟''

''بس کا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم چھوٹی گاڑی والوں پر بھروسا نہیں کر سکتے وہ دشمن بھی ہو سکتے ہیں اور چور ڈاکو بھی۔''

''یہ دشمن کون ہیں؟''

''میں نہیں جانتی مگر اندازہ ہے۔ یہاں کا ایک طاقتور سردار میرے پیچھے پڑ گیا ہے یہ اسی کے آدمی ہیں جو مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔''

''یعنی یہ میرے چکر میں نہیں ہیں؟''

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''یہاں تمہیں کون جانتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے کوئی نکل آئے۔'' میں نے کہا۔ ''یقین سے مت کہو۔''

اس کا منہ بن گیا اس کے خیال میں' میں نے اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''اس طاقتور سردار کو تم سے کیا مطلب ہے؟''

''یہ اس سردار کا بھائی ہے جسے میں نے قتل کیا تھا۔'' وہ بولی۔ ''وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔''

''تم نے شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو کیوں مارا؟''

''وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے بس میں ہوں۔'' زینی کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔ ''اس لیے وہ مجھ سے جیسا چاہے سلوک کر سکتے ہیں۔''

''اگر تم ان سے خوش نہیں تھیں تو ان کے ساتھ کیوں تھیں؟''

''میں اصل میں تمہارے لیے پاکستان گئی تھی۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''وہ سمجھے کہ میں مجبوری میں ان کے ساتھ شامل ہوئی ہوں۔ یہ کام بھی بہ ظاہر میں نے ہی ان کو دلایا تھا۔ میں تم کو لے آئی اور ساتھ ہی ان کو بھی کیفر کردار تک پہنچا دیا۔''

میں نے اس کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ ''میرے لیے کیوں؟''

''کسی کو تمہاری تلاش ہے۔''

''میری تلاش کس کو ہے؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''میں تم کو اس کے پاس لے جانے کی کوشش کر رہی ہوں اگر کامیاب رہی تو تم دیکھ ہی لو گے۔''

''تم نے مجھے انجکشن کس چیز کا لگایا ہے؟''

''شریف بنائے رکھنے کا۔'' وہ ہنسی۔ ''اگر میں تمہیں یہ انجکشن نہ لگاتی تو اس وقت تم میرے قابو میں کہاں ہوتے؟''

میں نے سوچ کر کہا۔ ''ہاں میں بھاگ جاتا۔ آج تک کوئی دشمن مجھے زیادہ دیر قید نہیں رکھ سکا۔''

''تم بہت خطرناک آدمی ہو، مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ آ گئے۔''

''یہ شیر خان اور اس کے ساتھی......''

''انہیں بھول جاؤ۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ گھٹیا درجے کے جرائم پیشہ تھے اور ان کا انجام یہی ہونا تھا۔''

''میں نے شیر خان سے کہا تھا۔''

''تم نے ٹھیک کہا تھا میرے پاس وقت ہوتا تو میں انہیں تڑپا تڑپا کر مارتی۔''

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''دیکھنے میں اتنی ظالم نہیں لگتیں مگر تم نے کیسے آرام سے ان تینوں کو مار دیا۔''

''میں نے قسم کھائی تھی مجھے جب موقع ملا میں انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔''

''یہ چاروں جو ہمارے ساتھ آئے کیا تمہارے پرانے ساتھی ہیں؟''

''نہیں انہیں اس شخص نے ہائر کر کے میری مدد کے لیے بھیجا جس کے لیے میں کام رہی ہوں۔ ورنہ میں ان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔''

''شاید وہ چاروں مارے گئے ہیں۔''

اس نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ ''حملہ آور زیادہ تھے۔ مگر انہیں اسی لیے ہائر کیا گیا تھا۔ ویسے بھی اس ملک میں مرنے مارنے کے سوا اور ہے ہی کیا؟''

''تب تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''صرف اسی کام کے لیے اس کے بعد میں واپس

جار جیا چلی جاؤں گی۔ وہاں میرا خاندان ہے۔"

"تم نے جو وقت گزارا ہے کیا اس کے بعد نارمل زندگی گزار سکو گی؟"

"پتا نہیں۔" اس نے مجھے گھورا۔ "تم کچھ زیادہ ہی بات نہیں کر رہے ہو اس انجکشن کے بعد آدمی چپ رہتا ہے۔ مگر تم ہو کہ بولے جا رہے ہو۔"

"میں زیادہ بولتا ہوں۔" میں نے اعتراف کیا۔ زینی نے سڑک کی طرف دیکھا اور بولی۔

"میرا خیال ہے بس آ گئی ہے۔"

بس اسی سمت سے آرہی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ زینی نے رائفل بیگ میں کر لی اور اب بیگ اپنے قبضے میں لے لیا البتہ اس نے پستول جیکٹ تلے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "آؤ۔"

ہم سڑک پر آئے اور زینی نے خود کو نمایاں کرتے ہوئے بس روکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی بریک لگا دی اور ہمیں بس تک جانا پڑا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور اس میں خواتین اور حضرات کے ساتھ ساتھ چرند پرند بھی تھے۔ بس میں سیٹیں چند ایک تھیں جو وی آئی پی حضرات کے لیے مخصوص تھیں باقی سیٹیں نکال کر جگہ کشادہ کی گئی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ افراد کو ٹھونسا ہوا تھا۔ اندر کا حال دیکھ کر زینی نے آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور ڈرائیور نے فوراً اسے اپنے ساتھ والی نشست پیش کی اور اس پر براجمان کنڈیکٹر کو وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ زینی بیٹھ گئی اور میں دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ آگے جانے کا کوئی چانس ہی نہیں تھا۔ بس آگے بڑھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر پیچھا کرنے والوں میں سے کوئی بس میں ہوا تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ اس سے پہلے بھی ہم پر براہِ راست فائرنگ کی گئی تھی اور اب بھی امکان یہی تھا کہ ہمیں مارنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر شکر ہے بس میں کوئی دشمن نہیں تھا اور ہم آرام سے اسد آباد پہنچ گئے۔

جس جگہ ہم بس پر سوار ہوئے وہاں سے اسد آباد مشکل سے دس بارہ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا اور ڈرائیور تیز رفتاری کا مریض تھا اس نے یہ فاصلہ مشکل سے پندرہ منٹ میں طے کر لیا اور جب اسٹاپ پر ہم اترنے لگے تو ڈرائیور مایوس ہوا تھا کہ اس نے اتنی جلدی کیوں دکھائی مزید کچھ دیر زینی کا ساتھ رہتا۔ زینی نے راستے میں ٹکٹ لے لیے تھے۔ اسد آباد بڑا قصبہ یا چھوٹا شہر ہے اور رات کے وقت بھی یہاں خاصی چہل پہل تھی۔ زینی نے نیچے اترتے ہی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ٹیکسی والا اسے اڑا کر لایا تھا۔ بہ مشکل ہم اس کی زد سے بچے اگر ٹیکسی کے بریک بہت اچھے نہ ہوتے تو وہ ہم پر چڑھ جاتی۔ اس کے بریک تو اچھے ہونے تھے کیونکہ یہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا تھی اور یہاں ٹیکسی کے طور پر کام کر رہی تھی۔ افغانستان میں گاڑیاں اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ کوئی ڈیوٹی، ٹیکس اور رجسٹریشن نہیں ہے اس لیے نہایت سستی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی لگژری گاڑیوں سے ٹیکسی حتیٰ کہ بار برداری کا کام بھی لیا جا رہا تھا۔ اگر انہیں بنانے والی کمپنیاں اپنی گاڑیوں کا استعمال دیکھتیں تو یقیناً صدمے میں آجاتیں۔

کاریں کم نظر آرہی تھیں جب کہ بڑی لگژری فور وہیل ڈرائیوز کی بھرمار تھی۔ بازاروں کی رونق بتا رہی تھی کہ فی الحال یہاں لوگوں کے پاس خاصا پیسا آیا تھا۔ زینی نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو کسی جگہ کا بتایا۔ اس نے سر ہلایا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ عام سی گلیوں اور سڑکوں پر وہ بہت تیز ڈرائیو کر رہا تھا اور یہاں لوگ اس کے عادی تھے کیونکہ کسی نے اسے گالی نہیں دی اور نہ لعنت دکھائی جیسا کہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ شہر دو دریاؤں کے سنگم پر آباد ہے اور اس کا بڑا حصہ جزیرہ نما جگہ پر ہے جس کے تقریباً چاروں طرف پانی بہتا ہے۔ ہم اسی جزیرہ نما حصے میں اترے تھے اور اسی میں کہیں جا رہے تھے۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد ٹیکسی ایک بڑے سے مکان کے سامنے رکی۔ یہ جدید طرز کا اور ماربل سے ڈھکا ہوا مکان تھا۔ یقیناً کسی دولت مند کا تھا۔ فولادی گیٹ پر نہ صرف دو عدد مسلح گارڈز تھے بلکہ مکان کی چھت پر باقاعدہ مورچہ بنا کر اس میں ایل ایم جی نصب کی گئی تھی۔ ہم نیچے اترے تو ایک گارڈ آگے آیا۔

"ادھر کیوں آیا ہے؟"

"رنی شاہ سے کہو زینی آئی ہے۔" زینی نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ گارڈ کچھ دیر اسے نظروں سے ٹٹولتا رہا پھر مڑ کر گیٹ تک گیا اس نے آگے پیغام پہنچایا اور اس نے آگے کسی سے کہا کیونکہ پیغام خاصی دیر میں پہنچا اور نتیجے میں رنی شاہ خود آگیا۔ اس نے والہانہ انداز میں زینی سے ہاتھ ملایا۔

"تم ادھر کب آیا مجھے بتایا ہوتا میں گاڑی بھیجتا۔"

"میرے پاس گاڑی اور آدمی تھے۔" زینی نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "لیکن سب راستے میں رہ گئے۔"

رنی شاہ چونکا۔ "کیا ہوا؟"

"میرا خیال ہے گہرام کے آدمی تھے۔ انہوں نے

اسمار میں ہم پر حملہ کیا۔‘‘
رفی شاہ متفکر ہو گیا۔ ’’گہرام خان...... ان دنوں وہ بہت اونچا اڑ رہا ہے۔‘‘

’’جو جتنا اونچا اڑتا ہے اتنی ہی بلندی سے نیچے گرتا ہے۔‘‘ زینی نے جواب دیا۔ رفی شاہ پہلی بار میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے حاسدانہ لہجے میں پوچھا۔

’’یہ کون ہے؟‘‘

’’ایک قیدی ہے۔‘‘ زینی بولی۔

’’ضیا۔‘‘ رفی شاہ نے کسی کو آواز دی۔ ’’اسے نیچے لے جا کر بند کر دو۔‘‘

’’یہ میرے ساتھ رہے گا۔‘‘ زینی بولی۔ ’’میں اسے ایک لمحے کے لیے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ رفی شاہ کے انداز میں شک آ گیا۔ وہ خش خشی داڑھی اور بھاری جسامت والا پستہ قد شخص تھا اس میں سوائے دولت مندی کے اور کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی عورت اس کی طرف متوجہ ہوتی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ زینی کا نیاز مند تھا اور شاید اس کی دلنواز قربت سے بھی لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھ سے بلاوجہ خار کھا رہا تھا۔ زینی کی بات پر اس نے نہایت کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا۔

’’یہ کیسا قیدی ہے جسے تم ساتھ رکھنا چاہ رہی ہو۔‘‘

’’کیونکہ یہ میرا قیدی ہے۔‘‘ زینی نے ایک ادا سے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ ’’اگر میں اسے آزاد چھوڑ دوں تب بھی یہ کہیں نہیں جائے گا۔‘‘

’’مجھ سے شاعری میں بات مت کرو۔‘‘ رفی شاہ نے لہجہ بدل کر کہا۔ ’’تم جانتی ہو میں صرف ایک زبان جانتا ہوں۔‘‘

زینی نے گہری سانس لی اور اپنے بیگ سے انجکشن نکال کر اسے دکھایا۔ ’’امید ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے، ورنہ یہ اتنا خطرناک آدمی ہے کہ تمہارے یہ آدمی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔‘‘

’’ایسا کون سا سورما پیدا ہو گیا ہے۔‘‘ اس نے حقارت سے کہا۔ واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو افغانی پشتو میں ہو رہی تھی۔ یہ کسی حد تک پاکستانی پشتو سے مختلف ہے لیکن اسی طرح جیسے جنوبی پنجاب کی بولی پوٹھوہار کی پنجابی سے الگ ہے۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ زینی بہت روانی سے بول رہی تھی۔ زینی نے آگے جھک کر کہا۔

’’شہباز ملک کا نام سنا ہے۔‘‘

رفی شاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ’’وہ انڈیا والا۔‘‘

’’پاکستانی۔‘‘ زینی نے تصحیح کی۔ ’’ہاں وہی جس نے انڈیا میں تباہی پھیلائی تھی۔‘‘

رفی شاہ کی آنکھوں میں بدستور شک تھا بس شک کی نوعیت بدل گئی تھی۔ ’’دیکھنے میں تو یہ عام سا آدمی لگ رہا ہے۔‘‘

’’انسان کا کام ہی دھوکا دینا ہے۔‘‘ وہ مسکرائی۔ ہم اندر آئے۔ مکان باہر سے جتنا شاندار تھا اندر سے اس سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔ ہر چیز غیر ملکی اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہاں بجلی تھی اس لیے پورا گھر جگ مگ کر رہا تھا۔ زینی نے اندر آتے ہی بے تکلفی سے کہا۔ ’’اپنے باورچی سے کہو جلد از جلد کھانا بنا دے اور کچھ پینے کو دو۔‘‘

رفی شاہ نے دونوں چیزوں کا کہا۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں شہباز ملک ہوں اس کا رویہ کسی قدر بدل گیا تھا۔ میں اگر اپنی درست کیفیت میں ہوتا تو لازمی حیران ہوتا کہ میری شہرت سرحد پار تک موجود تھی۔ ایک ملازم ام الخبائث کی بوتل اور بلوریں جام ایک شیشے کی ٹرے میں رکھ کر لے آیا اور اس نے سلیقے سے جام بنا کر سب کے سامنے رکھے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’میں نہیں پیتا ہوں۔‘‘

رفی شاہ کی رگ خباثت پھڑکی اور اس نے زینی سے کہا۔ ’’تم تو کہہ رہی تھیں یہ تمہارے قابو میں ہے۔‘‘

’’ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اپنا ماضی بھول گیا۔‘‘

’’لیکن ہے تو تمہارے حکم کا غلام اسے کہو کہ شراب پیے۔‘‘

’’کیا ضرورت ہے جب کہ یہ نہیں پیتا۔‘‘ زینی نے بے پروائی سے کہا اور ایک ہی سانس میں اپنا جام خالی کر دیا۔ وہ بلانوش لگ رہی تھی۔ ورنہ یہ خاصی تیز شراب تھی۔

’’تمہیں پتا تو چلے کہ یہ سچ مچ تمہارے قابو میں ہے یا نہیں۔‘‘

اس کی بات پر زینی نے پہلے اسے گھورا اور پھر مجھے دیکھنے لگی۔ رفی شاہ نے کسی شیطان کی طرح اس کے دل میں وہم ڈال دیا تھا۔ میں کن کیفیت کے باوجود اندر سے عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ مجھے خوف آ رہا تھا کہ اگر زینی نے مجھے شراب پینے کا حکم دیا تو میں کیسے مزاحمت کروں گا جب کہ میں اس کا حکم مانتا آیا تھا اور میں نے ایک بار بھی مزاحمت محسوس نہیں کی تھی۔ مگر پہلی بار میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اس کا حکم نہیں ماننا چاہیے۔ زینی کچھ دیر بعد

بولی۔ ''شہباز پیو۔''

میں نے نفی میں سرہلایا۔ ''تم جانتی ہو میں نہیں پیتا۔''

رفی شاہ نے قہقہہ مارا۔ ''یہ تمہارا حکم ماننے سے انکار کررہا ہے۔''

زینی اب تشویش زدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم میرا حکم ماننے سے انکار کررہے ہو؟''

''تم جو کہتی ہو میں کرتا ہوں۔'' میں نے دفاعی انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن شراب نہیں پی سکتا۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''شہباز ملک یہ جام پیو۔ یہ میرا حکم ہے۔''

میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ بلکہ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اتنی مزاحمت بھی کیسے کی۔ میں تو کسی کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر عمل کررہا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جام اٹھالیا۔ مگر میں اسے منہ کی طرف نہیں لا پارہا تھا۔ میرے اندر سے کوئی منع کررہا تھا کہ میں اس حرام شے کو منہ نہ لگاؤں۔ اسے حلق سے نہ اتاروں۔ رفی شاہ اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ میری ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے زینی نے پھر زور دے کر کہا۔ ''شہباز اسے پی لو۔''

میں بے ساختہ جام منہ کے پاس لے کر آیا اور اس سے اٹھتی کراہیت آمیز بو سے میرا دل متلایا اور میں نے بے ساختہ ہی جھکتے ہوئے ابکائی لی اور الٹی کی پھوار میرے منہ سے نکل کر رفی شاہ تک گئی تھی۔ اس کی شلوار اور قمیص کا دامن داغ دار ہوا اور وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے منہ سے گالی اور زینی کے منہ سے قہقہہ نکلا تھا۔ ابکائی کے لیے جھکا تو جام قالین پر گر گیا تھا۔ رفی شاہ نے پاؤں پٹخ کر اپنے خادم کو پکارا اور خود وہاں سے چلا گیا۔ خادم آیا اور اس نے صورتِ حال کا اندازہ کرکے میری باتھ روم تک رہنمائی کی اور میں نے کلی کرکے منہ دھویا۔ میرے لباس پر جہاں جہاں دھبے آئے تھے۔ ان کو صاف کیا۔ واپس آیا تو خادم نشست گاہ کو صاف کر چکا تھا۔ زینی سکون سے مے نوشی میں مصروف تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تم بہت چالاک ہو، تم نے جان بوجھ کر قے کی ہے۔''

''کوئی اس طرح جان بوجھ کر قے کرسکتا ہے؟''

اس نے شانے اچکائے۔ ''کر بھی سکتا ہے۔''

میرا تو خیال تھا کہ اللہ نے مجھے اس حرام شے سے بچا لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ میری سن کرنے والی کیفیت ختم ہورہی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا اور مجھے زینی اور رفی شاہ پر غصہ آرہا تھا جنہوں نے میرے ساتھ ایسی حرکت کرنے کی کوشش کی۔ شاید قے کرنے سے دوا کا اثر قبل از وقت زائل ہورہا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ایسے انجکشن کا اثر بارہ گھنٹے رہتا تھا اور اس کے بعد دوسرا انجکشن دینا پڑتا تھا۔ زینی نے مجھے دس بجے کے قریب انجکشن دیا تھا۔ لازمی بات ہے رات کا انجکشن بارہ گھنٹے پہلے دیا گیا ہوگا۔ میں نو بجے سے بھی پہلے سو گیا تھا بلکہ دوا کے اثر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت نو بج رہے تھے اور زینی ایک گھنٹے بعد مجھے انجکشن دیتی۔ صبح میں دس بجے بھی سن والی کیفیت میں تھا اور زینی کے احکامات کی پوری طرح تعمیل کررہا تھا۔ مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کسی صورت انجکشن نہیں لینا چاہیے۔ ورنہ میں اس عورت کا غلام بنا رہوں گا۔ واپس آکر میں سعادت مندی سے کھڑا ہوگیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک زینی نے نہیں کہا۔

''کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔''

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے پانی چاہیے۔''

زینی کے اشارے پر خادم پانی لے آیا۔ چند منٹ بعد رفی شاہ آیا اور اس نے کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم اسے پھر شراب پینے کا حکم نہیں دوگی۔''

''میں حکم دوں گی اور یہ مانے گا۔'' زینی نے بے پروائی سے کہا۔ ''لیکن کیا فائدہ تمہارا لباس اور خوب صورت ڈرائنگ روم پھر سے گندہ نہ ہوجائے۔''

''اس کی فکر مت......''

''پلیز۔'' زینی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں یہاں صرف کھانے پینے نہیں آئی ہوں۔''

رفی شاہ چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مجھے بہرصورت کابل پہنچنا ہے۔''

رفی شاہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''موجودہ حالات میں یہ آسان کام نہیں ہے تم جانتی ہو یہاں سے جلال آباد تک گہرام خان کے آدمیوں کی چیک پوسٹیں ہیں۔ ان سے گزرے بغیر کوئی کابل نہیں جاسکتا ہے۔''

''یہ کام تم ممکن بناؤ گے۔'' زینی بولی۔ ''یہ بتاؤ یہاں آس پاس کوئی ائرفیلڈ ہے جہاں چھوٹا طیارہ اتر سکے۔''

رفی شاہ نے اپنی خشخشی داڑھی سہلاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ ''روسیوں کے زمانے کی ایک ائرفیلڈ ہے مگر وہ استعمال نہیں ہوتی ہے۔''

''قابلِ استعمال ہے؟''

''ہاں قابلِ استعمال ہے۔''

''تب کام چل سکتا ہے۔ مجھے اور اسے لینے کابل سے طیارہ آجائے گا۔''

رفی شاہ کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ ''لگتا ہے آج کل تم بھی بہت اونچا اڑ رہی ہو۔''

''میں اپنی بلندی پر ہوں۔'' اس نے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ''سب اس کے لیے ہو رہا ہے۔ یہ اصل آدمی ہے۔''

''طیارہ کیسے منگواؤ گی؟''

''کال کر کے۔'' زینی نے کہا۔ ''مجھے لوکیشن بتاؤ۔''

''یہاں سے دور ہے نقشے پر بتا سکتا ہوں۔'' رفی شاہ نے کہا تو زینی نے نقشہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''اس میں بتاؤ۔''

رفی شاہ نے اسد آباد کے جنوب مشرق میں ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''یہاں ہے مگر یہ بہت چھوٹا ہے۔ روسیوں نے اسے چھوٹے طیاروں اور ہیلی کاپٹرز کی ری فیولنگ کے لیے بنایا تھا۔''

''رات کے وقت لینڈنگ ہو سکتی ہے؟''

''میں معلوم کرتا ہوں۔'' رفی شاہ نے کہا۔ ''اس زمانے میں یہاں کا ایک سابق ایوی ایشن مین میرا جاننے والا ہے۔''

''تم معلوم کرو۔'' زینی بولی اور پھر اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''یقین کرو تم خسارے میں نہیں رہو گے۔''

رفی شاہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''کیسے تم تو چلی جاؤ گی۔''

''فوراً تو نہیں جا رہی ابھی چند گھنٹے یہاں رکوں گی۔'' زینی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا چند گھنٹے کافی نہیں ہیں؟''

''تمہارے ساتھ کے لیے تو چند دن اور ہفتے بھی کم لگتے ہیں۔''

''میں واپس بھی آؤں گی۔'' زینی نے اسے تسلی دی تو وہ اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زینی نے زیرِ لب ایک ایسی گالی دی کہ میرے کان گرم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کر آن کیا اور کسی کو کال کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''مجھے رات دو بجے اس لوکیشن پر چھوٹا طیارہ چاہیے...... ہاں لوکیشن نوٹ کرو۔''

اس نے مخصوص اصطلاحات کے ساتھ لوکیشن نوٹ کرائی۔ یہ ہوا بازی کی زبان تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے واپس بیگ میں رکھ لیا۔ اس وقت خادم وہاں نہیں تھا۔ یہ کام کر کے زینی نے بیگ سے میڈیکل پیک نکالا اور اس میں سے انجکشن برآمد کیا تو میں سمجھ گیا کہ اگلے انجکشن کا وقت آگیا ہے حالانکہ ابھی دس بجنے میں آدھا گھنٹا تھا مگر ہوشیار زینی نے قبل از وقت مجھے انجکشن لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور سرنج پر انگلی مارتے ہوئے بولی۔ ''بازو سامنے کرو۔''

میں نے بازو سامنے کیا اور جیسے ہی اس نے انجکشن کے لیے ہاتھ آگے کیا میں نے اس کا انجکشن والا ہاتھ پکڑ کر اسے گھمایا اور وہ بل کھا کر بہت آسانی سے میرے بازوؤں کے شکنجے میں آگئی۔ اس کا ہاتھ میں نے پکڑا ہوا تھا اور انجکشن کی سوئی اب اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما ہوا تھا اور اس کے مچلتے جسم کو میں نے ایک پاؤں سے قابو کیا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ''ہماری زبان میں ایک محاورہ ہے آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ اس کے علاوہ بھی بیشمار محاورے ہیں مگر فی الحال یہ بھی کافی ہے۔''

میں نے کہتے ہوئے انجکشن کی سوئی اس کی گردن میں داخل کر دی۔ وہ تڑپی تھی لیکن مجھے پسٹن دبانے سے نہیں روک سکی تھی۔ دوا اس کی گردن میں اتر گئی۔ گردن میں گوشت میں لگنے والا انجکشن بھی تقریباً نرو کے انجکشن کی طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ انجکشن لگنے کے بعد بھی وہ مزاحمت کرتی رہی اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح آس پاس موجود افراد کو متوجہ کر لے مگر اس کی بدقسمتی اور میری خوش قسمتی کہ اس دوران میں کوئی نہیں آیا تھا۔ جب اس نے مزاحمت ترک کی تو میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس کے باوجود میں پوری طرح ہوشیار تھا اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر اسے دوبارہ دبوچ سکتا تھا۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں سپاٹ پن آگیا تھا اور وہ یوں پلکیں جھپک رہی تھی جیسے الو کو تیز روشنی میں بٹھا دیا جائے۔

میں نے میڈیکل پیک واپس زینی کے بیگ میں رکھا۔ اس میں سے پستول نکال کر اپنی قمیض کے نیچے پتلون میں اڑسا اور واپس اپنی جگہ آگیا۔ اب بہ ظاہر سب پہلے جیسا تھا مگر رفی شاہ اینڈ کمپنی کو قطعی خبر نہیں تھی کہ بازی پلٹ گئی تھی اب جو صیاد تھا وہ قیدی بن گیا تھا اور جو بہ ظاہر قیدی ہے وہ صیاد بن چکا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد میں نے زینی سے کہا۔

''تم بالکل نارمل رہو گی اور ابھی جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کسی سے نہیں کہو گی۔''

''میں کسی سے نہیں کہوں گی۔'' زینی نے کہا اور اسی

لیے رفی شاہ وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی مسرور لہجے میں کہا۔

"کام ہو گیا ہے۔ میرے آدمی زمین گل کا کہنا ہے کہ رن وے اس قابل ہے کہ اس پر طیارہ اتر سکے اور وہاں روسیوں نے زیر زمین سیٹ اپ لگایا تھا وہ بھی موجود ہے۔ اگر وہاں موجود بجلی کا نظام کام کر رہا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے رن وے لائٹس آن کرنے کے لیے جنریٹر لے جانا پڑے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ جنریٹر کا بندوبست کرے۔ کیونکہ بیس پچیس سال سے بند پڑا سسٹم کہاں کام کرے گا؟ ویسے تمہیں کب جانا ہے؟" سوال کرتے ہوئے رفی شاہ کی آنکھیں گدھ نما ہو گئی تھیں جیسے اسے گوشت نظر آ گیا ہو۔

"رات دو بجے۔" زینی نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ نارمل تھا۔

"کافی وقت ہے۔" رفی شاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ "یہاں سے مشکل سے آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہے۔"

"دو بجے طیارہ وہاں پہنچ جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں وہ کچھ دیر انتظار کر لے گا۔ ویسے زمین گل وہاں پہنچ جائے گا۔ انتظام تو اسے ہی کرنا ہے۔ آؤ کھانا لگ گیا ہے۔"

شاندار ڈائننگ روم میں بڑی سی میز پر کھانا لگایا جا چکا تھا اور نہایت پر تکلف تھا۔ اس میں افغانی پلاؤ تھا۔ بکرے کی بجی تھی جو ظاہر ہے کہ ہماری آمد سے پہلے بن رہی تھی اور کباب تھے۔ یہ خاص ڈشیں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ چل چل کر معدے کی چکی بھی تیز ہو گئی تھی اور مجھے کئی دن سے ڈھنگ کا کھانا نصیب نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر کھایا۔ البتہ سیر ہوتے ہی ہاتھ روک لیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ معدے کی گرانی مجھے سست کر دے اور کسی موقع پر بازی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ کھانے کے بعد میٹھا آیا جو نہایت میٹھا تھا اس لیے میں نے صرف چکھا البتہ خاص ہاضم قہوے کی کئی پیالیاں خالی کر گیا تھا۔ رفی شاہ نے کسی رغبت سے نہیں کھایا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بھی بنت انگور سے دور ہونے کو تیار نہیں تھا اور یقیناً زینی کے لیے بے تاب تھا کہ وہ کب اپنا وعدہ وفا کرتی ہے۔

اگرچہ زینی کوئی پاکباز عورت نہیں تھی اور نہ ہی اسے اپنی عزت کی پروا تھی وہ اسے سکہ رائج الوقت سمجھنے والی عورتوں میں سے تھی اس لیے اگر وہ رفی شاہ کے بیڈروم سے ہو آتی تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میرے ضمیر کو گوارہ نہیں تھا کہ ایک عورت جو اصل میں اب میرے قبضے میں تھی میں اسے اپنی آزادی کے لیے یوں استعمال کروں۔ رفی شاہ بے خبر تھا کہ اصل بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ زینی سے چلنے کو کہتا تو وہ تیار ہو جاتی کیونکہ میں نے ہی اسے حالات کو نارمل ظاہر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اگر میں رکاوٹ بنتا تو راز فاش ہو جاتا کہ اب میں زینی کا معمول نہیں ہوں اور پھر مجھے رفی شاہ سمیت اس کے بہت سارے مسلح گرگوں سے نمٹنا پڑتا جو بالکل بھی آسان کام نہیں تھا۔ جب میں نے زینی کو قابو کیا تو مجھے خود کو اس کام پر آمادہ کرنا پڑا تھا کیونکہ دوا کا کچھ اثر باقی تھا۔ البتہ کھانے کے بعد میں خود کو بالکل نارمل محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور سے سیاہ تلخ قہوے نے دوا کا رہا سہا اثر بھی ختم کر دیا تھا۔ اب میں چاک و چوبند تھا۔ گیارہ بجے تک طعام ختم ہو چکا تھا اور رفی شاہ نشے میں خاصا دھت ہو گیا تھا۔ اس نے زینی سے کہا۔

"اب مجھے اور مت تڑپاؤ۔"

وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم یہیں رکو گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "زینی نے کہا ہے میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں۔"

"ہاں میں نے اس سے یہی کہا ہے۔" وہ فرمانبرداری سے بولی مگر رفی شاہ نہیں سمجھ سکا تھا اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"تو کیا اسے میرے بیڈروم میں بھی لے جاؤ گی۔"

"نہیں جناب میں باہر رکوں گا۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے نا زینی؟"

بہ ظاہر یہ سوال تھا مگر درحقیقت حکم تھا اور زینی اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ "ہاں یہ باہر رک جائے گا۔"

رفی شاہ کا بس چلتا تو وہ مجھے اپنے محل نما گھر سے باہر پھکوا دیتا۔ مگر وہ زینی کی وجہ سے مجبور تھا اور اس نے سوچا کہ کہیں وہ پورے کے چکر میں آدھی سے بھی نہ جائے۔ اس لیے بادل ناخواستہ مان گیا۔ "ٹھیک ہے یہ باہر رہے گا۔"

وہ ہمیں لے کر اپنے خاص حصے میں آیا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ وہاں صرف عورتیں اور لڑکیاں تھیں اور وہ سب نہایت کھلے ڈلے حلیے میں تھیں۔ ظاہر ہے یہ اس کا حرم تھا مگر وہ اس رفی شاہ کا حرم نہیں تھیں ورنہ وہ انہیں اس حلیے

میں کسی اجنبی کے سامنے آنے کی اجازت کیسے دیتا۔ یہ آج کے جدید دور میں انسانی غلامی کی بدترین صورت تھی۔ وہ مجبور عورتیں تھیں جو اس طاقتور اور دولت مند شخص کے قبضے میں تھیں۔ ان کی صورتوں پر خوف اور بے بسی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی خوشی سے یہاں نہیں تھیں۔ زینی کا بیگ اسی کے پاس تھا اور میں نے یوں نہیں لیا کہ کہیں رفی شاہ کو شک نہ ہو۔ اس گھر کے عام حصے میں صرف مرد ملازم تھے۔ مگر یہاں کوئی مرد ملازم نہیں آسکتا تھا۔ میں بھی زینی کی وجہ سے آگیا تھا۔ جیسے ہی رفی شاہ زینی کو لے کر اندر گیا میں حرکت میں آ گیا۔ میں پستول نکال کر اس طرف آیا جہاں رفی شاہ کے حرم کی عورتیں موجود تھیں ان کی تعداد نصف درجن تھی۔ ان میں سے دو تو نہ ہونے کے برابر لباس میں تھیں اور باقی بھی ناکافی کپڑوں کے ساتھ تھیں۔ یہاں موسم کا اثر نہیں تھا مگر ان عورتوں کو اس حلیے میں رکھنا سوائے نفسانیت کے اور کچھ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔

''شاہ جی نے حکم دیا ہے کہ تم سب ایک کمرے میں چلی جاؤ یہاں خطرہ ہے۔ کمرا اندر سے بند کر لینا۔ جب تک شاہ جی خود آواز نہ دیں باہر مت آنا۔''

وہ بے چاری حکم کی غلام تھیں۔ خطرے کا سن کر سب ہی افراتفری میں ایک کمرے میں جا گھسیں اور کمرا اندر سے بند کر لیا۔ میں نے اطمینان کیا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ پھر میں نے اس حصے میں آنے والا واحد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں واپس رفی شاہ کے بیڈ روم تک آیا تو اندر مجھے عجیب سی آواز آئی ایسا لگا جیسے کوئی خرخرا رہا ہو۔ یہ خراٹے لینے کی آواز بھی نہیں تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے لاک نکلا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ مجھے اُمید تھی کہ رفی شاہ جھنجلائے مگر دروازہ کھول دے گا اور اس کے بعد وہ میرے قابو میں ہوگا۔ جب دروازہ نہیں کھلا اور کوئی آواز بھی نہ آئی تو میں نے پھر دستک دی۔ اب خرخراہٹ کی آواز بھی رک گئی تھی۔ ایک منٹ بعد میں تیسری دستک دینے جا رہا تھا کہ دروازہ جھٹکے سے کھلا اور زینی میرے سامنے اس ہیئت کذائی میں کھڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی اور اس کی شرٹ سامنے سے نہ صرف کھلی بلکہ خون میں بھیگی ہوئی تھی۔

''واؤ۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ کیا؟''

اس نے کچھ بولے بغیر چھری سے اندر اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ چھری معمولی سی تھی اور پھل کاٹنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی مگر زینی نے اس کا استعمال رفی شاہ کی گردن پر کیا تھا۔ وہ بستر پر صرف شلوار میں یوں پڑا تھا کہ اس کے پاؤں نیچے تھے اور دونوں ہاتھ گردن پر جمے ہوئے تھے مگر وہ اس خون کو روکنے میں ناکام رہا تھا جو چھری کے وار کے بعد کٹ جانے والی شہ رگ سے بہہ رہا تھا۔ زیادہ خون بہنے کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میں نے قریب سے اس کا معائنہ کیا اور پھر زینی سے پوچھا۔ ''تم نے اسے کیوں قتل کیا؟''

''میں اس کام کے لیے بھی آئی تھی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''یہ ان درندوں میں سے ہے جنہوں نے میری آبرو لوٹی تھی۔''

میں نے سوال کرنے سے گریز کیا کہ اس کے پاس اس نام کی کوئی چیز بھی تھی؟ یہ ذاتیات میں آجاتا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کی بجائے میں نے کہا۔ ''اپنی شرٹ بند کرو اور جا کر یہ خون صاف کرو۔ ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔''

وہ فرمانبرداری سے بیڈ روم کے ساتھ موجود باتھ روم میں چلی گئی۔ بستر خون سے تر بتر ہو رہا تھا۔ رفی شاہ کے پلے پلائے جسم میں خاصا خون تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگائے بغیر بستر کے دونوں طرف موجود سائیڈ درازوں کی تلاشی لی۔ مجھے کسی ہتھیار کی تلاش تھی۔ اگرچہ زینی والے بیگ میں ایک رائفل بھی تھی مگر ہمیں زیادہ ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ رفی شاہ کے مرنے کے بعد صورتِ حال خراب ہو گئی تھی۔ اگر اس کے آدمیوں کو پتا چل جاتا تھا کہ وہ مارا گیا ہے اور زینی نے مارا ہے تو یہاں سے صحیح سلامت نکلنا محال ہو جاتا۔ اسلحہ مجھے ایک الماری میں ملا۔ اس کے ایک خانے میں جدید ترین ایم سولہ رائفلیں اور ان کا بے شمار ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ چند عدد ہینڈ گرنیڈ اور کچھ اسموک گرنیڈ بھی تھے۔ میں نے دو عدد رائفلیں دستے الگ کر کے بیگ میں رکھ لیں۔ ان کے اضافی میگزین، ہینڈ گرنیڈز اور اسموک گرنیڈز بھی بیگ میں ڈال لیے تھے۔ زینی ابھی تک باتھ روم سے نہیں نکلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے اندر سے کہا۔

''آجاؤ۔''

میرا خیال تھا کہ وہ شاک میں ہوگی اور شاید اب تک خود کو صاف بھی نہ کیا ہو مگر وہ تو مزے سے جھاگ سے بھرے ٹب میں بیٹھی ہوئی خوشبودار گرم پانی کے مزے اٹھا رہی تھی۔ اس نے نشیلی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آؤ تم بھی

آجاؤ بہت مزہ آرہا ہے۔''

میں پہلے ہی لاحول پڑھ چکا تھا۔ اس لیے اسے صرف اتنا کہا۔ ''ابھی رفی شاہ کے آدمیوں کو علم ہو جائے گا کہ وہ جہنم رسید ہو چکا ہے تب زیادہ مزہ آئے گا۔ بہتر ہوگا تم غسل صحت سے جلد فارغ ہو جاؤ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا اور ائر فیلڈ تک بھی جانا ہے۔''

کیونکہ میرا لہجہ تھا اس لیے وہ سنجیدہ ہو گئی اس نے سر ہلایا۔ ''میں بس ابھی آئی۔''

وقت بارہ بجے سے اوپر ہو چکا تھا۔ زینی نے دو بجے کا وقت دیا تھا۔ مگر میرا ایئر فیلڈ تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ طیارے میں بھلا میں کہاں جاتا؟ دوسرے غیر ملکی فوج اور ائر فورسز کے ہوتے ہوئے طیارے میں پرواز نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف میزائل سسٹم تھے جو طیارے کو آسانی سے گرا سکتے تھے۔ اس لیے میرا ارادہ اسی راستے سے واپسی کا تھا جہاں سے زینی مجھے لے کر آئی تھی۔ لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر طیارے کا آپشن بھی برقرار رکھنا تھا۔ میں زینی کے ان دشمنوں کو نہیں بھولا تھا جو اسمار سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور رفی شاہ کا کہنا تھا کہ گہرام نامی اس دشمن سردار کی کابل تک چیک پوسٹیں تھیں۔ میں نے واپس آ کر رفی شاہ کا موبائل تلاش کیا جو اس کی قمیض کی جیب میں مل گیا۔ میں نے اس کی ڈائل ہسٹری میں جا کر دیکھا تو دس بجے سے ذرا پہلے ایک ہی کال کی تھی۔ میں نے وہ نمبر زینی کے موبائل میں نوٹ کر لیا۔ بستر کی ایک سائیڈ دراز میں دو عدد جدید موبائل اور بھی تھے لیکن میں نے ان کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بعض اوقات بلاوجہ کی پنگے بازی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔

اس کام کے لیے زینی کا موبائل کافی تھا۔ البتہ اس سے بیلنس کا پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنا ضرور ہو کہ بہ وقت ضرورت کال کرنے سے مسئلہ نہ ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر بیلنس کافی ہوا تو میں پاکستان کال کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے دوں گا۔ اسلحے کے ساتھ والے خانے میں ایک لاکر نصب تھا اور اس کا تالہ نمبروں سے کھلتا تھا۔ یقیناً اس میں مال و دولت تھی۔ مگر رقم رفی شاہ کے پرس اور سائیڈ دراز سے خاصی مل گئی تھی۔ یہ ڈالرز تھے اور تقریباً دو ہزار کی رقم بنتی تھی۔ وہ میں نے جیب میں رکھ لی۔ اب میں زینی کا انتظار کر رہا تھا پندرہ منٹ بعد وہ یوں باہر آگئی کہ اس نے اوپر صرف تولیہ باندھ رکھا تھا۔ جو بہ مشکل اس کی رانوں تک آرہا تھا۔ میں نے لباس کا پوچھا تو اس نے کہا۔

''وہ خراب ہو گیا ہے میں نہیں پہن سکتی۔''

''تب کیا پہنو گی؟''

''یہاں کپڑے ہوتے ہیں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم نے دیکھا نہیں کتنی عورتیں ہیں یہاں۔''

''تب جلدی کرو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔ وہ باہر چلی گئی۔ دس منٹ بعد واپس آئی تو اس کا منہ بنا ہوا تھا اس نے مقامی طرز کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا اتنے کپڑے میں تو اس کے تین چار سوٹ آرام سے بن سکتے تھے۔ اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہی کپڑے ہیں یہاں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس لباس کے ساتھ بھاگ دوڑ مسئلہ ہو جائے گی۔ ایسا کرو تم اپنی جینز اور اوپر جیکٹ پہن لو شرٹ چھوڑ دو۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا اور باتھ روم چلی گئی۔ واپس آ کر اس نے اپنے گیلے بالوں کی ہی کنگھی کر کے ان کو پونی ٹیل کی صورت دے دی۔ بال خشک کرنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ موسم ہیٹر والا نہیں تھا۔ ورنہ اس سے کام چلایا جاتا۔ دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود اس کی فطرت نہیں بدلی تھی اس نے جان بوجھ کر جیکٹ کی زپ خاصی نیچے کی ہوئی تھی اور اس کا گلابی بدن جھلک رہا تھا۔ میں نے زپ اوپر کرنے کو کہا۔ وہ بولی۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس سے پتا چل رہا ہے کہ تم نے اندر شرٹ نہیں پہنی ہے۔'' میں نے سمجھایا تو اس نے با دل ناخواستہ زپ اوپر کر لی۔ میں نے بیلنس کے بارے میں پوچھا۔

''پتا نہیں مجھے یہ سیل دیا گیا تھا یہ نہیں بتایا تھا کہ اس میں بیلنس کتنا ہے۔''

میں نے سوچا کہ ایک بار یہاں سے نکل جائیں پھر میں موبائل استعمال کر سکوں گا۔ ایک بجے ہم باہر نکلے۔ میں نے زینی والی رائفل اپنے شانے پر ٹانگ لی تھی۔ رفی شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بٹن دبا کر لاک کر دیا اب یہ صرف چابی سے کھل سکتا تھا۔ یہی سلوک ہم نے باہر والے دروازے کے ساتھ کیا اور باہر آئے تو ایک خادم موجود تھا۔ زینی نے اس سے کہا۔

''ہمیں گاڑی چاہیے۔''

''گاڑی۔'' اس نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ کہا۔ ''پر وہ تو شاہ جی کے کہنے پر مل سکتی ہے۔''

''میں اس کے بیڈ روم سے آرہی ہوں۔'' زینی نے واہیات انداز میں کہا۔ ''اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کی گاڑیوں میں سے جو چاہے لے جاؤں۔ کیا میں اسے اٹھاؤں کہ وہ تمہیں بھی کہہ دے؟''

خادم ڈر گیا کہ مکمل کرمیاشی کے بعد اس وقت رفی شاہ مکمل آرام کے موڈ میں ہوگا اور اس میں خلل اندازی کے نہ جانے کیا نتائج نکلیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''شاہ جی نے آپ سے کہہ دیا تو ٹھیک ہے۔''

ہم باہر آئے جہاں پورچ میں کئی طرح کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور یہ سب اعلیٰ درجے کی لگژری گاڑیاں تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی فور وہیل ڈرائیو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا طاقتور انجن اسے ناہموار راستوں پر بھی بہت تیزی سے دوڑا سکتا تھا۔ ہمارے کام کے لیے یہ موزوں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس میں جتنی دور جاسکا جاؤں گا اور اس کے بعد باقی فاصلہ پیدل بھی طے کیا جاسکتا تھا۔ چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی اور ٹینک فل تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور زینی میرے برابر میں آگئی۔ اس نے اسلحے والا بیگ عقبی نشست پر ڈال دیا تھا۔ میں نے رائفل پیروں کے پاس رکھ لی۔ خادم کے اشارے پر گارڈز نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی باہر نکالی تھی کہ اچانک ایک طرف سے دو تیز رفتار گاڑیاں نمودار ہوئیں اور تیزی سے اسی طرف آنے لگیں۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے گاڑی کا رخ ان کے مخالف سمت میں موڑ دیا۔ زینی نے بھی خطرہ بھانپ لیا تھا اس نے مڑ کر دیکھا اور تشویش سے بولی۔

''یہ کون ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے کہا تھا کہ عقب سے فائرنگ کا شور بلند ہوا۔ اگلی والی گاڑی سے گیٹ پر فائرنگ کی گئی تھی اور یہ کوئی بڑی اور بھاری گن تھی جس کی فائرنگ یادور اور شور بے پناہ تھا۔ یہ گاڑی فائرنگ کے دوران میں رک گئی مگر دوسری اس کے پیچھے سے نکل کر ہمارے پیچھے آنے لگی۔

''سیٹ بیلٹ باندھ لو۔'' میں نے کہا اور اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ زینی نے بھی باندھ لی اور میں نے اسے رائفل اٹھا کر تھما دی۔ ''اسے سنبھال کر رکھنا۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے ایکسی لیٹر دبایا اور تنگ گلیوں میں گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ مگر پیچھے آنے والی گاڑی بہت زیادہ رفتار سے آرہی تھی۔ پانچ منٹ سے پہلے ہم ہائی وے تک پہنچ گئے تھے۔ مگر اس پر آتے ہی بائیں طرف سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہماری طرف آنے لگی تو میں نے اسٹیئرنگ دائیں طرف کاٹا۔ مجھے دائیں طرف ہی جانا تھا مگر دشمن پیچھے آرہا تھا پہلے اس سے چھٹکارا لازمی تھا۔ زینی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرے قابو میں ہے لیکن پھر بھی میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ہم ائرفیلڈ کی طرف نہیں جارہے تھے۔ ائرفیلڈ تک جانے کے لیے اوپر سے ہائی وے سے ایک پل دریائے کنہار پر نکلتا تھا اور اس سے گھوم کر ہم ائرفیلڈ کی طرف جاتے اس لیے اگر زینی سمجھ رہی تھی کہ ہم اسی طرف جارہے تھے تو وہ سمجھنے کے لیے آزاد تھی۔ مگر یہ دواسب سے پہلے انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم کرتی ہے۔

دونوں گاڑیاں ہائی وے پر آگے پیچھے آچکی تھیں اور اب تک میں فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ تنگ گلیوں میں بڑی گاڑی ایک حد سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔ البتہ ہائی وے پر آتے ہی اس کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کی رفتار آزمانے کا موقع ملا تھا اور وہ اب نزدیک آرہی تھی۔ پہلی گاڑی جس نے رفی شاہ کے مکان پر دھاوا بولا تھا اس پر بھاری مشین گن نصب تھی مگر اس گاڑی پر ایسی کوئی گن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے باوجود اس میں موجود افراد کا مسلح ہونا یقینی تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔ ''تیار ہو جاؤ۔ سن روف سے نکل کر جواب دینے کے لیے۔''

''کس بات کا؟'' اس نے پوچھا۔

اسی لمحے عقب سے پہلا برسٹ چلا مگر گولیاں گاڑی کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ گاڑی کی دونوں کھڑکیوں سے دو افراد نمودار ہوئے تھے اور خود کار رائفلوں سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، میں نے کہا۔ ''اس کی بات، جلدی کرو وہ نزدیک آرہے ہیں۔''

زینی نے اٹھ کر سن روف ہٹایا اور سیٹ پر کھڑے ہو کر چھت پر رائفل ٹکاتے ہوئے جوابی برسٹ مارا اور عقبی گاڑی کی رفتار فوری کم ہوگئی اور وہ اب دور ہونے لگی تھی میں نے رفتار میں مزید اضافہ کیا اور اب اسپیڈومیٹر کی سوئی ایک سو بیس کلومیٹرز پر تھی۔ ہائی وے بہت اچھی تھی اور فی الحال سیدھی جارہی تھی اس لیے رفتار بڑھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر رات کے اس پہر ٹریفک بھی نہیں تھا۔ مگر پل کے پاس آتے ہی مجھے مخالف سمت میں ایک وین سڑک پر آڑی کھڑی نظر آئی۔ اس نے راستہ بند کیا ہوا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ ایک گالی نکلی اور میں نے رفتار کم کرتے ہوئے گاڑی پل کی طرف موڑ دی۔ پل کی حد تک سڑک ٹھیک تھی لیکن جب ہم دوسری طرف اترے تو

سڑک نارمل ہو گئی تھی۔ دائیں طرف یہ آبادی میں گم ہو رہی تھی اور اس طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بائیں طرف موڑ دی۔ آگے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے؟ زینی کی فائرنگ سے نہ صرف گاڑی پیچھے ہوئی تھی بلکہ اس میں سے جھانکنے والے افراد بھی اندر چلے گئے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔ ''نقشہ نکال کر دیکھو ہمیں کس طرف جانا چاہیے۔''

وہ اندر آئی اور پیچھے سے بیگ اٹھا کر نقشہ برآمد کیا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ''اسی سڑک پر چلو۔ ہمیں گھوم کر آنا ہوگا سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور اسی پر ائر فیلڈ ہے۔''

اگرچہ میرا ائر فیلڈ کی طرف جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر قدرت اسی طرف لے جا رہی تھی اور طیارے میں فرار ہونا پڑتا تب بھی یہ عقب سے آنے والے دشمنوں سے بہتر تھا۔ نصف کلومیٹر بعد سڑک گھوم کر آبادی کے اوپر سے ہوتی ہوئی دوبارہ دریا کے پاس آنے لگی۔ پیچھے آنے والی گاڑی اس لحاظ سے مشکل میں تھی کہ ناہموار سڑک پر اسے قابو کرنا مشکل تھا۔ اس کا وزن زیادہ تھا اور وہ بے قابو ہو کر الٹ سکتی تھی۔ ہماری گاڑی ہلکی تھی اور اس وجہ سے رفتار کے باوجود اس پر کنٹرول آسان تھا۔ پیچھے آنے والی گاڑی تقریباً تین سو میٹرز دور تھی۔ پہلے برسٹ کے بعد اس کی طرف سے چند ایک برسٹ اور مارے گئے تھے مگر اتنی دوری سے نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور اس سے ایک گرنیڈ نکال کر اس کی پن کھینچی اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ زینی چونکی۔

''یہ کیا تھا؟''

''دیکھو۔'' میں نے عقبی آئینے میں دیکھا اور ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد گرنیڈ دھماکے سے پھٹا اور سڑک کے وسط میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تھا۔ دشمن کی گاڑی اس سے چند گز کی دوری پر تھی۔ دھماکے سے براہِ راست تو اتنا نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس کی شاک ویو نے گاڑی کو ہلایا اور ڈرائیور کے حواس اڑ گئے۔ گاڑی لہراتے ہوئے سڑک سے اتری اور پھر بے قابو ہو کر اس نے قلابازی کھائی اور مزید چند قلابازیوں کے بعد وہ دریا میں جا گری۔ زینی خوشی سے چلائی۔

''شاندار، گرنیڈ کہاں سے آیا؟''

''رفی شاہ کے کمرے سے ملا تھا۔'' میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ دوسری گاڑی پاس آ رہی تھی اور اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک گاڑی اور تھی جو یقیناً وہی وین تھی جس نے پل کے بعد راستہ روکا ہوا تھا۔ اب سڑک دریا کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے ایک طرف کھیت تھے اور اب علاقہ کسی میدان کی طرح ہموار تھا۔ ورنہ یہ سارا علاقہ پہاڑی تھا اور ہموار زمین بہت کم تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہاں ائر فیلڈ بنائی گئی تھی۔ میں نے زینی سے کہا۔ ''اپنے موبائل میں ڈائل پہلا نمبر ملاؤ اور اس پر موجود زمین گل نامی شخص سے بات کرو اس سے کہو کہ ہم ائر فیلڈ کے پاس ہیں کیا طیارہ آ گیا ہے؟''

اس وقت پونے ایک بج رہا تھا۔ زینی نے کال کی اور امین گل سے بات کرنے لگی۔ اس سے بات کر کے مجھے مطلع کیا۔ ''زمین گل نے لائٹس کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ جنریٹر لے آیا ہے، مگر طیارہ ابھی نہیں آیا وہ دو بجے تک آئے گا۔''

''طیارہ نہیں آیا مگر دشمن پیچھے ہیں۔'' میں نے پھر عقب میں دیکھا۔ ''سوال یہ ہے کہ ہمیں اتنی آسانی سے پرواز کی اجازت دے دیں گے؟''

''اس کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ طیارے کے ساتھ میرے آدمی بھی آئیں گے اور وہ ان سے نمٹ لیں گے۔''

میں چونک گیا۔ ''تمہارے آدمی؟ تم نے پہلے نہیں بتایا۔''

''تم نے پوچھا ہی نہیں۔'' وہ سادگی سے بولی

خیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا زینی میرے قابو میں تھی اور میں اس سے کام لے سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم اپنے آدمیوں کو یہی تاثر دو گی کہ میں تمہارے قابو میں ہوں۔''

''میں ایسا ہی کروں گی۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ بل کھاتے دریائے کنہار کے ایک نکلے پہلو کے ساتھ ائر فیلڈ شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے آغاز میں ایک بڑی سی عمارت تھی اور اس کے بعد رن وے تھا۔ عمارت تاریک نظر آ رہی تھی۔ جب ہم اس کے پاس پہنچے تو اس پر اسکول کا بورڈ نظر آیا تھا۔ گویا یہاں اب اسکول تھا جب کہ عمارت کی اصل ساخت بتا رہی تھی کہ یہ فوجی مقاصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ ہم اس کے ساتھ سے ہوتے ہوئے رن وے کی طرف آئے اور اس کے آخری حصے میں موجود دوسری عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ وہاں روشنی نظر آ رہی تھی۔ رن وے تقریباً پانچ سو گز لمبا تھا۔ جو عام پروں والے چھوٹے طیارے کی پرواز اور اترنے کے لیے کافی تھا۔ ایک پک اپ نما گاڑی کے ساتھ دو افراد کھڑے تھے۔ اس کے

پچھلے حصے میں موجود جنریٹر چل رہا تھا اور اس کے ہوز پائپ سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی ان کے ساتھ لے جا کر روکی اور نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"تم میں سے زمین گل کون ہے؟"

دونوں میں سے ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ "میں زمین گل ہوں اور یہ میرا بیٹا امین گل ہے۔"

"دشمن ہمارے پیچھے آرہے ہیں انہوں نے رفی شاہ کے گھر پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت ہم وہاں سے نکل رہے تھے۔ ہم نے ایک گاڑی تباہ کر دی مگر دو پیچھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم مسلح ہو۔"

زمین گل فکرمند ہو گیا۔ "شاہ جی نے ایسا بات تو بتائی نہیں ورنہ اسلحہ لے کر آتے ابھی تو صرف پستول ہے۔"

گویا پستول کوئی چھری چاقو جیسا اسلحہ تھا۔ پتا نہیں وہ کن ہتھیاروں کی صورت میں خود کو مسلح سمجھتے تھے۔ میں نے بیگ سے ایم سولہ رائفلیں نکال کر ان کے حوالے کیں اور پوچھا۔ "انہیں استعمال کر سکتے ہو؟"

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ "ادھر بچہ بچہ ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔"

"تب تیار ہو جاؤ وہ آنے والے ہیں اور ہاں رن وے لائٹس آن کر دو۔"

وہ اپنی گاڑی میں ایک چھوٹا جنریٹر لائے تھے اور اس کی وائرنگ اندر بجلی کی تنصیبات تک پہنچا دی تھیں۔ فی الحال جنریٹر سے صرف عمارت کی روشنیاں جلائی گئی تھیں۔ رن وے کی روشنیاں بند تھیں۔ زمین گل اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر تعاقب میں آنے والی دوسری گاڑی نمودار ہوئی اور ادھر رن وے لائٹس آن ہو گئیں۔ میں نے اور امین گل نے بیک وقت فائر کیے۔ میں نے برسٹ موڈ رکھا تھا مگر زمین نے سنگل موڈ پر فائر کیا اور بہترین نشانہ لگایا تھا کیونکہ گاڑی کی ونڈ اسکرین بکھر گئی تھی۔ گاڑی تیزی سے ریورس ہوئی اور اسکول کی عمارت کے عقب میں چلی گئی۔ وین بھی وہاں آ گئی تھی اور اس سے نکل کر مسلح افراد پھیل رہے تھے۔ مگر وہ اتنے دور تھے کہ ان کا نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح ہم بھی اتنے دور تھے کہ وہ آسانی سے ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

سوا ایک بج رہا تھا اور زینی نے طیارہ دو بجے تک منگوایا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ ٹھیک دو بجے آتا وہ اس سے پہلے بھی آ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ طیارہ آ بھی جائے تو وہ اسے لینڈ کرنے کی اجازت کہاں دیں گے؟ فضا اور رن وے پر اسے نشانہ بنانا بہت آسان ثابت ہوگا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی گنگناہٹ کی آواز آئی اور پھر آواز طیارے کی صورت اختیار کر گئی۔ تاریکی میں اس کی نیچے کی جلتی بجھتی سرخ روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ساخت واضح نہیں تھی لیکن آواز سے یہ چھوٹا طیارہ لگ رہا تھا۔ زینی نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور اسے بتانے لگی کہ نیچے مسلح افراد ہیں اور کس پوزیشن پر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے کال کر رہی تھی کیونکہ اس موبائل کی مدد سے طیارے سے رابطہ تو ممکن نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے کال ختم کی میں نے پوچھا۔

"کسے کال کر رہی تھیں؟"

"کابل میں اپنے آدمی کو۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ طیارے کے پائلٹ کو صورتِ حال سے آگاہ کرے گا۔"

چند لمحے بعد طیارہ جو رن وے کی سیدھ میں آ چکا تھا اچانک بلند ہوا اور گھومتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ ایک چکر لگا کر وہ اوپر سے گزرا تو نیچے سے اس پر مشین گن سے فائرنگ کی گئی مگر طیارے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ رن وے کی روشنیوں کے پاس آیا تو میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔ یہ ایک پروپلر انجن والا چھوٹا طیارہ تھا جس میں چار پانچ افراد کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ کابل میں موجود شخص نے یقیناً پائلٹ سے رابطہ کر کے اسے نیچے موجود خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے نیچے موجود افراد کے خلاف کیسے کارروائی ہوگی؟ مگر جلد مجھے اس کا جواب مل گیا۔ دوسری بار طیارہ گھوم کر اسکول کی عمارت کی سیدھ میں آیا اور دریا کے دوسری طرف سے پرواز کرتا ہوا نزدیک آنے لگا۔ اچانک اس کے پروں کے نیچے سے شعلے سے نکلے اور چند لمحے بعد اسکول کے دوسری طرف دھماکوں کے ساتھ شعلے بلند ہوئے تھے۔

طیارے میں راکٹ پوڈ فٹ تھی۔ جواب میں نیچے موجود افراد نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اپنا کام کر کے طیارہ فوراً اوپر اٹھ گیا تھا اور واپس دوسرے حملے کے لیے جا رہا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ زینی اتنی مطمئن کیوں تھی کہ طیارے میں موجود افراد نیچے موجود دشمن کا بندوبست کر لیں گے۔ اسے معلوم تھا کہ طیارہ مسلح ہوگا۔ شعلوں کا مستقل انعکاس بتا رہا تھا کہ کوئی گاڑی نشانہ بنی تھی اور اب جل رہی تھی۔ نصف کلومیٹر دوری کے باوجود ان لوگوں کی چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ان میں سے کچھ افراتفری میں اسکول کے دوسری طرف نمودار ہوئے۔ میں نے اور امین

گل نے بیک وقت انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ زمین گل کو دشمن سے زیادہ رفی شاہ کی فکر تھی اور وہ بار بار اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا میں نے تنگ آکر کہا۔ ''ہمیں کیا پتا، جب ہم نکلے تب دشمن آیا تھا۔ اب اللہ جانے وہاں کیا ہوا ہے؟''

زیبی نے آہستہ سے انگریزی میں کہا۔ ''تم نے انہیں اسلحہ دے کر اچھا نہیں کیا۔''

''یہ رفی شاہ کے آدمی ہیں لیکن اس وقت ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس لیے تم فکر مت کرو۔''

ہماری طرف سے فائرنگ ہوئی تو ادھر پناہ کے لیے آنے والے مشکل میں پڑ گئے۔ وہ واپس بھاگے تھے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ اسی اثنا میں طیارے سے دوبارہ شیلنگ ہوئی اور شاید دوسری گاڑی بھی نشانہ بن گئی۔ کیونکہ اس بار دھماکے اور شعلے کہیں زیادہ بلند تھے۔ شیلنگ کے بعد طیارہ بلند نہیں ہوا بلکہ اس نے مزید نیچے آتے ہوئے مشین گن سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ گاڑیاں تباہ ہونے کے بعد کام آسان ہو گیا تھا مسلح افراد کے پاس اب بچنے کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔ میں نے زمین گل سے کہا۔ ''ہمیں ان کا ساتھ دینا ہوگا۔''

''وہ کیسے؟'' زمین گل نے پوچھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے کہا اور گاڑی کا گیئر نیوٹرل کر کے اسے آگے دھکیلنے لگا۔ ''تم دونوں میرے دائیں بائیں سے ان لوگوں کو نشانہ بناؤ گے۔''

وہ میری حکمت عملی سمجھ گئے۔ میں درمیان میں رہ کر گاڑی کو دھکا لگا رہا تھا اور وہ میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ خودکار رائفلوں کے لیے پانچ سو میٹرز زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی مار اس سے زیادہ ہوتی ہے مگر پھر گولی خطرناک نہیں رہتی ہے۔ ساڑھے تین سو چار سو میٹرز کا فاصلہ مناسب تھا۔ طیارے کی مشین گن سے بچنے کے لیے دشمن کے نصف درجن آدمی اس طرف آچکے تھے۔ جب ہم ان کے قریب آنے لگے تو ان کو یہاں بھی لالے پڑ گئے۔ چار سو میٹرز کی دوری سے ان دونوں باپ بیٹے نے دو افراد کو نشانہ بنایا تو باقی افراد کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ اندھا دھند گولیاں برساتے ہوئے رن وے کے ساتھ کھلے میدان کی طرف بھاگ نکلے تھے مگر بدقسمتی سے وہ غلط وقت پر آڑ سے نکلے تھے۔ طیارہ پھر چکر کاٹ کر اس طرف آ گیا تھا اور اس نے بھگوڑوں پر مشین گن آزمائی ان میں سے دو اور گرے تھے اور باقی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اب میدان صاف تھا۔

میں گاڑی میں آ گیا۔ میرے ساتھ زمین گل تھا اور امین گل پیچھے آ گیا۔ ہم نے اسکول کی عمارت کے گرد چکر لگایا۔ دونوں گاڑیاں راکٹوں کا نشانہ بن چکی تھیں۔ پائلٹ ماہر نشانے باز بھی تھا اس نے دونوں بار درست جگہ پر راکٹ مارے تھے۔ ہم واپس آئے اور زیبی کو آل کلیئر کا سگنل دیا۔ اس نے پھر اسی شخص کو کال کی اور اس نے پائلٹ کو پیغام بھیجا کہ اب طیارہ لینڈ کر سکتا ہے۔ پائلٹ نے طیارے کو رن وے کی سیدھ میں لا کر نیچے کیا اور بہت آرام سے اتار لیا۔ چند منٹ بعد طیارہ ہمارے پاس آکر رکا اور اس میں سے پائلٹ کے ساتھ ایک شخص اترا تھا۔ یہ چار نشستوں والا طیارہ تھا۔ اترنے والے دونوں افراد سفید فام تھے۔ انہوں نے زیبی اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ زیبی سے ان کا انداز بے تکلفانہ تھا جیسے وہ اسے جانتے ہوں۔ البتہ مجھ سے رکھائی سے ملے تھے۔ میں نے امین گل سے کہا۔ ''جب ہم پرواز کر جائیں تو تم چلے جانا اور اس کا ذکر کسی سے مت کرنا رفی شاہ خود تم سے رابطہ کرے گا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

میں اور زیبی طیارے میں آئے پائلٹ نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے سیٹ سنبھالی اور طیارے کا رخ موڑنے لگا۔ میں پائلٹ کے برابر والی نشست پر تھا کیونکہ زیبی اور دوسرا آدمی مجھ سے پہلے پچھلی نشست پر آ گئے تھے۔ پائلٹ نے ہم سے کہا۔ ''جب تک فلائٹ لیول نہیں ہو جاتی تم لوگوں کو پریشر برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر متلی ہو تو سیٹ کے سائیڈ میں شاپر موجود ہے۔ زیبی نے جواب دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

پائلٹ نے سر ہلایا اور تھروٹل آگے کیا تو طیارہ تیزی سے آگے بڑھا اور رن وے پورا ہونے سے پہلے طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔ طیارے کے آلٹی میٹر کے مطابق یہاں کی بلندی سولہ سو ساٹھ میٹرز تھی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ تین ہزار میٹرز پر پہنچ کر پائلٹ نے طیارہ سیدھا کر لیا۔ انجن کا شور اور کانوں پر آنے والا پریشر کم ہو گیا تھا مگر یہاں کسی مسافر بردار طیارے جیسا آرام دہ ماحول نہیں تھا کیونکہ طیارے میں کیبن پریشر نہیں تھا۔ تین ہزار میٹرز کا مطلب تھا کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی اور یہاں فضائی دباؤ سطح سمندر سے نصف رہ جاتا ہے۔ انجن کا شور تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ زیبی اپنے ساتھ بیٹھے سفید فام سے کیا بات کر رہی تھی مگر وہ دونوں آپس میں محو گفتگو تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے سر خاصے نزدیک آ گئے تھے۔ مشرق

میں اسے برا سمجھا جاتا ہے مگر مغرب میں یہ عام سی بات ہے۔ اجنبی مرد عورت بھی دوران گفتگو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آجاتے ہیں۔

سفید فاموں کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا کیونکہ اب تک اس معاملے میں کوئی سفید فام نظر نہیں آیا تھا۔ پائلٹ اور دوسرا شخص دونوں غیر فوجی تھے۔ افغانستان میں غیر ملکی افواج کے ساتھ بے شمار عام افراد بھی آئے تھے۔ ان میں اکثریت کنٹریکٹرز کی تھی جنھوں نے افغانستان میں مختلف کاموں کے ٹھیکے لیے ہوئے تھے۔ اس لیے بہ ظاہر ان کی موجودگی کوئی خاص تعجب انگیز نہیں تھی۔ طیارہ اڑانے جیسے فنی کام زیادہ تر غیر ملکی کر رہے تھے۔ ان کی خدمات کرائے پر حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے کھٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے جتنی مہارت سے راکٹ جیسا پیچیدہ ہتھیار استعمال کیا تھا اور منٹوں میں زمین پر موجود دو گاڑیاں تباہ کر دی تھیں اس سے لگ رہا تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھے۔ زینی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ دوا کے زیرِ اثر تھی مگر دوسرا تو ایسا نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ زینی کی باتوں سے بھانپ نہ لے کہ جو بہ ظاہر قیدی ہے وہی اصل ماسٹر ہے۔

اسد آباد سے کابل کا فاصلہ سو کلومیٹرز بھی نہیں ہے اور طیارے نے مشکل سے نصف گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیا۔ کابل شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ خاصا بڑا شہر ہے اور سنا ہے کہ اس کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یعنی یہ دارالحکومت ہی نہیں افغانستان کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ دریائے کابل کی وادی میں اس کے دونوں اطراف بسا یہ شہر گزشتہ چار عشروں سے جنگ دیکھ رہا ہے۔ بہ ظاہر روس 1979 میں یہاں وارد ہوا تھا۔ مگر کابل کی جنگ اس سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ان چار عشروں میں یہاں امن اور سکون کا دور بہت کم گزرا اور اس شہر کے باسیوں نے زیادہ تر وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گولوں کے دھماکے سنتے ہی گزارا ہے۔ طیارے نے چکر لگایا اور پائلٹ کنٹرول ٹاور سے ہدایات لے رہا تھا ان ہدایات کی روشنی میں اس نے چکر لگایا اور ایک رن وے پر اتر گیا۔ اترنے کے بعد طیارہ رکا نہیں بلکہ ٹیکسی کرتا ہوا ایک ہینگر میں داخل ہو گیا۔ یہ ہینگر چھوٹے طیاروں کے لیے مخصوص تھا۔

میں نے طیارے کے ذریعے یہاں آکر رسک لیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ائر فیلڈ سے فرار ہونے کے بعد بھی وہ لوگ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ان کا علاقہ تھا اور وہاں سے ہمارا صحیح سلامت نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کابل میں بھی خطرہ تھا مگر میں پاکستانی سفارت خانے میں پناہ لے سکتا تھا اور سفارت خانے کی مدد سے واپس جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی نکلنے کے اور راستے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ یہاں بھی پاکستانی مشکوک سمجھے جاتے ہیں اور انہیں فوری طور پر عسکری تنظیموں یا خفیہ اداروں کا آدمی تصور کر لیا جاتا ہے جیسا کہ انڈیا میں ہوتا ہے اور ان کے ساتھ تقریباً وہی سلوک بھی ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ایسے واقعات بھی سننے میں آئے جب صرف پاکستانی ہونے کے جرم میں یہاں عام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ وہ تاجر تھے یا کمپنیوں کی طرف سے بہ طور لیبر آئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں برسرِ اقتدار طبقہ پاکستانیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہے۔ سرکاری اہل کار عام طور سے پاکستانیوں کے ساتھ دوستانہ رویہ نہیں رکھتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں انڈینز کو یہاں نہ صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ انہیں افغانستان کی تعمیرِ نو میں کروڑوں ڈالرز کے ٹھیکے بھی ملے ہیں۔

افغانستان میں پاکستانیوں کی تعداد شاید دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہو لیکن پاکستان میں کم سے کم پچاس لاکھ افغانی موجود ہیں اور ان میں سے بیشتر نہ صرف پاکستانی شناختی کارڈ بلکہ پاسپورٹ بھی رکھتے ہیں اور اس پر ساری دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ پنڈی جیسے درمیانے شہر میں بہت سے محلے اور بازار ایسے ہیں جہاں صرف افغانی پائے جاتے ہیں اور کھلے عام رہتے ہیں۔ انہیں کوئی صرف اس بنیاد پر کچھ نہیں کہتا کہ وہ افغانی ہیں۔ حالانکہ وہ پاکستان میں پائی جانے والی بیشتر خرابیوں کے ذمے دار ہیں۔ اسلحہ یہ لوگ لائے، منشیات کا پورا کاروبار ان کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے جرائم میں بھی یہ ملوث ہوتے ہیں۔ پنڈی اور اس کے گرد و نواح میں منظم ڈکیتیوں میں افغان گروہ ملوث ہیں جو حاصل ہونے والی رقم کو پھر دہشت گردانہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کے تانے بانے بھی ان ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔

ہمارے ہاں دہشت گردی میں ملوث اکثر افراد کا تعلق بھی پڑوسی ملک سے نکلتا ہے۔ اس کے باوجود افغانیوں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جب کہ افغانستان میں پاکستانیوں کا تاثر شاید انڈیا سے کچھ ہی اچھا ہو۔ آئے دن سرحد کے دوسری طرف سے زبان کے اور عملی گولے برسائے جاتے ہیں۔ ہماری چیک پوسٹوں پر حملہ

ہوتا ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں دہشت گردی میں مطلوب افراد افغانستان میں کھلے عام گھومتے ہیں اور اس کے باوجود لعن طعن ہم پر کی جاتی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی میں استعمال ہونے والا اسلحہ اور بارود افغانستان سے لایا جاتا ہے۔ پڑوسی ملک ہونے کے باوجود ہمارے یہاں اتنے کونسلیٹ نہیں ہیں جتنے کہ انڈیا نے کھول رکھے ہیں اور یہ کونسلیٹ ہماری سلامتی کے خلاف دن رات کام کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر افغانی پاکستان کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ پاکستان کے بہت زیادہ حامی بھی نہیں ہیں۔ عام طور سے ان کا رویہ بھی سرد مہری لیے ہوتا ہے۔

آج میں اسی افغانستان کے دارالحکومت میں تھا جو آج بھی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اگرچہ دنیا کی اکلوتی (فی الحال) سپر پاور یہاں مزید تین درجن سے زیادہ ممالک کے ساتھ براجمان تھی۔ مگر حالات اس کے قابو میں نہیں آرہے تھے اور آنے والے دنوں میں مزید ابتری کی پیشگوئی تھی۔ صرف افغانستان ہی نہیں بلکہ اس خطے کے دوسرے ممالک کے لیے بھی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں جن میں سرِ فہرست وطنِ عزیز ہے۔ مگر یہ وقت سیاست پر غور کرنے کی بجائے ذاتی فکر کرنے کا تھا کہ میں کس طرح جلد از جلد واپس اپنے ملک جا سکتا تھا۔ طیارہ ہینگر میں رک گیا تھا اور اس کا انجن بند ہو گیا تھا مگر پر اب تک گھوم رہا تھا۔ میں نے مڑ کر زینی کی طرف دیکھنا چاہا تھا کہ میری گردن میں کوئی چیز چبھی اور خواب آور سیال میری گردن میں اتر گیا کیونکہ فوراً ہی میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو انجکشن لگانے والی زینی تھی جو مسکرا رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”تم...... یہ کیسے......؟“

”ایسے۔“ اس نے انجکشن کا ایک سیٹ میرے سامنے کیا۔ ”یہ اینٹی ڈوٹ ہے اس کا توڑ...... کیا سمجھے؟“

بے ہوش ہونے سے پہلے میں سمجھ گیا تھا کہ زینی نے دوا کے اثر سے کیسے چھٹکارا پایا تھا۔ اس نے خاموشی سے کسی وقت اینٹی ڈوٹ لے لیا تھا جس نے دوا کا اثر ختم کر دیا اور اس کا اعتماد بحال ہو گیا اس کے بعد بھی وہ یوں بنی رہی جیسے میرے قابو میں ہو اور جب حالات پوری طرح اس کے قابو میں آگئے تو اس نے اصلیت پر آنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ طیارہ رکتے ہی اس نے میری گردن میں بے ہوشی کا انجکشن اتار دیا تھا اور آخری سوچ جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں خوش فہمی میں مارا گیا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک سادہ کمرے میں سادہ لیکن آرام دہ بستر پر تھا اور میرے سر کے عین اوپر ایک پیلی روشنی والا انرجی سیور روشن تھا۔ جاگنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میرا ذہن غنودگی کا شکار رہا اور پھر میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آمدورفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا اور ایک طرف روشن دان نما جالی لگی تھی۔ یہ شاید اے سی کا ڈکٹ تھا۔ میرے جسم پر اب ہلکی کریمی رنگ کی ٹی شرٹ اور اسی رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ پاؤں خالی تھے البتہ بیڈ کے ساتھ میرے جوتے رکھے تھے اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گردن میں جہاں انجکشن لگا تھا وہ جگہ دکھ رہی تھی مگر اس کے علاوہ میں بالکل فٹ فاٹ تھا۔ زینی نے مجھے پھر انجکشن نہیں دیا تھا جو اعتماد ختم کر دیتا ہے کیونکہ میں خود کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں تھی اور ایک حد سے زیادہ ان انجکشنوں کا استعمال خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

میں نہ جانے کہاں تھا کیونکہ آس پاس مکمل سناٹا تھا اور کسی قسم کی معمولی سی آواز بھی نہیں تھی۔ ایک بار پھر میرے اندر بھارتیوں کا خوف سرسرانے لگا کہ کہیں میں ان کے ہاتھ تو نہیں آگیا تھا۔ اگرچہ زینی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی آدمی نے مانگا ہے اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول سکتی تھی اور میں بے بس تھا کہ کسی طرح اس کی بات کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ ایک خیال ڈیوڈ شاکا بھی آ رہا تھا مگر کچھ عرصے پہلے ہی وہ پاکستان میں مجھ سے دست بردار ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے اتنی عجلت میں اور اتنے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ مجھے قبضے میں کرنے کی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اگر کوئی تک تھی تو اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کم سے کم چھ سات گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا اور اس دوران میں مجھے کابل سے کہیں دور بھی لے جایا جا سکتا تھا۔

مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں کابل یا اس کے آس پاس ہی کہیں تھا۔ موسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے دروازہ چیک کیا یہ پلائی کا بنا ہوا مضبوط دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا اور اس کے اندر نہ تو ہینڈل تھا اور نہ ہی کنڈی تھی۔ میں نے دستک دی اور پھر زور سے بجایا مگر دونوں صورتوں میں کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اب میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جب دروازہ کھلے اور صورتِ حال سامنے آئے۔ میں واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کم بختوں نے پانی کی ایک بوتل تک نہیں رکھی تھی اور

اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی۔ میں نے بیڈ کا جائزہ لیا کہ یہ لوہے کا بنا ہوا چھ بائی تین فٹ کا بیڈ تھا جس کے پائے فرش میں پیوست تھے اور اس کے وسط میں ہر چھ انچ کے بعد فولادی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر اسپرنگ میٹرس تھا اور یہ انتظام یقیناً ایک قیدی کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا میں کسی ایسی جگہ تھا جہاں قیدی رکھے جاتے ہیں۔

یہ جان کر میری تشویش میں اضافہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہو گیا تھا مجھے بیدار ہوئے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کسی کو متوجہ کروں کہ دروازہ کھلا اور زینی قیامت بنی ہوئی اندر آئی۔ اس نے جسم سے چپکی ہوئی منی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جسے جدید قسم کا بلاؤز بھی کہا جا سکتا تھا۔ بازو ندارد تھے اور گلا فراخ دلی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ ایک مختصری پٹی کے بعد پیٹ شروع ہو گیا تھا جو ناف سے نیچے تک کسی بھی لباس کی گرفت سے آزاد تھا۔ اس نے جو منی اسکرٹ پہن رکھا تھا اس میں اس کی ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس کا قد مناسب تھا یعنی پانچ پانچ مگر اس نے تین انچ کی ہیل کے ساتھ اس میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ میری توجہ پا کر اس نے خود کو مزید ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ میں نے گہری سانس لی اور کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم میرے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی ہو؟“

”بس اس کھیل کا آخری حصہ شروع ہو گیا ہے۔“ اس نے نارمل انداز میں کھڑے ہوئے کہا۔ ”تم تیار ہو؟“

”کس کام کے لیے؟“

”ناشتے کے لیے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں کھڑا ہوا تو وہ ذرا محتاط ہو گئی اور دروازے کے پاس ہو گئی۔ میں مسکرایا۔

”ڈر رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”حالانکہ میں عورتوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔“

”مجھ جیسی عورتوں کا نہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں اس بوقت انجکشن میسر نہ ہوتا تو تم میری گردن توڑنے میں دیر نہیں لگاتے۔“

وہ مجھے باہر لائی۔ یہ چھوٹی سی عمارت تھی اور یہاں کم سے کم چھ مسلح افراد تھے۔ مجھے واش روم جانے کا موقع ملا اور پھر ریڈی میڈ ناشتا نصیب ہوا۔ زینی نے صرف سیاہ چائے لی تھی۔ اس نے بہت نفاست سے میک اپ کیا ہوا تھا اور اس کی تیاری بتا رہی تھی کہ ہمیں کہیں جانا ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا ہینڈ بیگ تھا مگر اس کی جسامت سے قطع نظر مجھے یقین تھا کہ اس میں کوئی ہتھیار لازمی ہوگا۔ کمرے سے باہر آتے ہی دو افراد مجھ پر مسلط کر دیے گئے تھے اور اس وقت میرے پاس تھے۔ یہ چہرے مہرے سے افغانی ہی لگ رہے تھے۔ زینی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں قبل از وقت انجکشن کے اثر سے کیسے نکلا اسی طرح میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ قوت ارادی ختم ہونے کے بعد بھی اس نے اینٹی ڈوٹ کیسے لیا۔ ہم عام افراد نہیں تھے۔ میں ناشتے کے دوران میں محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کسی چیز میں کوئی الگ سے ذائقہ آ رہا ہے مگر میں ناکام رہا اور ناشتے کے بعد بھی ٹھیک رہا۔ زینی سکون سے انتظار کر رہی تھی جیسے ہی میں نے ہاتھ روکا اس نے کہا۔

”چلو۔“

”کیا تم بذاتِ خود مجھے ہینڈ اوور کرو گی۔“

اس نے میری طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”کاش کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ سکتی۔“

”میں کسی کے پاس رہنے والا شخص نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جلد یہ بات تم اور وہ شخص جان جائے گا جس نے مجھے بلوایا ہے۔“

”میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔“ زینی نے شانے اچکائے۔ ”میں چاہتی ہوں اب تم نارمل رہو لیکن اگر تم نے مزاحمت کی تو مجبوراً تمہیں بے بس کرنا پڑے گا۔“

”میں تعاون کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔“

”کس بات کا اور کیا تم میرے جواب پر یقین کرو گے؟“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا تم مجھے بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی کے حوالے کرنے جا رہی ہو؟“

”نہیں اس شخص کا بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”وہ بھارتی ہے؟“

”نہیں وہ بھارتی بھی نہیں ہے۔“

میں اس کے لہجے اور الفاظ پر غور کر رہا تھا اور مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“

”تب چلو۔“

ہم عمارت سے باہر آئے یہ ایک وسیع احاطے میں بنی ہوئی چھوٹی سی جھونپڑی تھی اور خاص بات یہ تھی کہ وہاں

سارے غیر ملکی نظر آرہے تھے۔ یہ شاید کابل میں غیر ملکیوں کے لیے مخصوص کمپاؤنڈ تھا جہاں وہ محفوظ زندگی گزار رہے تھے۔ یہ عام سویلین لوگ تھے جو زیادہ تر مغربی اور مشرق بعید کے ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ میں ایک بڑی لگژری وین کے پچھلے حصے میں ہوں آیا کہ میری دائیں بائیں دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص بھی مسلح تھا۔ زینی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے ایک شال نما چادر لے لی تھی۔ کابل کی گرد آلود سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم آدھے گھنٹے بعد کابل ائرپورٹ پہنچے جہاں گاڑی براہ راست ایک پرائیویٹ جیٹ ہینگر تک پہنچی۔ یہاں ایک چھوٹا جیٹ طیارہ منتظر تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

''یہ میرے لیے ہے؟''

''بالکل خاص طور سے تمہارے لیے۔''

''ہمیں کہاں جانا ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔ میں بھی نیچے آیا میرے نگران پہلے ہی اتر گئے تھے۔ ان کے ساتھ میں طیارے کی سیڑھیوں تک آیا اور دروازے پر موجود شخص کو دیکھ کر چونکا۔ وہ ڈیوڈ شا کا خاص آدمی کرنل جیمز ہیکسٹر تھا۔ وہ سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر فلٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ تو بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شا نے بلوایا تھا اور وہی میرے لیے اس طرح کے انتظامات کر سکتا تھا۔ میں طیارے میں داخل ہوا۔ میرا خیال تھا کہ زینی وہیں رہ جائے گی مگر وہ بھی طیارے میں آگئی۔ ہم کل تین مسافر تھے اور ایک ائرہوسٹس سمیت عملے کے کل تین افراد تھے۔ دروازہ بند ہوتے اور ہمارے نشستوں پر بیٹھتے ہی طیارے کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور اس نے ہینگر سے نکل کر رن وے پر ٹیکسی شروع کر دی۔ میں اور کرنل آمنے سامنے بیٹھے تھے اور زینی ذرا آگے صوفہ نما نشست پر تھی۔ طیارے میں آتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہوگئی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ یہ پوز بھی خاصا سنسنی خیز تھا مگر فی الحال میری توجہ کرنل پر تھی جو طیارے کی پرواز سے پہلے سگار نوشی میں مصروف تھا۔ جیسے ہی طیارے نے پرواز شروع کی اور بلندی پر آیا سیٹ بیلٹ سائن بجھا اور اس نے سگار جلا لیا۔

''تو ڈیوڈ شا کو پھر میری یاد آگئی؟''

کرنل نے سر ہلایا۔ ''وہ تمہیں کبھی بھولا نہیں۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بائی دی وے ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

''انڈیا۔'' کرنل نے کہا۔

''ڈیوڈ شا وہیں ہے؟''

''ظاہر ہے۔''

معاملات اس طرف جا رہے تھے جہاں میں لے جانا نہیں چاہتا تھا یعنی اس پُراسرار وادی تک۔ مگر میں بے بس تھا۔ میں طیارے میں تھا اور اس کا رخ انڈیا کی طرف تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھولنا چاہی تب پتا چلا کہ وہ نہیں کھل رہی تھی۔ کرنل مسکرایا اور بولا۔ ''صرف دو گھنٹے کا سفر ہے پھر تم آزاد ہوگے۔''

زینی نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور بولی۔ ''اب تم اور ہم آرام سے سفر کر سکیں گے۔''

اگلے دو گھنٹے تک میں اسی طرح بندھا بیٹھا رہا۔ طیارہ اتنی بلندی پر تھا کہ نیچے کچھ نظر نہیں آرہا تھا مگر جب برف پوش پہاڑ نظر آنا شروع ہوئے تو میں چونکا تھا۔ ہم ہمالیہ کے آس پاس تھے۔ پریشر کیبن اور پُرسکون ہموار پرواز کی وجہ سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ طیارہ کس رفتار سے اڑ رہا ہے لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم آواز کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور اتنی رفتار سے وہ دو گھنٹے میں بھارت کے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔ پھر طیارے کی بلندی کم ہونے لگی اور ذرا دیر بعد وہ ایک عام سی ائرفیلڈ پر اتر رہا تھا۔ یہ کوئی پبلک ائرپورٹ نہیں تھا بلکہ شاید نجی یا کلب ائرپورٹ تھا۔ طیارہ اترا اور رک گیا۔ ایک کار طیارے کی طرف آئی اس دوران میں ائرہوسٹس نے دروازہ کھول دیا اور میری سیٹ بیلٹ بھی خود بہ خود کھل گئی۔ میں، زینی اور کرنل نیچے اترے۔ کار کے ساتھ دو افراد تھے اور یہ مقامی تھے۔ انہوں نے دروازے کھولے اور ہم تینوں عقبی نشست پر آگئے۔ زینی مجھ سے لگ کر بیٹھی تھی اور اس نے میرے کان میں کہا۔ ''ہم بس پہنچنے والے ہیں۔''

''اطلاع کا شکریہ۔''

یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا کار ائرکلب سے نکل کر بل کھاتی سڑکوں پر سفر کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی مینشن میں تھے اور کار رکتے ہی میں نے لان میں دھوپ اور ڈرنک سے لطف اندوز ہوتے ڈیوڈ شا کو دیکھ لیا۔ ہم کار سے اتر کر براہ راست اس کی طرف آئے تھے۔ زینی سب سے آگے تھی اور مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی جب وہ لپک کر ڈیوڈ شا کے گلے لگ گئی۔ مگر اس کے کہے الفاظ پر میں اچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''پاپا میں شہباز کو لے آئی ہوں۔''

(جاری ہے)

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

برہان تبسم......سرگودھا

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اذان احمد......لاہور

اسی محاذ پہ مجھ کو شکست ہوتی ہے
میں جب بھی ہارا ہوں اپنی انا سے ہارا ہوں

سندس جمالی......ہالہ نو

اک نظر میں اس نے مجھ سے کرلیے اتنے سوال
میں بھی کیا کرتا کہ بس نظریں جھکا کر رہ گیا

نظیر حسن......سکھر

اب اٹھیں، تنہائی بولی
دس بجے ہیں دفتر جائیں

انیس اچکزئی......پشاور

اسی رنگ کا پھول اس نے چنا
جو ایک رنگ میری وفا میں نہیں

جمیل احمد......حضرو

آج بھی یاد کے دشت کا دامن کیوں گیلا کرجاتی ہیں
آنکھ سے اشکوں کی برساتیں صبح سے پہلے شام کے بعد

نصیر احمد......پشاور

اجنبی لگتا ہے سارا منظر
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ

ناصر ارشد خان......شادی پور

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

(ایم افضل کھرل ننکانہ کا جواب)

عرفانہ مقصود جہلم

بے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

(احمد جاوید ملتان کا جواب)

سیف الف......ملک وال

کیا اس لیے چنوائے تھے تقدیر نے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مہتاب فاطمہ......جہلم

اجنبی لگتا ہے سارا منظر
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ

(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

انیس امام......لاہور

نہ کوئی چارہ نہ حسرت نہ آرزو نہ طلب
قمر کے واسطے بس آپ کی دعا ہے بہت

(شکیل الرحمٰن کھاتاں کا جواب)

نسیم مرزا......لاہور

وجہ رسوائی نہ بن جائے ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کردے کہیں غربت میری

صباحت بتول......لاہور

وقت کا فیصلہ ضروری ہے
مجرموں کو سزا ضروری ہے

جاوید الحسن......مظفر گڑھ

وہ دیکھ شام کے بستر پہ گر گیا سورج
بدن سے پھوٹ رہی ہے تکان کی خوشبو

(منشی محمد عزیز مے لڈن کا جواب)

فدا حسین طوری......پاڑاچنار

یہ راز سمجھ پائے ہیں اب تک کتنے
اسرار کہیں اور کہیں مجرم بھی

کاظم حسن خان......کراچی

یک رنگیوں کے ساتھ وہ رہتا نہ تھا کبھی
بیگانہ تھا کبھی تو وہ تھا آشنا کبھی

(آفتاب احمد نصیر اشرفی لاہور کا جواب)

نگار قریشی........ حیدر آباد

نفسا نفسی کا ایسا عالم ہے
دایاں کھیلے ہے بائیں ہاتھ سے کھیل

(وحید ریاست بھٹی کلر سیداں کا جواب)

نوازش علی........ لاہور

روپ ملتے ہیں خدوخال ملتے ہیں
آدمی نہیں ملتا آدمی کے پیکر میں

نصیر ممتاز........ ساہیوال

رات اک بجھتے ہوئے جگنو نے مجھ سے یہ کہا
پوچھ مت کتنا مجھے بھی روشنی کا شوق تھا

اشرف بھٹی........ سرگودھا

روانی دل کے دریا میں کہاں تھی
محبت نے رواں رکھا ہوا ہے

(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

نوشین ملک........ جہلم

نت نئے خواب کے اشارے ہیں
یہ محبت کے استعارے ہیں

(مہوش سلطان سکھر کا جواب)

محمد فرقان........ ملانکہ سوداگر پورہ

تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا

(آصفہ بتول واہ کینٹ کا جواب)

خوش بخت الرحمٰن........ لاہور

یہ زمیں کانٹوں سے مزین ہوتی تب بھی چلے آتے
پتھروں پہ چل کے تیرے گھر آنے میں دشواری ہے

(نزہت احمد گجرات کا جواب)

قمر الحسن........ ساہیوال

اک بار گلاب عارض و لب کے ترے مہکیں
اک برق تبسم پھر جو چمک جائے تو اچھا

عبدالرحمٰن........ میرب

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ دے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

افتخار حسین........ حامد پور کنور

نہ کر محبت سے اتنی ہی نفرت کہ سبھی کوئی
کہ تجھ کو بھی کوئی ٹوٹ کر چاہتا ہے

(محمد ندیم اختر گلگت کا جواب)

شگفتہ مشتاق........ لاہور

وقت نے وہ خاک اڑائی ہے کہ دل کے دشت میں
قافلے گزرے بھی ہیں مگر نقش پا کوئی نہیں

(عدنان حسین کراچی کا جواب)

ناعمہ تحریم........ کراچی

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

(فرخندہ قاضی لاہور کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن........ لاہور

یہ خام خیالی ہے کہ یہاں تقدیر بنائی جاتی ہے
ہم تو خود تقدیر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں

آصفہ بتول........ جھنگ

یہ مانا ضبط غم میں گریہ و زاری نہ کر پائے
چھپایا گل مگر خوشبو کی پردہ داری نہ کر پائے

(ناصر حسین حیدر آباد کا جواب)

ضیا احمد........ ڈی آئی خان

غم کے دو انداز ہیں وجدان و عرفان
دونوں کی تصویر ہے شاعر کا دیوان

(فدا محمد ورک لاہور کا جواب)

نیاز ملکھانی........ سکھر

جو آتش خاموش سلگتی ہے دلوں میں
اٹھ اٹھ کے اسے اور ہوا دیتی ہیں آنکھیں

(اشفاق احمد ملتان کا جواب)

نازش سحر........ ملتان

لہو کا دریا عبور کرنے کو لازمی ہے جنون لیکن
جو صاحب ہوش بھی تھا تیراک سب سے آگے نکل گیا وہ

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔
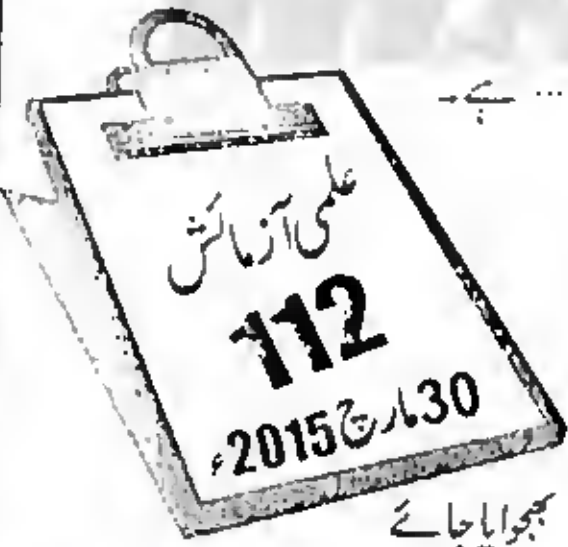
نام:

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2015ء تک علمی آزمائش 112 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 72

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 112

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 مارچ 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

14 فروری کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت اسٹاف کالج کے واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے مگر بعد میں وہ تاریخ پاکستان کے سب سے متنازع کردار قرار دیے گئے۔

علمی آزمائش 110 کا جواب

مولانا غلام رسول مہر 15 اپریل 1895ء میں پھول پور جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کے سن میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ اپنی عمر پر پہنچتے پہنچتے کافی نام پیدا کر لیا اور صحافت کی آبرو کے خطاب سے نوازے گئے۔

انعام یافتگان

1۔ عنایت علی۔ لاڑکانہ 2۔ وسیم باری۔ چنیوٹ 3۔ انعام الحق جادید۔ سکھر
4۔ زاہدہ ادریس۔ میر پور آزاد کشمیر 5۔ نیاز کھوکھر۔ لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نعمان اشرف، رسول بخش بلیجو، ارباب حسین ہارون صدیقی، اسرار احمد، باسط فاروقی، علی زبیر سید، زاہد حیات، نعمت گل، عنبرین احمد، کلیم صدیقی، عنایت گجر، یاسین خان، مختار بٹ، کاوش ارشد، صدف فاطمہ، انعام حیات، خاقان احمد، فرحت عباس نقوی، علی نظیر، نیاز احسن، اکبر حسین، اشرف اللہ خان، نذر حسین، سبطین سید، طفیل احمد، غلام حسن، مولا بخش بٹ، نبیل اختر، الیاس محمد، قیام الدین انصاری، توصیف احمد انصاری، عنایت مسیح، صباحت مرزا،

سہیل احمد کھتری۔ سید توفیق امداد امام رضوی' مسز زبیدہ خاتون' یحییٰ کادوانی' محمد فیضان' نیاز احمد' ثنا اللہ فاروقی' فتح احسان' آس محمد' محسن اختر بلوچ' احمد اعزاز' اختیار الدین صدیقی' سلیم مختار' ثنا بتول' امجد سعید عطاری' عاصم ملک' شکیلہ فاروقی' خالدہ ادریس سلفی' شوکت علی' تسلیم ضیا' کوثر جہاں' آفتاب منصور' ملک غلام علی' سنجیدہ احمد' حسن خان اچکزئی' سید عزیز الدین' پروین کنول' جمیل عثمانی' نعمت مرزا' اختر عباس' اطہر حسین' ثانیہ احسن' امیر الاسلام' زبیر ملک' جبینا کوثر' نوید حسن' زبیر اختر' جاوید اقبال' توقیر حسین، غلام شبر عابدی، خاقان خان، نرجس فاطمہ، وردہ بتول، انیس احمد چاؤلہ، محمد فتح یاب خان اچکزئی، محمد فیضان، محمد سلیم کھوکھر، ہارون محمد، سعید الدین مروت، فہیم بٹ، خواجہ خیر محمد۔ خیر پور سے احمد علی زیدی، نورین اصغر، قیام الدین، ارشاد العصر۔ گجرات سے ذیشان علی سید، محمد طاہر، واثق علی، ارشاد زیدی، نعمان فاروق۔ شادی پور سے احمد علی، نسیم نیازی، ہارون اشرف، نیاز بٹ۔ خانیوال سے ارشد علی، تفسیر حسین، عابد سلطان، عمران حیات خان، ڈی آئی خان سے یاور حسین، زاہد علی، اللہ بخش، سلمان اشرفی۔ ڈی جی خان سے یونس احمد، نذر علی سید، خاقان اشرف، نصیر علی نصیر۔ جھنگ سے نورین ملک، التماس عباس، کائنات فاطمہ، زاہد علی، وقار علی۔ تلہ گنگ سے فصیح الدین، مرزا انعام، کلیم الدین، اختر عباس، توصیف حسین سید۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن، عباس حیدر، نبیل خان، جنید علی صدیقی۔ چنیوٹ سے فتح یاب خان، ماہا زیدی، فرمان علی، صولت حیات، اشرف علی خان، سرگودھا سے محمد یامین، الیاس صادق بٹ، انعام حسین، محمد سلیم الدین۔ حاصل پور سے فرمان الیاس، فرہین، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ لڈن سے انیس احمد، غیاث الدین۔ سیالکوٹ سے شفق شیکی۔ بھکر سے محمد عارف قریشی، نرگس خان۔ میر پور خاص سے نوشین فاطمہ زیدی، علی عباس، حیات محمد، رخسانہ چانڈیو، فرحین رضا، نعمان قائم خانی، شبر حسن۔ تمکین فرحت الاسلام' محمد عاقل' ارشد سلیم' شاہد اسلام خان' غزالہ شاہین' عبدالقیوم شہزاد بھمبھیو' صنوبر جونیجو' فرحت اللہ بھٹو' انجم خورشید' فاضل جتوئی' نعمت جوکھیو' محمد عماد طٰہٰ یاسین' نسرین اشرف' نزہت پروین' زینب فرید اصفہانی' کوکب نسیم۔ سوئی بلوچستان سے: محمد اکمل قمر۔ فیصل آباد سے: عتیق اسلم' منور سلیم' نصرت جہاں' عباس علی اصفہانی' خاقان خان ڈرائیور' دلاور حسن' دلدار بھٹی' کاشف' شفیق خاقان' عرفان مروت' ثمین اختر' زیب علی' ملک شفیق' نعمان حسن' شازیہ احسن۔ رحیم یار خان سے: ظہور الامین بٹالوی' زیبو' کاشان لاشاری' فاطمہ فرحت' نصرت اسماعیل' شبیر حسین شبیری' اسماعیل اچانک' امتیاز احمد' نازش' عمار یاسر' محمد عابد' کیف سرمدی' گل باز خان' زیب النسا۔ بدین سے: عباس علی ساند' شاہد علی۔ چکوال سے: عارف احمد' احمد جاوید' وسیع احمد' صاحب جان' سلمیٰ ممتاز۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، سرفراز خان، قیام الحسن، کاظم جعفری، حیات محمد، یامین محمد، قیام الحسن، انصار الدین، احسن ممتاز، فرقان جعفری، صدف حسن، عنبرین عنایت علی، ذیشان مصطفیٰ، طفیل احمد، محمد ذیشان، رفیق مصطفیٰ، نظیر حسین، انیسہ جعفری، نیاز علی، گل فراز، کلیم ریسانی، سلمان توقیر، ارباز خان، وردہ علی سید۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین۔ لاہور سے مسرت اسلم ملک۔ ظفر الحسنین، عباس علی سید، فیضان بٹ، عارف صدیقی، رشید علی، محمد یاسین، کائنات بٹ، نیاز چوہان، متین لاہوری، سلمان احمد بٹ، اشرف علی، تاثیر احسن، رحیم بخش، فہیم احمد۔ علی مصطفیٰ' میاں ساجد دوا کھری (گوجرہ) محمد نوید اختر' عبدالجبار (کمالیہ) خان بیلہ سے: عائشہ عبدالرشید۔ مسلم باغ (بلوچستان) سے: رحمت اللہ باغ۔ قصور سے: رائے عبدالوحید کھرل (پتوکی) میر پور آزاد کشمیر سے: محمد حسین۔ ساہیوال سے ارباز خان، زویا بتول۔ شیخوپورہ سے انیس احمد۔ پشاور سے عباس طوری، الیاس گل، فرحان خان، نوازش کاظمی، فصیح الدین، کبیر الحسن، رحیم اللہ، نجم الدین، نوشین ملک، ارشد مہدی، نیاز کھوسو، فرقان سید، منظہر حسین بھیکو، شاہد خان آفریدی، سلمان اچکزئی، سلمان محمد، احمد شاہین خٹک، فرزانہ ملک، نعیم الحسن۔ پشاور خان گل عزیز، سرفراز گل۔ بہاولپور سے کاظم علی، ثنا کوثر، رحیم داد چودھری، نور الٰہی فضل، فیضان مصطفیٰ، عباس علی، منظر حسین، کاظم علی، انیس احمد صدیقی، ماہا نیازی، بلو نیازی، ثنا نیازی۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)

بیرونِ ملک سے احمد خان، یاسین گل، احمد صدیقی (شارجہ)، اشرف علی خان (دبئی)، اسلم شاہد (جرمنی)، محمد اسرائیل (مسقط)، ارباز خان (ٹوکیو جاپان)، گل صنوبر (بحرین)۔

بچانے والا

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
مارنے والے سے بچانے والا قوی ہوتا ہے۔ یہ معقولہ بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہوا ہے جو خود میں منفرد ہے۔ آپ یقین کریں میری زندگی داؤ پر لگ گئی تھی مگر بچانے والے نے بچا لیا۔
نازی
(سرگودھا)

سکینہ نے مجھے بتایا کہ چودھری مظفر کی مجھ پر نظر ہے تو میں پریشان ہوگئی۔ چودھری مظفر ہمارے علاقے کا نامی گرامی بدمعاش اور جرائم پیشہ تھا۔ چوری، ڈکیتی، مویشی چوری، شراب و نشے کی فروخت اور اسمگلنگ اس کے دھندوں میں شامل تھا۔ گاؤں کے باہر اس کا بڑا سا ڈیرہ تھا۔ جہاں وہ اور اس کے حالی موالی رہتے تھے۔ وہ سب بھی چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ گاؤں کے لوگ چودھری مظفر اور اس کے گرگوں سے ڈرتے تھے۔ ان کے منہ لگنے سے گریز کرتے تھے بلکہ سامنا ہونے پر راستہ بدل لیتے تھے۔ خاص طور سے عورتیں ان سے دور ہی رہتی تھیں۔ عورتوں کے حوالے سے بھی ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ اس حوالے سے کتنے ہی واقعات گاؤں میں پیش آچکے تھے۔ اس لیے سکینہ کی بات سن کر میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

”میرے چاچے کا لڑکا فضل بھی مظفر کے ڈیرے پر ہوتا ہے اس نے سنا اور پھر مجھے بتایا ہے۔“

ہم فضل کے بارے میں جانتے تھے۔ وہ اچھے خاندان سے تھا مگر مختلف فطرت کا تھا۔ مزاج کا تیز اور لڑائی جھگڑے کا ماہر تھا۔ بڑا ہوا تو بری صحبت میں پڑ گیا۔ تعلیم اس نے اسکول کے زمانے میں چھوڑ دی تھی۔ ایسے لوگوں کا آخری ٹھکانا مظفر چودھری جیسے بدمعاشوں کے ڈیرے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بچپن میں سکینہ اس کی منگ تھی مگر اس کے کرتوت دیکھتے ہوئے سکینہ کے گھر والوں سے پہلے خود فضل کے باپ نے یہ رشتہ ختم کر دیا۔ حالانکہ شکل وصورت کا اچھا تھا اور سکینہ کے ساتھ اس کی جوڑی بجتی مگر اب سکینہ اپنی خالہ کے گھر جانے والی تھی۔ اس نے انٹر کرلیا تھا اسی سال اس کی شادی متوقع تھی۔

ماضی میں ایسے واقعات ہو چکے تھے کہ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں پُراسرار طور پر غائب ہوئیں اور پھر پُراسرار طور پر واپس آگئیں۔ عزت کے لیے ان کے گھر والے دم سادھ کر بیٹھ گئے یا پھر گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ دو بار ایسا ہوا کہ اغوا ہونے والی لڑکیوں کی لاشیں ملیں۔ پولیس نے ان کی موت کو خودکشی قرار دیا اور ان میں سے ایک لڑکی کے بھائی نے مظفر کے ڈیرے پر جا کر اسے قتل کرنے کی کوشش کی اور خود مارا گیا۔ بعد میں اس کی لاش بھی غائب کر دی گئی۔ ان واقعات کے بعد گاؤں والے محتاط ہو گئے تھے مگر

وہ کتنی احتیاط کر سکتے تھے۔ گاؤں دیہات میں عورتوں کو بھی گھروں سے نکلنا پڑتا ہے اور نچلے طبقے کی تمام ہی عورتیں کھیتوں کے کام اور جانور چرانے میں حصہ لیتی تھیں۔ اس لیے لوگ بس اتنی احتیاط کر سکتے تھے کہ اکیلی عورت یا لڑکی کو جانے نہیں دیتے تھے۔ بہت سوں نے تو معاشی مجبوری کے باوجود اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو گھر بٹھا لیا تھا۔ مگر سب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی عورتیں اور لڑکیاں مجبوری کے عالم میں باہر جاتی رہیں۔

اس گاؤں میں ہماری بھی زمین تھی اور میرے بابا گاؤں کے ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ہمارا سارا گھرانا پڑھا لکھا اور ملازمتوں سے منسلک ہے۔ میرے دو بڑے بھائی شہروں میں ہوتے ہیں۔ میری بڑی بہن جس کی شادی ہوگئی ہے وہ بھی ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر ہے۔ لڑکیوں کا پرائمری، بابا کے اسکول کے ساتھ ہی ہے مگر اسے مڈل کا درجہ نہیں ملا تھا۔ بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی اسکول اس وقت بنا جب میں پہلی کلاس میں آئی اور اس کے بعد اسکول درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا رہا۔ لڑکیوں کا ہائی اسکول ہمارے گاؤں سے ذرا دور ایک قصبے میں تھا۔ بابا نے مجھے وہاں داخل کرا دیا۔ میں تانگے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ اسکول آتی جاتی تھی۔ وہیں سے انٹر پاس کیا۔ مگر آس پاس کالج نہیں تھا اس لیے بابا کے کہنے پر میں نے ابھی سے پرائیویٹ بی اے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

میرے ساتھ میری سہیلیوں ماہم اور سکینہ نے بھی انٹر کیا تھا۔ ماہم میری طرح پرائیویٹ بی اے کر رہی تھی البتہ سکینہ کو آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کا باپ زمیندار تھا اور ان کے ہاں لڑکیوں کو اسکول سے آگے پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ آگے بھی پڑھے۔ زمینداری تو ہمارے ہاں بھی تھی لیکن ہمارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ بہرحال اب کالج جانا نہیں تھا اس لیے ہم ساتھ ہی رہتے۔ میں نے سکینہ سے کہا کہ وہ بھی کتابیں حاصل کر لے اور ہمارے ساتھ پڑھ لیا کرے اس کی تیاری ہو جائے گی اور وہ شادی کے بعد بھی پیپرز دے سکتی ہے۔ مگر سکینہ نہیں مانی۔ ماہم کو تعلیم کا شوق نہیں تھا وہ صرف اپنے منگیتر کے کہنے میں بی اے کر رہی تھی۔ میرا ارادہ بی اے کرنے کے بعد بی ایڈ کرنے کا تھا۔ مگر ماں جی نے کہہ دیا تھا کہ بی اے کے بعد مجھے جو پڑھنا ہے وہ اپنے شوہر کے گھر جا کر پڑھوں۔ وہ مجھے صرف بی اے ہی کرائیں گی۔

ہمارا گاؤں شکر گڑھ تحصیل میں پاک بھارت سرحد کے پاس ہے۔ مشکل سے دو کلومیٹرز کا فاصلہ ہوگا۔ جن دنوں دونوں ملکوں میں کشیدگی ہوتی ہے یہاں رہنے والوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ بھارتی بے دریغ آبادیوں پر فائرنگ اور گولہ باری کرتے ہیں۔ میرے بچپن میں یہاں کھلی سرحد تھی۔ جس پر نہ کوئی رکاوٹ تھی اور نہ کوئی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے جب بھارتی فوج فائرنگ کرتی

تو ہمارا بہت نقصان ہوتا تھا۔ لوگ مارے جاتے تھے اور جانور بھی فائرنگ کی زد میں آتے تھے۔ بلکہ جانوروں کا جانی نقصان کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ بابا بتاتے ہیں کہ ایک بار تو مسلسل فائرنگ کی وجہ سے ہم سرحد کے پاس کھیتوں سے گندم بھی نہیں کاٹ سکے تھے اور فصل خراب ہو گئی تھی۔ پھر کوئی دس بارہ سال پہلے جب دونوں طرف سے سرحدوں پر فوج جمع ہوئی تو ہماری طرف بھی مورچے بنائے گئے اور سرحد کے ساتھ پشتے تعمیر کیے گئے۔ ان سے یہ ہوا کہ ہم براہِ راست فائرنگ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ مگر گولہ باری سے اب بھی محفوظ نہیں تھے۔ ایک بار چند گولے ہمارے گاؤں پر بھی گرے تھے۔ اللہ نے کرم کیا کہ جانی نقصان نہیں ہوا مگر چند گھر گرے تھے۔

میرے دادا گورداسپور سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور وہاں اپنی زمینوں کے بدلے انہیں یہاں بارہ ایکڑ زمین مل گئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں وہ اچھے خاصے زمیندار تھے مگر یہاں انہوں نے اپنی اولاد کو زمینداری پر لگانے کی بجائے تعلیم دلا کر نوکریوں پر لگایا۔ میرے تایا اور چچا فوج میں گئے۔ ان کے بچے بھی فوج میں تھے۔ بابا نے تعلیم کا شعبہ پسند کیا۔ انہوں نے بی ایڈ کیا اور استاد بن گئے پھر نوکری کے دوران میں انہوں نے ایم ایڈ بھی کیا اور اب وہ اسکول پرنسپل تھے۔ روایتی سرکاری اسکولوں کی نسبت بابا نے اپنے اسکول کا ماحول اور تعلیمی معیار بہت اچھا رکھا تھا۔ اسکول کے بچے ہمیشہ سالانہ امتحانات میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بابا کا اسکول آگے رہتا تھا۔ یہاں کے لڑکے تقریری اور دوسرے مقابلوں میں بھی انعامات جیت کر آتے تھے۔ کئی سال تک بابا کے اسکول نے تحصیل کے بہترین اسکول کا ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ یہ سب بابا کی محنت کا نتیجہ تھا۔

ہمارے گاؤں کی زمین زرخیز ہے۔ یہاں بہترین فصل حاصل ہوتی ہے۔ پانی بھی اچھا ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تب یہاں بجلی آئی، پھر فون اور گیس کی سہولت بھی آ گئی۔ آخر میں یہاں موبائل فون کی سہولت آئی۔ سڑکیں بنیں اور نزدیکی نہر پر پل بنے تو آنے جانے کے کئی راستے بن گئے۔ اس سے یہاں کے لوگوں کے لیے بہت آسانی ہو گئی تھی۔ نئی نسل کو اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن بابا بتاتے ہیں کہ ان کے زمانے میں بہت مشکل تھی۔ ہمیں کھانا بنانے کے لیے لکڑیاں خریدنا پڑتی تھیں اور کچا باورچی خانہ ہوتا تھا کیونکہ جدید باورچی خانے میں لکڑی کہاں جلاتے۔ اسی طرح لالٹین کی روشنی ہوتی تھی۔ ٹی وی نہیں تھا۔ اخبار بھی ایک دن بعد آتا تھا۔ اب تو ٹی وی کھولو اور چینل لگاؤ تو پورے ملک کی خبریں ایک منٹ میں مل جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ کی سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا جہان کی معلومات گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔

میرے بڑے بھائی عبدالرحمٰن اور عبیدالرحمٰن شہروں میں ہوتے تھے۔ عبدالرحمٰن بھائی ایک سیلولر کمپنی میں اچھے عہدے پر تھے جب کہ عبید بھائی اپنا بزنس کرتے تھے۔ میرے تایا اور چچا کے گھرانے پہلے ہی لاہور اور اسلام آباد منتقل ہو گئے تھے۔ اب گاؤں کی حویلی میں صرف بابا کا یعنی ہمارا خاندان تھا۔ وہ بھی کل چار افراد پر مشتمل تھا۔ میں یعنی نازیہ، مجھ سے چھوٹا سیف الرحمٰن، بابا اور ماں جی۔ مجھ سے بڑی بہن رضیہ کی شادی میرے تایا کے لڑکے شہریار بھائی سے ہوئی تھی۔ میری نسبت چچا کے بیٹے وحید اللہ سے طے ہوئی تھی۔ وحید ان دنوں کاکول اکیڈمی میں تربیت مکمل کر رہا تھا اور آنے والے بہار میں اس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ بابا اور چچا کا ارادہ تھا کہ بی اے مکمل ہوتے ہی ہماری شادی کر دی جائے۔ یہ ارینج میرج ہوتی لیکن نسبت طے ہونے کے بعد وحید خود بہ خود میرے دل میں گھر کرتا چلا گیا۔ اب اس کا نام بھی سنتی تھی تو دل کی دھڑکن خود بہ خود تیز ہو جاتی تھی۔

عید کے موقع پر عام طور سے پورا خاندان حویلی میں جمع ہوتا تھا اور اس وقت اگر وحید آیا ہوتا تو میں مشکل میں پڑ جاتی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمروں تک محدود رہنا پڑتا تھا۔ صحن اور حویلی کے دوسرے حصوں میں بھی اس وقت جاتی جب مجھے پتا چل جاتا کہ وحید گھر میں نہیں ہے۔ مجھے بہت شرم آتی تھی۔ دو تین بار وحید سے اتفاقاً سامنا ہوا تو میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ سب میری حالت دیکھ کر ہنستے تھے اور میرا مذاق اڑاتے، مجھے پرانی روح قرار دیتے۔ خود رضیہ باجی کہتیں کہ اب لڑکیاں کہاں شرماتی اور منگیتروں سے چھپتی پھرتی ہیں اب تو وہ ان سے گپ شپ کرتی ہیں اور موبائل پر بات کرتی ہیں۔ وحید نے دو تین بار مجھ سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے رضیہ باجی سے کہلوا دیا کہ وہ ابھی مجھ سے بات نہ کرے۔

چاچا کی فیملی بڑی عید پر ہمارے ہاں آئی تھی اور یہیں قربانی کی تھی۔ وحید بھی چھٹی پر آیا تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ

اس نے نہ صرف چھپ کر مجھے دیکھا بلکہ میری تصویریں بھی لی تھیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا تو بہت شرم آئی۔ مگر ساتھ ہی اچھا بھی لگا۔ وحید نے بعد میں میرا موبائل نمبر کسی سے لے کر مجھے ایس ایم ایس کیا۔ ''قسم سے دل چاہ رہا ہے بس پاس آؤٹ ہوتے ہی تجھے لے جاؤں۔ نازو خدا کی قسم تو بہت خوب صورت ہے۔''

یہ ایس ایم ایس پڑھتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ میرا موبائل کبھی بابا بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اگر وہ پڑھ لیتے تو نہ جانے دل میں کیا سوچتے۔ میں نے وحید کو منع کیا کہ اب وہ ایسے ایس ایم ایس نہ کیا کرے۔ مگر وہ باز نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ایس ایم ایس آتے تھے۔ ہمارے ہاں ماحول ایسا نہیں تھا اور نہ ہی میری سہیلیوں میں ایسی کوئی تھی جو میری صورت شکل پر بات کرتی۔ ہمارے ذہن میں ایسی باتیں آتی ہی نہیں تھیں۔ حالانکہ ہم تینوں ہی صورت شکل کے اچھے تھے۔ مگر جب وحید نے کہا کہ میں بہت خوب صورت ہوں تب میں نے پہلی بار خود پر توجہ دی۔ نین نقش اچھے تھے۔ میرے براؤن بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔ میرا قد پانچ فٹ چار انچ سے ذرا زیادہ تھا۔ میں نہ تو طویل قامت لگتی تھی اور نہ پست قامت۔ جسم متناسب تھا۔ اگرچہ وزن کسی قدر زیادہ تھا مگر گاؤں دیہات میں یہ عام سی بات سمجھی جاتی ہے۔ پہننا اوڑھنا بھی اچھا تھا۔

وحید شکل و صورت میں بابا پر گیا تھا۔ ان کی طرح سرخ و سفید اور کھڑے نقوش والا۔ مگر میں نے کبھی اس کی شکل و صورت کے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے تو اس سے محبت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی انتظار تھا کہ وہ کب آئے اور مجھے ہمیشہ کے لیے لے جائے۔ مگر مجھے تو یہ بات سوچ کر حیا آتی تھی وحید سے کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے اپنی محبت کا اظہار میں چیزوں سے کرتی تھی۔ عیدوں پر اس کے لیے خود کرتے کاڑھ کر بھیجتی تھی۔ اس کے لیے رومال بناتی تھی۔ سردیوں میں سوئیٹر تیار کرتی تھی۔ وہ جب حویلی آتا اس کے لیے تینوں وقت کا کھانا میں ہی بناتی تھی۔ وحید یہ سب جانتا تھا اس لیے اس نے بھی اصرار نہیں کیا کہ میں عام لڑکیوں کی طرح اس سے بات کروں یا بے تکلف ہوں۔ بس وہ کبھی کبھی ایس ایم ایس کر دیا کرتا تھا اور میری جان پر بن جاتی تھی۔

میں چھٹی کلاس سے پردہ کرنے لگی تھی۔ برقع یا عبایا نہیں پہنتی تھی مگر چادر سے خود کو پوری طرح ڈھک کر جاتی تھی۔ شروع میں چہرہ کھلا ہوتا تھا۔ مگر ذرا بڑی ہوئی تو چہرہ بھی چھپانے لگی تھی۔ صرف اسکول ہی نہیں بلکہ گاؤں میں بھی کہیں جاتی تو پردہ کر کے جاتی تھی۔ گاؤں کے سارے ذی حیثیت لوگ آس پاس تھے اور ان ہی سے ہمارے تعلقات تھے۔ یعنی مردوں کی مردوں سے اور عورتوں کی عورتوں سے۔ میری دوستی سکینہ اور ماہم سے زیادہ تھی۔ دو تین لڑکیاں اور بھی تھیں مگر ہم تین کا گروپ ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھا۔ ماہم کا خاندان بھی زمیندار تھا اور ان کی گاؤں کے آس پاس اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے کارخانے بھی تھے اور گاؤں میں ان کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔

حویلیوں کے درمیان ایک مشترکہ سی زمین تھی اور اس پر باغ بنا کر اسے عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا یعنی حویلیوں کی عورتیں یہاں تفریح اور ہوا خوری کے لیے آتی تھیں۔ کناروں پر چار فٹ اونچی چار دیواری تھی اور اس میں آمد و رفت کے کئی راستے تھے۔ گھاس کے تختے تھے۔ پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ لکڑی اور ماربل سے بنی نشستیں تھیں۔ درختوں پر پینگیں بندھی تھیں اور ہم لڑکیاں ان پر پینگیں لیتے تھے۔ عام طور سے شام کے آس پاس ہم یہاں آتے تھے۔ گپ شپ ہوتی اور پھر مغرب سے پہلے سب یہاں سے چلے جاتے تھے۔ حویلیوں کے محافظ نظر رکھتے تھے کہ کوئی باہر کا فرد اس طرف نہ آئے۔ اگر کوئی آنے لگتا تو وہ اسے پہلے ہی روک دیتے تھے۔ اس لیے ہم لڑکیاں یہاں کھل کر تفریح کرتے تھے اور آپس میں ہنستے بولتے تھے۔ ہمیں خوف نہیں تھا کہ کوئی وہاں آجائے گا۔

اتفاق سے اس روز میں اور سکینہ تھے اور سکینہ نے مجھے موقع پا کر خبردار کیا۔ میں مظفر چودھری کا نام سن کر سہم گئی تھی۔ وہ تھا بھی ایسا فرد جس سے انسان کو خوف آئے۔

اس وقت وہ تقریباً چالیس سال کا تنومند اور صورت سے ہی خطرناک نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ گورا چٹا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سرخی اور مکروہ سے نقوش اسے ہیبت ناک بناتے تھے۔ میں نے اسے دو تین بار ہی دیکھا تھا اور ہر بار مجھے اس کی صورت سے خوف اور کراہیت آئی تھی۔ کھلے کرتے اور شلوار میں اس کا ڈیل ڈول اور زیادہ لگتا تھا ہمیشہ اس کے ہاتھ میں بڑی سی گن ہوتی تھی۔ وہ کھلی جیپ میں گاؤں اور علاقے کی سڑکوں پر دندناتا پھرتا تھا۔ اس کے

ساتھ اس کے چار پانچ گرگے بھی ہوتے تھے۔ پندرہ سال پہلے کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اس علاقے کے نامی گرامی بدمعاش اور اسمگلر صوفی شاہ کا آدمی تھا۔ مگر صوفی شاہ صرف اسمگلر تھا اور وہ عام لوگوں سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی عام افراد کو اس سے کوئی پریشانی ہوتی تھی۔ بلکہ سننے میں آیا ہے کہ وہ غریب غربا کی مدد بھی کرتا تھا۔ ایک بار سرحد پار مال لے جاتے ہوئے وہ فائرنگ کا نشانہ بن گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے پاکستان اور انڈیا کے سرحدی محافظوں نے مارا تھا اور بعض اس کا الزام اس کے دشمنوں پر لگاتے ہیں مگر آج تک پتا نہیں چل سکا کہ اس کا قاتل اصل میں کون تھا۔

مظفر چودھری صوفی شاہ کا معمولی درجے کا کارندہ تھا مگر اس کی موت کے بعد اس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ وہ چند سالوں میں گروہ کا سرغنہ بن گیا۔ شروع میں اس نے اسمگلنگ کی مگر اس کے بعد دوسرے جرائم بھی شروع کر دیئے اور اس کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی متاثر ہونے لگی۔ اس نے نئی نسل کو شراب، منشیات اور دوسرے غلط کاموں پر لگا دیا۔ کتنے ہی گھر اس کی وجہ سے برباد ہوگئے۔ جب نشہ کی برائی آئی تو لوگوں میں شرم و حیا اٹھ گئی اور وہ اپنی عزتوں پہ ہاتھ صاف کرنے لگے۔ گاؤں میں تو بیٹیاں اور عزت سانجھی بھی جاتی مگر دوسری بہت ساری قدروں کی طرح اب یہ بھی گاؤں سے غائب ہو چکی ہے۔ اب سب اپنی اپنی عزتوں کے خود ذمے دار ہیں۔

ہماری حویلی کے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں ہوتا تھا بس ایک ملازم راحت بابا تھا وہی گیٹ بھی کھولتا اور بند کرتا تھا مگر جب آس پاس ڈکیتیاں پڑیں تو بابا نے ایک مسلح محافظ رکھ لیا۔ یہ راحت بابا کا بیٹا صباحت تھا اور ریٹائرڈ فوجی تھا۔ ہم اس خاندان کو نصف صدی سے جانتے تھے۔ اس کے پاس لائسنس بھی تھا۔ پستول اور شاٹ گن بابا نے اسے دلوادی۔ اب وہ ہمہ وقت گیٹ پر رہتا تھا۔ رات میں گیٹ کے ساتھ ہی چوکی میں سوتا تھا۔ شروع میں ہماری حویلی کی دیوار مشکل سے سات فٹ اونچی تھی۔ جب حالات بدلے تو بابا نے اس کی اونچائی دس فٹ کرادی اور اس پر دو فٹ کی خاردار تار لگوادی جس میں بہ وقت ضرورت کرنٹ بھی دوڑ سکتا تھا۔ خود بابا بھی پستول اور ریوالور رکھتے تھے۔ شام ہوتے ہی مین گیٹ بند ہو جاتا تھا اور اس کے بعد صباحت کسی کے لیے بھی پورے اطمینان کے بعد ہی چھوٹا دروازہ کھولتا تھا۔

مسلح گارڈ گاؤں والوں کے لیے انوکھی چیز تھی۔ پہلے صرف بڑے جاگیردار مسلح گارڈز رکھتے تھے اور ان کا مقصد بھی حفاظت سے زیادہ اپنی شان و شوکت اور قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا تھا۔ مگر اب تو ہر صاحبِ حیثیت مسلح گارڈ رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا اور یہ سب تبدیلیاں میرے دیکھتے دیکھتے آئی تھیں اور میں ان کے ساتھ ہی بڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ سب مجھے نامانوس نہیں لگتا تھا پھر جب بابا اور ماں جی سے سنتی تو مجھے لگتا کہ واقعی تبدیلی آگئی ہے۔ مگر اس روز سکینہ سے یہ خوفناک بات سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی اور تب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ واقعی تبدیلی آچکی ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ کوئی میرے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔ سوچنا تو دور کی بات ہے کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

مظفر چودھری ہمارے علاقے کا ہوّا تھا اور کوئی بھی اسے غیر سنجیدہ نہیں لیتا تھا۔ آغاز میں معمولی بدمعاش نظر آنے والا مظفر چودھری اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ علاقے کے جدی پشتی جاگیردار بھی اس سے ڈرنے لگے تھے۔ وہ اس کے منہ لگنے سے گریز کرتے اور اس کی سرگرمیوں سے نظریں چراتے تھے۔ شروع میں علاقے کے بااثر لوگوں نے پولیس اور انتظامیہ کی مدد سے اسے لگام ڈالنے کی کوشش کی مگر جلد ایک پڑوسی گاؤں کے جاگیردار کے گھر ایسا ڈاکا پڑا کہ ڈاکو مال کے ساتھ عزت بھی لے گئے تھے۔ تب سے ان طاقتور لوگوں نے بھی مظفر چودھری کا راستہ چھوڑ دیا۔ اب وہ جنگل کے کسی درندے کی طرح آزاد تھا جو چاہتا کرتا کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں سے اس کے تعلقات تھے اور اس کی طرف سے انہیں باقاعدگی سے بھاری رقم ملتی تھی اس لیے اب پولیس بھی اس کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

ایسے شخص کے بارے میں جب کسی لڑکی کو پتا چلے کہ وہ اس پر بری نظر رکھتا ہے تو اس کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ وہی حال میرا ہوا تھا۔ پھر مجھ سے باغ میں نہ ٹھہرا گیا۔ سچی بات ہے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں سکینہ سے معذرت کر کے گھر آئی تو خزاں کے ابتدائی موسم میں بھی مجھے سردی لگ رہی تھی۔ ماں جی نے مجھے دیکھا تو فکرمند ہو گئیں۔ ''نازی کیا ہوا ہے تیری رنگت پیلی پھٹک ہو رہی ہے۔''

''کچھ نہیں ماں جی۔'' میں نے کہا تو ماں جی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک گئیں۔

"کیسے نہیں ہو رہا، تیرا ماتھا گرم ہے۔ بخار ہو گیا ہے چل اندر میں تیرے لیے الائچی والی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

مجھے سچ مچ بخار ہو گیا تھا۔ جب مظفر چودھری کا خیال آتا میرا جسم لرز اٹھتا تھا۔ پھر میں خود کو تسلی دیتی تھی کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ کوئی میری طرف غلط نظر سے دیکھے۔ میرے بابا ہیں میرے بھائی ہیں۔ میرا منگیتر ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے کس کی جرأت ہے میری طرف ہاتھ بڑھا سکے۔ اس کے باوجود میری بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ رات تک مجھے تیز بخار ہو گیا تھا۔ بابا نے پریشان ہو کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا مگر میں نے منع کر دیا میں رات کے اس پہر باہر جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی۔ اسپتال شکر گڑھ کے قصبے میں تھا اور وہ یہاں سے کوئی دس کلومیٹرز دور تھا۔ پکی سڑک کی وجہ سے آدھے گھنٹے کا راستہ تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں حویلی میں محفوظ تھی یہاں سے نکلی تو کوئی مجھے اچک کر لے جائے گا۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

"میں باہر نہیں جاؤں گی۔"

"بیٹا ایک گھنٹے میں آ جائیں گے۔" بابا نے کہا۔

"آپ نے دوا دے دی ہے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

پہلے ماں جی نے پٹیاں رکھ کر میرا بخار کم کیا تھا پھر بابا نے دوا دی تھی۔ میں باہر جانے سے اتنا ڈری کہ کچھ دیر میں سچ مچ میرا بخار اترنے لگا اور ایک گھنٹے بعد میں پسینے میں نہا چکی تھی اور بخار مکمل طور پر اتر گیا۔ ماں جی نے مجھے گلوکوز ملا دودھ دیا اور میں سو گئی۔ صبح اٹھی تو ہلکی پھلکی ہو رہی تھی اور میں نے پہلی بار اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری اسکول کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی ورنہ مجھے باہر جانے کے خیال سے پھر بخار چڑھ جاتا۔ اب خوف بھی پہلے جیسا نہیں تھا بس مجھے باہر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا اور مجھے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ یہ بات ماں جی کو بتاؤں یا نہیں۔ مجھے شرم آ رہی تھی اور اس سے زیادہ یہ خیال تھا کہ ماں جی پریشان ہو جائیں گی۔ وہ لازماً بابا کو بتائیں گی اور وہ بھی فکر مند ہو جائیں گے۔ بس اسی خیال سے میں نے زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے اب میرا خیال زیادہ پختہ ہو گیا تھا کہ مظفر چودھری کتنا بڑا بدمعاش صحیح لیکن ہم بھی کوئی گرے پڑے نہیں تھے جو وہ اپنی مرضی کر جاتا۔ میرے گرد مضبوط دیواروں اور ان سے زیادہ مضبوط بازوؤں کا گھیرا تھا۔

اب میں باہر جانے میں احتیاط کرنے لگی تھی۔ ہماری حویلی میں کئی ملازمائیں تھیں۔ ان میں ایک سفینہ بی بی بھی تھی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی تنومند اور دلیر عورت تھی۔ مردوں کی طرح لاٹھی لے کر چلتی تھی اور اس کا استعمال بھی جانتی تھی۔ جب میں چھوٹی تھی اور گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی تو اسی کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ ایک بار سفینہ بی بی نے ایک پاگل کتے کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ اچانک جھاڑیوں سے نکل کر ہم پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ ہم میں سے کسی کو کاٹ لے مگر سفینہ نے نہایت حوصلے سے اسے لاٹھی کی مدد سے ہم دونوں سے دور رکھا۔ اتنے میں میری چیخیں سن کر آس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ آ گئے اور انہوں نے کتے کو مار کر بھگا دیا۔ اگر اس روز سفینہ بی بی نہ ہوتی تو شاید کتا مجھے کاٹ ہی لیتا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ بڑے ہونے کے بعد میں نے سفینہ بی بی کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا مگر اب اسے ساتھ لے جانے لگی تھی۔ اسے ذرا تعجب ہوا تھا۔

"کیا ہوا نازی بی بی اب تک تو آپ اکیلے ہی چلی جاتی تھیں۔ پھر اب مجھے کیوں لے جا رہی ہیں؟"

"بس مجھے ڈر لگتا ہے آج کل حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں اس لیے تمہیں ساتھ لے جاتی ہوں۔ تم بہت بہادر ہو نا اس لیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی بی بی۔" وہ بولی۔

سفینہ بی بی کا اس دنیا میں سوائے ایک بیٹے کے اور کوئی نہیں تھا۔ ریحان سترہ اٹھارہ سال کا جوان لڑکا تھا مگر سفینہ بی بی کے برعکس اس میں ہمت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہایت بزدل اور ہر کسی سے دب جانے والا لڑکا تھا۔ بابا نے کوشش کر کے اسے اسکول میں چپڑاسی لگوا دیا تھا۔ مگر اس کی ملازمت پکی نہیں تھی۔ یہ کنٹریکٹ جاب تھی اور بابا نے کہا تھا کہ ریحان کے پکا ہونے کا امکان زیادہ نہیں تھا۔ اس پر بھی سفینہ بی بی بہت خوش تھی کیونکہ اس ملازمت سے پہلے ریحان کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس نے بہ مشکل میٹرک تک پڑھا تھا اور اس کے بعد سے آوارہ گھوم رہا تھا۔

سفینہ بی بی اس کے لیے بہت فکر مند رہتی تھی۔ اس نے بابا سے منت سماجت کر کے اسے نوکری پر رکھوایا تھا۔ ورنہ بابا کسی کی سفارش ماننے والے آدمی نہیں تھے وہ تو

خلاف میرٹ کسی بچے کو پاس کرنا دور کی بات تھی اس کے نمبر تک نہیں بڑھاتے تھے۔ وہ اسکول کے ہر بچے پر نظر رکھتے تھے اور اگر انہیں شبہ ہو جاتا کہ کسی ٹیچر نے کسی بچے کو اس کی استعداد سے زیادہ نمبرز دیئے ہیں تو وہ خود اس کے پرچے نکلوا کر چیک کر لیتے تھے اور اگر ٹیچر نے زیادہ نمبرز دیئے ہوتے تو اس کی شامت آجاتی۔ ریحان کے بارے میں بابا کا کہنا تھا کہ وہ ان کے اسکول کے غبی ترین طلبا میں سے ایک تھا اور اس نے میٹرک کا امتحان نہ جانے کیسے پاس کر لیا تھا ورنہ وہ اس قابل نہیں تھا۔ بہرحال ملازمت میں اپنا کام ٹھیک سے کر رہا تھا اسی لیے ملازمت پر برقرار تھا ورنہ بابا نے سفینہ کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر اس نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تو تنخواہ سے پہلے وہ خود اسے ملازمت سے نکال دیں گے۔ سفینہ بی بی نے یقین دلایا تھا کہ ریحان دل لگا کر کام کرے گا۔

میں نے بتایا کہ میں آس پاس کی حویلیوں میں اپنی سہیلیوں کے پاس جاتی تھی یا پھر مشترکہ باغ میں چلی جاتی تھی۔ میں نے اب جانا کم کر دیا اور جاتی بھی تو سفینہ بی بی کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی باغ میں رکتی تھی اور میں اسی کے ساتھ واپس آتی تھی۔ سفینہ بی بی کی وجہ سے نکلنا کم ہو گیا کہ اسے حویلی میں کام ہوتے تھے۔ وہ نہ تو ہر وقت میرے ساتھ نکل سکتی تھی اور نہ ہی میرے ساتھ زیادہ دیر رک سکتی تھی سکینہ اور ناہم کے ہاں جانا ہوتا تو سفینہ بی بی مجھے چھوڑتی اور پھر مقررہ وقت پر واپس لینے آتی تھی۔ سکینہ اور ناہم حیران تھے کہ میں نے اچانک آنا جانا کم کیوں کر دیا تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں بی اے کے پیپرز کی تیاری کر رہی ہوں اور کیونکہ خود سے پڑھ رہی ہوں اس لیے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

بابا نے میرا رجسٹریشن پنجاب یونیورسٹی میں کرا دیا تھا اور مجھے تمام ضروری کتابیں منگوا دی تھیں۔ میں نے سال اوّل کے پیپرز کی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں کئی گھنٹے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی اس کے باوجود میرے پاس کئی گھنٹے رہتے تھے۔ مگر میں باہر کم ہی جاتی تھی۔ حویلی میں تفریح کی تمام سہولیات تھیں۔ ٹی وی اور کمپیوٹر تھا مگر ماں جی کو پسند نہیں تھا کہ میں ایک حد سے زیادہ ٹی وی یا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھوں اس لیے میں انہیں کم استعمال کرتی تھی۔ کمپیوٹر تو صرف انٹرنیٹ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ ٹی وی بھی زیادہ تر حالات حاضرہ کے لیے دیکھتی تھی یا پھر کھانے بنانے والے پروگرام دیکھتی تھی، باقی مجھے ڈراموں اور شوبز سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میرا اصل شوق مطالعہ تھا۔ جب میں فارغ ہوتی تو میرے ہاتھ میں کوئی کتاب اور رسالہ ہوتا تھا۔ عام گھرانوں کے برعکس جہاں بچوں کو ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور ماں باپ آنکھیں بند کر لیتے ہیں مگر جہاں بچوں کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ نظر آتا ماں باپ کو بچوں کی تربیت میں خرابی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ مگر بابا نے ہم بہن بھائیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ ہم پڑھیں اور سب پڑھیں۔ اس لیے ہم سب بہن بھائیوں کو مطالعے کا شوق ہے۔ کچھ پڑھے بغیر ہمیں نیند ہی نہیں آتی ہے۔

ایک مہینے بعد موسم بدل گیا تھا۔ سردی آگئی تھی۔ ایک دن ماں جی نے کہا۔ ”چلو سردیوں کے کپڑے لے آتے ہیں۔“

میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہی تھی کیونکہ پچھلے ایک سال میں میرا قد اور وزن کسی قدر بڑھا تھا اور مجھے پچھلے سال کے کپڑے چھوٹے اور تنگ ہو گئے تھے اس لیے میں نئے کپڑے بنانا چاہتی تھی۔ میں تیار ہو گئی۔ ماں جی نے بابا سے کہہ دیا کہ اگلے روز ہم شاپنگ کے لیے جائیں گے۔ کپڑوں کی خریداری ہم سیالکوٹ سے کرتے تھے۔ وہاں ہر طرح کے کپڑے مل جاتے تھے۔ شکر گڑھ کی مارکیٹ اتنی بڑی نہیں تھی۔ اس لیے ہم سیالکوٹ جاتے تھے۔ بابا نے کہا کہ ہم صباحت کے ساتھ جائیں۔ جب بابا ساتھ نہیں ہوتے تھے تو صباحت کے ساتھ ہی بھیجتے تھے وہ ڈرائیو بھی کرتا تھا۔ ہم اگلے دن اسی کے ساتھ نکلے۔ ہمارے گاؤں سے سیالکوٹ کوئی پچاس کلومیٹرز دور اور راستہ مشکل سے ایک یا سوا گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے پہلے ہائی وے بہت خراب تھی مگر اب بہترین بن گئی ہے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا ہے اور راستہ کٹ جاتا ہے کیونکہ دوپہر تک واپس آنا تھا اس لیے ہم نو بجے نکلے۔ مارکیٹ بھی اس وقت تک کھل جاتی تھی۔ دو سے تین گھنٹے میں خریداری مکمل کر کے ہم دو بجے تک واپس آجاتے۔

جب میں نے میٹرک کیا تو بابا نے مجھے موبائل فون رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ پچھلے دنوں عبید بھائی آئے تو میرے لیے پاس ہونے کا گفٹ اسمارٹ فون کی شکل میں لائے تھے۔ سیکنڈ ائر میں، میں نے بابا سے اسمارٹ فون دلانے کا کہا مگر ماں جی نے منع کر دیا تو دل مسوس کر رہ گئی۔ اب غیر متوقع طور پر بھائی نے گفٹ کر دیا تو میں خوش ہو گئی تھی۔ سفر کے دوران میں اسی میں لگی رہی اسی لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ ایک جیپ ہمارے پیچھے آرہی تھی۔

صباحت کے چوکس ذہن نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ گاؤں سے نکلتے ہی یہ سیاہ جیپ ہماری کار کے پیچھے لگ گئی تھی۔ اس نے راستے میں کئی بار رفتار بڑھا کر اور کم کر کے چیک کیا تو جیپ کی رفتار بھی کم اور زیادہ ہوئی تھی۔ سیالکوٹ پہنچ کر اس نے ہمیں مارکیٹ میں چھوڑا اور کار کا آئل چیک کرانے کا کہہ کر چلا گیا۔ البتہ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ "بی بی جی جب تک میں نہ آؤں مارکیٹ سے باہر مت آیئے گا۔ جب میں کال کروں تب آیئے گا۔"

ماں جی حیران ہوئیں۔ "مگر کیوں پتر؟"

اس وقت صباحت نے ہمیں اصل وجہ نہیں بتائی اور بہانہ کیا۔ "ماں جی آج کل یہاں وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔ اکیلی عورتوں کو دیکھ کر ڈاکو آ جاتے ہیں۔ اندر مارکیٹ میں خطرہ نہیں ہے۔"

ہم مارکیٹ میں آئے اور خریداری میں لگ گئے۔ اس میں تین گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ اس دوران میں صباحت نے اس جیپ کو اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کی مگر وہ مارکیٹ کے باہر رہی۔ تب اس نے یہ کیا کہ مارکیٹ کے دوسری طرف آیا اور اس نے ماں جی کو کال کر کے اس طرف سے باہر آنے کو کہا۔ یہ کپڑا مارکیٹ کا بیرونی حصہ تھا مگر مارکیٹ کے اندر ہی واقع تھا۔ ماں جی اور میں حیران ہوئے تھے کہ اس نے ہمیں وہاں کیوں بلایا ہے؟ ہم باہر آئے تو وہ عجلت میں تھا۔ اس نے جلدی سے سامان رکھا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ جیسے ہی ہم بیٹھے اس نے کار چلا دی تھی۔ مارکیٹ سے باہر آنے پر ماں جی نے پوچھا۔ "پتر کیا بات ہے تو نے وہاں کیوں بلایا ہمیں؟"

تب صباحت نے اصل بات بتائی۔ "ماں جی گاؤں سے نکلتے ہی ایک سیاہ جیپ ہمارے پیچھے لگ گئی تھی اور وہ مارکیٹ تک ساتھ رہی۔ میں یہی چیک کرنے کے لیے گیا تھا کہ وہ صرف پیچھے آتے ہیں یا نہیں مگر وہ مارکیٹ کے باہر ہی رہے۔" صباحت نے بتایا۔ "اس لیے میں پیچھے کی طرف آیا اور آپ دونوں کو بھی وہیں بلایا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ صاحب سے کال کر کے مشورہ کر لوں۔"

ماں جی نے اپنے موبائل سے بابا کو کال کی اور انہیں صورتِ حال بتا کر موبائل صباحت کو تھما دیا۔ وہ بابا سے بات کرنے لگا۔ میں نے محسوس نہیں ہونے دیا مگر سیاہ جیپ کا سن کر میں اندر سے سہم گئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کا تعلق مظفر چودھری سے ہوگا۔ میں ماں جی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ ہم خیر خیریت سے واپس حویلی پہنچ جائیں۔ صباحت کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ بابا بھی یہ سن کر فکر مند ہو گئے تھے۔ انہوں نے صباحت سے کہا کہ وہ واپسی میں دوسرا راستہ اختیار کرے۔ اس نے سیالکوٹ سے پسرور جانے والی سڑک پکڑی اور بڑا ننا سے اسے شکر گڑھ کی طرف موڑ دیا۔ ظفر وال سے ہوتے ہوئے ہم شکر گڑھ کی طرف آئے۔ شکر ہے اس راستے میں ہمیں سیاہ جیپ نہیں ملی۔

مگر جیسے ہی ہم شکر گڑھ سے آگے نکلے سیاہ جیپ پھر ہمارے پیچھے آنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سیالکوٹ کی مارکیٹ میں ہمارا سراغ کھونے کے بعد انہوں نے اس جگہ انتظار کرنے کا سوچا تھا کیونکہ گاؤں کی طرف جانے کے لیے اس جگہ سے لازماً گزرنا پڑتا تھا۔ اس ہائی وے کا سب سے سنسان حصہ بھی تھا اور یہاں دن میں بھی ٹریفک بہت کم ہوتا تھا۔ بابا نے دو سال پہلے یہ نسان کار لی تھی اس کا انجن بہت طاقتور تھا۔ پھر صباحت ماہر ڈرائیور بھی تھا۔ اس نے رفتار تیز کی۔ اب گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ عام طور سے شکر گڑھ سے بیس پچیس منٹ کا راستہ ہے لیکن اس روز صباحت نے اسے صرف پندرہ منٹ میں طے کیا اور ہم حویلی پہنچ گئے۔ ان پندرہ منٹوں میں ہمارا یعنی میرا اور ماں جی کا ڈھیروں خون خشک ہوا تھا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ سیاہ جیپ گاؤں کے باہر تک پیچھے رہی پھر وہیں رک گئی۔ اس نے گاؤں والے راستے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔

حویلی میں آ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ ماں جی پریشان تھیں۔ صباحت نے جیپ کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ کچھ دیر میں بابا آ گئے تو اس نے انہیں جیپ کا نمبر بتایا۔ نمبر سیالکوٹ کا تھا۔ اتفاق سے بابا کا ایک شاگرد وہیکل رجسٹریشن آفس میں کام کرتا تھا۔ بابا نے کال کر کے اسے نمبر بتایا اور جیپ کے مالک کے بارے میں پوچھا۔ اس نے چھان بین کر کے اگلے دن بتایا کہ جیپ کا مالک کوئی میاں نیاز احمد ہے اور پتا شکر گڑھ کا ہے۔ مگر جب مزید چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ جیپ میاں نیاز احمد کے نام پر تھی لیکن یہ وہ جیپ نہیں تھی جو ہماری گاڑی کے پیچھے لگی رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جعلی نمبر پلیٹ استعمال کر رہی تھی۔ بابا اور ہم مزید پریشان ہو گئے تھے۔ بابا اور ماں جی کے ذہن میں وہی بات تھی کہ سیاہ جیپ میں ڈاکو تھے مگر مجھے یقین تھا کہ اس میں مظفر چودھری خود یا اس کے آدمی تھے اور وہ میرے پیچھے

آ ئے تھے۔

مجھے ایک بار پھر خیال آیا کہ بابا نہ سہی ماں جی کو بتا دوں کہ مظفر چودھری میرے پیچھے ہے۔ مگر میں کہہ نہ سکی شرم، جھجک اور خوف سب مانع آئے تھے۔ سکینہ نے جب مجھے یہ بات بتائی تو اس کو مہینے سے اوپر ہو گیا تھا اور میرا خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا مگر آج کے واقعے نے اس خوف کو نہ صرف تازہ کر دیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا۔ بابا نے پابندی لگا دی کہ اب میں اور ماں جی ان کے بغیر حویلی سے باہر نہیں جائیں گے۔ صباحت کو حکم دیا کہ حویلی کا بڑا گیٹ اب دن میں بھی بند ہوگا اور چھوٹا گیٹ اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد کسی کے لیے کھولا جائے گا۔ میں تو خود یہی چاہتی تھی کہ گھر میں رہوں اور باہر نہ جاؤں۔ اس لیے بابا کے فیصلے سے خوشی ہوئی۔ مگر بابا اور ماں جی دونوں سمجھ رہے تھے کہ یہ ڈاکوؤں کا چکر تھا۔ ماں جی نے بابا سے کہا کہ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ''آپ پولیس میں رپورٹ کریں آخر آپ کے اتنے شاگرد پولیس میں ہیں۔''

''وہ بھی کروں گا اور یہ مسئلے کا حل نہیں احتیاط ہے۔'' بابا نے سمجھایا۔

''بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' میں نے بابا کی تائید کی تو وہ خوش ہو گئے۔

''میری بیٹی ماں سے زیادہ سمجھدار ہے۔''

ماں جی خفا ہو گئیں۔ ''ہاں، میں ہی ناسمجھ ہوں۔''

ہماری زمینیں ٹھیکے پر تھیں۔ دادا نے بارہ ایکڑ زمین لی تھی مگر بعد میں بابا اور ان کے بھائیوں نے کوشش کر کے اسے ایک مربع کر لیا تھا اور اب بھی زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ نئی زمینیں لے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بے شک ملازمت یا بزنس کیا جائے گا مگر ایک بنیاد کے طور پر زمین رکھی جائے اور اسے بڑھایا جائے۔ یہ اب تک مشترک تھی اور اگر کوئی اپنے حصے سے دست بردار ہوگا تو دوسرا اسے خرید لے گا۔ کسی اور کو فروخت نہیں کی جائے گی۔ مگر ساتھ ہی زمین کے معاملات اوپن رکھے جائیں گے ہر کسی کو معلوم تھا کہ اس کی زمین اتنی تھی اور یہاں تھی۔ بعد میں تنازعات سے بچنے کے لیے بابا اور ان کے بھائیوں نے یہ انتظام کیا تھا۔ انہوں نے اگلی نسل سے کہہ دیا تھا کہ ان کے بعد زمین خاندان کی سطح پر تقسیم کر لی جائے اور ہر خاندان اپنی زمین کا خود ذمے دار ہوگا۔

بابا نے دونوں بھائیوں کو بھی سیاہ جیپ اور اس میں سوار مشکوک افراد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ سیف الرحمٰن ان دنوں بی بی اے میں داخلے کا ٹیسٹ دینے اسلام آباد عبید بھائی کے پاس گیا ہوا تھا۔ اگر اس کا داخلہ ہو جاتا تو وہ وہیں رہتا۔ گویا حویلی میں صرف بابا رہ جاتے۔ سیف اگرچہ صرف سولہ سال کا تھا مگر مرد تھا اس کے ہونے سے جو ڈھارس ہو سکتی تھی اب وہ نہیں تھی۔ بھائیوں نے بابا کو مشورہ دیا کہ وہ اضافی گارڈز رکھ لیں اور اب مجھے اور ماں جی کو باہر بھیجیں تو ہمارے ساتھ کم سے کم دو افراد ہوں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بھی عبید بھائی کے پاس چلی جاؤں۔ بے شک کچھ عرصے کے لیے تو شاید میرے لیے بہتر ہو۔ میں نے ماں جی سے کہا تو انہوں نے منع کر دیا۔ ''میں اکیلی رہ جاؤں گی۔''

''ماں جی بس کچھ عرصے کے لیے۔''

ماں جی نے پھر انکار نہیں کیا مگر ان کے موڈ سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شاید ہی اجازت دیں۔ میں نے بابا سے اجازت لینے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے سوچا کہ سرما میں پیپرز کی تیاری کر لوں اور بہار میں اسلام آباد جاؤں۔ ابھی تو وہاں یہاں سے زیادہ ٹھنڈ شروع ہو گئی تھی۔ سیف کی کال آئی تو اس نے بتایا کہ غضب کی سردی ہے اور کمبل سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔ سردی یہاں بھی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ہاں شام کے بعد کھلے میں نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میں پیپرز کی تیاری اور گھر کے کام دن میں نمٹا لیتی تھی۔ شام سات بجے ہم کھانا کھا لیتے تھے اور اس کے بعد میرا وقت شروع ہوتا جب میں ہوتی اور کتابیں رسالے ہوتے تھے۔

بابا نے نہ صرف ہمیں مطالعے کا شوق دلایا تھا بلکہ ہمارے گھر میں ڈھیروں کتابیں بھی تھیں۔ ایک بڑا سا کمرا لائبریری کا روپ اختیار کر گیا تھا اور اس میں بلاشبہ ہزاروں کتابیں تھیں۔ ہر مہینے درجنوں کے حساب سے نئی کتابیں، درجن سے اوپر مختلف رسائل اور روزانہ کئی اخبارات آتے تھے۔ ہفتہ وار رسائل اس کے علاوہ تھے۔ کتابیں بابا خود لاتے تھے۔ مجھے دقیق موضوعات پسند نہیں تھے۔ فکشن کے علاوہ ہلکے پھلکے موضوعات پر کتابیں پڑھتی تھی۔ رات کو پڑھنے کے لیے پہلے سے کچھ منتخب کر لیتی اور موڈ کے لحاظ سے اپنے لیے چائے یا کافی بنا کر میں رضائی میں گھس کر مطالعے میں مگن ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی ایس ایم ایس آ جاتا تو اسے دیکھ لیتی، جواب دینے کا موڈ ہوتا تو دیتی ورنہ صبح تک

کے لیے ملتوی کر دیتی۔ میں نئے ماہ کا ایک ڈائجسٹ دیکھ رہی تھی کہ ایس ایم ایس ٹون بجی۔ میں نے میسج کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''تم مجھے اچھی لگی ہو۔ اس لیے تمہارا نمبر حاصل کیا ہے۔''

میرا دل ایک لمحے کو رکا تھا۔ میرے پاس دو سال سے موبائل تھا اور مجھے آج تک ایسا کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا تھا۔ میرے دل نے بے ساختہ گواہی دی کہ یہ میسج مظفر چودھری کی طرف سے تھا۔ میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ مجھے لگا کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ میں عام طور سے رات کو دروازہ اندر سے بند نہیں کرتی تھی کیونکہ ماں جی رات کو چکر لگاتی تھیں اور مجھے دیکھتی تھیں مگر اس وقت میں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر میں نے میسج ڈیلیٹ کر دیا اور پھر اس نمبر کو بلاک کر دیا۔ میں نے بلاک سروس لی ہوئی تھی۔ موبائل رکھ کر میں نے پھر رسالہ اٹھالیا مگر میرا دل اب مطالعے میں نہیں تھا۔ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اگر یہ میسج مظفر چودھری کی طرف سے تھا تو اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پوری طرح میرے پیچھے پڑ چکا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی چیز کے پیچھے پڑ جائیں تو اسے حاصل کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ وہ اس کی قوت بھی رکھتا تھا۔ میں اتنی ٹینشن میں تھی کہ ایس ایم ایس کی ہلکی سی ٹون بجی تو میں اچھل پڑی تھی۔ میں نے ایس ایم ایس کھول کر دیکھا۔ اس بار یہ دوسرے نمبر سے آیا تھا۔ مگر کیا اسی نے کیا تھا۔

''تم کتنے نمبرز بلاک کرو گی۔ یقین کرو میری جان تم بلاک کر کر کے تھک جاؤ گی مگر میرے پاس نمبرز ختم نہیں ہوں گے۔''

اس بار اس کے طرزِ تخاطب نے میری جان نکال دی تھی۔ وحید میرا منگیتر تھا مگر اس نے آج تک مجھے یوں مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر اپنا پورا حق سمجھ رہا ہے۔ پانی سر سے اونچا ہو رہا تھا اور میں اب بابا اور ماں جی کو بتانے کا سوچ رہی تھی۔ مگر میں یہ میسج کیسے دکھاتی؟ شرم سے مر جاتی۔ اب میں پچھتائی کہ پہلا میسج کیوں ڈیلیٹ کیا۔ بے شک نمبر بلاک کر دیتی مگر میسج رکھتی تو بابا اور ماں جی کو دکھا سکتی تھی۔ پھر یہ بھی واضح نہیں تھا کہ میسج بھیجنے والا کون ہے۔ اگر میں مظفر چودھری کا نام لیتی تو بابا مجھ سے پوچھتے کہ مجھے کیسے پتا چلا؟ اور جب میں سکینہ کا بتاتی تو پھر یہ سوال سامنے آتا کہ میں نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ بلا وجہ بابا کے ذہن میں شک آ جاتے۔ میرے حوالے سے ان کے ذہن میں شک آئے اس سے زیادہ بہتر میں یہ سمجھتی کہ مجھے موت آ جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ریت میں گردن چھپانے سے کام نہیں چلے گا مجھے اس مسئلے کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں نے ہمت کر کے میسج کیا۔

''کون ہو تم اور تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ میسج کرنے کی؟''

ایک منٹ سے بھی پہلے اس کا جواب آیا۔'' جانی میں تمہارا سب سے بڑا عاشق ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے دن رات کا چین حرام ہو گیا ہے اب تو تم پاس آؤ گی تو سکون ملے گا۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق تمہیں پتا چل گیا ہے ناں کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

مجھے سخت سردی کے موسم میں بھی پسینا آ گیا تھا۔ میں نے لکھا۔'' تم سخت واہیات آدمی ہو اور تمہاری ماں بہن نہیں ہیں جو تم کسی غیر لڑکی کو اس طرح کے میسج کر رہے ہو۔ اب مجھے کوئی میسج مت کرنا میں جواب نہیں دوں گی اور میں اپنے ماں باپ کو بتا رہی ہوں۔''

''بتا دو گڑیا میں کسی سے ڈرنے والا شخص نہیں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد بھی اس کے میسج آتے رہے لیکن میں نے انہیں کھولا نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مزید بکواس کرے گا۔ میں نے موبائل آف کر کے رکھ دیا اور فیصلہ کیا کہ صبح ماں جی کو دکھاؤں گی وہ خود بابا کو دکھا دیں گی۔ یہ سوچ کر میں کسی قدر مطمئن ہو گئی تھی کہ میرے سر پر میرے بڑے میرے محافظ تھے اور وہ مجھے محفوظ رکھتے۔ اطمینان کے باوجود رات دیر سے نیند آئی۔ میرے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ دیر سے سوئی تو صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ آنکھ بھی دروازہ بجنے سے کھلی۔ باہر ماں جی تھیں۔ پہلے انہوں نے دروازہ بند کرنے کا پوچھا کہ کیوں بند تھا اور پھر میرا چہرہ دیکھا اور فکر مند ہو گئیں۔

''تو ٹھیک ہے نا؟''

''سر میں درد ہے ماں جی۔''

انہوں نے میرا ماتھا چھوا۔'' بخار بھی ہے۔ چل تو ناشتا کر لے میں تجھے دوا دیتی ہوں۔''

''بابا کہاں ہیں؟''

''وہ آج جلدی چلے گئے۔ اسکول سے انہیں کسی میٹنگ میں جانا ہے کہہ رہے تھے آج دیر سے آئیں گے۔''

میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ سورج نکل آیا تھا مگر بادلوں کی وجہ سے ہلکی سی دھوپ تھی۔ مجھے سردی لگی تو میں اندر چلی آئی۔ ماں جی نے جبراً دودھ کا بڑا والا گلاس پلایا اور پھر دوا دی تھی۔ میں دوا لے کر لیٹ گئی۔ میں نے ماں جی کو بتانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کہ جب بابا آئیں گے تب ماں جی کو بتاؤں گی اور پھر وہ بابا سے بات کریں۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے سو گئی اور دوپہر تک سوتی رہی۔ اٹھی تو طبیعت بہتر تھی۔ باہر آئی تو پتا چلا کہ ماں جی ہمارے ایک پڑوسی ملک اصغر علی کے گھر گئیں ہیں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ملک اصغر علی ہمارے دور کے پڑوسی تھے، ان کی حویلی کئی مکانات چھوڑ کر تھی۔ بابا سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ملک صاحب کے والد بہت بوڑھے اور خاصے عرصے سے بیمار تھے۔ سفینہ بی بی نے بتایا کہ آج صبح اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور عصر کے وقت تدفین تھی۔ کچھ دیر میں ماں جی آ گئیں۔ انہوں نے کہا۔

''تیرے بابا کو اطلاع کر دی ہے مگر وہ دور ہیں انہیں آنے میں دیر لگے گی۔''

''تب آپ چلی جایئے گا۔''

''تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تجھے چھوڑ کر کیسے جاؤں۔''

میں ہنسی۔ ''میں بچی تھوڑی ہوں جو آپ کے بغیر رہ نہیں سکوں گی۔''

''سفینہ۔'' ماں جی نے سفینہ بی بی سے کہا۔ ''تو رک جانا جب تک میں نہیں آتی۔''

''ٹھیک ہے بی بی جی۔'' وہ بے دلی سے بولی۔ اسے شام کے وقت جانے کی جلدی ہوتی تھی کیونکہ ریحان چار بجے گھر آ جاتا تھا۔ سفینہ اسے گھر جا کر کھانا دیتی۔ ویسے سارا دن بہت پھرتیلی اور چاق و چوبند رہتی تھی لیکن جہاں شام کا وقت قریب آتا سفینہ بی بی سست ہو جاتی اور اگر دیکھتی کہ کام زیادہ ہو گیا ہے کسی تکلیف یا بیماری کے بہانے سے سرک جاتی تھی۔ ماں جی سمجھتی تھیں اس لیے اگر کام نہیں ہوتا تو اسے جلد جانے کی اجازت بھی دے دیتی تھیں۔ اس وقت بھی سفینہ بی بی کو فکر لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح جلد گھر چلی جائے۔ اس نے دبے لفظوں میں ماں جی سے کہا۔ ''بی بی ذرا جلدی آیئے گا وہ ریحان......''

''پتا ہے، پتا ہے۔'' ماں جی نے تیز لہجے میں

مثبت سوچ

آپ کی شخصیت کو، آپ کی صحت کو، آپ کی تخلیقی صلاحیت اور آپ کی جرأت پر تعمیری اثرات مرتب کرتی ہے۔ آپ کی سوچ جتنی زیادہ مثبت ہو گی آپ کی زندگی اتنی ہی زیادہ خوشگوار ہو گی۔ منفی سوچ کا اثر بالکل الٹ ہوتا ہے۔ یہ آپ کو کمزور کر دیتی ہے اور آپ میں اعتماد کی کمی واقع کر دیتی ہے۔ جب آپ منفی سوچتے ہیں یا منفی گفتگو کرتے ہیں تو آپ اپنی طاقت کو ختم کر رہے ہوتے ہیں جب آپ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں یا دفاعی انداز اپناتے ہیں تو اس طرح آپ گھٹن، دباؤ اور ناخوشگواری کا شکار ہوتے ہیں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔ آپ جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ منفی سوچ آپ کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے مثبت سوچ آپ کی ذہنی صحت کو بہتر بناتی ہے اور آپ کی کارکردگی کو عروج پر لے جاتی ہے۔

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

کہا۔ ''ایک دن ذرا دیر سے روٹی ملے گی تو مر نہیں جائے گا تیرا پتر۔''

ماں جی عصر سے ذرا پہلے چلی گئی تھیں۔ میں نشست گاہ میں بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ عصر کے بعد وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ماں جی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ٹی وی بند کر کے اٹھ رہی تھی کہ سفینہ بی بی اندر آئی اور اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کو بی بی صاحبہ بلا رہی ہیں۔''

وہ امی کو بی بی صاحبہ کہتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''امی آ گئی ہیں؟''

''نہیں جی وہ آپ کو ملک صاحب کے ہاں بلا رہی ہیں۔'' سفینہ بی بی نے جواب دیا۔ میں حیران ہوئی۔

''ملک صاحب کے ہاں لیکن کیوں؟''

''مجھے نہیں پتا بی بی جی پر انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو بھیج کر میں چھٹی کروں۔''

سفینہ بی بی کچھ بے چین سی تھی میں سمجھی کہ وہ چھٹی کے نام پر بے تاب ہو رہی ہے۔ میں نے چادر لی اور باہر آئی تو سفینہ بی بی صحن میں موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''بی بی آپ چلیں میں ذرا یہ چاول اندر رکھ کر آتی ہوں۔''

امی نے چاول ابال کر خشک ہونے کے لیے دھوپ

میں رکھوائے تھے۔ میں گیٹ کی طرف بڑھی۔ صباحت نے مجھے آتے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں باہر نکلی اور ملک صاحب کی حویلی کی طرف جانے لگی۔ پہلے میں نے سوچا کہ سفینہ بی بی کا انتظار کر لوں لیکن یہ سوچ کر کہ کہیں دیر نہ ہو میں خود ہی جانے لگی۔ ان کی حویلی کے راستے میں مشترک باغ آتا تھا۔ میں اسی سے گزرنے لگی۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ آسمان پر گھرے بادلوں کی وجہ سے تاریکی وقت سے پہلے چھا رہی تھی اور درختوں کے نیچے تو اندھیرا سا تھا۔ اس وقت باغ میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے ڈر لگا مگر ہمت کرکے آگے بڑھتی رہی۔ جب تک میں باغ میں داخل ہوئی سفینہ بی بی حویلی سے نہیں نکلی تھی۔

میں باغ کے وسط تک پہنچی تھی کہ اچانک کوئی تاریکی سے نکل کر جھپٹا اور اس سے پہلے کہ میرے منہ سے آواز نکلتی سائے نے میرا منہ دبا لیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑا تھا جس سے تیز بُو اٹھ رہی تھی میں نے تڑپ کر اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانا چاہا مگر وہ دوسرے ہاتھ سے مجھے جکڑ چکا تھا۔ وہ متوسط قامت تھا لیکن مضبوط مرد تھا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ کپڑے سے اٹھتی تیز بو میرے دماغ پر چڑھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔ پھر میں چکرا کر گرنے لگی۔ مگر گرتی کہاں سے کیونکہ مجھے تو اس شخص نے جکڑ رکھا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں بے حس ہو گئی ہوں تو اس نے مجھے آرام سے نیچے لٹایا اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ میں نے کیونکہ کپڑا منہ پر لگنے کے بعد سانس روک لی تھی اس لیے بو مجھ پر اتنی اثر انداز نہیں ہوئی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتی۔ ایک دو ہلکی پھلکی سانسیں لی تھیں جن سے بو میرے دماغ پر چڑھ گئی اور اس کے اثر سے میں نیم غشی کی کیفیت میں تھی۔ مگر بے ہوش نہیں ہوئی تھی اور آس پاس کی آوازیں سن رہی تھی۔ البتہ جسم یا زبان ہلانے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میرا جسم میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اتنے میں کوئی آیا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اسے لے کر نہیں گئے۔ میرا پتر کہاں ہے؟''

میں دنگ رہ گئی تھی کیونکہ آواز سفینہ بی بی کی تھی۔ مجھے جکڑنے والے نے بھی آہستہ سے کہا۔ ''فکر نہ کرو وہ گھر پہنچ جائے گا۔ تم دونوں ماں بیٹے اپنی زبان بند رکھنا۔ اگر کسی نے زبان کھولی تو ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے گی۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ اسی اثنا میں وہاں کوئی اور بھی آ گیا اور ان دونوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور کہیں لے جانے لگے۔ میں قطعی بے بس تھی۔ آج تک مجھے کسی غیر مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اب میں یوں بے بس تھی کہ وہ جیسے چاہے مجھے پکڑ اور چھوڑ رہے تھے۔ مگر ان کے انداز میں سفلاپن نہیں تھا اور نہ ہی وہ بات کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ مجھے خاموشی سے کہیں لے جائیں۔ میرا سر اب پہلے سے زیادہ چکرا رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اندازہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ یقیناً مظفر چودھری کا پلان تھا۔ اس نے کسی طرح سفینہ بی بی کو ساتھ ملایا تھا۔ شاید اس نے ریحان کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور پھر سفینہ بی بی کی مدد حاصل کی۔ اس کی مدد سے مجھے حویلی سے باہر آنے پر مجبور کیا۔ ملک صاحب کی حویلی تک جانے کا راستہ باغ سے گزرتا تھا اس لیے یہ لوگ وہاں میرے منتظر تھے اور جب میں گزرنے لگی تو مجھے قابو کر لیا۔ چکر بڑھ رہے تھے اور آخری احساس یہ تھا کہ مجھے کسی کار کی ڈکی میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک کھردری بان کی چارپائی پر بندھی پڑی تھی۔ نہ صرف میرے ہاتھ پاؤں تختی سے بندھے ہوئے تھے بلکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اوپر سے مجھ پر بھاری کمبل پڑا ہوا تھا جس سے نہایت ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ مگر نیچے چادر بھی نہیں تھی اور کھلی بان سے یخ ہوا آ کر میرے جسم کو سرد کر رہی تھی۔ مگر مجھے سردی سے زیادہ اپنی عزت آبرو کی پروا تھی میں نے اپنا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ کسی نے اب تک میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی ہے۔ میرا لباس بھی ٹھیک تھا۔ البتہ دوپٹا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر بس ناک سے معمولی سی آواز نکلی۔ اپنی بے بسی اور اس سے زیادہ آنے والے وقت کے خوف نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ پھر میں نے کوشش کرکے سر سے کمبل سرکایا۔ جس کی بدبو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔

اندر تاریکی تھی اس لیے جب سر نکالا تو معمولی سے سو واٹ کے پیلے بلب کی روشنی نے بھی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ بلب عین میرے سر پر روشن تھا۔ چند لمحے کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کھول کر دیکھا تو خود کو ایک کچی کوٹھری میں بند پایا۔ کچی دیواروں پر لکڑی کی بلیاں لگی تھیں اور ان پر مٹی لیپ کر چھت بنائی گئی تھی۔ کوٹھری زیادہ

بڑی نہیں تھی۔ مشکل سے دس فٹ لمبی اور ساتھ فٹ چوڑی تھی۔ اس میں ایک سنگل چارپائی تھی جس پر میں پڑی تھی اور مخالف سمت میں ایک اور سنگل چارپائی تھی۔ درمیان میں کوٹھری کا دو پٹ والا دروازہ تھا جو بند تھا۔ پتا نہیں میں کہاں تھی اور میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ مجھے اتنا یقین تھا کہ مجھے اغوا کرانے والا مظفر چودھری تھا۔ میں اسی کے کسی ٹھکانے پر تھی۔ میں کانپنے لگی تھی مگر سردی سے نہیں خوف سے۔ پھر مجھے ماں جی اور بابا کا خیال آیا ان پر میری گم شدگی سے کیا گزر رہی ہوگی۔

یہاں وقت بتانے والی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ ہی باہر سے کوئی آواز آرہی تھی۔ ایسا سناٹا تھا جس میں دور کہیں جھینگر بول رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ میری گم شدگی کے بعد یقیناً ماں جی نے سفینہ بی بی سے پوچھ گچھ کی ہو گی کہ میں کہاں گئی کیونکہ امی مجھے اس پر چھوڑ کر گئی تھیں۔ مجھے اُمید ہوئی کہ شاید بابا اور ماں جی اس سے سختی سے پوچھیں تو وہ اگل دے کہ اس نے مجھے کن لوگوں کے حوالے کیا ہے۔ مگر جب مجھے اغوا کرنے والے کی دھمکی یاد آئی جو اس نے سفینہ بی بی کو دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اسے اور اس کے بیٹے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دیں گے۔ اس کے بعد سفینہ بی بی کے لیے زبان کھولنا بہت مشکل تھا۔ مظفر چودھری اپنی دھمکی پر عمل کرنے والا شخص تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے اندر اُمید کا جو چراغ جل اٹھا تھا۔ وہ بجھنے لگا۔

میں بے بس تھی میرے ساتھ کچھ بھی ہو جاتا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد شاید مظفر چودھری مجھے قتل کر کے خاموشی سے کہیں دفنا دیتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی خوب صورتی سے نفرت محسوس ہوئی تھی نہ میں اتنی خوب صورت ہوتی اور نہ مظفر چودھری کی غلیظ نظریں مجھ پر پڑتیں اور وہ مجھے اغوا کرنے کا سوچتا اور اس پر عمل کرتا۔ کاش کہ میں عام سی شکل و صورت والی لڑکی ہوتی۔ کم سے کم اس آفت سے تو بچتی جس میں اس وقت گرفتار تھی۔ مگر یہ سب میری تقدیر میں تھا۔ شاید میں خوب صورت نہ ہوتی تب بھی میرے ساتھ یہی ہوتا۔ میرا ذہن میرے قابو میں نہیں تھا اور بے ربط سوچیں میرے دماغ میں چکرا رہی تھیں۔ کبھی میں سوچتی کہ کاش ایسا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی اور کبھی مجھے اپنے گھر والوں کا خیال آتا۔ کبھی اپنے انجام کی فکر لگ جاتی۔

مگر رفتہ رفتہ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے خود سے کہا کہ اگر مجھے یہاں سے نجات حاصل کرنی ہے تو مجھے اس کے لیے خود کوشش کرنا ہو گی۔ سب سے پہلے مجھے خود کو آزاد کرانا تھا۔ میں نے ہاتھوں پر زور آزمائی کی۔ مجھے سوتی رسی سے باندھا گیا تھا اور اس کی بندش بہت سخت تو نہیں تھی مگر جہاں گرہ لگی تھی وہاں سے یہ ذرا بھی نرم نہیں ہو رہی تھی۔ میں کوشش کرتی رہی اور جلد محسوس کر لیا کہ اس طریقے سے میں خود کو آزاد نہیں کرا سکوں گی۔ میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھی اور خود پر سے کمبل ہٹا دیا۔ میرے جسم پر ویلوٹ کے شلوار قمیص کے علاوہ سوئیٹر تھا۔ حویلی سے نکلتے ہوئے دوپٹا اور گرم چادر بھی تھی اور یہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ کمبل ہٹا تو میں ایک لمحے کو لرز اٹھی تھی سردی بہت شدت کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہوئی تھی جس سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔

باہر بادل ہلکے سے گرجے تو بارش کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرے پاؤں اس طرح بندھے تھے کہ دونوں پیروں میں رسی سے الگ گرہ لگا کر ان کو آپس میں ملا دیا گیا تھا اور یوں میرے پاؤں کسی قدر آزاد تھے۔ میں کوشش کر کے چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ مجھے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے میں رسی کاٹ سکوں۔ مگر یہاں سوائے چارپائیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں پیروں کو معمولی سی حرکت دیتی یخ بستہ زمین پر دوسری چارپائی کی سمت بڑھی۔ میرے پیروں سے چپل بھی غائب تھی۔ زمین جیسے برف کی ہو رہی تھی۔ کسی طرح میں دوسری چارپائی تک پہنچی اور اس پر پڑا کمبل بندھے ہاتھوں سے سرکانے لگی۔ خوش قسمتی سے میرے ہاتھ سامنے کی طرف بندھے تھے ورنہ میں یہ معمولی سا کام بھی نہ کر پاتی۔ کمبل ہٹایا تو مجھے اس کے نیچے ایک پاؤچ سا نظر آیا۔

میں نے بے تابی سے اسے اٹھایا اور کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ اصل میں ریگزین اور چپکنے والی پٹی سے بنی پاؤچ تھی جس میں اوزار رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس کو کھولا تو اندر سے چھوٹے چھوٹے اوزار گرے۔ ان میں ایک نیل کٹر نما آلہ تھا۔ اس میں متعدد چیزیں تھیں۔ میں نے بہ مشکل ان میں موجود چھوٹا سا چاقو کھولا۔ اس چکر میں میرا ایک ناخن بھی ٹوٹ گیا۔ مگر مجھے ایک اُمید نظر آئی کہ میں خود کو تو آزاد کرا سکتی تھی۔ چاقو زیادہ تیز نہیں تھا اور اس کا پھل بھی چھوٹا تھا اس لیے میں نے بہت مشکل سے انگلیاں موڑ کر اسے رسی تک پہنچایا اور رسی کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ چاقو کی

دھار تیز نہیں تھی اور یہ چھوٹا بھی تھا۔ میں دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی اور کئی بار چاقو میری کلائی میں بھی لگا۔ زخم آئے اور مجھے تکلیف ہوئی تھی۔ میرے آنسو نکل رہے تھے مگر میں نے کوشش جاری رکھی۔

نہ جانے کب تک میں رسی پر چاقو رگڑتی رہی اچانک رسی ڈھیلی ہوئی اس کے بل کا بڑا حصہ کٹ گیا تھا۔ اس لیے وہ ڈھیلی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد کام آسان تھا۔ ایک منٹ میں میرے ہاتھ آزاد ہوگئے تھے اور میں کلائیاں مسل رہی تھی جن پر نشان پڑ گئے تھے۔ پھر میں نے اپنے پاؤں آزاد کیے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند نکلا۔ میں نے زور لگانے سے گریز کیا کیونکہ دونوں پٹ ہل رہے تھے اور آوازیں نکال رہے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کسی نے سن لیا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں ہاتھ پیروں سے آزاد ہوگئی ہوں۔ دروازہ باہر سے زنجیر لگا کر بند کیا گیا تھا۔ یہ پرانا طریقہ تھا جو اب گاؤں دیہات میں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ پٹ ہلتے تو زنجیر کھنکتی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گئی اور چارپائی پر آگئی کیونکہ زمین بہت سرد تھی اور میرے پاؤں یخ ہو گئے تھے۔ میں سمٹ کر بیٹھ گئی اور خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ آزادی کی کوئی اُمید نظر نہیں آرہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں؟

اچانک میری نظر اس چاقو پر گئی جس سے میں نے رسی کاٹی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ تیز دھار نہیں تھا لیکن اگر میں اسے اپنی کلائیوں پر آزماتی تو یہ میری کلائی کی نسیں کاٹ سکتا تھا۔ مگر جب میں نے سوچا کہ میں اپنے ہاتھ خود کاٹوں گی تو میں لرز اٹھی تھی۔ میں اس معاملے میں بہت کم ہمت تھی۔ مجھے تو انجکشن کی سوئی سے خوف آتا تھا۔ ہلکی سی چوٹ لگ جاتی تو میں رو دیتی تھی۔ عزت مجھے جان کے مقابلے میں زیادہ پیاری تھی۔ مگر میں خودکشی نہیں کرسکتی تھی۔ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے لیکن اصل بات یہ تھی کہ مجھ میں خودکشی کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں خودکشی نہیں کرسکتی تھی مگر ان لوگوں کو دھمکی تو دے سکتی تھی کہ اگر کسی نے میرے پاس آنے کی کوشش کی تو میں اپنی شہ رگ کاٹ لوں گی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مظفر چودھری جیسے لوگوں پر اس دھمکی کا کیا اثر ہوگا؟

میں ایک بار پھر منتشر الخیال ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ کیسے خود کو اور اپنی عزت کو بچاؤں؟ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کوٹھری کے باہر سے زنجیر کھنکنے کی آواز آئی اور میری حالت خراب ہو گئی۔ میں نے چاقو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے گلے کے پاس کر لیا مگر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ جان کو تو نہیں مگر اس طرح میں خود کو چاقو مار لوں گی۔ آنے والا اجنبی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر مسکرایا۔ ”مرنا چاہتی ہے؟“ اس نے کہا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”چل اپنا گلا کاٹ کر دکھا۔“

میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھ گئی تھی مگر میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”مجھے جانے دو ورنہ میں مر جاؤں گی مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔“

”یہی تو کہہ رہا ہوں چل شاباش اپنا گلا کاٹ لے۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ اچانک چاقو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں اپنے آپ میں سمٹ کر رونے لگی تھی۔ میرے منہ سے التجائیں نکل رہی تھیں۔ ”خدا کے لیے مجھے جانے دو، تمہیں اللہ، اس کے پیارے رسول ﷺ کا واسطہ مجھے جانے دو، میں شریف لڑکی ہوں۔ میرے ماں باپ مر جائیں گے۔“

”چپ کر۔“ اس نے اچانک اٹھ کر میری چوٹی پکڑ کر کھینچا تو میں بے اختیار اٹھتی چلی آئی۔ ”نخرے مت کر...... اگر تو نے کوئی حماقت نہیں کی تو صبح تک تجھے گھر چھوڑ دیں گے۔“

اس نے اتنی بے دردی سے بال کھینچے تھے کہ میرے سر میں شدید درد ہو گیا تھا۔ میں چلا اٹھی تھی مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر مجھے کھینچتا ہوا کوٹھری سے باہر لایا۔ میں خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کوٹھری کے باہر چھوٹا سا کچا صحن تھا اور اس کے پار ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جس پر کھپریل کی چھت تھی۔ احاطہ زیادہ بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ کم سے کم اس جگہ یہ مشکل سے چالیس فٹ چوڑا تھا۔ کاٹیج کے آگے کیا تھا میں اس سے بے خبر تھی۔ وہ کھینچ کر مجھے کاٹیج کے برآمدے تک لایا اور پھر واحد دروازہ کھولتے ہوئے اندر دھکا دیا۔ میں لڑکھڑاتی ہوئی اندر قالین پر جا گری تھی۔ یہ سجا ہوا بیڈروم تھا اور شاندار قسم کے بیڈ پر نیم دراز شخص ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے ہوئے تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ مظفر چودھری نہیں بلکہ سکینہ کے چچا کا لڑکا فضل تھا۔

میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر مکروہ پن اور ایسے تاثرات تھے جیسے کسی بھیڑیے نے کوئی بھیڑ دیکھ لی ہو۔ میں بے اختیار خود میں سمٹ گئی۔ مجھے لانے والا اندر آیا اور اس نے فضل سے کہا۔ ''یاد رکھنا تیرے بعد ہماری باری ہے۔ صبح سے پہلے یہ قصہ ختم کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس اپنا کام شروع کرے۔''

''فکر مت کر ابھی تو پوری رات پڑی ہوئی ہے۔'' فضل نے کہا۔ ''اب تو جا اور چوکس رہنا کوئی آئے تو مجھے خبردار کرنا۔''

مجھے لانے والا سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی فضل اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ ایک طرف آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور کمرا گرم تھا۔ آتش دان دیکھ کر مجھے خیال آیا اور میں اچانک اٹھ کر اس کی طرف بھاگی۔ مگر مجھے آتش دان تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا اس سے پہلے فضل نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بستر پر پھینک دیا اور ایک گندی گالی دے کر بولا۔ ''تو کیا سمجھتی ہے بہت ہوشیار ہے تو...... دیکھ کیسے میرے قابو میں آئی ہے۔''

''میں تیری کزن کی سہیلی ہوں۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''اس کا خیال کر لے۔''

''اس کا خیال بھی کروں گا۔'' وہ بھیانک انداز میں مسکرایا۔ اسی لمحے باہر بادل گرجے اور اس بار آواز بہت تیز تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کھپریل کی چھت پر بوندیں گرنے کی آواز بہت تیز تھی۔ فضل اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔

''اچھا ہے بارش اور بجلی کے شور میں تیرا شور دب جائے گا۔ ویسے یہاں کوئی پکار سننے والا نہیں ہے۔''

''ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''وہ تو ہے جو ہر جگہ ہوتا ہے اور سب کی سنتا ہے۔''

''تو بس اسی کو پکار، مگر میرا مزہ خراب مت کرنا۔'' اس نے قمیص بھی اتار دی اور بستر کی طرف بڑھا تھا کہ عجیب سی سنسناتی آواز آئی۔ فضل ٹھٹک گیا تھا۔ آواز جیسے آسمان کی طرف سے آئی تھی۔ پھر اچانک کوئی چیز چھت توڑتی ہوئی فضل کے عقب میں گری تھی۔ میں سرکتے ہوئے بیڈ کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی لیے جب خوفناک دھماکا ہوا اور فضل کے عقب میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تو میں جیسے خود بہ خود ہی بیڈ کے دوسری طرف گری تھی۔ دھماکا ایسا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے کان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ میں دوسری طرف گری تھی اور مجھ پر نہ جانے کیا کیا چیزیں گر رہی تھیں۔ ان میں ٹھوس چیزیں بھی تھیں اور پانی بھی تھا جس نے مجھے شرابور کر دیا تھا۔ میں نے منہ فرش کی طرف کر لیا تھا اور خود میں سمٹ گئی تھی۔

جب چیزوں کی بارش رکی تو میں نے حرکت کی اور خود پر آنے والی چیزیں ہٹانے لگی۔ یہ ملبہ تھا ہٹاتے ہوئے کوئی چیز میرے ہاتھ میں آئی اور میں نے محسوس کیا کہ انسان کا ہاتھ تھا مگر وہ اتنی آسانی سے کیسے میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یہاں لائٹ تھی مگر دھماکا ہوتے ہی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ البتہ جا بہ جا لگی آگ سے یہاں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بلند کیا تب دیکھا کہ وہ کہنی سے نیچے سے کٹا ہوا انسانی ہاتھ تھا جس سے نسیں اور گوشت جھانک رہا تھا۔ یہ یقیناً فضل کا ہاتھ تھا میں نے چیخ مار کر اسے دور پھینکا۔ کمرے کی حالت بگڑ گئی تھی بلکہ اب کمرا کہاں رہا تھا کیونکہ اس کی چھت اور دو طرف کی دیواروں کا بڑا حصہ غائب ہو گیا تھا اور اس طرف سے باہر کی تاریکی، بارش اور رہ رہ کر چمکنے والی بجلی دکھائی دے رہی تھی۔ میں بہ مشکل اٹھی اور ملبے سے ہوتی ہوئی باہر آئی۔

یہ کاٹیج کے سامنے والا حصہ تھا۔ احاطے میں ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس کے پار گیٹ تھا۔ کاٹیج میں برابر دو کمرے تھے۔ میں سامنے والے برآمدے میں آئی تھی کہ پھر وہی سنسناتی ہوئی آواز آئی۔ مجھے یاد آیا کہ دھماکے والی چیز جب کاٹیج کی چھت توڑ کر اندر آئی تو اس سے پہلے ایسی ہی سنسناتی آواز آئی تھی۔ یہ یاد آتے ہی میں بے ساختہ گاڑی کی طرف بھاگی۔ اسی لمحے عقب سے کسی نے چلا کر کہا۔ ''وہ بھاگ رہی ہے پکڑو اسے۔''

میں گاڑی تک آئی تھی کہ عقب میں ہونے والے دھماکے کی لہر نے مجھے اچھال کر کچے میں پھینکا۔ پانی اور کیچڑ میں گرنے کی وجہ سے مجھے معمولی سی چوٹ آئی اور گاڑی نے مجھے برسنے والے ملبے سے بچا لیا تھا۔ یہ دھماکا کم شدت کا لگا تھا کیونکہ میں کھلی جگہ تھی۔ اس کے باوجود دھچکا اتنی شدت کا تھا کہ مجھے سنبھل کر اٹھنے میں وقت لگا اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو کاٹیج مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ بس بچ جانے والی دیواریں رہ گئی تھیں اور اس کے ملبے سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ مگر بہت تیز بارش ان شعلوں کو بجھاتی جا رہی تھی، شعلوں کی روشنی میں مجھے کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ شاید

میرے بارے میں خبردار کرنے والا بھی مارا گیا تھا۔ آواز کاٹیج کی طرف سے آئی تھی اور اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خالی ذہن کے ساتھ کھڑی کاٹیج کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اوپر سے برستے یخ بستہ پانی نے مجھے چونکایا اور میں گیٹ کی طرف بڑھی۔

بڑا گیٹ بند تھا اور اس پر اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اس سے باہر آئی تو میں نے خود کو کھیتوں کے درمیان ایک ویرانے میں پایا۔ ایک طرف جھاڑیاں اور چھوٹے درخت تھے اور اس طرف روشنی بھی ہو رہی تھی۔ روشنی لمبی قطار کی صورت میں درختوں سے جھانک رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھی تھی کہ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اس طرف جانا ٹھیک نہیں ہے۔ عقب میں تاریکی تھی۔ لیکن میں اسی طرف جانے لگی۔ کچھ دیر پہلے تک مجھے عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی پھر اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ وہ شخص جو فرعون بنا ہوا تھا لمحے سے بھی پہلے ٹکڑوں میں بدل گیا اور اس کے ساتھی جو حصے کی بات کر رہے تھے ان کے حصے میں بھی موت آئی۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ ہوا کیا تھا؟ اوپر سے سنسناتی آواز کے ساتھ آنے والی چیز کیا تھی جس نے لمحوں میں اس جگہ کو تباہ کر دیا تھا۔

اللہ نے میری جان اور عزت دونوں کی حفاظت کی تھی۔ مگر اب میں سوچ رہی تھی کہ میں کس طرف جاؤں جو محفوظ رہ سکوں اور مدد حاصل کروں۔ میں رکی نہیں تھی بلکہ سوچنے کے دوران بھی بڑھتی رہی تھی۔ روشنی نہیں تھی مگر جب بجلی چمکتی تو چند لمحے کے لیے ماحول روشن ہو جاتا تھا۔ یہاں کھیت تھے اور ان کے درمیان میں پگ ڈنڈیاں تھیں۔ کھیتوں میں گندم کے پودے زمین سے سر نکال چکے تھے۔ میں کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو مجھے دور چند کچے گھروندے دکھائی دیئے اور میں اس طرف بڑھنے لگی۔ اُمید کے ساتھ خوف بھی تھا کہ کہیں یہاں مجھے مدد کی بجائے فضل جیسے کسی شیطان سے واسطہ نہ پڑ جائے۔ مگر اُمید کے سہارے بڑھتی رہی۔ جب قریب آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ دیکھی بھالی ہے اور یہاں بابا کے ایک واقف کار زمیندار کے مزارع رہتے تھے آس پاس کی زمین بھی اسی زمیندار کی تھی۔ مسلسل یخ بستہ بارش میں بھیگنے سے میری حالت خراب ہو گئی تھی اور میں بہ مشکل ایک مکان تک پہنچی اور اس کی زنجیر پکڑ کر بجانے لگی۔ میں پوری قوت سے بجا رہی تھی کہ اندر آواز پہنچے اور بالآخر اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ''کون ہے اس وقت؟''

''دروازہ کھولو'' میں چلائی۔ میری آواز نے کام کیا اور عورت نے دروازہ کھول دیا۔ اسے دیکھتے ہی میں لہرائی اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ پھر مجھے ہوش آیا تو میں حویلی میں تھی ماں جی اور بابا میرے پاس تھے۔ ان کو دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ مجھے پیار کر رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے۔ پھر ماں جی نے بتایا کہ میں جس گھر تک پہنچی تھی اس کا ایک آدمی بابا کے پاس آیا تھا کیونکہ عورت نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس وقت میں صاف ستھری تھی ماں جی نے مجھے صاف کر کے میرے کپڑے بدل دیئے تھے۔ مگر جب اس گھر تک پہنچی تو میں کیچڑ اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں گھر سے غائب ہوئی تو ماں جی اور بابا پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت پولیس میں رپورٹ کی اور سب سے پہلے نفیسہ بی بی پکڑی گئی۔ پولیس کو دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے بتایا کہ مجھے مظفر چودھری نے اغوا کرایا ہے۔

مگر جب پولیس نے اس کے ڈیرے پر چھاپہ مارا تو مظفر چودھری اور اس کے آدمیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ سے ایک پولیس والا مارا گیا تو پولیس نے مزید نفری منگوا لی اور انتقامی جذبے سے مظفر چودھری کے ڈیرے پر چڑھائی کر دی۔ فائرنگ کے تبادلے میں مظفر چودھری اپنے چھ ساتھیوں سمیت مارا گیا اور پولیس نے وہاں موجود مزید ایک درجن افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر میں وہاں سے نہیں ملی تھی۔

میں نے بتایا کہ مجھے فضل نے اغوا کرایا تھا اور جہاں مجھے رکھا وہ جگہ پُراسرار طور پر تباہ ہو گئی۔ بابا کی وجہ سے میں کھل کر نہیں بتا سکی تھی کہ وہاں کیا ہونے والا تھا اور اللہ نے میری عزت محفوظ رکھی تھی۔ پولیس آئی اور مجھ سے بیان لیا۔ میں نے اس جگہ کے بارے میں بتایا تو پتا چلا کہ گزشتہ رات سرحد پار سے بھارتی فوج نے گولہ باری کی تھی جس میں وہ جگہ تباہ ہوئی جہاں میں قید تھی۔ وہ اصل میں مارٹر گولے تھے جو سنسناتی آواز کے ساتھ کاٹیج پر گرے تھے۔ میں سن کر حیران رہ گئی تھی کہ اللہ کیسے اپنے مجبور بندوں کی مدد کرتا ہے۔ بات زیادہ پھیلی نہیں تھی اور بابا نے صرف پولیس کو بتایا تھا۔ مگر آنے والے دنوں میں یہ بات پھیل گئی۔ مگر کسی نے میری پاکیزگی پر شبہ نہیں کیا تھا۔

تشنگی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
ہم مصنوعی زندگی جینے کے عادی بنتے جارہے ہیں۔ ہمیں یہ تک احساس نہیں کہ مصنوعیت خوش حال زندگی کی موت ہے۔ یہ بظاہر پرسکون نظر آنے والی مصنوعی زندگی تباہی کے عمیق غار کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اگر میری بات غلط لگے تو مرینہ اسد کے حالات دیکھ لیں اس کے مقابلے میں آسیہ کیسی آسودہ زندگی گزار رہی ہے۔ پیچ در پیچ والی یہ روداد یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف
(کراچی)

رویوں کا اظہار چہرے کے تاثرات سے بخوبی ہوتا ہے، دل محبت، خلوص سے بھرا ہو یا رشک وحسد کے جذبے سے پُر ہو کچھ لوگ چاہتے ہوئے بھی چھپا نہیں پاتے یا انہیں دوسروں کی پرواہی نہیں ہوتی، ان کی بلا سے کسی کا دل ٹوٹے تو ٹوٹے، وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے بالکل نہیں ہچکچاتے، سامنے والے کو نیچا دکھانے میں بھی ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی ہے۔
مرینہ اسد کا بھی اس وقت کچھ ایسا ہی حال تھا، وہ جو

شروع ہوئی تو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آسیہ چپ چاپ بیٹھی اس کی لن ترانیاں سننے پر مجبور تھیں، کیوں کہ گھر آئے مہمان کی عزت کرنا اس کے مزاج اور روایت کا حصہ تھا۔

’’اوہ آسی، تمہارا دم نہیں گھٹتا، تم اتنی قدیم تو نہیں ہو جتنا تم نے آثار قدیمہ جمع کر رکھا ہے‘‘ مرینہ نے کاندھے اچکا کر منہ بناتے ہوئے لفاظی کی انتہا کر دی۔

’’کیوں بھئی؟ فرنیچر میں بھلا کیا برائی ہے؟ میں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہے۔ جب ہی پرانا ہونے کے باوجود چمک دمک ماند نہیں پڑی۔‘‘ آسیہ نے سنہری بارڈر والے نازک سے گلاس میں ٹھنڈا پانی مرینہ کو پیش کرتے ہوئے دبے لفظوں میں صفائی دی۔ اسے مرینہ کا بے باک تبصرہ بالکل پسند نہیں آیا تھا مگر اس نے برداشت کا دامن تھامے رکھا۔

’’آسیہ تم لوگ کس زمانے میں جی رہے ہو؟ میں تمہارے سامان کی برائی نہیں کر رہی بلکہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اب اس قسم کا فرنیچر آؤٹ آف فیشن ہو چکا ہے، ویسے بھی تمہاری شادی کو کئی سال گزر چکے ہیں ڈیئر یہاں تو فیشن دنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔‘‘ مرینہ نے اپنی نازک سی ناک ناگواری سے سکیڑتے ہوئے ایک دم پٹری بدلی۔ اس کی باتوں نے آسیہ کو گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔ کیوں کہ وہ خود بھی کئی مہینوں سے گھر کی تزئین و آرائش کے لیے فراز کے پیچھے پڑی ہوئی تھی مگر وہ مسلسل ٹالے جا رہا تھا۔

’’اچھا ایک بات بتاؤ؟ ایک جیسی چیزیں دیکھ کر تم لوگوں کا دل بیزار نہیں ہوتا، نہ بابا نہ مجھے تو اسی یکسانیت سے شدید کوفت ہوتی ہے۔ میں تو اسی لیے کچھ مہینے گزرتے نہیں ہیں کہ اسد کے پیچھے لگ کر... پورے گھر کا رنگ وروغن تبدیل کرواتی ہوں۔ سارے کمروں... کو دوبارہ سے جدید انداز میں ڈیکوریٹ کرواتی ہوں، گاڑی کا پرانا ماڈل تبدیل کر کے نئی خریدتی ہوں، تب کہیں جا کر سکون ملتا ہے۔‘‘ مرینہ اپنی نیوی بلیو قیمتی ساڑی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے اترائی۔ وہ ایسی ہی تھی جب تک اپنی غلط بات کو بھی دلائل سے منوا نہ لیتی بحث جاری رکھتی۔ آسیہ کو اس کا تمسخرانہ لہجہ ایک دم برا لگا۔

’’اتنے سالوں سے ایک ہی ماڈل کے شوہر کے ساتھ کیسے گزارا کر رہی ہو؟ انہیں تبدیل کرنے کا نہیں سوچتیں۔‘‘ آسیہ نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر مرینہ کی شیخیوں پر جل کر سوچا۔

’’اب یہ کارپٹ دیکھو، کتنا پرانا ڈیزائن ہے۔‘‘ مرینہ اس کے جذبات کی پروا کیے بغیر بولے جا رہی تھی۔ آسیہ نے اس کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے کالے بالوں پر سنہرا رنگ کروا لیا تھا۔ جسم تھوڑا ابھر گیا تھا مگر اس کی دلکشی میں اضافہ ہوا تھا۔ شیشے کی میز پر اس کی مخروطی انگلیاں مسلسل تھرک رہی تھیں۔

’’مرینہ بالکل ویسی کی ویسی ہے۔ منہ کھولتے ہوئے بالکل نہیں سوچتی، جب ہی تو یونی ورسٹی میں بھی سب اس سے چڑتے تھے۔ جہاں جاتی، پورا گروپ اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تتر بتر ہو جاتا۔‘‘ آسیہ نے اپنی یونی ورسٹی کی یادوں کو تازہ کیا۔

’’تبدیلی میری جان، تبدیلی ہر انسان کو اچھی لگتی ہے۔ مجھے دیکھو، کتنی اپ ٹو ڈیٹ ہوں اور ایک تم ابھی تک پرانے زمانے میں جی رہی ہو۔‘‘ مرینہ نے ایک ادا سے کہا۔ آسیہ نے لبوں تک آتے ہوئے قہقہے کو روکا۔ مرینہ کا حد سے بڑھا ہوا مصنوعی انداز۔ اس کی خوبصورتی پر داغ بنا جا رہا تھا۔ اس کی شخصیت کا بھدا پن نمایاں ہو رہا تھا۔

’’تم بھی کیا ایک ہی چیز کو لے کر بیٹھ گئیں۔ چھوڑو ان باتوں کو میں تمہیں گرما گرم چائے پلاتی ہوں۔‘‘ آسیہ نے پرانے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ جس کی چولیں اب ہل گئی تھیں۔ چر...... چر کی آواز نکلی۔ کثرت استعمال کی وجہ سے اس کے اسپرنگ اب بیٹھنے والے کو چبھنے لگے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے میوزک الگ بجتا تھا۔ مرینہ نے فوراً ہی اسے تمسخرانہ ہنسی سے نوازا۔

آسیہ کا دل ایک دم چھوٹا ہونے لگا۔ اس کے اندر ایک یہی خامی تھی۔ وہ سامنے والے کی برتری سے بہت جلد مغلوب ہو جاتی۔ فراز کی بے تحاشہ محبت کے باوجود اس میں اب تک اعتماد کا فقدان تھا، اسی لیے وہ مرینہ کی فضول باتوں کا منہ توڑ جواب دینے کی جگہ اس سے متاثر ہونے لگی۔ چائے کا بہانہ بنا کر وہاں سے تیزی سے اٹھ گئی۔

مرینہ نے کمرے سے جاتی ہوئی آسیہ کے حسین چہرے کی طرف دیکھا۔ سبک نقوش پر اترتی اداسی، اور پھیکی پڑتی رنگت دل کو ٹھنڈک کا احساس دلانے لگی۔ آسیہ فراز کی محبت اور رفاقت پا کر حسین ترین ہو گئی تھی۔

مرینہ کی نفسیات میں ایسی کجی تھی کہ وہ دوسروں کو دکھ دے کر لطف اٹھاتی۔ اس کے اندر بے چینیوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ وہ اپنی ناکام زندگی کی ذمے داری ہمیشہ دوسروں پر ڈالتی آئی تھی۔ آسیہ کے لیے تو اس کا دل پہلے ہی غبار سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

وہ ایک دم مڑی تو سائیڈ ٹیبل پر فراز کی مسکراتی ہوئی تصویر سنہری فریم میں دکھائی دی۔ مرینہ ایک ٹک دیکھے گئی۔ وہ اسی مسکراہٹ پر تو فدا ہوئی تھی، دل ناشاد ایک بار پھر تشنہ آرزوؤں کا سوگ منانے لگا۔

''آسی تمہاری وجہ سے میری زندگی کی بہار مجھ سے روٹھ گئی، میرے جذبوں پر تاعمر خزاؤں نے ڈیرہ جمالیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

آسیہ لوازمات سے بھری ٹرالی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں لوٹی تو مرینہ کو کھویا کھویا سا پایا۔

''مرینہ یار۔ چلو بغیر تکلف کے شروع ہو جاؤ۔'' آسیہ اس کے دل میں پلنے والے برسوں پرانے ناسور سے ناآشنا مسکراہٹ سجائے چائے پیش کرتے ہوئے چہکی تو مرینہ کے خیالات کی مالا بکھر گئی۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم شادی کے بعد بہت بورنگ ہو گئی ہو، پکی گھر والی بن گئی ہو...... یار باہر نکلو، دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔'' مرینہ نے، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے مزیدار کباب اور چکن رول ہری چٹنی میں ڈبو کر کھاتے ہوئے آسیہ کو اکسایا۔

کافی وقت گزارنے کے بعد مرینہ چلی گئی مگر آسیہ اس کے جانے کے بعد بھی ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ اس کی باتوں کو سچ جانتی خواہشوں کے جال میں پھنستی چلی گئی۔

''نیا فرنیچر، پردے اور اتنے بڑے گھر کا رنگ وروغن، کوئی چھوٹی موٹی خواہش تو تھی نہیں کہ فراز پل بھر میں پوری کر دیتے۔'' آسیہ کے دماغ نے سمجھایا بھی۔ پھر بھی اس دل کا کیا کرتی؟ جس پر ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا۔

''ایک دفعہ گھر کی حالت درست کروالوں پھر اس مرینہ کو ضرور انوائیٹ کروں گی جو یونی ورسٹی میں تو میرے آگے پیچھے پھرتی تھی مگر آج کیسی باتیں بنا رہی تھی۔ اس کا غرور تو حد سے تجاوز کر گیا ہے۔'' آسیہ کا معصوم دل بری طرح سے گھائل ہوا تھا، اسے یہ بھی فکر نہیں تھی کہ فراز گھر لوٹنے والا ہے۔ دونوں بچیاں اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ امی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے سارے کام وام بھول کر نئے تانے بانے بننے میں مگن ہو گئی۔ آج سے پہلے وہ فراز کی محبت میں گم، اپنی زندگی میں مست ملنگ بنی جیے جا رہی تھی۔ مرینہ کی کھوکھلی دار باتوں نے اس کا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ وہ جسے سب کچھ سمجھتی تھی دنیا کی نگاہوں میں تو وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے فراز سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔

☆☆☆

''اب کیا کروں...... بل کیسے ادا کروں؟'' آسیہ نے مزیدار برگر اور کولڈ ڈرنک کی ٹرے تھامنے کے بعد اپنے کالے بیگ میں ہاتھ ڈال کر پیسے ٹٹولے تو یاد آیا کہ مما نے یونیورسٹی جانے کے لیے پانچ سو کا ایک کڑکتا نوٹ دیا تھا، وہ تو ٹیبل پر ہی بھول آئی۔ اب اتنے سے پیسوں کے لیے سب کے سامنے بے عزتی کا خوف جو طاری ہوا تو اس کا حسین چہرہ دھندلانے لگا۔

اس کا آج یونی ورسٹی میں پہلا دن تھا، وہ اتنی ہڑبونگ میں گھر سے نکلی کہ ناشتا بھی نہیں کر سکی۔ ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈنے میں الگ برا حال ہوا۔ بھوک عروج تک جا پہنچی تو اس نے کیفے ٹیریا کا رخ کیا۔ اب ایک نئی پریشانی لاحق ہو گئی۔ وہ سوچ میں گم تھی کہ آرڈر سرو کرنے والے لڑکے عارف نے اسے ٹوکا۔ وہ اسٹوڈنٹ کی ایسی شرارتوں سے بیزار ہو چکا تھا، جو اکثر بل دیے بغیر بھاگنے کے چکر میں رہتے اور بعد میں اسے مالک سے خوب ڈانٹ پڑتی۔

''جلدی کریں جی، رش بڑھ رہا ہے۔ آپ راستہ روکے کھڑی ہیں'' عارف ایک دم تیز لہجے میں بولا تو آسیہ کی ہمت مزید جواب دے گئی۔

''پلیز...... ایک سنٹ'' اس نے ٹرے وہیں کاؤنٹر پر رکھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پین ہونٹوں میں دبایا اور سائیڈ میں ہو کر بڑی جانفشانی سے بیگ کی دوبارہ سے تلاشی لینے لگی، کچھ سکے ہاتھ لگے تو تھوڑا سکون محسوس ہوا۔

فراز جو چائے کی طلب میں یہاں آ کر بیٹھا تھا، بہت دیر سے اس معصوم چہرے والی لڑکی کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ پریشان سی ہے۔ فائنل تک پہنچتے پہنچتے فراز ایسے کئی نظاروں کا عادی ہو چکا تھا۔ یونی ورسٹی میں آنے والے نئے اسٹوڈنٹ کی بوکھلاہٹ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس لڑکی میں کچھ تو الگ بات تھی جو فراز کی نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

''ابھی بھی پیسے پورے نہیں ہوئے۔'' آسیہ نے اپنی گلابی ہتھیلی پر سکوں کو جمع کر کے گنا اور خود سے بولی۔ فراز پوری بات سمجھ گیا، تو وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب سے گزرا۔ اپنی پریشانی میں مگن آسیہ کو ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ کم پیسے لے کر ڈرتے ڈرتے کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔

''مس...... آپ اپنی ٹرے یہاں چھوڑ گئیں۔ ابھی۔ اِدھر اُدھر ہو جاتی تو آپ شور مچاتیں کہ ہم نے سامان

نہیں دیا۔" عارف اسے دیکھتے ہی شروع ہوگیا۔

"وہ......دراصل......میرے پاس بل۔میں ۔اگر کل......" آسیہ نے اٹک اٹک کر اپنا مدعا پیش کرنا چاہا مگر شرمندگی سے بولا نہیں گیا۔

"ہاں......بل ادا ہو چکا ہے۔بس اب یہ لے جائیں۔برگر ٹھنڈا اور ڈرنک گرم ہوگئی ہے۔" لڑکے نے سر پر ہاتھ مار کر کہا اور بڑے زبردستی اسے تھما دی۔

"کیا؟ میرا مطلب ہے......کس نے بل ادا کیا؟" حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"مس......آپ کیوں بکری کے وقت ہمارا ٹائم خراب کر رہی ہیں، وہ جو سامنے کالی شرٹ میں فراز بھائی بیٹھے ہیں ......اس نے بل دیا ہے۔" عارف نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا، اس کی زبان سے تیز اس کے ہاتھ چل رہے تھے ،فراز سب کا ہر دل عزیز تھا اسی لیے کافی لوگ اسے پہچانتے تھے۔عارف مڑ کر جلدی سے دوسرے اسٹوڈنٹ کے آرڈر کی تکمیل کرنے لگا۔وہ گم صم کھڑی رہ گئی، پھر اخلاقی تقاضے نبھانے کے لیے اس میز کی طرف بڑھی جہاں فراز تنہا بیٹھا انکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو......میں پیسے گھر بھول آئی تھی......کل ہی لوٹا دوں گی۔" آسیہ نے فراز کے قریب پہنچ کر جھجکتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے......اب ہم ایک جگہ پڑھتے ہیں......کبھی آپ بھی مجھے چائے پلا دیجیے گا، حساب برابر۔" فراز نے اسے اپنی میز پر بیٹھنے کی آفر کی اور ہلکے پھلکے انداز میں اس کی شرمندگی دور کرنا چاہی۔

"وہ تو میں ضرور پلاؤں گی مگر پہلے آپ کو بل کے پیسے لینے پڑیں گے۔" آسیہ وہیں بیٹھ کر پیٹ پوجا کرتے ہوئے قدرے ریلکس انداز میں سر ہلا کر بولی۔

"چلیں، اگر آپ پیسوں کی واپسی کے لیے اتنی ہی بضد ہو رہی ہیں تو کبھی کسی اور کو مشکل میں دیکھیں تو خاموشی سے اس کی مدد کر دیجیے گا......بس میرا قرضہ اتر جائے گا۔" فراز کے چہرے کی سحر انگیز مسکراہٹ اور سوچ کا مثبت انداز' آسیہ کے دل میں گھر کر گیا۔وہ پہلی ملاقات میں ہی اس سے کافی متاثر ہوگئی۔

فراز کو بھی آسیہ بہت اچھی لگی ،سنہری رنگت، کالی لٹ اس کی صندل جبیں پر لہرا رہی تھی ،شہابی مخمل سے لب، آنکھوں میں ایسی چمک جیسے فانوس جل اٹھے ہوں، بے انتہا پرکشش اور بوٹے سے قد پر ایسی پھبن کہ دیکھنے والا ایک لمحہ کو ٹھٹک جائے۔فراز نے مکمل جائزہ لے کر اس کا عکس اپنے دل میں اتار لیا۔

"آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔" آسیہ کی سریلی آواز اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو فراز بے چین ہونے لگا۔کچھ اور نہ سوجھا تو اسے فوراً اپنے گروپ میں شمولیت کی دعوت دی۔آسیہ کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو اس نے بلا جھجک ہامی بھر لی۔

☆☆☆

"آسیہ یہ پکڑو......کافی کا کپ......اس کے بعد شاعری کے مقابلے کی تیاری شروع کریں گے۔" زمیف نے فراز کے اشارے پر آسیہ کو کافی کا کپ تھمایا۔جو وہ اپنے پینے کے لیے لایا تھا۔وہ سب یونی ورسٹی میں ہونے والے ایک ادبی مقابلے کے انعقاد میں کوشاں تھے۔آسیہ صبح سے مصروف تھی چہرے سے تھکان ظاہر ہو رہی تھی۔

"تم......نہیں پی رہے" آسیہ نے تشکرانہ انداز میں ایک سپ لیتے ہوئے پوچھا تو وہ فراز کو غصے سے دیکھنے لگا۔

"آس......تم پی لو......اس کا موڈ نہیں ہوگا۔" فراز نے شوخی دکھائی تو زمیف نے اسے گھورا۔پوری یونی ورسٹی میں وہ واحد بندہ تھا جسے اپنے دوست کے دل کی خبر تھی۔

آسیہ کو یہاں، جلد ہی ایسے مخلص دوستوں کا ساتھ میسر آ گیا۔وہ بڑی شوخ اور چنچل لڑکی تھی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اس کا نام سرفہرست رہتا۔وہ پورے گروپ کی کرتا دھرتا بنی ہوئی تھی۔سب اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسے بہت اہمیت دیتے تھے، سوائے مرینہ کے جو فراز کی وجہ سے اس گروپ میں شامل ہوئی تھی مگر پیسے پر گھمنڈ اور بدمزاجی کی وجہ سے اس کی دوسرے ساتھیوں سے کم ہی بنتی تھی۔

آسیہ کے آتے ہی مرینہ کی اہمیت مزید کم ہوگئی......وہ اس کی مقبولیت سے جلتی تھی مگر مجبور تھی، اگر معاملہ فراز کا نہ ہوتا تو ان لوگوں کو منہ بھی نہ لگاتی مگر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ساری باتیں برداشت کر رہی تھی۔وہ شروع سے ہی فراز کی سحر انگیز مسکراہٹ اور نشیلی آنکھوں پر مرمٹی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کی دولت اور اثر ورسوخ سے متاثر ہو کر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا فراز اس سے خوشی خوشی شادی کر لے گا مگر وہ یہ بات نہیں جانتی تھی ان تلوں میں تیل نہیں۔

وہ فراز کا جھکاؤ آسیہ کی جانب ہوتا دیکھ کر کڑھنے لگی تھی، آسیہ مرینہ کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی

تھی۔ مرینہ نے ایک دو بار آسیہ سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی مگر فراز کا اتنا برا ری ایکشن سامنے آیا کہ اس نے مجبوراً اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، بھولی بھالی سی آس نے خوشی خوشی اسے دل سے دوست مان لیا۔

فراز بظاہر اس سے اخلاق سے ملتا..... مگر اس کے دل میں مرینہ کے لیے کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ آسیہ سے ملنے کے بعد تو فراز کے دل میں کسی اور کے لیے جگہ بچی ہی نہیں..... وہ پوری کی پوری سما گئی۔

☆☆☆

ابھی ان لوگوں کا تعلیمی سال اختتام پزیر ہی ہوا تھا کہ ایک دن فراز نے سب کو فون کر کے یونی ورسٹی میں ملنے کے لیے کہا اور دھما کا کر ڈالا، کم از کم مرینہ کے لیے تو یہ دھما کا ہی ثابت ہوا جس نے اس کی ہستی کے پرخچے اڑا ڈالے۔

''دوستوں..... قدر دانوں ..... مہربانوں..... اس اتوار کو میرے غریب خانے پر جمع ہو جانا'' فراز کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، آسیہ بھی ایک ہفتے سے یونیورسٹی نہیں آ رہی تھی، سب حیران و پریشان اس کے گرد جمع ہو گئے سوائے رمیض کے جو فراز کا یار غار تھا، وہ دور کھڑا دوست کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھا۔

''یہ کیا نیا ڈراما ہے؟ تیرا ولیمہ ہے جو سب کو اپنے گھر بلا رہا ہے۔'' ناصر نے سپاری کا پورا پیکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے اسے چھیڑا، مرینہ کا دل دھڑکا۔ وہ بغور فراز کو دیکھنے لگی..... آسیہ بھی ابھی ابھی آ کر ان لوگوں کے پاس کھڑی ہوئی تھی، اس کے چہرے کی شرمگیں مسکراہٹ اور گالوں پر امڈتی شرم وحیا کی لالی کوئی نئی داستان رقم کرنے جا رہی تھی۔

''بھائی۔ اتوار کو میرا نکاح ہے..... ولیمے کی دعوت ایک سال بعد کھلاؤں گا۔'' فراز ایک دم شوخ ہو گیا۔ وہ مرینہ کی حالت سے بے پروا، سرشار سا دوستوں سے مبارک بادیں وصول نے لگا۔

''کیا..... کب..... اچانک..... کس سے؟'' سب نے اس پر گھونسوں کی بارش کرتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ ہنستا ہوا وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

''اس راز سے تو آس ہی پردہ اٹھائے گی۔'' فراز نے معنی خیز نظروں سے آسیہ کو دیکھا جو چھوئی موئی ہوئی جا رہی تھی۔ مرینہ دل پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کا ہنسی مذاق دیکھ رہی تھی۔

''کیوں تیرا منہ ٹوٹ جائے گا..... جلدی بتا'' شاہد نے اسے ایک گھونسا رسید کیا اور بولا۔

''میرے پیاروں..... راج دلاروں..... مابدولت۔ اپنے اور آسیہ کے نکاح میں شرکت کا دعوت نامہ دینے خاص طور پر یونی ورسٹی آئے ہیں''۔ وہ چہکا تو سب دوستوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

''اوئے..... اوئے..... چھپی رستم۔ تسی گریٹ ہو..... کمال کر دیا یار۔ ہماری ناک کے نیچے سب چلتا رہا اور ہمیں خبر ہی نہیں''۔ ناصرہ چیخ کر اس سے لپٹ گئی..... اب پورے گروپ کی توپوں کا رخ آسیہ کی طرف ہو گیا جس کے لبوں پر بڑی دلنشین مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''ویسے تو میری دوست بنتی ہو اس کے باوجود مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائی۔'' مرینہ نے کمر پر ہاتھ رکھا اور آسیہ کے مقابل کھڑے ہو کر غصے سے چنگھاڑی، پورا گروپ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ مرینہ کے انداز نے خوشی کے ماحول کو بدل کر رکھ دیا۔

''یار..... اس میں بتانے والی کیا بات تھی؟ مجھے دوران تعلیم ان فضولیات میں پڑنا نہیں تھا، اب رازی کی فیملی اچانک ہمارے گھر آئی اور دو دن میں یہ رشتہ طے پا گیا۔'' آسیہ اس کی نیت جانے بغیر ہاتھ پکڑ کر صفائی دینے لگی۔

''پلیز..... کول ڈاؤن۔'' فراز کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مرینہ کو کچھ سنانا چاہ رہا تھا مگر رمیض نے اس کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کی۔

''اچھا..... سوری..... یار..... چھوڑ دو..... ان باتوں کو تم نکاح والے دن صبح سے میرے گھر آ جانا۔'' آسیہ اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے بولی مگر مرینہ نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا، اپنا بیگ اٹھایا، اور سر جھکائے بغیر کسی سے ملے مین گیٹ پار کر گئی، یونی ورسٹی سے جاتے ہوئے۔ وہ صرف رازی کی اچھی یادیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے مڑ کر آسیہ کی جانب دیکھا بھی نہیں جو اس کے رویے پر سن سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

''آس..... ثانیہ..... ہانیہ..... ارے سب کہاں ہو؟'' فراز جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ ایک اجنبی سا احساس دل میں جاگا، اس کی بے قرار نگاہیں بیوی اور بیٹیوں کو تلاش کرنے لگی۔

''پاپا..... پاپا..... چاکلیٹ دیں'' وہ دونوں جو تھوڑی دیر پہلے ہی ماموں کے ساتھ گھر لوٹی تھیں ماں کا موڈ آف دیکھ

کر اپنے کمرے میں جا کر کھلونوں سے کھیلنے لگیں۔ باپ کی پکار پر یوں آ کر لپٹ گئیں، جیسے سالوں کی بچھڑی ہوئی ہوں۔ فوراً فرمائش کر دی۔

''یہ لو اپنا بھتا...... جانتا تھا اس کے بغیر گھر میں انٹری تھوڑی ملے گی۔'' فراز نے ہنستے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دونوں کو چاکلیٹ پکڑائیں۔ ان دونوں نے ایک ساتھ باپ کا منہ چوما تو فراز نے سرشاری سے آنکھیں موند لیں، دن بھر کی تکان ہوا ہو گئی۔

''ارے۔ چلو عذرا خالہ آئی بیٹھیں ہیں...... جلدی سے ڈرائنگ روم میں جا کر سیپارہ پڑھو۔'' آسیہ نے پھیکی سی مسکراہٹ سے شوہر کا استقبال کیا۔ اور بیٹیوں کو اسکارف پہنا کر تاکید کی، وہ دونوں سیپارہ سینے سے لگا کر سر ہلاتی ہوئی اندر کی طرف بھاگیں۔

''اوہو کیا بات ہے...... شوہر کے آتے ہی سب کو بھگا دیا۔'' فراز نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر بیوی کو دیوار سے چپکا دیا۔

''اف...... آپ کا کیسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو گیا ہے؟ فضول باتوں میں ماہر ہو گئے ہیں۔ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ میں نے سینڈوچ بنائے ہیں۔'' آسیہ نے بے دلی سے اپنا آپ چھڑایا اور باہر نکل گئی۔ فراز کو اس کی بے اعتنائی ایک دم بری لگی مگر سر جھٹک کر نظر انداز کرتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

''سنیں، آپ کو مرینہ یاد ہے...... وہ جو، ہمارے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی۔'' آسیہ نے فراز کو تولیہ پکڑاتے ہوئے پوچھا، وہ، ہاتھ منہ پونچھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

''مرینہ...... وہ ہی نک چڑھی بلی نا۔ جس کی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ مجھے یاد آیا وہ ہی نا۔ جو ہر وقت اپنے باپ کے پیسے کا شو آف کرتی رہتی تھی۔'' فراز نے ذہن پر زور ڈالا اور کچھ سوچ کر کہا۔

''جی ٹھیک پہچانا۔ آج وہ اتنے سالوں بعد ہمارے گھر آئی تھی۔'' آسیہ نے پلیٹ میں کیچپ نکال کر اسے سینڈوچ کے ساتھ پیش کیا۔

''ارے...... وہ محترمہ یہاں کیسے۔ خیریت تو تھی؟'' فراز نے حیرت سے پوچھا۔

''پتا نہیں...... بتا رہی تھی کہ اس نے ناصرہ سے سارے پرانے دوستوں کے ایڈریس حاصل کیے ہیں۔ اب سب سے مل کر پرانی یادوں کو تازہ کر رہی ہے۔ اصل میں وہ دو سال سے بیوٹیشن کا کوئی خصوصی کورس کرنے دبئی گئی ہوئی تھی، چند دنوں قبل پاکستان لوٹی تو پرانے لوگوں سے دوبارہ میل ملاپ شروع کیا ہے۔'' دھانی سوٹ میں لمبے بالوں کا جوڑا بنائے آسیہ بہت پیاری لگ رہی تھی، فراز کو مرینہ کے بارے میں جاننے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو بیوی کے حسن کی چمک میں کھونے کا طلب گار ہو رہا تھا۔

''تو پھر...... ٹھیک ہے نا راضی...... ہم اس بار اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے اور فرنیچر تبدیل کر سکتے ہیں نا۔'' اس کی داستان حمزہ کب ختم ہوئی، فراز کو خبر نہیں، نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں فرنیچر کی تبدیلی کا سن کر چونک کے اٹھ بیٹھا۔

''کیا مطلب؟...... یہ مرینہ کا ذکر ہوتے ہوتے بات گھر کی سجاوٹ تک کہاں جا پہنچی؟'' فراز نے سنجیدگی سے پوچھا۔ آج کل کے حالات میں غم جاناں سے اہم غم روزگار بنا ہوا تھا۔

''مرینہ آئی تھی، کچھ نہ کچھ تو برا ضرور ہونا تھا۔'' فراز کا دل اندیشوں میں گھر گیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

''بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ اب گھر کو نئے انداز میں سجایا سنوارا جائے، بھلا اس میں کیا غلط بات ہے؟'' آسیہ نے گھبرا کر صفائی پیش کی، وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ راضی کو اس کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔

''میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ بات قابلِ عمل نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ بڑی مشکلوں کے بعد تو ہمارا بزنس جما ہے۔ میں ابھی کسی قسم کی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔'' فراز نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیوی کے چہرے پر چھائے اشتیاق کو نظر انداز کیا۔ دو ٹوک الفاظ میں بات ختم کر دی، وہ اس معاملے میں اس کو جھوٹے خواب دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

''یہ بات تو میں کئی سالوں سے سن رہی ہوں کہ حالات صحیح نہیں، حالات صحیح نہیں...... اب ایسا بھی کیا کہ انسان دل مار کر بیٹھ جائے۔ مجھے نہیں پتا، اب...... گھر میں کچھ نہ کچھ تو نئی تبدیلی ہونا چاہیے۔ کمروں کی حالت دیکھو...... گھر نیا رنگ و روغن مانگ رہا ہے۔ اس بار تو میں پردے بھی تبدیل کروں گی، قسم سے دھو دھو کر ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔'' آسیہ نے منہ پھلا کر ضدی لہجے میں کہا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کو اچھی حالت

میں دیکھنے کی خواہش نہیں..... مگر یہ کوئی دو پیسے کا تو کھیل نہیں۔ ایک بار ہاتھ تو لگا کر دیکھو پھر پتا چلے گا کتنے پیسے کمرے دم خرچ ہو جاتے ہیں مگر تم سمجھتی ہی نہیں ہو۔'' فراز غصے سے بولا تو آسیہ رونے بیٹھ گئی، مرد کو قابو میں رکھنے کے لیے آنسو عورت کا سب سے قدیم اور مؤثر ہتھیار ہے۔ یہ تدبیر اس وقت بھی کارآمد ثابت ہوئی۔ وہ ایک دم موم ہونے لگا۔

''آسی..... میری جان، پلیز چپ ہو جاؤ۔ اچھا میری ایک بات تو سنو..... مجھے ایک بڑا آرڈر ملنے کی امید ہے اگر اس میں منافع ہو گیا تو یقین کرو یہ بندہ خطاکار فرمائشیں ضرور پوری کرے گا۔ پلیز جہاں اتنا صبر کر لیا وہاں تھوڑا انتظار اور کر لو۔'' فراز نے پیار سے اس کے ریشمیں بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے منانے کی کوشش کی۔

''رازی، میں جانتی ہوں آپ مجھے ایسے ہی بہلا رہے ہیں۔ شادی سے پہلے تو آسمان سے تارے توڑ لانے کی باتیں کرتے تھے۔ اب ایک چھوٹی سی گھر سجانے کی خواہش پوری نہیں کر پا رہے ہیں..... اچھا خیر مجھے اپنے اور بچیوں کے گرم کپڑے خریدنے ہیں، اس لیے اضافی رقم چاہیے، اتنا تو کر سکتے ہیں نا؟'' آسیہ پر مرینہ کی باتوں کا ایسا ملمع چڑھا کہ اسے رازی کی محبت کی شفافیت پر شبہ ہونے لگا، اس کے طنزیہ انداز پر فراز کو صدمہ پہنچا۔

اف..... یہ مجھ سے اتنی بدگمان ہو گئی ہے، اسے لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ فراز کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کی اپنی آسی ہے، جو بن کہے ہر بات سمجھ جاتی تھی۔ بیوی کی بے رخی پر اس کے دل میں درد سا اٹھا، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''بس یار، فراز کا مزاج ایک دم مختلف ہے، وہ اسد بھائی کی طرح نہیں سوچتے، میری ناراضی سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔'' آج بڑے دنوں بعد فراز کی جلدی گھر واپسی ہوئی تو وہ دشمن جاں فون پر مصروف دکھائی دی، وہ اسے ہر حال میں منانا چاہتا تھا تاکہ ان کے گھر پر چھایا جمود ٹوٹ جائے، بچیاں بھی ماں کی بدمزاجی سے پریشان تھیں۔ آسی کی روٹھی سی شکل اس پر الگ بھاری پڑ رہی تھی، کام پر بھی توجہ کم ہونے لگی تھی مگر وہ کیا کرتا آسی صرف بیوی ہی تو نہیں تھی، وہ تو اس کی زندگی تھی بھلا زندگی روٹھ جائے تو کیسے جیا جائے؟

وہ ثانیہ ہانیہ کے لیے آئس کریم اور آسی کے لیے گجرے تھامے کمرے میں داخل ہوا تو وہ فون پر کسی سے دکھڑے رونے میں مصروف تھی۔ فراز اس کی باتیں سننے لگا۔ آسیہ کو کمرے میں رازی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ چونک کر مڑی۔

''اچھا..... مرینہ میں تم سے کل بات کروں گی۔'' اس نے جلدی سے فون بند کیا اور نگاہ اٹھا کر فراز کو دیکھا۔ وہ جوتے اتارنے میں مصروف تھا۔ چہرے کی شیو بڑھی ہوئی۔ لال آنکھوں کے ساتھ بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا، ایک لمحے کو تو دل چاہا کہ ساری ناراضی بھلا کر اسے فکروں سے آزاد کر دے مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

''مرینہ ٹھیک کہتی ہے، اب تو یہ رازی کی محبت کا امتحان ہے، اسے میرا کتنا خیال ہے؟'' وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ایلکٹراز جیل سے فرار معما بن گیا

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان فرانسسکو کے ساحل سے ڈیڑھ میل دور ایلکٹراز (Alcatraz) جزیرے پر قائم جیل سے اب تک 36 قیدی فرار ہونے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ان میں دو قیدی ایسے بھی تھے جنہوں نے فرار ہونے کے لیے دوبارہ قسمت آزمائی لیکن دونوں مرتبہ ناکام رہے۔ فرار کی کوشش کرنے والے دیگر قیدیوں میں 23 قیدی فرار کے دوران پکڑ لیے گئے اور چھ محافظ کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ تاہم تین قیدی، فرینک موریس، کلیرنس اینگلین اور جون اینگلین گیارہ جون 1962ء کو اس جزیرے سے ایسے فرار ہوئے کہ ان کا آج تک پتا نہ چل سکا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ آج بھی ان کے نام ایف بی آئی کی مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تینوں مفرور قیدی فرار کے دوران سمندر میں ڈوب گئے۔ تاہم تلاش کی متعدد کوششوں کے بعد بھی ان کی لاشوں کا پتا نہ چل سکا۔ اس واقعے نے اتنی شہرت حاصل کی کہ 1979ء میں اس پر ہالی وڈ میں اسکیپ فرام ایلکٹراز کے نام سے ایک فلم بنائی گئی جس میں فرینک موریس کا کردار اداکار کلینٹ ایسٹ وڈ نے ادا کیا۔

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

''اوہ تو بات اتنی سیدھی نہیں، جتنا میں سمجھ رہا تھا، یہ میاں بیوی کی معمول کی لڑائی نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں تو مرینہ کا ہاتھ شامل ہے، فراز میاں اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا، یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔'' اس نے آسیہ کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تو بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔

☆☆☆

''مما...... تھک گئے...... اب گھر چلیں......'' آسیہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ موسم سرما کے کپڑوں کی خریداری کرنے اس بڑے سے شاپنگ پلازا میں آئی ہوئی تھی جو اس کے گھر سے دور واقع تھا۔ کم بجٹ میں اچھے سوئیٹرز لینے کا معرکہ دو گھنٹے میں جا کر سر کیا تو بچیوں کا بوریت اور تھکن سے برا حال ہو گیا۔ پچھلی رات کو ہی فراز نے اسے ماہانہ خرچ کے علاوہ کچھ اضافی پیسے دیئے تھے، وہ ہانیہ اور ثانیہ کے لیے گرم جرسی، اپنے لیے ایک گرم سوٹ اور فراز کے لیے بلیک رنگ کی ہائی نیک خرید کر فارغ ہوئی تو بیٹیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''اچھا...... بات تو سنو پاس ہی مما کی ایک فرینڈ رہتی ہیں، تھوڑی دیر ان کے یہاں چل کر بیٹھتے ہیں، پھر واپس جائیں گے۔'' آسیہ نے بچیوں کو جوس اور چپس کا پیکٹ دلاتے ہوئے کہا تو دونوں نے سر ہلا کر ہامی بھری۔ آسیہ بہت دنوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی اسی لیے خوب انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے مرینہ کے گھر یوں بغیر اطلاع دیئے جانے پر پہلے تو ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔

''کیا ہوا؟ یوں چلے جانے پر کوئی قیامت تھوڑی آ جائے گی۔'' اس نے لمحے بھر سوچا پھر سر جھٹک کر بے فکری سے چل دی مرینہ نے جو ایڈریس دیا تھا۔ وہ پچھلی گلی میں سڑک کے کنارے واقع بڑے بڑے گھروں میں سے ایک کا تھا، بچیاں جوس پیتے ہوئے خوشی خوشی ساتھ چل پڑیں۔

☆☆☆

''ارے...... اچانک...... فون کر کے آتی تو اچھا ہوتا۔'' مرینہ کی بے رخی پر آسیہ کا دل خراب ہو گیا، وہ جتنا جوش و خروش سے آئی تھی سب بھاپ بن کر رہ گیا۔ مرینہ انہیں بٹھا کر تیزی سے اندر واپس چلی گئی۔

آسیہ نے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جو مرینہ کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا، بے انتہا مہنگے ڈیکوریشن پیسز، جہازی سائز صوفے، کرسٹل کے لیمپ شیڈ دیواروں پر آویزاں شان و شوکت میں اضافہ کر رہے تھے۔

''واقعی مرینہ کی اتراہٹ جائز ہے، ڈیکوریشن تو اسے کہتے ہیں۔'' آسیہ نے حسرت سے ایک ایک چیز کو تکتے ہوئے سوچا۔ اس کا احساس کمتری کا شکار ایک دم عود آیا۔ ایک دم اندر سے شور کی آواز آئی۔ کوئی مرد گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ مرینہ کے من من کی آوازیں بھی آسیہ کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

''یہ اسد بھائی اس طرح مرینہ سے بات کرتے ہیں۔'' آسیہ کی نگاہوں سے بہت سارے پردے ہٹتے چلے گئے، اسد کا بیوی کے لیے متعفن لہجہ، اس کے اندر پھریری سی دوڑ گئی۔ فراز نے اتنے سالوں میں کبھی اس سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کی۔ مادی خوشی ہی سب کچھ نہیں ہوتی اصل چیز دل کا سکون ہوتی ہے۔ چند لمحوں میں ہی اس کا فلسفۂ حیات بدل کر رہ گیا۔

☆☆☆

''شیراز بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟ کب ہوا یہ حادثہ...... رازی کیسے ہیں؟'' آسیہ کی تو جان ہی نکل گئی، جب اس کے جیٹھ نے اسے فراز کی گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی۔ وہ اسے اپنے ساتھ اسپتال لے جانے آئے تھے۔

''افوہ تم چلو تو راستے میں ساری بات بتاتا ہوں۔'' شیراز خود بھائی کی وجہ سے پریشان تھا، اوپر سے آسیہ کا رونا، اسی لیے مجبوراً تھوڑا سخت لہجہ اختیار کیا اور اسے جلدی چلنے کے لیے کہا۔

''دو منٹ...... رکیے گا میں آتی ہوں۔'' اس نے تیزی سے چادر اوڑھی، دروازے کو لاک کیا، بچیوں کو پڑوس میں عذرا خالہ کے گھر چھوڑا اور جیٹھ کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شیراز نے گاڑی دوڑائی۔ راستہ صاف تھا، وہ لوگ پندرہ منٹ میں ہی اسپتال پہنچ گئے۔

دونوں بے قراری سے ایمرجنسی کی طرف بڑھے، ڈاکٹر فراز کے سر میں ٹانکے لگانے اور زخم صاف کر کے پٹی کرنے میں مصروف تھا، زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے فراز کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی، آسیہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا، آنسو گالوں پر بہنے لگے تو فراز نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینا چاہی تو منہ سے ''سی'' کی آواز نکل گئی، شیراز بھی بھائی کے کپڑے خون میں لت پت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

''آپ لوگ باہر جائیں، مریض ڈسٹرب ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے فراز کو تکلیف میں دیکھا تو انہیں باہر انتظار کرنے کا

کہا۔ وہ لوگ باہر نکل آئے تو فراز کا اسسٹنٹ انور ایک بینچ پر بیٹھا ملا، وہ ہی اسے اسپتال لے کر آیا تھا۔

"پتا نہیں...... سر آج کل کن الجھنوں میں ہیں، سگریٹ نوشی بھی شروع کر دی ہے، آفس کا مسئلہ الگ چل رہا ہے، شاید اسی لیے گاڑی چلاتے ہوئے چوک گئے، وہ تو منجھے ہوئے ڈرائیور ہیں مگر پتا نہیں کیسے گاڑی ان سے بے قابو ہو گئی اور فٹ پاتھ سے جا ٹکرائی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں گھر جانے کے لیے بائیک پر ان کے پیچھے ہی دفتر سے نکلا تھا، لوگوں کا ہجوم دیکھا تو رک گیا۔ پتا چلا سر کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ بے ہوش پڑے تھے۔ میں نے لوگوں کے ساتھ مل کر انہیں فوراً ہی اٹھایا اور اسپتال لے آیا۔" انور شیراز کے برابر میں بیٹھا حادثے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ساری باتیں سنتے ہی آسیہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز اٹھا۔

"اچھا دفتر میں کس قسم کے مسائل چل رہے ہیں؟ یہ چھوٹا کچھ بتاتا بھی تو نہیں ہے۔" شیراز کے لہجے میں بھائی کے لیے فکر مندی تھی۔ وہ انور سے تفصیلات جاننے لگے۔ آسیہ کے کان دوبارہ ادھر لگ گئے۔ اسے یاد آیا کہ فراز نے دو دن پہلے اسے کچھ بتانے کی کوشش تو کی تھی مگر وہ منہ پھلائے اس کی بات سنے بغیر اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی، اب دل کو ملال اور پچھتاوے نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"اصل میں فراز صاحب کو پہلی بار امریکا سے چاولوں کا ایک بڑا آرڈر ملا تھا، انہوں نے سارا جمع جتھا لگا کر مال تو باہر بھجوا دیا مگر وہاں سے وقت پر پیسوں کی ادائیگی نہیں ہو پائی۔ اسٹاف کو تنخواہ دینے کا وقت بھی سر پر آ گیا، پھر دوسرے بلوں وغیرہ کا بھی مسئلہ تھا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ مسلسل اپنے بائیر کو یاد دہانی کے فون اور ای میل کر رہے تھے مگر ابھی تک وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں آیا ہے۔" انور نے تفصیل سے شیراز کو سارے حالات بتائے۔

"اچھا، تو فراز کو یہ پریشانی لگی ہوئی تھی، شاید اسی لیے اس نے غائب دماغی میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرا دی ہو گی۔" شیراز نے انور سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، کیوں کہ وہ اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، کافی دیر ہو گئی تھی، اس کے گھر سے بھی فون آنے لگے تھے، کراچی کے حالات کی وجہ سے ہر شخص سہما سہما سا رہنے لگا ہے۔

"میرا نہیں خیال کہ حادثے کی صرف یہ ہی وجہ رہی ہو گی۔" انور نے شیراز کے استفسار پر نفی میں سر ہلایا۔ آسیہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

"کیا مطلب، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" شیراز نے حیرت سے انور کو گھورا۔

"مجھے فراز صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے، تین سال گزر گئے ہیں۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں، وہ ایک کھرے کاروباری آدمی ہیں، ایسے مسئلے مسائل تو بزنس کا حصہ ہیں، وقتی پریشانی الگ بات ہے مگر وہ ان سے نمٹنا بھی خوب جانتے ہیں، لیکن آج کل ان کی طبیعت کا چڑچڑاپن بتا رہا ہے کہ بات کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو، اب ہر بات کوئی اپنے دفتر کے ساتھیوں سے شیئر تو نہیں کرتا نا۔" انور نے گہری نظروں سے ان دونوں کو دیکھا، آسیہ کو سلام کیا اور شیراز سے مصافحہ کیا۔

"ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟" شیراز نے اس سے ہاتھ ملایا، اور خود کلامی کی۔ ان کی سوئی اسی بات پر اٹک گئی۔

"اب یہ بات تو فراز صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔" انور نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے، شیراز بھی اس کا شکریہ ادا کرتے اس کے پیچھے چل دیے۔

"اف یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، میں نے اپنی بے وقوفی میں ایک فضول سی بات کو انا کا مسئلہ بنا کر رازی کو اتنی ذہنی اذیت دی کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔" انور کی باتوں نے آسیہ پر سوچوں کے نئے در وا کر دیے۔ دل پہ آنسوؤں ...کی نمی گری تو مطلع صاف ہو گیا، اسی لیے اس نے اپنا محاسبہ شروع کر دیا، ہر طرف سے اپنے آپ کو ہی مجرم پایا۔

"اے لڑکی ...... تم رازی کی پریشانی کے بارے میں کچھ جانتی ہو۔" شیراز نے گاڑی چلاتے ہوئے سوچوں میں گم آسیہ سے پوچھا۔

"جی...... نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اسی میں عافیت تھی۔ شیراز اسے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ فراز ابھی دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا، ویسے تو خطرے کی کوئی بات نہیں تھی لیکن اسے ٹیسٹ کی رپورٹ آنے تک اسپتال میں رکنا تھا۔ رات ہو چلی تھی، آسیہ کی خواہش تو تھی کہ وہ شوہر کے ساتھ رکے، مگر شیراز نے سختی سے منع کر دیا تھا، ایک تو وہ مردانہ وارڈ تھا، اس لیے انہوں نے خود رکنے کا فیصلہ کیا، پھر بچیوں کا بھی مسئلہ تھا۔ اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھر آنا پڑا۔

☆☆☆

آسیہ نے بچیوں کو کھانا کھلایا اور سلانے کے لیے لٹا دیا، چھوٹی ہانیہ جو فراز سے بہت ہلی ہوئی تھی اس کے بغیر

سونے کو تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک پاپا کو یاد کر کے روتی رہی، اسے گود میں لیے گھنٹا بھر ٹہلایا۔ وہ پھر کہیں جا کر سوئی۔

"فراز گھر پر نہیں ہیں تو لگ رہا تھا کہ جیسے دنیا کے سارے کام ہی ختم ہوگئے ہوں۔" آسیہ سوچوں میں گم تھی۔

بچیاں سوگئیں، تو گھر میں اور سناٹا طاری ہوگیا۔ اس کی گھبراہٹ کم ہی نہیں ہو رہی تھی، رازی کا زرد چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا تو رونا آجاتا۔

اس نے وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھنے لگی، خضوع و خشوع سے اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں، بچیوں پر ایک نظر ڈالی چھوٹی والی نے ٹانگ مار کر چادر دور پھینک دی تھی، دونوں کو ٹھیک سے چادر اوڑھائی، کمرے کی لائٹ بجھائی اور قرآن شریف لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ دیر تک تلاوت کرنے سے دل کو سکون حاصل ہوا۔ چائے کی طلب ہونے لگی تو وہ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر کچن سے باہر نکل آئی اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ فرنیچر، پردے، شوپیس سب اپنی اپنی جگہ تھے مگر شوہر کے نہ ہونے سے گھر گھر نہیں لگ رہا تھا، ایک ہی دن میں ہنستا بستا آشیانہ جیسے کھنڈر میں تبدیل ہوگیا تھا، اسے ان سب چیزوں کو دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی، جن کی وجہ سے اس نے رازی کا دل دکھایا۔

مادی چیزوں کی چاہ میں ہی تو اس نے اپنے محبوب کو ذہنی اذیت پہنچائی، اسے احساس ہو رہا تھا کہ اصل حقیقت تو پیار، محبت، میاں بیوی کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی، بچوں کی قلقاریاں اور گھر کا سکون ہوتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ چیزیں تو فانی ہوتی ہیں، پھر ان سے ایسا بھی کیا لگاؤ کہ رشتوں کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ مٹی، گارے سے بنا ہوا مکان چھوٹا ہو یا بڑا اگر وہاں رہنے والوں کے درمیان محبت پائی جائے تو اسے گھر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اس نے چائے ختم کی اور کمرے میں چلی آئی۔

بستر پر لیٹتے ہی سوچیں ڈنک مارنے لگیں۔ فراز اتنے دنوں سے اپنے کاروباری پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے باعث آزار بن گئی، پچھتاوے کا ناگ اسے رات بھر ڈستا رہا، اذیت کے مارے آسیہ کی ساری رات آنکھوں میں کٹی۔

یہ اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی، ایسا لگتا تھا جیسے سویرا ہی نہیں ہوگا، وہ پہلی بار ایسی اندھیری تنہائی کا شکار ہوئی تھی، اس کی زندگی کی ہر اندھیری رات میں فراز کی رفاقت اور محبت کی چاندنی نے روشنی پھیلائی تھی، آج وہ اکیلی ہوئی تو احساس ہوا کہ گھر تو گھر والوں سے بنتا ہے، سامان سے نہیں۔

فجر کی اذان نے اسے جیسے زندگی کی نوید دی، صبح کے اجالے کے ساتھ ہی وہ رات کی گلا گھونٹتی کیفیت سے باہر نکل آئی، اس کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی ہو، جلدی سے بستر سے اتر کر واش روم میں گھس گئی۔

وہ نماز پڑھ کر جائے نماز طے ہی کر رہی تھی کہ شیراز بھائی کا فون آگیا، کہ فراز کی ٹیسٹ کی رپورٹس رات کو ہی آگئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ سب کلیئر ہے۔ بس کچھ دنوں تک آرام کرنا پڑے گا تاکہ گھاؤ بھر جائیں۔ وہ تھوڑی دیر میں اسے ڈسچارج کرا کے گھر لا رہے ہیں۔

آسیہ نے فوراً ہی شکرانے کے نفل ادا کیے، وہ کچن میں فراز کے لیے کھچڑی اور چکن سوپ چڑھا رہی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ دوڑی کہ آواز سے بچیاں نہ اٹھ جائیں، وہ دونوں بھی رات کو دیر سے سوئی تھیں اسی لیے آسیہ نے انہیں آج اسکول نہیں بھیجا۔

اس نے چیک کیا تو مرینہ کا فون تھا، اس نے فوراً ہی لائن کاٹ دی، وہ اس وقت اپنی دوست نما دشمن سے بالکل بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی جس نے اس کی ہنستی بستی دنیا اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آسیہ نے خوشی خوشی فراز کی پسند کے کپڑے استری کیے اور نہانے گھس گئی، اس کے گھر پہنچنے سے قبل وہ فریش ہونا چاہتی تھی۔ اتنے دنوں کی بے رخی کا کچھ تو ازالہ کرنا تھا۔

☆☆☆

اسپتال سے واپسی کے بعد وہ پندرہ دن بستر پر رہا، اس دوران میں جس طرح آسیہ نے گھر اور باہر کی ذمہ داریاں نبھائیں اس کے دل کے سارے گلے شکوے یوں دھل گئے جیسے بارش کے بعد سارا منظر دھل جاتا ہے۔ وہ آسیہ کی تیمارداری، محبت فراموش نہیں کر پایا، جو اس نے ایکسیڈنٹ کے بعد نبھائی۔

وہ بستر پر منہ پھلائے پڑا رہتا، آفس کے معاملات کی الگ فکر ورکرز کو تنخواہوں کی ادائیگی کرنی تھی، ایسے میں وہ نہ صرف اس کے غصے کو برداشت کرتی بلکہ شوہر کو جیسے ہتھیلی کا چھالا بنا ڈالا۔

شیراز بیوی بچوں کے ساتھ روزانہ چکر لگاتا۔ جتنا ہو سکتا، باہر کے کام نمٹا جاتا۔ انور نے دفتر کے سارے معاملات

ایمانداری سے سنبھالے۔ اکثر وہ دفتر کا کام گھر ہی لے آتا تو وہ بھی بھائی کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیتا، مگر روزانہ کے کئی کام ایسے ہوتے جو آسیہ کو خود کرنے پڑتے، سب سے خوش آئند بات یہ ہوئی کہ اس دوران میں جب بھی مرینہ کا فون آیا، یا تو آسیہ نے مختصر سلام دعا کر کے بند کر دیا، یا پھر دوبارہ بات ہی نہیں کی۔ فراز کے ایکسیڈنٹ کا سن کر وہ محترمہ آنے کو مچل اٹھیں مگر آسیہ نے بڑے طریقے سے منع کر دیا، ویسے بھی رازی نے بیوی کو تنبیہ کر دی تھی کہ وہ مرینہ سے تعلقات کم سے کم رکھے گی۔ رازی کی بیماری کے دوران میں اسے خود بھی احساس ہوا کہ اس کے لیے دنیا میں اپنے شوہر سے بڑھ کر کچھ نہیں، دوسروں کے ورغلانے میں آکر گھر کو تباہی کے دہانے تک لے جانا کہاں کی عقلمندی تھی۔

☆☆☆

''آس......او......آس، ارے بیگم صاحبہ سب کام کاج چھوڑو، آکر میری بات سنو۔'' فراز کی آواز میں خوشیاں کھنک رہی تھیں۔

''کیوں ...... چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔'' آسیہ جو کچن میں بڑے انہماک سے رات کے کھانے کے لیے قیمہ بھوننے میں مگن تھی کفگیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، ہاتھ پونچھ کر باہر جاتے ہوئے بولی۔

''میں...... تمہیں بتا نہیں سکتا کہ کتنا خوش ہوں'' فراز نے اسے گھما ڈالا۔ آسیہ کا سر گھومنے لگا، تو وہ چکراتے سر کو تھامے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''سو......سوری میں تو بھول ہی گیا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے، ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی ہے۔'' رازی ایک دم اپنے جذباتی پن پر گھبرا اٹھا اسے پیار سے تھام کر زبردستی وہیں لٹا دیا۔ اپنی خوشی میں اس کے دماغ سے یہ بات تو نکل ہی گئی تھی کہ وہ آج کل دوبارہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی ہے۔

''کیا ہوا...... کیوں اتنے خوش ہیں؟'' سیب کا جوس پی کر اس کے حواس بحال ہوئے تو نرمی سے پوچھنے لگی۔ رازی کے چہرے کی شوخی لوٹ آئی۔

''تمہارے علم میں یہ بات تھی نا...... میں نے چاولوں کا جو آرڈر امریکا بھیجا تھا، اس کی ادائیگی رکی ہوئی تھی، وہ تو شیراز بھائی کی مالی مدد کی وجہ سے میں ورکرز کی رکی ہوئی تنخواہیں اور بلوں کی ادائیگی کے قابل ہوا، اب مائیکل جو میرا بائیر ہے اس کا جواب آگیا ہے۔ اس نے نہ صرف پوری رقم بھیج دی ہے، بلکہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کا ہرجانہ بھی الگ سے ادا کیا ہے، اس لیے اچھی خاصی رقم میرے اکاؤنٹ میں آگئی ہے۔'' اس نے آسیہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پیار سے کہا، جو سر کے نیچے کشن لگائے، منہ اونچا کیے مکمل طور پر شوہر کی طرف متوجہ تھی۔

''اچھا...... مگر آپ نے پوچھا نہیں کہ اس نے پیسے دیر سے کیوں بھیجے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ...... ایک طویل کہانی ہے جو اس نے مجھے فون پر بتائی، مجھ سے بزنس کرنے سے قبل اس نے ایک اور بڑی پاکستانی پارٹی سے ڈیل کی تھی، انہوں سیمپل والا مال تو بہت اچھا دیا، مائیکل مطمئن ہو گیا۔ مگر جب مال یہاں سے آگے سپلائی ہوا تو پتا چلا کہ چاولوں میں وزن بڑھانے کے لیے کنکر وغیرہ کی ملاوٹ کی گئی تھی، مائیکل کا کسٹمر تو ایسے گھٹیا مال پر بھتے سے اکھڑ گیا۔''

مائیکل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی ساکھ کا معاملہ تھا اس لیے اس نے وہاں اضافی رقم دے کر پہلے وہ چاول صاف کروائے، پھر انہیں آگے سپلائی کیا۔ وہاں کی لیبر پاکستان کے مقابلے میں بہت مہنگی ہے اسی لیے اسے ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا جس سے اسے فائدے کی جگہ نقصان ہوا۔

''اس بار اس نے اپنے ایک پاکستانی ورکر نسیم کے توسط سے جو کہ میرا بہت اچھا دوست بھی ہے، بڑی کمپنی کی جگہ مجھ جیسے چھوٹے سپلائر کو بزنس دیا، نسیم کے بھروسے پر اس نے مجھے پہلی بار آرڈر تو دے دیا مگر پھر بھی وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا، بقول اس کے ایک پاکستانی سے چوٹ کھا کر بیٹھا تھا، اتنی جلدی اعتماد کیسے بحال ہوتا پھر اسے یہ بھی شبہ تھا کہ کیوں کہ میرا کاروبار بڑے پیمانے پر نہیں ہے، تو کہیں زیادہ منافع کی لالچ میں، میں نے بھی ملاوٹ والا مال آگے نہ بھیج دیا ہو۔ اس لیے اس نے اپنی تسلی کے لیے پہلے مال چیک کیا پھر سپلائی آگے بڑھائی، ان معاملات کی وجہ سے وہ پیمنٹ روکے ہوئے تھا۔ جب اسے وہاں سے پوری ادائیگی ہو گئی تو اس نے میرے پیسے بھیج دیے۔ اسے ای میلز کے ذریعے میری مشکلات کا اندازہ ہو رہا تھا اسی لیے بغیر کہے ہرجانہ بھی بھرا۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ ہمارا چاول وہاں اتنا پسند کیا جا رہا ہے کہ مائیکل کا ایک اور بڑا آرڈر بھی مل گیا۔''

''آخر چند پیسوں کی لالچ میں لوگ نہ صرف اپنا دین وایمان خراب کرتے ہیں بلکہ وطن سے بھی غداری کرتے ہیں، کیا فائدہ ہوا، اب اس فرم کو مائیکل تو نیا آرڈر نہیں دے گا

نا...... اگر ایمانداری سے چلتے تو وہ ان کے ساتھ کاروبار کر رہا ہوتا۔"

"تمہیں پتا ہے نا جان ...... جہاں وطن کی عزت کا معاملہ آجائے وہاں میرے لیے ہر بات ختم ہو جاتی ہے، میں سب سے پہلے پاکستان کی نیک نامی کے بارے میں ہی سوچوں گا، اسی لیے میں نے کم منافع رکھتے ہوئے مائیکل کو سب سے اچھی کوالٹی کے صاف ستھرے چاول بھیجے تھے، اب ان لوگوں کو نہ صرف ہمارا کام پسند آیا بلکہ مجھے اس سے بھی بڑا آرڈر مل گیا ہے، میں نے سب سے پہلے تو شیراز بھائی کے پیسے دینے ہیں۔" وہ سرشاری سے مسکرایا۔

"یہ ......تو بہت اچھا ہوا، بے شک اللہ نیکی کی راہ اپنانے والوں کو کبھی بے آسرا نہیں چھوڑتا۔" آسیہ نے آنکھ بند کر کے کہا اور خاموش ہو گئی۔

"کیا بات ہے...... تم اتنی خوش نظر نہیں آرہی ہو، جیسی میں توقع کر رہا تھا۔" رازی نے اس کے چہرے کی پھیکی سی مسکراہٹ دیکھی تو پوچھ بیٹھا۔

"بس...... ویسے ہی صبح سے طبیعت گری گری سی ہے۔" آسیہ نے اسے ٹالنا چاہا اور اس کا دل رکھنے کو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ڈیئر۔ میں تمہاری ہر ادا سے اچھی طرح واقف ہوں، اصل بات بتاؤ۔" رازی نے اسے دوبارہ زبردستی لٹایا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا، تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"صبح مرینہ کا فون آیا تھا، وہ آج کل بہت پریشان ہے۔ فون پر ہی رونے لگی۔" آسیہ نے ہاتھ مسلتے ہوئے بتایا، رازی اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو گیا تھا۔

"کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔" رازی کا لہجہ پُرتجسس تھا، وہ اندر سے ڈر گیا کہ اس عورت نے اب ان کی ہنستی ہوئی زندگی میں کوئی نیا تماشا نہ کھڑا کر دیا ہو۔

"آج کل وہ لوگ بڑے برے حالات سے گزر رہے ہیں۔" آسیہ نے ٹھہر ٹھہر کر بتانا شروع کیا۔ "اصل میں اختیارات کے ناجائز استعمال کی وجہ سے جن افسران کی تنزلی ہوئی ہے ان میں اسد بھائی کا بھی نام آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ غضب بھی ہوا کہ اب ان کے اثاثوں کی بھی جانچ پڑتال شروع ہو گئی ہے کہ سرکاری تنخواہ دار ملازم کے پاس اتنی جائیداد کہاں سے آئی؟" آسیہ نے افسردہ لہجے میں بتایا، صبح فون پر مرینہ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کے بعد سے اس کا دل بہت اداس تھا، وہ ایک نرم دل لڑکی تھی کسی کو یوں روتا دیکھنا اس کے لیے مشکل امر تھا۔

"مرینہ کے والد تو خود، سرکاری افسر تھے، میں نے سنا تھا کہ ان کا اپنے وقت میں بڑا اثر رسوخ تھا، انہوں نے اس سلسلے میں داماد کی مدد نہیں کی۔" فراز بھی افسردہ ہو گیا، بہرحال وہ ان لوگوں کی پرانی رفیق کار تھی۔

"ساری بات کرسی کی ہوتی ہے...... جب وہ ہی نہ رہے، تو تعلقات بھی دم توڑ جاتے ہیں۔ جب تک آدمی بڑے عہدے پر ہوتا ہے۔ لوگ جھک جھک کر سلامی دیتے ہیں، بعد میں کون کسی کو پوچھتا ہے، اب ان سے جو ہو سکتا ہے وہ کر رہے ہیں، مگر اس بار اوپر سے بہت سختی ہو رہی ہے ویسے محکمے میں ان کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں رہی، ایسا پیسا جیسے آتا ہے ویسے ہی چلا جاتا ہے، وہ تو خود اب بچوں کے محتاج ہیں۔" آسیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اللہ اس کی مشکل آسان کرے، خیر تم اپنی طبیعت مت خراب کرو۔ ایک اور خوش خبری سنو...... میں نے رنگ والے کو بلا لیا ہے، سب سے پہلے گھر میں رنگ و روغن کا کام مکمل کروا لیتے ہیں، اس کے بعد نیا فرنیچر لے آئیں گے۔" فراز نے بیوی کی خواہشات پوری کرنے کی ٹھانی۔

"نہیں...... اب مجھے اپنا گھر ایسے ہی پیارا لگ رہا ہے، کسی بھی طرح کی فضول خرچی کی کوئی ضرورت نہیں، میں سمجھ گئی ہوں کہ مکان کی رونق مکینوں سے ہوتی ہے سامان سے نہیں۔" آسیہ نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا۔ اس کی حسین آنکھیں خوشی کے احساس سے جگمگ کرنے لگیں۔ رازی نے محبوبیت سے بیوی کو دیکھا اور سر ہلا کر اتفاق کیا۔

"پاپا، ...... پاپا...... میری چاکلیٹ آپی نے کھا لی۔" چھوٹی والی ہانیہ ہانپتی ہوئی آکر باپ سے ٹکرا گئی۔

"نہیں پاپا میں نے تو یہ والی چاکلیٹ کھائی تھی...... اس پر ہانیہ کا نام کہاں لکھا ہے؟" چھوٹی ثانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ شرارت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"یہ لو پاپا آپ دونوں کے لیے بہت ساری چاکلیٹس لائے ہیں، اب تو میری شہزادیاں خوش ہیں نا۔" فراز ان دونوں کا جھگڑا نمٹانے میں لگ گیا۔ آسیہ پاس کھڑی مسکراتی رہی، تھوڑی دیر میں ان چاروں کی ہنسی کمرے میں گونجنے لگی، مکان کو گھر بنانے میں اسے بہت سی آزمائشوں سے گزرنا تو پڑا تھا مگر اب وہ جینے کا گر پہچان گئی تھی۔

تمنا

جناب معراج رسول
سلام تہنیت
زیرِ نظر واقعہ تازہ تازہ ہے۔ دل کو چیر دینے والا۔ میرے آنسو اب تک تھم نہ پائے ہیں۔ میرا خیال ہے قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔
ڈاکٹر ممتاز عمر
(کراچی)

ہمیشہ کی طرح شاہ زیب اسکول سے آیا۔ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ شام ڈھلے آنکھ کھلی تو خنکی بڑھ چکی تھی۔ موسمِ سرما کی وجہ سے سورج بھی جلدی غروب ہونے لگا تھا۔ اس نے اٹھتے ہی ماں کو پکارا۔ ”ماما! آپ نے مجھے جلدی کیوں نہیں اٹھایا؟ مجھے بہت سا کام کرنا تھا۔“

ناہید نے اس کے قریب آکر کہا۔ ”مجھے بتا دیتے تو میں اٹھا دیتی۔ کمبل کی گرمائی میں تم کچھ زیادہ ہی سو لیے میں سمجھی تھکے ہوئے ہو۔“

’’ہاں ماما! تھکاوٹ تو ہے کیوں کہ دن بھر کل کے پروگرام کے لیے ریہرسل ہوتی رہی۔ بار بار چیزوں کو درست کرنے کی خاطر ہمیں اپنے ٹیبلو کو دہرانا پڑا۔ پھر مجھے گھر کے لیے کام بھی دے دیا گیا ہے مگر نیند میں کچھ زیادہ ہی وقت ضائع ہو گیا۔‘‘

’’چائے پی کر کام بھی کر لینا۔‘‘ ماں بولی۔

اس نے ہاتھ منہ دھوئے اور چائے پینے کے بعد اپنی ٹیبل پر جا بیٹھا۔

رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ گل فراز نے پکار کر کہا۔ ’’کیپٹن صاحب! آ جائیں کھانا کھا لیں۔‘‘ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھا مگر لاابالی انداز میں کھانا کھایا۔ وہ اٹھنے والا تھا کہ باپ نے پوچھا۔ ’’بیٹا! کیا سارے کارڈ بنانے کی ذمہ داری تم پر آن پڑی ہے۔‘‘

مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ’’نہیں آدھے کارڈ تابش بنا رہا ہے۔ ہم دونوں کی خوشخطی کے پیشِ نظر سر نے ہم دونوں کو کارڈ بنانے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔‘‘

ناہید نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’بیٹا ہماری خواہش کب پوری ہوگی؟ وہ دن کب آئے گا جب تم پاک فوج کی وردی زیب تن کیے کاندھوں پر فیتے سجائے ہمارے خوابوں کو تعبیر بخشو گے؟‘‘

شاہ زیب بولا۔ ’’ماما چند سال کی بات ہے، انٹر کے بعد سلیکشن ہوگا اور پھر آپ کو خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ بس یہ دو تین سال اہم ہیں۔ میں کیپٹن بنوں گا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ دونوں نے تو میری پرورش کے دوران ہی مجھے کیپٹن کہہ کہہ کر ذہنی طور پر تیار کر دیا ہے کہ میرا مقصدِ حیات ملک و قوم کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔‘‘

گل فراز بولا۔ ’’بیٹا تمہارے دادا کی بھی یہی خواہش تھی مگر جب میں سلیکشن کے لیے گیا تو بہت ذرا سی کمی کی وجہ سے تمہارے دادا کے خواب کو پورا نہ کر سکا۔ بس یوں سمجھو تمہارے سلیکشن سے جہاں ہماری خواہش پوری ہوگی وہیں ہمارے بزرگوں کی روحوں کو بھی تسکین پہنچے گی۔‘‘

کھانے سے فارغ ہو کر شاہ زیب ایک بار پھر اپنی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ کارڈوں پر اشعار لکھتا۔ انہیں مختلف زاویوں سے دیکھتا اور کلرز کے ذریعے انہیں مزید جاذبِ نظر بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ اتنی سجاوٹ و خوب صورتی پیدا کرنے کے بعد بھی وہ بعض کارڈوں سے مطمئن نہ ہو پاتا۔

یوں خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ دوبارہ کارڈ بنانے لگتا۔ اس کام کو کرتے ہوئے اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اسے وقت کا اندازہ ہی نہ رہا۔

’’بیٹا! گھڑی دیکھو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔‘‘ ناہید نے پکار کر کہا۔

’’بس ماما میں دو کارڈ اور مکمل کر لوں پھر سونے کے لیے آتا ہوں۔‘‘

ماں اس کے قریب آ کھڑی ہوئی، کئی کارڈ اٹھا کر دیکھے اور ماشاء اللہ و سبحان اللہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ پوچھنے لگی۔ ’’پروگرام کس طرح ترتیب دیا گیا ہے؟‘‘

’’پہلے ٹیبلو پیش کیے جائیں گے پھر نویں اور دسویں جماعت کے طلباء کے لیے ان کی شخصی خوبیوں کے مطابق اشعار پڑھ کر باری باری انہیں کارڈ دیں گے جس کے بعد دسویں جماعت کے طلباء بھی تمام اساتذہ کو اشعار کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کریں گے۔ یوں پارٹی کے اختتام پر دعوت کا اہتمام ہے۔‘‘

پشاور صدر کے ایک گھر میں تین نفوس پر مشتمل یہ چھوٹا سا خاندان تھا۔ گل فراز الیکٹرونک کے سامان کا تاجر تھا۔ بازار میں اس کی دکان تھی۔ ناہید اس کی چچا زاد تھی۔ دونوں تعلیم یافتہ و خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ شادی کے کئی سال تک ناہید کی گود سونی رہی۔ طبی اعتبار سے زوجین مکمل تندرست تھے۔ پھر دعاؤں اور منتوں کی نوبت آئی۔ اس پورے عرصے میں ناہید کا حسن خاصا ماند پڑ گیا۔ اس کی فکرمندی اور بے چینی اس کی صحت کو متاثر کر رہی تھی مگر پھر مشیتِ ایزدی کے مطابق شادی کے ساتویں برس ان کے گلشن میں پھول کھلا جس کی آمد پر تمام خاندان میں خوشیاں منائی گئیں۔ مٹھائیاں بٹیں، دعوتیں ہوئیں اور شاہ زیب کی آمد سے ناہید کے چہرے کی بشاشت اور حسن و رعنائی بھی لوٹ آئی۔ اب اس کی توجہ کا مرکز و محور اس کا بیٹا تھا جس کی پرورش اور نگہداشت میں کسی قسم کی کمی کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی یہ احساس کچوکے لگاتا کہ شاہ زیب کے بعد کسی اور اولاد کی ولادت نہ ہوئی مگر وقت کے گزرنے سے یہ خلش بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ یوں ماں اور باپ کی شفقت و محبت تنہا شاہ زیب کے حصے میں آئی۔ اس کی اٹھان بڑی خوبصورت تھی وہ صحت مند اور ڈبل ڈول کے اعتبار سے اپنے ہم عمروں میں نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں اسے آرمی پبلک اسکول کی راہ دکھائی گئی جہاں کے ماحول میں اس نے خوب خوب نام کمایا۔ وہ نصابی و غیر

نصابی.... سرگرمیوں میں ممتاز شمار کیا جاتا۔ پرائمری کے امتحان میں وہ تمام اسکول میں اوّل آیا۔ اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں ٹرافی سے نوازا گیا۔ آٹھویں جماعت تک بھی وہ اپنی کلاس میں اوّل آتا رہا۔ نویں جماعت کے نتائج میں بھی اس نے نوّے فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔ وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی انعامات حاصل کرتا یوں وہ اپنے والدین کے لیے ہی نہیں اساتذہ کے لیے بھی باعث فخر تھا۔ ماں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود اس کے کپڑے استری کرتی، شوز پالش کرتی اور اس کی تمام خواہشات کو پورا کرتی۔ موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی وہ اس کے لیے سوئیٹر بننے شروع کر دیتی جسے دیکھ کر اکثر اس کا شوہر کہا کرتا۔ ”تم اتنی محنت سے سوئیٹر بنتی ہو حالانکہ بازار میں خوب صورت وودیدہ زیب سوئیٹر با آسانی مل جاتے ہیں۔“

”ان سوئیٹرز میں ماں کی ممتا اور جذباتی وابستگی تو نہ ہوگی۔“ وہ بڑی محبت سے کہتی۔

16 دسمبر کی صبح گل فراز اور ناہید نے اٹھ کر نماز فجر ادا کی اور دونوں ہی جدا جدا مصروفیات میں لگ گئے۔ گل فراز نے پہلے قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور بعد میں اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ناہید نے بھی قرآن کریم کے مطالعے کے بعد کچن کی راہ لی۔ وہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی کہ اسے اندازہ ہوا شاہ زیب شاید نہیں اٹھا۔ وہ کمرے میں گئی اور شاہ زیب کو آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ محنت سے تیار کیے کارڈز سنبھالے، ناشتے کے لیے ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے گھڑی پر نظر پڑی تو اس نے ماں کو پکار کر کہا۔

”ماما! میں اسکول جا رہا ہوں۔“

”ناشتا بالکل تیار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ناہید ٹرے لیے آگے بڑھی مگر اسی دوران وین کا ہارن بجا۔ شاہ زیب نے آگے بڑھ کر ماں کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

”ماما کیا کروں گاڑی آگئی۔ آپ نے میرے لیے ناشتا بنایا آپ یہ سمجھیں میں نے ناشتا کرلیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔

ناہید ٹرے ٹیبل پر رکھ کر محویت کے عالم میں اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اسی دوران گل فراز بھی آگیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا جس کے بعد گل فراز اپنی دکان کے لیے روانہ ہو گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ گھریلو ملازمہ آگئی جس سے مخاطب ہو کر وہ بولی۔ ”پہلے کچن میں برتن دھولو پھر جھاڑو دے کر پوچھا لگا لو اور ہاں آج مشین لگا کر کپڑے بھی دھولو۔“ یہ کہہ کر وہ خود اٹھی اور دوپہر کے کھانے کی غرض سے کچن کی طرف چلی جہاں اس نے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچن اور ٹی لاؤنج برابر برابر تھے۔ مارننگ شوز آرہے تھے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ وائٹ چکن کڑاہی بنانے کی عملی ترکیب بتائی جارہی ہے جسے دیکھنے اور سمجھنے کی خاطر وہ کچن کی مصروفیات ترک کر کے ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھی۔ وہ آج پہلی بار اس طرح کھانے کی ترکیب نہ دیکھ رہی تھی بلکہ وہ تو اکثر انواع و اقسام کے کھانوں کی تراکیب سمجھ کر نئے نئے تجربے کرتی تھی جس سے اس کا شوہر اور بیٹا خوب خوب محظوظ ہوا کرتے تھے۔

دن گیارہ بجے کا وقت تھا اچانک بریکنگ نیوز آنی شروع ہوئی جس کے مطابق آرمی پبلک اسکول پر وہشت گردوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اساتذہ و طلباء یرغمال بنا لیے گئے تھے۔ دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ یہ خبر بار بار تازہ ترین خبر کے طور پر آتی رہی اور پھر پروگرام روک کر اس اندوہناک واقعے کی براہ راست کوریج شروع ہوئی۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر کئی چینل دیکھے ہر طرف یہی لرزہ خیز خبر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند طلباء کی موت کی خبر پچاس سے

بچوں کو دودھ پلانے والی ماؤں کا بلڈ پریشر

ماؤں کی جانب سے شیر خواروں کو دودھ پلانے کا فائدہ صرف بچوں کو ہی نہیں ہوتا بلکہ خود مائیں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ ایک نئے طبی جائزے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دودھ پلانے کے کئی سال بعد بھی ماؤں کے بلڈ پریشر بڑھنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آف ویسٹرن سڈنی اسکول آف میڈیسن کے ریسرچرز نے دیکھا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کو جتنے زیادہ عرصے تک اپنا دودھ پلاتی ہیں 64 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے تک ان میں ہائی بلڈ پریشر کا امکان اتنا ہی کم ہوتا ہے تاہم 64 سال کی عمر کے بعد اس فائدے کا امکان گھٹنے لگتا ہے۔ ریسرچ نے بریسٹ فیڈنگ اور ہائی بلڈ پریشر میں تعلق کو سمجھنے کے لیے 74 ہزار 785 آسٹریلوی خواتین کے بارے میں تفتیش کی جو 45 سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھیں۔

مرسلہ: زویا فرہاد، جہلم

زیادہ کی تعداد تک پھیل گئی۔ اس دوران جب یہ خبر نشر ہوئی کہ دہشت گردوں نے اسکول کے اس ہال پر بھی قبضہ کر رکھا ہے جہاں نویں دسویں کے طلباء کی پارٹی ہو رہی تھی تو اس کی بے چینی و اضطراب بہت بڑھ گیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کر رہی تھی۔ بظاہر ٹی وی اسکرین پر آرمی پبلک اسکول کے واقعات دکھائے جا رہے تھے مگر وہ لاشعوری طور پر تصور میں اسکول کے اس ہال میں جا پہنچی جہاں پارٹی ہو رہی تھی۔ دہشت گرد فائرنگ کرتے اور بچے ان سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دل خراش چیخوں سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام لیا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اپنا موبائل اٹھا کر اس نے گل فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ نیٹ ورک بزی تھا۔ بمشکل تمام رابطہ ہو پایا۔ دوسری طرف سے گل فراز بولا۔ ”میں اسکول کی طرف جا رہا ہوں تم میرا انتظار کرو۔“

وہ ٹی وی کے سامنے سکتے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ شہدا کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ملازمہ نے آکر کچھ پوچھا جس پر وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

یہ سن کر ملازمہ واپس چلی گئی۔ وہ کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی کبھی چینل بدلتی پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملاتی، بڑی کوششوں کے بعد ایک بار پھر گل فراز سے رابطہ ہو پایا جس پر اس نے بتایا کہ وہ لیڈی ریڈنگ اسپتال میں ہے جہاں بے تحاشا رش ہے۔ مزید کوئی معلومات ہوئیں تو بتائے گا۔ اس نے اپنی ماں اور بھائی کا نمبر ڈائل کیا کچھ دیر بعد وہ بھی آگئے۔ انہوں نے بتایا۔ ”تمام بازار بند ہیں۔ ٹریفک بے ہنگم، افراتفری کا عالم ہے۔“ پھر یہ کہہ کر ”میں بھی لیڈی ریڈنگ اسپتال جا رہا ہوں ....چلا گیا۔“

لیڈی ریڈنگ اسپتال کے باہر لوگوں کا اژدحام تھا۔ گل فراز کا برادر نسبتی زاہد خان بھی اس سے جا ملا۔ سینکڑوں والدین تھے جو اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہجوم بے تحاشا تھا وہ دونوں بڑی مشکل سے ایمرجنسی میں پہنچے جہاں ہر زخمی بچے کے گرد اس کے عزیز و اقارب کھڑے تھے۔ مختلف بچوں کو دیکھتے ہوئے ایک بچے حذیفہ کے پاس کھڑے ہو کر گل فراز نے اس کی طبیعت پوچھی۔ نحیف و کمزور آواز میں وہ بولا۔ ”انکل ٹھیک ہوں۔“ جس کے بعد اس کا اگلا سوال یہ تھا۔ ”اور شاہ زیب......“ جس پر حذیفہ نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے اور یہ کہتے ہوئے کہ ”شاید وہ تو......“ آنکھیں بند کر کے آنسو بہانے لگا۔

ان دونوں نے مل کر تمام زخمی بچوں کو دیکھا اور پھر مردہ خانے کی طرف مڑ گئے۔ جن بچوں کی شناخت ہوتی جا رہی تھی انہیں ان کے ورثا کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ آہ و فغاں کی صدائیں تھیں۔ نالہ و فریاد ایسی کہ آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ہر طرف کہرام مچا تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کی لاشوں کے گرد کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ گل فراز بہت سے چہروں کو پہچانتا تھا۔ اکثر شاہ زیب کے ہم جماعتوں کے والدین تھے مگر یہ وقت کسی کو تسلی دینے اور صبر کی تلقین کا نہ تھا۔ وہ خود بے چین و مضطرب تھا اس لیے کسی اور کو کیا تسلی دیتا۔ آگے کی جانب اس اسٹریچر کے گرد وہ اور زاہد ٹھہر گئے۔ یہ کوئی اور نہیں اس کا اپنا بچہ تھا۔ اس کے سامنے شاہ زیب ہونٹ اور آنکھیں کھولے اس طرح لیٹا تھا کہ جیسے ابھی کہے گا۔ ”بابا جی! آپ آگئے مجھے گھر لے چلیے۔ بھوک لگی ہے۔ ماما نے ناشتا بنایا تھا میں اب جا کر کروں گا۔“ مگر یہ سب کچھ ایک خیال تھا جس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کیے دیتا تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ زبان گنگ تھی پھر اچانک وہ شاہ زیب کے بازو پکڑ کر ہلانے لگا۔ ”کیپٹن صاحب! اٹھو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اسی پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ زاہد نے اسے اٹھایا۔ طبی عملے نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جس کے بعد اسے ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ زاہد بھی بڑی مشکل سے اپنے اوسان قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ کسی کو تو اس وقت حوصلہ مندی کا ثبوت دینا تھا۔ کارروائی مکمل ہوئی۔ لاش ان کے حوالے کر دی گئی جسے اسٹریچر پر لٹا کر ایمبولینس میں رکھ کر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر طرف سے ایمبولینسوں کے سائرن بجنے کی آوازیں تھیں اگلی نشست پر زاہد اور پیچھے اسٹریچر پر شاہ زیب ابدی نیند سو رہا تھا۔ گل فراز دیوانہ وار اسے تکے جا رہا تھا۔ آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ اسی حال میں گھر کے پاس پہنچے تو اہل محلہ بھی جمع تھے۔ لوگوں نے آگے بڑھ کر اسٹریچر نکالا کسی نے گل فراز کو سنبھالا۔ گھر کا دروازہ کھول کر جوں ہی اسٹریچر اندر کی طرف لے جایا گیا ناہید آہ و فریاد کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر بے اختیار کہنے لگی۔ ”میرے کیپٹن صاحب! تم تو کہہ کر گئے تھے ماما آپ سمجھیں میں نے ناشتا کرلیا مگر بیٹا ناشتا تو اب تک رکھا ہے آؤ کھا لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دیوانہ وار شاہ زیب کے بوسے لینے لگی اور اسی حالت میں ایک طرف گر کر بے ہوش ہوگئی۔

نرس نے آکر بتایا۔ ”سر اس مریض کی پھر وہی کنڈیشن ہوگئی ہے۔“

میں اس وقت کسی کی رپورٹ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس لیے بے دھیانی سے پوچھا۔ ”کس مریض کی بات کر رہی ہو؟“

”وہی جو پولیس کسٹڈی میں ہے سر۔“ اس نے بتایا۔ ”اس پر پھر رونے کا دورہ پڑا ہے۔“

”او کے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم چلو

محترم مدیر اعلیٰ

میں اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ جو واقعہ سنانے جا رہا ہوں یہ تب کا ہے جب میں پریکٹس کرتا تھا۔ یہ واقعہ خود میں انوکھا ہے اس لیے میں نے اسے بطور خاص سرگزشت کے لیے لکھا ہے۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

ڈاکٹر عبدالمجید
(کراچی)

میں ابھی آتا ہوں۔"

نرس کے جانے کے بعد میں اس مریض کے بارے میں سوچنے لگا۔ رحیم نام تھا اس کا 'عبدالرحیم۔ وہ قاتل تھا اس نے ایک دکان دار کا قتل کر دیا تھا۔

دکاندار ساٹھ باسٹھ سال کی عمر کا آدمی تھا۔ اس نے اندرونِ سندھ سے آ کر کراچی میں دکان کھولی تھی۔ شاید یہ رحیم بھی اسی علاقے کا تھا۔ جس نے نہ جانے کس وجہ سے دکان دار کا خون کر دیا تھا۔

چونکہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس لیے گرفتار بھی ہو گیا تھا۔ اس دکان دار سے جھگڑے کے دوران اس کو چوٹ لگی تھی جو بہت شدید تھی۔ پولیس اسے زخمی حالت میں اسپتال لے آئی تھی۔ جہاں اب اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔

میں چونکہ ایک پولیس سرجن ہوں اس لیے اس قسم کے واقعات روزانہ کا معمول تھے۔

میرا ایک شوق اور بھی ہے اور وہ ہے قیدیوں کے حالات معلوم کرنا۔ ان کی کہانیاں سننا اور خود ان کی کہانیاں لکھنا۔ اس طرح میں نے درجنوں کہانیاں لکھ لی ہیں۔

ایسی جگہوں سے زیادہ سچی کہانیاں اور کہاں ملتی ہوں گی۔

بہرحال میں نے فائل بند کی اور اس وارڈ کی طرف چل پڑا جہاں اس قیدی رحیم کو رکھا گیا تھا۔ اتنے عرصے میں میرا یہ تجربہ ہو گیا کہ کون حادثاتی طور پر مجرم بنا ہے اور کون ایسا ہے۔ جس کی فطرت میں جرم شامل ہے۔

رحیم ایسا آدمی نہیں دکھائی دیتا تھا جو اپنی فطرت میں برا ہو۔ وہ ایک دھیمے لہجے اور نرم چہرے والا آدمی تھا۔ اس نے پولیس والوں کو یہ بتایا تھا کہ اس کا کسی بات پر دکان دار وسایا سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے وسایا کا خون کر دیا۔

لیکن اس کی یہ کہانی مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ بات کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔

چونکہ میں ایک بااختیار ڈاکٹر تھا اس لیے میرے کہنے پر رحیم کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں وغیرہ نہیں لگائی گئی تھیں۔

میں اس کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آیا کرتا۔ اس لیے وہ میرا احترام بھی کرتا تھا۔

میں جب اس کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر اس نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ "نہیں نہیں لیٹے رہو۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم ابھی کمزور ہو۔"

"مہربانی ڈاکٹر صاحب۔" وہ پھر لیٹ گیا۔

"تمہارے زخم بھرنے لگے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "تم بہت جلد ٹھیک ہو کر چلے جاؤ گے۔"

"لیکن جاؤں گا کہاں ڈاکٹر صاحب۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ "یہاں سے نکل کر جیل ہی تو جانا ہے ناں۔ تو زخم ٹھیک ہوں یا نہ ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے بہت دکھ بھرے لہجے میں یہ بات کی تھی۔

"عبدالرحیم تم مجھے ایک بات بتاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم پر جو یہ الزام ہے اس کی کہانی کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں نے خود اس بندے کو مارا ہے۔ اس سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"بس یہی بات میں نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "اس آدمی کا قتل جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی اور وجہ معلوم ہوتی ہے۔"

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہی زخمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کیا نجومی بھی ہیں؟"

"ارے نہیں بھائی بس یوں ہی میں نے اندازہ لگایا تھا۔"

کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب بات تو کچھ اور ہی ہے۔"

"اگر تم مناسب سمجھو تو بتا دو۔"

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کسی نہ کسی کو بتانا تو پڑے گا۔ ورنہ اندر ہی اندر مر جاؤں گا ڈاکٹر صاحب مر جاؤں گا۔"

"تو چلو بتانا شروع کرو۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کریں۔ جیسے اپنی کہانی سنانے کے لیے خود کو سمیٹ رہا ہو۔

☆.....☆

"میں عبدالرحیم ہوں۔ ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا۔ بڑی دکھ بھری زندگی گزاری ہے صاحب۔ بہت پریشانی کی۔ دو بیٹے ہیں میرے اور ایک بیٹی۔ جو سب سے چھوٹی تھی۔ نیلما نام تھا اس کا۔ میں اس کو پیار ... سے ریشم کہا کرتا۔ وہ تھی بھی ریشم جیسی۔ ملائم ملائم خوب صورت۔ مجھ سے بہت لاڈ کرتی تھی۔ اپنی ماں سے زیادہ میرا خیال رکھا

کرتی۔ میں چاہے جتنی رات کو بھی کام سے واپس آؤں نیلما میرے انتظار میں ہی رہتی تھی۔“

”اور تم کرتے کیا تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے قصبے سے کچھ فاصلے پر کاٹن کی ایک فیکٹری ہے چونکہ ہمارے علاقے میں کپاس کی فصل زیادہ ہوا کرتی ہے اس لیے وہ فیکٹری ہمارے ہی علاقے میں بنائی گئی ہے۔ تو میں اس فیکٹری میں سپروائزر تھا صاحب۔ میری ڈیوٹی شفٹوں میں ہوا کرتی تھی کبھی دن کو کبھی رات کو۔ لیکن ڈیوٹی چاہے کسی بھی وقت کی ہو۔ نیلما میرا انتظار کرتی رہتی اور جب میں آتا تو مجھ سے لپٹ جایا کرتی۔“

”ہاں رحیم بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔ جن کو میں پھولوں کی طرح رکھتا ہوں۔“

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے اسے کیا یاد آ گیا تھا۔

نہ جانے کون سا غم اسے بے چین کر دیتا تھا۔ کیسی کہانی تھی۔ میں نے اس کی زبانی جو کچھ کہا لکھا ہے وہ صرف ایک نشست کی بات نہیں تھی۔ بلکہ دو چار دنوں میں جا کر معلوم ہو سکا تھا۔

اس کے بعد اس نے تفصیل سے جو کہانی سنائی وہ بہت الم ناک تھی۔

اس نے بتایا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھ میں ایک بری عادت تھی۔ اس عادت نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ نہ جانے کیسے لت لگ گئی تھی۔ میں اپنے خدا کا بھی گناہ گار ہو گیا تھا اور اپنی نگاہوں سے بھی گر چکا تھا۔“

”اور وہ عادت کیا تھی عبدالرحیم؟“ میں نے پوچھا۔

”جوا کھیلنے کی عادت۔“ اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

یہ سن کر مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ عبدالرحیم ایسا تو نہیں لگتا تھا کہ وہ جوا کھیلنے کا عادی ہو۔ لیکن شاید جو شخص کسی کا قتل کر سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہوگا۔

”بس صاحب ایک دوست کے بہکاوے پر یہ لت لگ گئی تھی مجھے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں فیکٹری سے جب بھی شام کو نکلتا جوے کے اڈے پر پہنچ جاتا۔ اس اڈے کو چلانے والا بشیرا نام کا ایک بدمعاش تھا۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔“

”ظاہر ہے ایسے اڈوں کو چلانے والا ایسا ہی ہوگا۔“ میں تلخ ہو کر بولا۔ اس آدمی سے اب وحشت سی ہونے لگی

جست کی کمی کی علامات

وہ انسان جن کے زخم ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہو ان میں جست کی کمی ہوتی ہے۔ اس کمی کو پہچاننا نہایت آسان ہے۔ ناخنوں پر سفید دھبے جست کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح شدید یا متعدی بیماری کے بعد مریض میں ذائقے کی پہچان ختم ہونے کی وجہ بھی جست کی کمی ہے۔ ایسے مریض کی بھوک میں کمی بھی واقع ہو جاتی ہے جس سے وزن کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جست کی کمی کو پورا کرنے کا سب سے بہترین طریقہ خوراک ہے۔ سب سے زیادہ جست اوسٹر اور میٹ (گوشت) میں ہوتا ہے جبکہ جست کی مناسب مقدار خشک پھلوں، مٹر، لوبیہ اور دالوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

مرسلہ: زدیا فرہاد، جہلم

تھی۔ لیکن ابھی یہ بھید سامنے نہیں آیا کہ اس نے دکاندار کا خون کیوں کیا۔

”پھر یہ ہوا ڈاکٹر صاحب کہ شروع شروع میں جیتتا چلا گیا۔ یہ جوا چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ پہلے دانا دکھاتی پھر جال میں پھنسا لیتی ہے اور انسان ساری زندگی اس میں پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ میرے پاس پیسے آنے لگے تھے۔ میری زندگی کچھ اور ہو گئی تھی لیکن میں نے گھر والوں کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ بلکہ ان پر اپنے پیسے ظاہر ہی نہیں کیے تھے۔ چھپا کر رکھتا تھا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اپنے قصبے میں زمین کا ایک ٹکڑا دیکھ رکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کو خریدنے کا ارادہ تھا۔ بس خواب تھے کہ کچھ دنوں کے بعد میں بھی چھوٹا موٹا زمیندار بن جاؤں گا لیکن قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔“

”تم جوے میں ہار گئے ہو گے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”جی صاحب اور بہت بڑی رقم ہار گیا۔ ہوا یہ کہ میں پہلی دفعہ جب پچیس ہزار روپے ہارا تو میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں اپنے تو کن ہار گیا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے جتنے پیسے بھی جمع کیے وہ زیادہ سے زیادہ سات آٹھ ہزار روپے تھے۔ بقایا کہاں سے

لاتا۔ میں بہت پریشان تھا کہ اڈے کا بدمعاش میرے پاس آگیا۔

''کیا بات ہے عبدالرحیم۔ تو ایک طرف کیوں آکر بیٹھ گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اب کیا بتاؤں۔ میں پورے پچیس ہزار ہار گیا ہوں اور گھر میں بھی اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ادا کرسکوں۔ چار پانچ گھنٹوں کی مہلت دی ہے اس نے۔''

''ارے تو اس میں ایسی کون سی بات ہوگئی۔ اس کھیل میں اوپر نیچے تو ہوتا رہتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''چل پریشان مت ہو۔ پچیس ہزار مجھ سے لے لے۔''

''تم سے؟'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو کیا ہوا۔ تو پرانا بندہ ہے۔ پورا بھروسا ہے تجھ پر۔ جب کوئی لمبا ہاتھ لگے تو واپس کردینا۔''

''اس وقت اس کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی ڈاکٹر صاحب۔ وہ وقت پر کام آرہا تھا لیکن میں کیا جانتا تھا کہ میں جال میں پھنستا جارہا ہوں۔ میں نے اس سے پچیس ہزار لے کر جوے کا ادھار چکتا کردیا۔''

''اس کے بعد جیت کے آسرے پر تم نے پھر جوا کھیلا ہوگا۔''

''جی ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے شرمندہ ہوکر گردن جھکائی۔ ''پھر کھیلا، کھیلتا رہا اور آہستہ آہستہ دو لاکھ کا قرض ہو گیا۔ یہ قرض اس بدمعاش کا تھا۔ میں جب بھی کسی سے ہارتا اس وقت وہ مدد کرنے میرے پاس آجاتا۔ لیکن جب رقم دو لاکھ ہوگئی تو اس نے آنکھیں دکھادیں۔''

''بس بھائی! اب بہت ہوگیا۔'' اس نے کہا۔ ''اب میرے پیسوں کی واپسی کی بات کر۔ دو لاکھ بہت ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں نہیں کرسکتا۔''

''بھولا بھائی بس تھوڑا سا موقع اور دے دو۔'' میں نے کہا۔ ''تم دیکھ لینا قسمت میرا ضرور ساتھ دے گی۔''

''تیرے ستارے گردش میں ہیں عبدالرحیم۔ قسمت اب بھی تیرا ساتھ نہیں دینے والی۔ تو یہ کہانی رہنے دے اور میرے پیسوں کی بات کر۔''

''ڈاکٹر صاحب میں نے اس کم بخت کی بہت منت سماجت کی لیکن ایک ہفتے سے زیادہ مہلت دینے پر وہ تیار نہیں ہوا۔ اب میں کہاں سے دو لاکھ لے کر آتا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس بدمعاش کے پیسے ادا نہیں کیے تو وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ میرا گھر تھا، بیوی تھی۔ بچے تھے۔ پورے محلے میں بدنامی ہوجاتی کہ میں جوا کھیلا کرتا ہوں۔ خدایا میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا تھا۔''

''کیا تم اپنے گھر والوں کو اعتماد میں نہیں لے سکتے تھے۔''

''نہیں صاحب، گھر والوں کو میں کیا بتاتا۔ وہ تو بے چارے ویسے ہی میرے سامنے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ میں نے ان کو ایسا رکھا ہوا تھا۔''

اس شخص کی اس بات سے ...... بے زاری اور نفرت کے جذبے مجھ میں کروٹیں لینے لگے۔ وہ تو ایک بے رحم سا انسان تھا۔ بیوی بچوں پر ظلم کرنے والا۔ ان کو دبا کر رکھنے والا۔ عیاشیوں کے لیے جوا کھیلنے والا۔ پھر کسی کا خون کردینے والا۔ ایسا شخص تو رحم کے قابل ہی نہیں ہوسکتا۔

''ڈاکٹر صاحب، وسایا میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔'' اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''کون وسایا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی دکاندار جس کا میں نے خون کیا ہے۔''

اوہ تو اب جاکر پتا چلا کہ عبدالرحیم اس دکاندار کو پہلے سے جانتا تھا اور اس قتل کا محرک کچھ اور تھا۔ جیسا میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ عام جھگڑے کی واردات نہیں تھی۔

''وسایا میری جان پہچان کا تھا صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم ہوٹل میں ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ اس کی بیوی مرچکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جس کی شادی ہوچکی تھی اور وہ اکیلا زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر خود میرا حال پوچھا اور میں نے اسے بتادیا کہ میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں۔''

''عبدالرحیم میں نے اس بندے کے بارے میں سن رکھا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ وہ تو تمہیں برباد کردے گا۔''

''اس لیے تو پریشان ہورہا ہوں۔'' میں پریشان ہوکر بولا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟ کون دے گا مجھے دو لاکھ۔''

''میں دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''تم!''

''ہاں میں۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''میں اس وقت تمہارے کام نہیں آؤں گا تو کب آؤں گا۔ تم کل شام کو مجھ سے دو لاکھ لے لینا اور منہ پر مارنا اس بدمعاش کے۔''

''میں تو حیران رہ گیا تھا۔ اس دور میں کون کس کی مدد کرتا ہے اور وہ بھی پورے دو لاکھ روپے۔ وہ تو مجھے اپنا احسان مند کیے دے رہا تھا صاحب۔ لیکن جب دوسری شام

میں اس سے ملا تو اس نے ایک ایسی بات کر دی کہ میں چکر میں آ کر رہ گیا صاحب۔"

"کیا کہا تھا اس نے۔"

"اس نے کہا تھا دیکھو عبدالرحیم۔ میں تمہیں دو لاکھ تو دے رہا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"میں پیسے تمہیں واپس کر دوں گا وسایا۔"

"نہیں، میں پیسے تو مانگ بھی نہیں رہا۔ تم چاہے کبھی واپس نہ کرو۔"

"تو پھر۔"

"تم اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔" اس نے کہا۔

میں تو بس سناٹے میں رہ گیا تھا۔ کیا بات کر دی تھی اس نے۔ وہ عمر میں مجھ سے بھی دو چار سال بڑا ہوگا اور میری نیلما پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"وسایا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں ہو سکتا تو رہنے دو۔" اب اس کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔ "کوئی کسی کی یوں ہی تو اتنی مدد نہیں کرتا ہے نا۔"

"لیکن یہ تو سوچو کہ میری بیٹی اور تم میں کتنا فرق ہے۔"

"تمہاری مرضی۔ مجھے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا ہے۔"

اس وقت تو میں ناراض ہو کر واپس چلا آیا۔ پھر سوچتا رہا کہ کیا کروں اور تو کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ ایک طرف وہ بدمعاش تھا اور دوسری طرف میری نیلما۔

"پھر ڈاکٹر صاحب میں نے وہی کیا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔"

"یعنی تم نے اپنی معصوم بچی اس کے حوالے کر دی۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔" اس نے اپنی گردن جھکائی۔

"وہ بہت رو رہی تھی ڈاکٹر صاحب۔ میرا یہ فیصلہ سننے کے بعد میرا ہاتھ تھام کر روتی رہی تھی۔ بابا بابا کرتی رہی تھی لیکن اس کی قربانی دے کر میری جان بچ رہی تھی نا ڈاکٹر صاحب۔ اس لیے میں نے اسے قربان کر دیا۔"

"عبدالرحیم! میں تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلے ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو تم سے نفرت ہونے لگی ہے۔"

"میں اسی قابل ہوں صاحب۔" وہ پھر رونے لگا تھا۔ "اسی قابل ہوں۔"

"چلو آگے بتاؤ کیا تمہاری بیوی نے کچھ نہیں کہا؟"

"وہ بے چاری کیا بولتی صاحب۔ میں نے تو اس کو دبا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ صرف روتی رہی۔ اس بے چاری پر تو سکتہ ہو گیا تھا صاحب۔ نیلما کو میں نے زبردستی وسایا کے ساتھ کر دیا۔ مولوی کو بلا کر اس کا نکاح کروا دیا اور واپس کچھ دنوں کے بعد نیلما کو لے کر شہر آ گیا۔"

"اور تم نے اپنا قرض ادا کر دیا۔"

"ہاں صاحب! قرض ادا کر دیا اور کبھی اس طرف نہیں گیا لیکن کیا فائدہ تھا اپنی بیٹی کی بھینٹ تو دے ہی چکا تھا۔"

"اور تمہاری بیٹی کا کیا ہوا۔"

"پتا نہیں صاحب! بہت دنوں تک اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوا کہ وہ کیسی ہے، وسایا اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ کچھ نہیں معلوم۔ پھر ایک دن بیوی نے بے حال ہو کر کہا کہ جاؤ خدا کے لیے شہر جا کر اس کی خیریت تو معلوم کر لو۔"

"او تو تم اس طرح شہر آ گئے۔"

"ہاں صاحب! مجھے پتا چل گیا تھا کہ وسایا نے یہاں دکان کھول لی ہے میں اس کو تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا۔"

"لیکن تم نے اس کو قتل کیوں کیا؟"

"وہی بتا رہا ہوں صاحب، جمعے کا دن تھا۔ جمعے کی نماز ہو رہی تھی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا۔ وہاں مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے اور وہ واقعہ بتا رہے تھے کہ ایک بار ایک آدمی ہمارے نبی پاکؐ کے پاس آیا اس نے بتایا کہ اس نے اپنی ایک بیٹی کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی وہ بیٹی رو رہی تھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بابا بابا کہہ رہی تھی۔ یہی تو میری بیٹی بھی کر رہی تھی صاحب۔ میں بھی تو ویسا ہی باپ تھا۔ پھر جب مولوی صاحب نے بتایا کہ نبی پاکؐ یہ سن کر رونے لگے۔ تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوا صاحب۔ میں نماز پڑھے بغیر مسجد سے باہر آ گیا اور سیدھا وسایا کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میری بیٹی کو چھوڑ دے۔ اس نے انکار کیا اور میں نے اس کا قتل کر دیا۔ یہ ہے میری کہانی صاحب۔ خدا کے لیے اس کہانی کو لکھ دیں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ آج بھی جب کوئی اپنی بیٹی پر ظلم کرتا ہے، چاہے کسی طرح ہو تو نبی پاکؐ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ خدا کے لیے ان پاک آنکھوں میں آنسو نہ آنے دیں۔ ورنہ دنیا اور آخرت دونوں برباد ہیں۔"

یہ تھی عبدالرحیم کی کہانی۔ جو پہلی بار بہت اچھا آدمی معلوم ہوا پھر بہت برا بن گیا اور پتا چلا کہ وہ ایک بہت بڑا انسان ہے۔

تحفے

مکرم و محترم مدیر
السلام علیکم
میں اپنی زندگی کا ایک اہم گوشہ بے نقاب کررہا ہوں۔ اس گوشے کو میری بزدلی سمجھنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر میں تحفے لیتا رہتا تو کیا ہوتا؟ میری آپ بیتی پڑھنے والے اپنے آس پاس بھی نظر رکھیں کہ کہیں اس مرض کا کوئی مریض آپ کے آس پاس تو نہیں ہے۔

احسن سلیم
(اسلام آباد)

میں نہیں جانتا تھا کہ دروازے پر کون دستک دے رہا ہے۔

مجھے اس فلیٹ میں آئے ہوئے صرف چار پانچ ہی دن ہوئے تھے۔ کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک کوئی کام والی بھی نہیں رکھی تھی اور جمعدار کے آنے کا وقت بھی نہیں تھا پھر یہ کون ہوسکتا تھا۔

بہر حال تیسری دستک پر میں نے دروازہ کھول دیا۔

ایک معقول صورت انسان دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔

''معاف کیجیے جناب میں نے آپ کو زحمت دی۔'' اس نے بہت ہی مہذب انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے اوپر والے فلیٹ میں رہتا ہوں۔''

''اوہ تو آپ میرے پڑوسی ہوئے۔''

''جی ہاں۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''پڑوسی ہوں آپ کا، وجاہت

کہتے ہیں مجھے۔"

"اور میں احسن سلیم ہوں۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔

"یہ لیں، یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔" اس نے پلیٹ میری طرف بڑھادی۔ "اس میں ایک خاص قسم کا حلوا ہے اس قسم کا حلوا صرف میرے خاندان والے بنانا جانتے ہیں۔"

"ارے صاحب یہ کیا زحمت کی آپ نے۔"

"نہیں بھائی، اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ آپ میرے نئے پڑوسی ہیں یہ تو میرا فرض بنتا ہے نا۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔"

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی تھی کہ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے وہ پلیٹ لے لی۔ "آئیں اندر تو آئیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں جناب! اس وقت نہیں۔" اس نے معذرت کرلی۔ "اس وقت ذرا جلدی ہے۔ پلیٹ پھر کبھی لے جاؤں گا۔"

وہ پلیٹ دے کر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ پتا نہیں کیسا آدمی تھا۔ بہرحال جو بھی ہو اس کا حلوا واقعی بہت لذیذ تھا۔

اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ورنہ یہاں کون کس کو پوچھتا ہے۔

وہ شخص مجھے حلوا دے کر گیا تھا۔ اب میرا فرض بنتا تھا کہ میں بھی بدلے میں کچھ نہ کچھ دوں۔ لیکن میں اسے کیا دے سکتا تھا۔

بہت سوچنے کے بعد یہی بات سمجھ میں آئی کہ اسے فلیٹ میں بلا کر اس کی خاطر تواضع کردوں گا۔ اس طرح کچھ عزت رہ جائے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ دو چار دنوں تک وہ دکھائی نہیں دیا اور ایک دن اچانک بلڈنگ کے گیٹ پر مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آگیا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا۔ اس نے بتانا شروع کردیا۔ "کیا بتاؤں جناب، دو چار دنوں کے لیے ایک ضروری کام سے کوئٹہ چلا گیا رات ہی کو واپس آیا ہوں۔"

"چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔"

"آپ کا تحفہ میری جیب ہی میں پڑا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیسا تحفہ؟"

"یہ لیں۔" اس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی سا قلم نکال کر میری طرف بڑھادیا۔ "یہ میں آپ ہی کے لیے کوئٹہ سے لایا تھا۔"

"ارے! وہ کیوں...... کیوں اتنی زحمت کی۔"

"نہیں جناب اس میں زحمت کیسی آپ تو میرے پڑوسی ہیں اور ایک اچھا پڑوسی بھائیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ لیں رکھ لیں پلیز۔" اس نے اس انداز سے کہا کہ مجھے قلم رکھنا ہی پڑ گیا۔

اب میرے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ بے چارہ دو بار مجھے کچھ نہ کچھ دے گیا تھا۔ ایک بار اس نے حلوا دیا تھا اور دوسری بار ایک قیمتی قلم تحفے کے طور پر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ تحفے تحائف دیے جائیں۔ لیکن جب وہ اتنا کچھ کررہا تھا تو یہ میرا بھی فرض بنتا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ دوں۔

دفتر سے واپسی پر ایک شام میں نے اس کے لیے ایک پرفیوم خرید لیا۔ یہی طریقہ ہوسکتا تھا کہ میں اس کے تحفوں کے احسانات کا بدلہ دے سکتا۔

پرفیوم میں نے اس کے فلیٹ میں جا کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ کے دروازے پر دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ "ارے صاحب! میرے نصیب کہ آپ میرے پاس تشریف لے آئے...... آئیں اندر آجائیں۔"

"پھر کبھی سہی، اس وقت تو میں آپ کو یہ دینے آیا ہوں۔" میں نے پرفیوم کی شیشی اس کی طرف بڑھادی۔

"ارے یہ کیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جناب میں اپنے لیے پرفیوم لے رہا تھا۔ پھر آپ کا خیال آیا میں نے سوچا کہ آپ کے لیے بھی لے لوں۔"

"اوہو، کیوں زحمت کی آپ نے؟"

"دیکھیں انکار مت کیجیے گا۔" میں نے کہا۔ "کچھ میرا بھی تو حق ہے پلیز۔"

اس نے کئی بار میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ پرفیوم لے لیا۔ پھر اس سے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور میں اپنے فلیٹ میں آگیا۔

کچھ دنوں تک پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے کسی کام میں مصروف ہوگیا ہو۔

دو چار دنوں کے بعد وہ پھر ٹپک پڑا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ "ارے جناب ایک بار پھر اپنے کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑ گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"چلیں، یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ بزی رہتے ہیں۔"

"ہاں صاحب! کام تو کام ہوتا ہے۔" پھر اس نے وہ پیکٹ میری طرف بڑھادیا۔ "یہ لیں جناب انارکلی بازار سے آپ کے لیے لیتا آیا ہوں۔"

"خدا کی پناہ، یہ ہے کیا؟"

"یہ شیشے کے گلاسوں کا ایک سیٹ ہے۔" اس نے بتایا۔ "بیلجیئم کا بنا ہوا ہے۔ بہت نفیس ہے۔ آپ جیسے باذوق آدمی کے ذوق کے عین مطابق۔"

"لیکن کیوں، آپ کیوں اتنی زحمت کیے جارہے ہیں؟"
"پھر وہی زحمت کی بات کی آپ نے۔" وہ بُرا مان گیا تھا۔ "اس میں کون سی زحمت ہوگئی۔ میں اپنی محبت میں لے کر آیا ہوں۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔"
اس بار بھی اس کا تحفہ قبول کرنا پڑا تھا۔
دو چار دنوں کے بعد وہ پھر آگیا۔ اس بار وہ میرے لیے دو عدد قمیص لے کر آیا تھا۔ "یہ لیں جناب یہ انگلینڈ کی قمیص ہیں۔ آپ کے لیے لایا ہوں۔"
"وجاہت صاحب! یہ آپ کیا کرنے لگے ہیں۔ اب مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔"
"پلیز دل نہ توڑیں۔" اس نے کہا اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ "میں تو بس محبت کا بھوکا ہوں۔ اگر قبول کرلیں گے تو عنایت ہوگی۔"
مجھے وہ قمیص قبول کرنی پڑ گئی تھیں۔ کچھ شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ اس شخص نے اتنا بہت کچھ دے دیا تھا اور میں نے کیا دیا تھا، بس پرفیوم کی ایک شیشی۔
اس لیے میں نے اس کے لیے شیونگ کی ایک کٹ خرید لی۔ پورے دو ہزار کی، بہت ہی شاندار۔ جب میں نے اس کے حوالے کی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ "ارے یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ اتنا مہنگا تحفہ خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔"
"وجاہت صاحب! آپ کے خلوص کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ پلیز قبول کرلیں۔" اس نے قبول کرلیا۔
تیسری شام کو وہ پھر میرے دروازے پر تھا۔ اس بار وہ ایک نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ جو ایک بڑا سا کارٹن اٹھائے کھڑا تھا۔
"سلیم صاحب! یہ آپ کی نذر ہے۔" اس نے کارٹن کی طرف اشارہ کیا۔
"وجاہت صاحب کیا ہے اس میں۔"
"سلیم صاحب ایک ڈیک ہے، دو عدد اسپیکر کے ساتھ۔ آرام سے میوزک سنتے رہیے گا۔"
"ڈیک!" میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ "یہ ڈیک آپ مجھے تحفے میں دے رہے ہیں؟"
"جی ہاں۔" اس نے انکساری سے گردن جھکا دی۔
"اچھا سیٹ مل رہا تھا میں نے سوچا آپ کے لیے لے لوں۔"
"لیکن یہ تو کمال ہے۔ میرا مطلب ہے اتنا مہنگا تحفہ اچھا نہیں لگتا۔"
"بھائی صاحب رہنے دیں۔ جب خلوص کا رشتہ ہو تو مہنگے اور سستے کی پروا نہیں کرتے۔ رکھ لیں پلیز۔" اس نے پھر اتنے خلوص سے بات کی کہ ہے اس کا تحفہ رکھنا ہی پڑ گیا۔
اب پھر میرے سامنے ایک سوال آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے اس مہنگے تحفے کے عوض کیا دیا جائے۔ اس کم بخت نے تو شرمندہ کرنے پر کوئی کسر نہ چھوڑی۔
بہت سوچ کر میں نے اپنے دفتر سے دس ہزار روپے ایڈوانس کے طور پر لیے اور 13 انچ کا ایک کلر ٹی وی اس کے حوالے کردیا۔
وجاہت اس ٹی وی سیٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
"ارے اب یہ کیوں لیا آپ نے؟" اس نے کہا۔ "یہ تو بہت قیمتی ہے۔"
"وجاہت صاحب! آپ کے خلوص سے زیادہ قیمتی نہیں۔ میں انکساری سے بولا۔ "بس اسے قبول کرلیں۔"
"اب تو لینا ہی پڑے گا۔" اس نے کہا۔ "آپ نے تو مجھے خرید لیا ہے۔"
میں نے وہ سیٹ اس کے حوالے کردیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنا فرض ادا کردیا ہے اور اب کچھ دنوں کے لیے سکون ہوجائے گا۔
لیکن کہاں کا سکون، صرف چار دنوں کے بعد وہ پھر میرے پاس آگیا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں تو کچھ نہیں تھا لیکن وہ بہت پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔
"چلیں میرے ساتھ چلیں۔" اس نے کہا۔
"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"بس ذرا نیچے تک۔ بس پانچ منٹ کا کام ہے۔"
ظاہر ہے میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ سیڑھیوں کے پاس ہی ایک جگمگاتی ہوئی بائیک کھڑی ہوئی تھی۔
"سلیم صاحب! یہ بائیک آپ کی نذر ہے۔" اس نے کہا۔
"کیا!" اس دفعہ میں واقعی بے ہوش ہونے والا تھا۔ "یہ بائیک...... یہ نئی بائیک...... آپ نے میرے لیے خریدی ہے......!!"
"جی ہاں، آپ ہی کے لیے۔" اس نے بتایا۔ "آج ہی شوروم سے نکلوا کر لایا ہوں۔"
"لیکن وجاہت صاحب! یہ تو انتہا ہوگئی، اتنی قیمتی چیزیں میں کیسے قبول کرسکتا ہوں؟"
"پلیز، انکار نہ کریں۔ یہ تو آپ کو لینا ہی ہوگی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس کی التجا کچھ ایسی تھی کہ میں انکار نہیں کرسکا۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کی چابی قبول کرلی۔

لیکن اب ایک بہت بڑا خطرہ میرے سر پر منڈلانے لگا تھا۔

اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ اس نے مجھے کوئی تحفہ دیا میں نے جواب میں اس سے قیمتی تحفہ دے دیا۔ اس نے جواب الجواب کے طور پر اس سے زیادہ قیمتی تحفہ دے دیا اور نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ اس نے بائیک تحفے میں دے دی تھی۔

لہٰذا جواب میں مجھے کوئی گاڑی تحفے میں دینی تھی۔ فرض کریں اس نے میری گاڑی کے جواب میں کوئی پلاٹ تحفے میں دے دیا تو پھر میں کیا کرتا۔

اس لیے بہتر یہی تھا کہ اس محلے سے ہی بھاگ لوں۔ ویسے بھی وہ فلیٹ تو کرائے ہی پر تھا۔ میری جب مرضی ہو وہاں سے نکل سکتا تھا۔

پھر میں نے یہی کیا۔ میں نے مالک مکان سے اپنا ایڈوانس واپس لیا اور راتوں رات خاموشی سے نکل لیا۔

لوگ تو اپنے پڑوسیوں کی بدمعاشیوں سے تنگ آکر مکان چھوڑتے ہیں اور میرا یہ حال تھا کہ میں پڑوس کی مہربانی سے تنگ آکر بھاگ نکلا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد میرے کچھ پرانے دوستوں نے مجھے فون کر کے بتلایا کہ انہوں نے پرانے دوستوں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک کلب بنا لیا ہے اور ہفتے کی رات اس کلب کی طرف سے ڈنر دیا جارہا ہے۔

یہ بہت اچھی خبر تھی۔ اس قسم کی بور لائف میں اس قسم کی سرگرمیاں رنگ بھر دیتی ہیں۔ میں نے شرکت کی یقین دہانی کرادی۔

ہفتے کی رات میں ہوٹل پہنچ گیا۔ پرانے دوستوں سے مل کر دل خوش ہوگیا تھا۔ ہم کتنے دنوں کے بعد مل رہے تھے۔

پرانے زمانے پوری شدت کے ساتھ یاد آنے لگے تھے۔ اس تحریک کا بانی اسلم حسین تھا۔ اس نے ایک آدمی سے تعارف کروایا۔ ”سلیم! یہ ہمارے دوستوں کے حلقے میں تو نہیں رہے ہیں لیکن ہم نے اعزازی طور پر ان کو اپنی محفل یاراں کا ممبر بنالیا ہے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ میں خوش دلی سے بولا۔ ”اب ان کا مکمل تعارف میں کروادوں۔“

”یہ ڈاکٹر درانی ہیں۔“ اسلم نے بتایا۔ ”پاکستان کے صفِ اوّل کے سائیکاٹرسٹ۔“

”اوہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”نفسیات سے میری بھی بہت گہری دلچسپی رہی ہے۔“

میں اور ڈاکٹر درانی باتیں کرنے لگے۔ اسلم حسین دوسرے دوستوں کے پاس چلا گیا تھا۔ میں نے یوں ہی باتوں باتوں میں اس پڑوسی کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس نے تحفے دے دے کر مجھے بے حال کردیا تھا۔

ڈاکٹر درانی نے ہنسنا شروع کردیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔“

”نفسیاتی مرض ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں! اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ڈورو مانیا (Doro mania) کہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”اس میں مبتلا حضرات بعض اوقات اتنے حساس ہوجاتے ہیں کہ اگر ان کا تحفہ قبول نہ کیا گیا تو شدید نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”کہ میں وہاں سے بھاگ آیا۔“

”ہاں! یہ بہت اچھا کیا آپ نے۔“ ڈاکٹر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک خوب صورت سا لائٹر نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تمباکونوشی کرتے ہیں۔“

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ یہ بری عادت پیچھا نہیں چھوڑتی۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”میں پچھلے دنوں سنگاپور میں تھا۔ وہاں سے میں نے یہ لائٹر خریدا تھا۔“ ڈاکٹر نے لائٹر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیں، یہ میں آپ کو تحفے میں دے رہا ہوں۔“

”مجھے تحفے میں!“ مجھے شاک سا لگا تھا۔ ”یہ آپ مجھے تحفے میں دے رہے ہیں؟“

”جی ہاں رکھ لیں نا پلیز۔“

میں نے ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اچانک باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ڈاکٹر پکارتا ہی رہ گیا تھا لیکن میں کہاں رکنے والا تھا۔

ایک اور تحفہ ایک اور ڈورو مانیا کا مریض۔ ایک سے تو جان چھڑا کر بھاگا تھا اب یہ دوسرے سے ملاقات ہوگئی تھی۔

تو وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں پلٹ کر دوستوں کے کلب کی طرف نہیں گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ مجھے جب بھی کوئی شخص ملتا ہے تو میں پہلے اس سے یہی پوچھتا ہوں کہ بھائی خدا کے لیے یہ بتا دو کہ تم مجھے کوئی تحفہ دینے کا ارادہ تو نہیں کررہے اگر وہ ہاں کہہ دیتا ہے تو میں دوبارہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔

طعنے

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
یہ روداد ہمارے ہی علاقے کی ہے۔ اس پوری روداد میں ایک سبق ہے۔ ایک انوکھا پن ہے اور یہی انوکھا پن خود میں ایک خوب صورتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ روداد قارئین سرگزشت کو بھی پسند آئے گی۔
محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

چودھری محبت خان اور چودھرائی ریوراں بی بی نے محبت کی شادی کی تھی۔ محبت خان عمر پور کا رہنے والا تھا اور ریوراں علی پور کی۔ وہ علی پور کے ملک زمان کی بیٹی تھی۔ حسن اور خوب صورتی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ محبت خان بھی کچھ کم نہ تھا۔ وہ مردانہ حسن و جمال کا نادر نمونہ تھا۔ اس کا نام ہی محبت خان نہ تھا، کردار بھی محبت بھرا تھا۔ وسیع و عریض اراضی کا مالک تھا۔ بڑی سی حویلی تھی، ڈھور ڈنگر اور نوکر چاکر تھے۔ زندگی رواں دواں تھی۔ گاؤں میں بھی اس کی بڑی

عزت تھی اور اس کی واحد وجہ اس کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ غریب نوازی اس کی فطرت تھی۔ ان ہی اوصاف نے اسے مقبول بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک کمی تھی۔ شادی کے سات سال گزرنے کے باوجود ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ چودھرائن اس دکھ کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتی تھی۔ ڈاکٹر حکیم۔ ٹونا ٹوٹکہ دوا اور دارو جو حیلہ اس کے بس میں تھا وہ کر چکی تھی لیکن اس نے گود اب بھی سونی تھی اور اسی غم میں وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ چودھری محبت نے بظاہر کبھی کچھ نہ کہا تھا لیکن اندر ہی اندر اسے بھی ارمان تھا کہ ان کے آنگن میں بچوں کی قلکاریاں گونجیں۔

گاؤں کے غریب اور مزارعے بھی جھولی اٹھا کر اس کے لیے دعائیں مانگتے تھے کیوں کہ چودھرائن بھی سخاوت اور فراخ دلی میں محبت خان سے کم نہ تھی۔ مگر نہ جانے اس کی بھابی صغراں کو اس سے کیا بیر تھا کہ اس نے کبھی زیوراں کو اچھا نہ جانا۔ زیوراں کا بھائی ملک سلطان اپنے گاؤں عمر پور کا بڑا زمیندار تھا۔ اس کی شادی زیوراں کی شادی کے چھ ماہ بعد ہوئی تھی اور اب وہ تین بچوں کے والدین تھے۔ صغراں اکثر زیوراں کو بانجھ ہونے کے طعنے دیتی تھی مگر اس کے باوجود زیوراں اس کی کوئی بات دل پر نہ لیتی اور اس کے طنز کو برداشت کر لیتی۔ وہ بھائی اور بھابی کا بے حد احترام کرتی تھی۔ ملک سلطان کو تو بہن کا بہت خیال رہتا تھا مگر صغراں کی وجہ سے وہ مجبور رہتا تھا۔

صغراں کے طعنے کبھی کبھی اس کو رلا دیتے۔ آٹھواں سال گزرا تو چودھرائن کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ایک روز وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ چودھری کا دل دہل گیا۔ اس نے اسے تسلی دی اور اگلے دن ہی اس نے عمرہ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چند ہی دنوں میں سفر کے مراحل طے ہو گئے۔

اللہ کے گھر پر نظریں پڑتے ہی دونوں کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ایک سیلاب ان کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ انہوں نے رو رو کر اور گڑگڑا کر اپنے رب سے جانے انجانے میں سرزد ہوئے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنی عرضی پیش کر دی۔ پھر روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جا کر بھی انہوں نے اپنی جھولیاں پھیلا دیں۔ آنسو ایک بار پھر ان کے دامن بھگونے لگے۔ ان کے یوں چھا چھوں برستے آنسوؤں کی بارش نے رحمتِ الٰہی کے جذبۂ رحم کو جوش دلا دیا۔ سفر سے واپس آنے کے کچھ ہی ماہ بعد جب ڈاکٹر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ چودھرائن کی گود بھرنے والی ہے تو اس حویلی میں اصلی گھی کے چراغ جلائے گئے۔ شیرینی بٹی، مسجد میں ختم القرآن ہوا اور دعائیں مانگی گئیں۔

سارا گاؤں چودھری اور چودھرائن کی خوشیوں میں برابر کا شریک تھا۔ زیوراں نے مصلے پر رو رو کر دعا مانگی کہ اسے بیٹا دینا۔ چودھری بھی رب کے آگے فریاد کرتا کہ اس کی دعا تھی کہ اسے بیٹی ملے۔

☆......☆

مگر جب ولادت ہوئی تو محبت خان کی دعا کا پھل تھی۔ اس کا نام خوش بخت رکھا گیا۔ اس نے باپ بننے کی خوشی میں خوشیاں منانے کا اعلان کیا مگر چودھرائن تو بیٹے کی امید لگائے بیٹھی تھی لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ ہو سکتا ہے اگلی بار لڑکا ہو جائے مگر ڈاکٹر افشاں نے جس کے ہاتھوں خوش بخت کی پیدائش ہوئی تھی اس نے یہ کہہ کر اس کے ارمانوں پر اوس ڈال دی کہ چودھرائن کے آئندہ ماں بننے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ خوش بخت اس کی پہلی اور آخری اولاد رہے گی۔ زیوراں نے نہ جانے کس دل سے یہ خبر قبول کی مگر اس نے بیٹی کو کبھی بھی اپنے اس دکھ کا احساس نہ ہونے دیا۔

خوش بخت کی پیدائش کے چند دنوں بعد صغرا ایک اور بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کا نام انہوں نے کاشان رکھا تھا۔ اس سے پہلے صغراں کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ زیوراں کے بھائی سلطان نے بھی خوش بخت کی پیدائش پر بہت خوشی منائی تھی۔ بھانجی کی خوشی میں اس نے اپنے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کی کہ اس کی بہن کی گود بھی ہری ہو گئی ہے۔ اب کاشان کی پیدائش نے ان خوشیوں کو دو چند کر دیا تھا۔ لہٰذا سلطان نے صغراں سے پوچھے بغیر ہی خوش بخت اور کاشان کی نسبت بچپن میں ہی طے کر دی۔ محبت خان اور زیوراں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس رشتے کو دل سے قبول کر لیا۔ صغراں نے بھی سلطان کے فیصلے کی تائید کر دی اور خوش بخت کو کاشان کے نام کی انگوٹھی بھی پہنا دی گئی۔

☆......☆

خوش بخت اپنی ماں زیوراں سے بھی بڑھ کر خوب صورت تھی۔ جب وہ عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر پہنچی تو لوگ اسے دیکھ کر گنگ رہ جانے لگے۔ ایسا

لگتا تھا کہ کوئی حور رستہ بھول کر زمین پر آگئی ہو۔ گاؤں کی سب لڑکیوں کی رنگت سے اس کی رنگت صاف تھی۔ گالوں پر لالی نمایاں تھی۔ گاؤں میں اس سے بڑھ کر حسین اور کوئی لڑکی نہ تھی۔ کاشان بھی کم نہ تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ قصبے کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد وہ شہر چلا گیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ بھی کبھار اپنی پھوپی سے ملنے آتا تھا۔ خوش بخت سے بھی گفتگو ہو جاتی تھی لوگ اس جوڑی کو لاکھوں میں ایک کہتے تھے۔ صغراں بھی خوش بخت کو پسند کرنے لگی تھی کیوں کہ وہ بہت ہی خوب صورت تھی، نازک بھی اور سلیقہ شعار بھی۔ محبت خان اور زیوراں کی تو وہ جان تھی۔ صغراں کے طعنے بھی اب ختم ہو گئے تھے اور زیوراں بھی بانجھ ہونے کا لیبل اتار چکی تھی۔ کاشان ایف اے پاس کرنے کے بعد گاؤں واپس آگیا تھا اور اس نے اپنی زمینوں کا حساب کتاب سنبھال لیا تھا۔ سلطان اور صغراں سوچ رہے تھے کہ اب خوش بخت کی ڈولی لے ہی آئیں۔ خوش بخت کے ماں باپ کا بھی یہی خیال تھا کہ اب بیٹی کو رخصت کر دیا جائے۔

خوش بخت اور اس کی سہیلیوں کو بھی خبر ہو گئی تھی کہ خوش بخت کو دلہن بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ان ہی دنوں خوش بخت کی طبیعت خراب سی رہنے لگی۔ جسم میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ رنگت بھی پیلی ہو گئی تھی اور چہرہ بھی اترنے لگا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے طور پر خوش بخت کی دیکھ بھال کی۔ ٹونے ٹوٹکوں کو آزمایا مگر اس کی حالت بہتر نہ ہوئی تو اس نے اس کے باپ کو بتایا تو وہ فوراً اسے شہر کے بڑے اسپتال لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے خوش بخت کا چیک اپ کیا اور پھر اسے شہر کے ایک مشہور سرجن کی طرف ریفر کر دیا۔ سرجن نے کافی دیر معائنہ اور مختلف قسم کے سوالات کرنے کے بعد کچھ ٹیسٹ کرانے کو کہا جو ایک مشہور لیبارٹری سے کرائے گئے۔ رپورٹس اگلے روز ملنی تھیں لہٰذا محبت خان ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا۔ خوش بخت بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ رات بھی اس نے خاصی تکلیف میں گزاری تھی۔ اگلے دن محبت خان رپورٹس لے کر سرجن کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے ساری رپورٹس پڑھنے کے بعد کہا۔ ''محبت خان! آپ کی بیٹی میں جسمانی تبدیلیاں آرہی ہیں۔''

''حیرت ہے جسمانی تبدیلیاں اور اس عمر میں۔'' محبت خان حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میری بیٹی تو اس وقت پچیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس عمر میں اب بھلا کیا تبدیلیاں آئیں گی اور پھر ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی بلکہ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' محبت خان بولتے بولتے رک گیا اور ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ خوش بخت گاؤں کے کسی لڑکے کے ساتھ...... اگر ایسا ہوا تو میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔ مگر نہیں میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو شرم و حیا کا پیکر ہے۔''

''آپ کی بیٹی لڑکا بن رہی ہے۔'' ڈاکٹر نے دھماکا کر دیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میری بیٹی لڑکا بن رہی ہے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے اور بھلا کبھی ایسا ہوا بھی ہے؟ آپ رپورٹ کو غور سے پڑھیں۔ لگتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''چودھری صاحب! ایسا ممکن ہے، اس سے پہلے کئی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ آپ کی بیٹی کی بھی جنس تبدیل ہو چکی ہے۔ میں اسے اسپتال میں داخل کر رہا ہوں۔ ایک معمولی سے آپریشن کے بعد وہ مکمل مرد بن جائے گی اور معمول کے مطابق زندگی بھی گزرے گی۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اس کو کوئی ایسی دوا دیں، کوئی ایسا ٹیکا لگائیں کہ وہ لڑکی ہی رہے، ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کو حقیقت کیسے تسلیم کراؤں گا۔'' محبت خان افسردہ سا ہو کر بولا۔

''کمال کر رہے ہیں آپ؟ قدرت آپ کو پلا پلایا بیٹا دے رہی ہے اور آپ ہیں کہ ناشکری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! اگر یہی بیٹا مجھے آج سے پچیس سال پہلے مل جاتا تو میں گاؤں میں شیرینی تقسیم کرتے نہ تھکتا۔ میں نے خوش بخت کی پیدائش پر بھی مٹھائی تقسیم کی تھی اور صبر بھی کیا تھا کہ یہ اللہ کی دین تھی۔'' چودھری محبت خان بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مستقبل کے مناظر تیزی سے گزر رہے تھے کہ وہ گاؤں کیسے جائے گا۔ زیوراں کو کیسے بتائے گا۔ بتا دیا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ وہ عورت جو روزِ ازل سے اپنے دل میں بیٹے کی خواہش لیے ہوئے تھی۔ اب وہ اپنی اس خواہش کو اس انوکھے روپ میں پورا ہوتے کیسے برداشت کرے گی۔ کہیں وہ اس خوشی میں دیوانی ہی نہ ہو جائے۔''

ڈاکٹر نے محبت خان کی ذہنی کیفیت کو جان لیا تھا۔ اس نے چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔

"چودھری صاحب! خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس نے آپ کو بیٹی دی جسے آپ نے دل سے قبول کر کے سینے سے لگایا اور اب وہی آپ کو بیٹا دے رہا ہے تو آپ ناشکرے کیوں بن رہے ہیں۔"

محبت خان گم صم سا بیٹھا ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو کیسے کہتا کہ بات صرف ان کے سمجھنے اور قبول کرنے کی نہیں ہے۔ گاؤں اور علاقے کے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیسی کیسی باتیں سننے کو ملیں گی زیوراں کیسے سمجھائے گی جو بیٹی کو وداع کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ سلطان، صغراں اور کاشان کو ہم کیا جواب دیں گے۔ ہم کیسے ان کا سامنا کریں گے۔ صغراں تو آسمان سر پر اٹھالے گی۔ اس کی طنزیہ باتیں ہمیں جیتے جی مار ڈالیں گی۔ کاشان پر کیا گزرے گی جو خوش بخت کا منگیتر ہے اس سے محبت کرتا ہے۔"

☆......☆

صغراں اور سلطان دونوں ہی کاشان کے سر پر سہرا باندھنے کے لیے بے تاب تھے۔ صغراں اور اس کی بیٹی سلمٰی روزانہ ہی بازار کے چکر لگا رہی تھیں۔ وہ اس شادی کو منفرد اور یادگار بنانا چاہتی تھیں۔ خوش بخت اور سلمٰی میں پیار محبت بھی بہت تھا اور اب تو خوش بخت سلمٰی کی بھابی بن کر اس کے پاس ہی آ رہی تھی۔ سلمٰی کی خوشی تو دیدنی تھی کہ اس کی ہونے والی بھابی لاکھوں میں ایک تھی۔ صغراں نے زیور کا آرڈر بھی دے دیا تھا اور اب کپڑوں کی خریداری ہو رہی تھی۔ حویلی کے سب نوکر بھی خوش تھے کہ سلطان کی حویلی میں خوشیوں کی برات اترنے والی تھی۔

زیوراں بھی مصروف تھی۔ وہ بڑا سا بکس کھولے خوش بخت کے جہیز کے جوڑے چھانٹنے میں مصروف تھی مگر اس کا دھیان خوش بخت کی طرف ہی تھا۔ اکتا کر اس نے بکس بند کیا اور دالان میں بچھے تخت پر آ بیٹھی اور خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ سامنے کام کرنے والی عورتیں اناج صاف کرنے میں مصروف تھیں۔ دوپہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ فضا اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"اے میرے رب! کوئی خیر کی خبر سنانا۔" اس نے دوپٹا پھیلا کر دعا کی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں اتنے میں ملازمہ رضیہ اس کے قریب آئی تو اس نے پوچھا۔ "خوش بخت کی خبر......؟"

چودھرائن اداس ہو کر بولی۔ "رضیہ! پتا نہیں آج میرا دل کیوں ڈول رہا ہے۔ اللہ خیر کرے، عجیب عجیب سے خیالات دل میں آ رہے ہیں۔ نہ جانے میری خوش بخت کس حال میں ہے۔"

"بی بی جی! دل چھوٹا نہ کریں۔ سوہنا رب خیر کرے گا۔" رضیہ نے اسے تسلی دی اور اس نے آمین کہہ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے میں ایک نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ چودھری صاحب واپس آگئے مگر خوش بخت ان کے ساتھ نہیں ہے۔

زیوراں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور چودھری کے کمرے میں پہنچی۔ وہ بڑی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ بیوی پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں بے بسی نمایاں تھی۔ چودھری کی یہ حالت دیکھ کر چودھرائن کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ دھم سے فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ محبت خان بھی اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی رہی۔ وہ کوئی مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور چودھرائن اذیت کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ بالآخر محبت خان نے ہمت کی اور اسے دھیرے دھیرے بتانے لگا۔ زیوراں منہ کھولے یوں سن رہی تھی جیسے محبت خان اسے الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہو۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں سے ٹپک کر دوپٹے کو بھگو رہی تھیں۔ محبت خان نے بات ختم کی تو وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"زیوراں! رب نے تیری سن لی ہے۔ تجھے بیٹے کی بہت چاہ تھی ناں۔ اب اللہ پلا پلایا بیٹا دے رہا ہے تو، تو رونے بیٹھ گئی۔" چودھری نے کہا۔

"کون سی عورت ہے جسے بیٹے کی طلب نہیں، یہ بیٹا جو مجھے آج مل رہا ہے اگر اُس وقت مل جاتا تو۔" زیوراں تڑپ کر بولی۔

"تو......تو ساری برادری میں مٹھائی بانٹتی۔ آج تو وہ حسرت پوری کرلے میں مٹھائی منگوا دیتا ہوں۔" چودھری نے کہا۔

"اس وقت اور اب میں بہت فرق ہے۔ اُس وقت اگر مجھے یہ بیٹا مل جاتا تو میں اکیس گاؤں میں مٹھائی بانٹتی۔ میں شریکے برادری میں سر اٹھا کر چلتی اور ٹکے ٹکے سے لوگوں کے طعنے نہ سنتی۔" یہ کہہ کر زیوراں نے پھر رونا شروع کردیا۔ اس کے رونے کی آوازیں سن کر حویلی کے سارے ملازم بھی وہاں آگئے۔

چودھری نے سب کے سوالیہ چہروں کی طرف دیکھا اور لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''تم سب چودھرائن کو مبارک دو۔ اللہ نے ہمیں اس عمر میں اولاد نرینہ سے نوازا ہے۔ اب ہماری بیٹی خوش بخت نہیں بلکہ بخت خان بن گئی ہے۔''

ملازم سناٹے میں آگئے کہ چودھری کیسی انہونی بات کر رہا ہے۔

چودھری محبت کمرے سے نکلا اور عمر پور روانہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سلگ رہا تھا کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ عمر پور جا کر اس نے سلطان کو یہ بات بتائی تو وہ حیران ضرور ہوا مگر اس نے سچائی کو تسلیم کر لیا۔ محبت خان کو مبارک باد بھی دی اور کہا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جائے گا پھر وہ دونوں اکٹھے بخت خان کو لے کر آئیں گے۔

☆......☆

منٹوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی جس نے بھی سنا حیرت سے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ کئی ایک نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ مولویوں نے اسے قیامت کی نشانی کہا۔ جوانوں نے اسے سائنسی دور کا کرشمہ قرار دیا مگر عورتوں نے تو اس کی توجیہات کو اور ہی رنگ دیا۔ کسی نے خوشی کا اظہار کیا کہ چلو چودھرائن کی خواہش پوری ہو گئی۔ کسی نے کہا چودھری نے اپنی جاید اد بچانے کے لیے ڈھونگ رچایا ہے۔ کوئی بولی چودھری نے شہر میں دوسری شادی کر رکھی ہوگی اور یہ بیٹا اس سے ہوگا۔ مگر اس کا سب سے زیادہ دکھ صغراں کو تھا۔ کئی عورتیں تو اس کے ہاں باقاعدہ پرسہ دینے گئیں۔

☆......☆

ادھر خوش بخت ان ہنگاموں سے بے خبر خواب آور دواؤں کے زیر اثر اونگھ رہی تھی۔ اسے اپنی بیماری کا علم ہو چکا تھا۔ یقین نہ آنے کے باوجود اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسا کون سا لمحہ تھا جب اس نے لڑکا ہونے کی خواہش کی ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو قبولیت بخش دی۔ اسے خوش بخت سے بخت خان بننے کے لیے کئی تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑا مگر اب وہ مکمل طور پر لڑکا بن چکی تھی۔ اسپتال کے کاغذات میں اس کا نیا نام بخت درج کیا گیا تھا۔

بالآخر اسپتال سے رخصت ہونے کا دن آ گیا۔ چودھری محبت اور سلطان ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ ایک نرس بخت خان کو ساتھ لیے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بخت خان کو دیکھ کر دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اتنا گھبرو جوان، محبت خان کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کی کئی ایکڑ اراضی کا اکلوتا وارث، اس کے بڑھاپے کا سہارا۔

قدرت کی عنایت کے رنگ بھی عجیب تھے۔ وہ بخت پر نظریں جمائے اس کی طرف بڑھا۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور پھر جوش سے گلے لگایا اور بولا۔ ''اوئے اب شیروں کی طرح اکڑ کر چل پتر! اب تو لڑکی نہیں۔ جو شرما رہا ہے۔''

بخت خان مسکرانے لگا اور سلطان خان کے گلے جا لگا۔ پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنے باپ کی طرف مڑ کر بولا۔ ''چلیں ابا جان! اماں راہ دیکھ رہی ہوگی۔''

''ہاں بیٹا! اس نے تیرا بڑا انتظار کیا ہے مگر تو نے بڑی دیر لگا دی۔'' بخت خان باپ کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور چپ چاپ باپ اور ماموں کے ساتھ چل پڑا۔

☆......☆

حویلی میں شادی کا سماں تھا۔ گاؤں کی سب عورتیں بخت خان کو دیکھنے کے لیے جمع تھیں۔ جوں ہی وہ تانگے سے اتر کر حویلی میں داخل ہوا تو اس پر پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ لڑکیاں بالیاں اسے دیکھنے کے شوق میں ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ''ناک نقشہ بالکل ویسا ہی ہے۔''

''بھئی صورت تو بدلنے سے رہی۔''

''سچ مچ کا لڑکا لگتا ہے۔''

''لگتا ہی نہیں کہ یہ پہلے لڑکی تھا۔'' غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔

بخت خان! اپنی ماں کے قریب جا پہنچا اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ زیوراں نے سر سے پاؤں تک اسے غور سے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر بولی۔ ''واہ مولا! تیرے رنگ۔'' یہ کہہ کر وہ بخت خان کے ہاتھوں کو وارفتگی سے چومنے لگی۔ اس کے آنسو زار و قطار بہہ بہہ کر اس کا دامن بھگونے لگے۔ گاؤں کی عورتیں آگے بڑھ کر چودھرائن کو مبارک باد دینے لگیں کہ سوہنے رب نے اسے گھبرو جوان بیٹا دیا ہے جوان دونوں کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

☆......☆

محبت خان کے معمولات اب بدل گئے۔ کھیتوں پر جانا اس نے کم کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بخت خان اب کھیتوں

اور جایداد کا سارا حساب کتاب سنبھال لے۔ اس نے ایک منشی بھی رکھ لیا جو بخت خان کی رہنمائی کرنے لگا۔ اسے شروع میں یہ کام مشکل لگا مگر وہ آہستہ آہستہ سیکھنے لگا۔ مگر اس کا شرمیلا پن نہ دور ہوا۔ اس کی چال اب بھی لڑکیوں والی تھی اور وہ نظریں جھکا کر ہی چلتا تھا۔ اس کی سہیلیاں اب اس سے باقاعدہ پردہ کرنے لگی تھیں۔

علی پور سے صرف کاشان ملنے آیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھدار تھا۔ جب کہ اس کی ماں اور بہن بھائی ان پڑھ تھے۔ کاشان نے بخت خان کو مبارک باد دی اور کہا کہ قدرت جو فیصلہ کرتی ہے اس میں بہتری ہی ہوتی ہے۔ اب تم میرے کزن ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہو۔ آج سے ہماری دوستی پکی۔ کاشان نے ایسی باتیں کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی اور پھر اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دے کر چلا گیا۔ اگلے دن بخت خان نہ چاہنے کے باوجود بھی علی پور چلا گیا۔ اس کے ماموں سلطان اور کاشان نے اسے خوش آمدید کہا مگر اس کی ممانی صغراں اور اس کے دو بیٹوں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی۔ سلمٰی، بخت خان سے ملنا چاہتی تھی مگر اس کی ماں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ بخت کے سامنے نہ آئے۔ لہٰذا وہ کسی سہیلی سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔ کاشان کے بھائیوں، عرفان اور عمران نے بخت خان سے سرسری سا ہاتھ ملایا اور کسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ صغراں نے بھی بادل نخواستہ اسے خوش آمدید کہا اور کھانا لگا کر چلی گئی۔ پھر اس کے سامنے نہ آئی۔ بخت خان ان لوگوں کے طرز عمل سے حیران رہ گیا اور وہ یہ جان گیا کہ اس کے ماموں اور کاشان کے علاوہ کسی نے اس کے اس روپ کو قبول نہیں کیا۔ اس نے ان کی طنزیہ باتیں بھی سن لیں جو وہ آپس میں کر رہے تھے مگر ان کے برعکس کاشان کی دوستی نے اسے حوصلہ دیا اور اسے یقین سا آگیا کہ زندگی کے اس نئے سفر میں وہ اس کا ساتھ دے گا۔ اسے دکھ تھا کہ سلمٰی اس سے ملنے نہیں آئی۔

بخت خان جب ندی پار کر کے اپنے گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو اس نے کنویں والا راستہ اختیار کیا کیوں کہ وہ شارٹ تھا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ کنویں پر گاؤں کی لڑکیوں اور عورتوں کی قطار سی لگی تھی جو پانی بھرنے آئی تھیں۔ دو لڑکیاں کنویں سے ڈول نکال نکال کر سب کے گھڑے بھر رہی تھیں اور آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔ دور سے انہیں بخت خان گاؤں کی طرف آتا نظر آیا تو ان سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں سے ایک بولی۔ ''ارے اب تو وہ بالکل لڑکا لگتا ہے۔ سچ مچ کا مرد بن گیا ہے، واہ مولا تیرے رنگ۔''

''تیرا کیا خیال تھا۔ آدھا تیتر۔ آدھا بٹیر والی بات ہو گی۔'' ایک لڑکی ہنس کر بولی۔

''تھوڑی سی بٹیر والی بات تو اب بھی اس میں رہ گئی ہے۔'' ایک اور لڑکی بولی تو سب ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ ''تم دیکھو تو سہی اس کی چال وہی لڑکیوں والی ہے۔ سر جھکائے زمین کے کنکر گنتا جا رہا ہے۔ کسی کی طرف دیکھتا تو ہے ہی نہیں۔''

''تو تمہارا مطلب ہے بخت خاص ویسی نہیں بنا سپتی ہے۔'' ایک اور لڑکی اپنا گھڑا اٹھاتے ہوئے بولی۔

''ہاں بنا سپتی ہی سمجھو۔ آج کے ناخالص اور دو نمبری دور کی پیداوار۔'' ایک شرارتی لڑکی نے لہک لگائی تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

ایسی باتیں اب روزانہ ہی کنویں پر ہونے لگی تھیں۔ بخت خان کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں عجیب عجیب طنزیہ باتیں کرتے ہیں۔ کچھ اسے چودھری کے گناہوں کی سزا کہتے اور کچھ اللہ کی طرف سے آزمائش۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں مگر بخت خان خاموش تھا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ کسی کا منہ بند تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو بھی یقین دلانے میں عرصہ لگا تھا کہ وہ اب خوش بخت نہیں، بخت خان ہے۔ تو پھر لوگ اسے اتنی جلدی کیسے قبول کر لیں گے۔ ان ہی سوچوں کی وجہ سے وہ ہر ایک سے کٹا کٹا رہنے لگا۔ کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ کیوں کہ اس کا کوئی دوست جو نہ تھا، بس ایک کاشان ہی تھا جو اس سے ملنے آجاتا تھا اور اس کو اپنے ہمراہ باہر لے جاتا۔ اسے وہ کھیل کھیلنے۔ شکار کرنے اور گھوڑے پر بیٹھنے کے مشورے دیتا۔ وہ ہر بات اس کو اپنے برابر لا کر کرتا تھا جس سے خوش بخت میں حوصلہ پیدا ہوتا۔

علی پور کا سالانہ میلہ نزدیک آگیا تھا۔ کاشان ابھی سے کہہ گیا تھا کہ وہ تیار رہے۔ وہ خود اسے لینے آئے گا اور میلہ میں لے جائے گا۔ اسے کھیل تماشے دکھائے گا۔

میلے والے دن کاشان آکر اسے ساتھ لے گیا۔ کبڈی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ گاؤں کے جوان لڑکے ایک ٹولی کی صورت میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ کاشان اور بخت خان بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں موجود سب لڑکوں نے بڑی حیرت

سے اس نئے جوڑے کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اشارہ بازیاں کیں۔ کسی نے کوئی طنزیہ جملہ بھی کس دیا۔ ''کبڈی تو مردوں کا کھیل ہے۔عورتوں کا کیا کام۔''

بخت خان مزید وہاں نہ ٹھہرا اور کاشان کو چھوڑ کر گھر لوٹ آیا۔ کاشان نے برا نہ منایا اور اگلے دن پھر اس سے ملنے آگیا۔ دونوں کا اکثر وقت ساتھ گزرنے لگا تھا اور یہی وقت بخت خان کو اچھا لگتا تھا۔ مگر کاشان کی ماں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ خوش بخت اسے پسند تھی اسی لیے وہ اسے اپنی بہو بنانا چاہتی تھی مگر اس کا یوں راتوں رات لڑکا بن جانا اس نے قبول نہ کیا تھا۔ وہ کاشان کو اس سے ملنے سے منع کرتی تھی مگر کاشان کہتا۔ ''ماں! تم تو خواہ مخواہ اس غریب کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ اس میں اس کا بھلا قصور کیا ہے۔ کل تو آپ اس کے گن گاتی تھیں۔ بہو بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا مگر آج......'' کاشان ماں سے الجھ پڑا تو وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

''پتر کاشان! کل اور آج میں بہت فرق ہے۔ تم اسے کوئی عذاب الٰہی سمجھو۔ جس کا سایہ میں تم پر نہیں پڑنے دوں گی۔ مجھے تو یہ قیامت کے آثار لگتے ہیں۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ یہ سائنسی ترقی کا زمانہ ہے۔ جس میں ہر بات ممکن ہے۔ یہ انہونی نہیں ہے۔ لڑکی سے لڑکا اور لڑکے سے لڑکی بن جانا عام سی بات ہے۔'' کاشان نرم لہجے میں بولا مگر اس کی ماں کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولی:

''ہوش کی بات کر بیٹا! یہ انہونی نہیں تو کیا ہے۔ کبھی تم نے گندم کے پودے کے ساتھ بھٹے اگتے دیکھے ہیں۔ کبھی آم کے درخت پر خربوزے لگتے دیکھے ہیں۔ کبھی سنا ہے کہ مرغی نے انڈے نہیں چوزے دیے ہیں۔''

''مگر اس میں بخت خان کا کیا قصور ہے۔ اس میں اس کی مرضی کا دخل تو نہیں ہے۔ ایسا تو کسی کے ساتھ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی دن میرے ساتھ......''

''اللہ نہ کرے بیٹا! ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ مجھے بخت خان سے ہمدردی ہے مگر زمانہ خراب ہے۔ سنا نہیں تم نے گاؤں کے لوگ کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' صغراں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''اماں! آپ بھی تو ایسی باتیں کرتی ہیں۔'' کاشان یہ کہہ کر ناراض سا ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے بخت خان سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ اسے لڑکی ہونے کے خول سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

☆......☆

ادھر زیوراں اب بخت خان کے سر پر سہرا دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔ جب اس نے کاشان کی بہن سلمٰی کا نام لیا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ صغراں نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا کہ میری بیٹی کا نام کیوں لیا۔ غضب خدا کا، زیوراں اپنے عذابوں کا پھندا میرے گلے میں ڈالنے چلی ہے۔ وہ تو زیوراں کے درپے ہو گئی کہ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ میری بیٹی کا نام لیا۔'' اس آدھے تیتر اور آدھے بٹیر کے لیے کیا میری ہی بیٹی رہ گئی تھی۔''

زیوراں ہکی بکی ہو کر رہ گئی۔ جیسے اس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔ ''صغراں بہن! تم نے جب میری بیٹی مانگی تھی تو اس وقت میں تو ہرگز نہیں اچھلی تھی۔ میں نے تمہارے دس دس نام نہیں رکھے تھے۔ میں نے تو اسے دل سے بیٹا بنایا تھا میں نے تمہارا مان رکھا تھا کہ تمہارے ایک ہی بار رشتہ مانگنے پر ہاں کر دی تھی۔ ورنہ لوگ تو بیٹی دیتے وقت لڑکے والوں کو بیسیوں پھیرے لگواتے ہیں مگر میں نے......''

''میرے بیٹے کا نام اب مت لو۔ وہ تو خالص گھبرو جوان ہے۔ تمہارے بیٹے کی طرح راتوں رات جنس بدل کر نہیں آیا۔'' صغراں طنزیہ لہجے میں بولی۔

''مگر اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ یہ تو سوہنے رب کی دین ہے۔ جس کو جب چاہے اور جس رنگ میں دے۔''

''ظاہر ہے تم نہیں کہو گی تو اور کون کہے گا۔'' صغراں کا لہجہ ابھی تک طنزیہ تھا۔ ''تمہیں بڑی آس تھی ناں بیٹے کی۔ وہ تو پوری ہو گئی اور وہ عین اس وقت جب بیٹی کی رخصتی قریب تھی۔ جایداد بچانے کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے تم لوگوں نے۔''

''تو اس بات کا مروڑ اٹھ رہا ہے تمہارے پیٹ میں۔'' زیوراں کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ ''تو تم خوش بخت کے ذریعے ہماری جایداد پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے اب تمہیں بخت خان کا وجود کھٹک رہا ہے۔'' یہ کہہ کر زیوراں غصے سے باہر نکل آئی۔ گھر آ کر چودھرائن نے اپنے دل کی ساری بھڑاس چودھری محبت پر اتار دی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بخت خان کے دل میں تیر کی مانند کھبتا چلا گیا۔ اس نے ماں اور باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے میں دل کا بوجھ

آنکھوں کے راستے بہا کر ہلکا کر رہا تھا۔ ساری رات اس نے جاگ کر گزار دی۔

اس دن سے بخت خان خاموش سا رہنے لگا۔ اس نے کاشان سے بھی ملنا کم کر دیا۔ علی پور نہ جانے کی تو اس نے قسم کھالی تھی مگر کاشان خود اس سے ملنے کے لیے آتا رہا۔

کاشان نے بھی اپنی ماں اور پھوپی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اس لیے اس نے پھوپی سے اور بخت سے ان کے گھر آکر معافی مانگی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود یہی چاہتا تھا کہ بخت اور سلمٰی کی شادی ہو جانی چاہیے مگر اس کی ماں تو ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ ایک روز کاشان زبردستی بخت خان کو ندی کے کنارے لے گیا اور اس کی ہمت بڑھا کر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔

''کاشان! میں سوچتا کہ مجھے پیدا کرنے میں رب کی کون سی مصلحت تھی؟ کاشان کو بخت خان سے ایسی تلخ اور براہِ راست بات کی توقع ہرگز نہ تھی مگر بخت خان اداس اور دھیمے لہجے میں بولتا رہا۔'' میری ماں اس دنیا کی سب سے بدقسمت عورت ہے۔ پہلے اس کو اولاد کی تمنا تھی اور بیٹے کی آس تھی مگر اسے بیٹی ملی تو وہ اپنا دکھ چھپا گئی کہ بیٹا بھی مل جائے گا مگر وقت اور قدرت نے اسے یہ نعمت نہ دی۔ یہ نعمت اب ملی بھی تو کس روپ میں۔ نہ میں اس کا دکھ بانٹنے والی بیٹی ہوں اور نہ ہی اسے خوشیاں دینے والا بیٹا۔''

''کاش میں سلمٰی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے سکتا۔'' کاشان معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ تو بخت خان کی آنکھوں میں سلمٰی کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ پہلے ان دونوں میں کتنی محبت اور دوستی تھی۔ کیا اب وہ بخت خان کو شوہر کے روپ میں قبول کر لے گی مگر اس کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

☆......☆

چودھرائن ابھی تک آگ میں جل رہی تھی اس نے صغراں کو نیچا دکھانے کے لیے دن رات ایک کر دیا اس نے ہر اس گھر کے چکر لگائے جہاں بھی جوان لڑکی موجود تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ صاف انکار کیا اور نہ ہی ہاں کی بس گول مول سا جواب دے کر ٹال دیا۔ بخت خان تو ماں کو منع ہی کرتا رہا کہ اب وہ کہیں نہ جائیں مگر اس کی ماں بہو لانے کے لیے سرگرداں ہی رہی۔ بخت خان کوشش کے باوجود بھی سلمٰی کی ماں کے طنزیہ الفاظ نہیں بھلا سکا تھا اور اس کے کانوں میں ہر وقت یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ ''ہوں آدھا تیتر آدھا بٹیر۔''

''کیا واقعی یہ سچ ہے۔ ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ اب مکمل مردانہ زندگی گزاروں گا۔ پھر یہ طنزیہ اور حقارت بھرے جملے یہ سلگتے فقرے اور دل میں آگ لگانے والی باتیں کیوں اچھالی جاتی ہیں۔ کیا میں واقعی اپنے ماں باپ کے کسی گناہ کی سزا ہوں۔'' بس اس دن سے بخت خان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزرنے لگا۔ اس نے زمینوں پر جانا اور کاشان سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چودھری محبت نے اس بات کو محسوس کیا اور اس کی سرزنش بھی کی مگر اس کی خوش دلی شاید ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھی۔ اس روز بھی چودھری محبت نے اس سے ذرا غصہ بھرے انداز میں بات کی تھی کہ وہ ہر وقت کمرے میں کیوں بند رہنے لگا ہے۔ باہر نکلو زمینوں پر جاؤ۔ گھومو پھرو اور جاندار زندگی بسر کرو۔ اتنا سنتے ہی بخت خان باہر نکل گیا۔ اس کا رخ زمینوں کی طرف ہی تھا۔ مگر بخت خان لوٹ کر گھر نہ آیا۔ دوپہر ڈھلی تو اس کی ماں کھانے کے لیے اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہ آیا تو اس نے ملازموں کو ڈیرے پر بھیجا مگر بخت خان وہاں بھی نہ تھا۔ شام بھی ڈھلنے لگی تھی۔ چودھرائن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر رات آئی اور گزر گئی۔ چودھری محبت نے سارا گاؤں اور علی پور بھی چھان مارا مگر بخت خان کا نشان نہ ملا۔ حویلی اور گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔

اگلے دن گاؤں کے چرواہے نے بتایا کہ گاؤں سے باہر کافی دور جا کر جہاں ندی کافی گہری ہو جاتی ہے وہاں پر پانی میں کسی کی لاش تیر رہی ہے۔ یہ سن کر چودھری اور گاؤں کے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ وہ لاش بخت خان ہی کی تھی۔ اس نے گہرائی والی جگہ کود کر خودکشی کر لی تھی اس کی لاش بڑی مشکل سے باہر نکالی گئی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں گویا بنانے والے سے پوچھ رہا ہو کہ اس کے بنانے میں اس کی کیا مصلحت تھی؟ چودھرائن کے بین کلیجہ چیر رہے تھے۔ کاشان سرہانے کھڑا رو رہا تھا اور صغراں اس کی لاش کو دیکھ کر زار و قطار آنسو بہا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''چودھری محبت! تیرا بخت خان تو بڑا گھبرو جوان تھا سچا اور انمول۔'' اور کاشان اپنے آنسو پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کاش میری ماں یہ بات بخت خان کی زندگی میں کہہ دیتی۔

ڈیڑھ سیانا

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں اس بار ایک منفرد نوعیت کی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس کا مرکزی کردار بھی میں خود ہوں۔ جی ہاں یہ میری اپنی سرگزشت ہے۔ میں نے جو قدم اٹھایا اس کی وجہ سے کچھ لوگ مجھے غلط کہیں گے ان سے استدعا ہے کہ وہ میرے پورے حالات کو مدنظر رکھیں۔ سنار کی سو اور لوہار کی ایک۔ میں نے یہی کیا ہے۔

شاہنواز
(ٹورنٹو کینیڈا)

آج میرا بڑی شدت سے کسی کو قتل کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور یہ ''کسی'' کوئی اور نہیں بلکہ میرا بڑا بھائی ہے۔ اگر میں اس ارادے پر عمل کر لیتا تو زمانہ مجھے برادر کش اور شاید شیطان کے القابات سے نوازتا جس نے اپنے بڑے بھائی کو قتل کر دیا۔ کیونکہ دنیا تو یہ جانتی تھی کہ حق نواز نہ صرف میرا بڑا بھائی ہے بلکہ اگر میں کسی مقام پر تھا تو اس کی واحد وجہ نواز ہی تھا۔ یہ باتیں بھی اسی نے پھیلائی تھیں۔ مجھے دنیا کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس دنیا نے مجھے دیا ہی کیا تھا جو میں اس کی

پروا کرتا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں دبو اور بزدل ہوں۔ اپنے بڑے بھائی تو کیا ایک چھپکلی مارنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے جس وقت میرے اندر نواز کو قتل کرنے کی خواہش ابھری اسی وقت میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ میں قیامت تک اس خواہش پر عمل نہیں کرسکوں گا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہوں گا۔ میرا خیال ہے بات اس طرح آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی جب تک میں آغاز سے نہیں بتاؤں۔

میرا آغاز نواز کا اختتام تھا۔ یعنی مجھے اس کے بچے کچے پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ مجھے پہلا کپڑا جو نصیب ہوا وہ اس کی اترن تھی۔ اس وقت غریب سے غریب بچہ بھی نیا کپڑا پہن ہی لیتا ہے مجھے زیادہ تر نواز کے اتارے ہوئے اس کے بچپن کے کپڑے ہی پہننے کو ملے تھے۔ پھر اس کے موزے، ٹوپے، سوئیٹر، کمبل، بستر اور جوتے پہننے کو ملے۔ حد یہ کہ مجھے ماں باپ سے پیار بھی وہ ملا جو نواز سے بچ جاتا تھا۔

وہ مجھ سے خاصا بڑا ہے یعنی پورے آٹھ برس اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا اور میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اسے بڑے بھائی ہونے کے ناطے مجھ سے شفقت اور محبت سے پیش آنا چاہیے تھا۔ بڑے بھائی کی طرح ایثار اور قربانی سے کام لینا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس اس کی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ نہ ملے یا ملے تو بہت معمولی سا اور نہ ہونے کے برابر۔ یہ کام وہ اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا کہ میں تو کیا میرے ماں باپ بھی اس کی چال بازی نہ سمجھ پاتے تھے۔

جب میرے لیے نئے کپڑوں یا چیزوں کی بات ہوتی تو نواز نہایت ہوشیاری سے اپنے پرانے کپڑے اور چیزیں پیش کردیتا تھا اور اس طرح معصومیت سے غیر محسوس انداز میں مہنگائی کو اجاگر کرتا کہ ماں باپ دونوں اس کی باتوں میں آجاتے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ نئی اور اچھی چیز استعمال کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں دس برس کا اور نواز اٹھارہ برس کا تھا تو اماں نے ابا کا ایک پرانا جوڑا جو اتنا بھی پرانا نہیں تھا اسے نواز کے لیے سلائی کرکے اسے دیا تو اس نے ہنگامہ کر دیا اور اتنا شور کیا کہ گھر سر پر اٹھا لیا کہ اسے پرانا جوڑا دیا جا رہا تھا۔ اس نے نہایت جذباتی انداز میں ایک لمبی تقریر کی جس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔ ”اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ میں دوسروں کی اترن پہنوں۔ نہیں پال سکتے تو بتا دیں میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، محنت مزدوری کرلوں گا۔ بھوکا مرجاؤں گا مگر اب اس گھر میں نہیں آؤں گا۔“

اسے اس تقریر کا صرف دسواں یا بیسواں حصہ سمجھیں۔ جسے سن کر اماں اور ابا کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے تھے۔ پہلا بیٹا ہونے کے ناطے وہ اس سے پاگلوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ جب کہ مجھے اس پیار کا دسواں حصہ بھی نہیں ملا تھا۔ اماں دھاڑیں مار کر رونے لگیں اور ابا نے بلبلا کر اماں پر چڑھائی کردی اور انہیں بے نقط سنائیں کہ انہیں نواز کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا میں مرگیا ہوں جو تم میرے بیٹے کو اترن پہنا رہی ہو۔

”آپ کا نیا سوٹ ہی تو ہے ایک دوبار پہنا اور پھر چھوڑ دیا۔“ اماں نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سوچا کہ پھر سے سلائی کرکے نواز کے سائز کا کردوں۔“

ابا کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب انہوں نے وہ سوٹ اٹھا کر چولہے میں جھوک دیا۔ میں دس سال کا تھا اور اس وقت تک مجھی مشہور ہوگیا تھا (اس شہرت میں بنیادی کردار بھائی صاحب کا تھا)۔ مگر میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میں جو بچپن سے اترن پر گزارہ کرتا آرہا ہوں۔ کیا اماں ابا نے کبھی اس طرح میرے لیے سوچا؟ مگر ذہن پر خاصا زور دینے کے بعد بھی ایسا کوئی واقعہ ذہن میں نہیں آیا کہ اماں ابا نے مجھے اترن پہنانے سے انکار کیا ہو۔ حد یہ کہ جب بچہ اسکول جاتا ہے تب تو اسے پہلی بار نیا بستہ، یونیفارم، جوتے اور کتابیں ملتی ہیں۔ مگر مجھے تو یہ بھی نواز کی برسوں پہلے چھوڑی ہوئی ملی تھیں۔ مجھے صرف کاپیاں اور پینسل وغیرہ نئی ملی تھیں۔ ممکن ہے اگر نواز نے اپنی بچی کچی سنبھال کر رکھی ہوتیں تو یہ بھی مجھے پرانی ہی ملتیں۔ اس امید پر کہ نواز کے اس داؤ پیچ اور اماں ابا کے اس ردعمل کے بعد پالیسی بدل جائے گی۔ چند دن بعد میں نے ہمت کرکے اماں سے کہہ دیا۔

”میں یہ شلوار قمیص نہیں پہنوں گا۔“

اس وقت اماں سلائی مشین پر حق نواز کا ایک دس سال پرانا سوٹ کانٹ چھانٹ کر میرے مطابق کر رہی تھیں۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں اس سے زیادہ جسامت رکھتا تھا جتنی میری دس سال کی عمر میں نہیں تھی۔ اماں نے حیرت سے زیادہ قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں نہیں پہنے گا، اچھا خاصا سوٹ تو ہے۔“

اماں جسے اچھا خاصا کہہ رہی تھیں اس کا کپڑا ابھی گھس

گیا تھا۔ اماں کو بہت احتیاط سے سلائی کرنا پڑ رہی تھی۔
میں نے مزید ہمت کر کے کہا۔ ''میں اترن نہیں پہنوں گا۔''

''ہاں ہاں، تو کسی نواب کی اولاد ہے۔'' اماں نے طنزیہ لہجے میں ایک طویل لیکچر شروع کیا جس میں اپنی مالی مشکلات اور مہنگائی کا رونا رونے سے لے کر ان احسانات کی طویل فہرست کا ذکر بھی تھا جو وہ ماں باپ کی حیثیت سے اپنا پیٹ کاٹ کر ہمارے لیے کر رہے تھے۔ میں اتنا گنگ ہوا کہ یہ احتجاج بھی نہ کر سکا کہ وہ جن احسانات کا ذکر کر رہی ہیں وہ صرف نواز کے ساتھ ہوئے ہیں۔ بہر حال اس لیکچر سے میرے اندر جو خوش فہمی آ گئی تھی وہ فوراً رفع ہو گئی اور مجھے پتا چل گیا کہ میرے لیے پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میں اب بھی وہی شاہ نواز تھا جسے دوسرے نہیں بلکہ نمبر دو بیٹے کی حیثیت حاصل تھی اور اس حیثیت میں ساری عمر کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جب تک اماں ابا زندہ رہے میں دو نمبر ہی رہا۔

ابا کی علاقے کی مارکیٹ میں کریانے کی دکان تھی۔ اگرچہ متوسط علاقہ تھا مگر جنرل اسٹور کا کام اچھا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری مالی حالت (جس کی خرابی کا رونا صرف میرے لیے رویا جاتا تھا) آس پاس کے پڑوسیوں سے خاصی بہتر تھی۔ ابا میٹرک پاس تھے اور اماں نے صرف پانچویں تک اسکول دیکھا تھا۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد بہت سارا پڑھے۔ اس لیے انہوں نے صرف چار سال کی عمر میں نواز کو نزدیکی سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس وقت بھی اسکولوں کا رواج بہت کم تھا۔ نواز کو پڑھنے کا شوق نہیں تھا مگر اس نے بھانپ لیا تھا کہ اماں ابا کی کمزوری تعلیم ہے اس لیے وہ یوں پوز کرنے لگا جیسے اسے بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ حالانکہ روز اسکول جانا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ براہِ راست انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے دوسری ترکیب نکالی اور آئے دن اسکول جانے کے وقت اسے جسمانی عوارض لاحق ہو جاتے تھے۔ وہ جانے سے انکار نہیں کرتا تھا مگر تیار ہوتے ہوئے یوں کراہتا اور اداکاری کرتا کہ بالآخر اماں کو ترس آ جاتا اور وہ اسے خود اسکول جانے سے منع کر دیتیں۔

ہوشیار نواز فوراً نہیں مانتا تھا بلکہ اپنی تکلیف کو مسلسل بیان کرتے ہوئے اسکول جانے پر اصرار کرتا اور پھر اماں کی بات یوں مانتا جیسے صرف اماں کے کہنے پر اسکول نہیں جا رہا ہے ورنہ اس وقت اسے ملک الموت بھی اسکول جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ پانچویں تک یہ بہانے چلتے رہے اور مزے کی بات تھی کہ یہ تمام عوارض اور تکالیف صرف اسکول کے وقت تک ہوتی تھیں جیسے ہی وقت گزرتا نواز بھلا چنگا ہو جاتا اور دوپہر ختم ہوتے ہی کھیلنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ بڑی کلاسوں میں آنے کے بعد اس نے حکمتِ عملی بدل دی۔ اب وہ تیار ہو کر باہر نکلتا اور اپنے جیسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کسی میدان کا رخ کرتا جہاں وہ کرکٹ کھیلتے تھے۔ اماں گھر میں رہنے والی عورت تھیں اور ابا کو دکان سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ نواز پر نظر رکھتے۔ اس لیے وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد تھا۔

پڑھائی میں رہ جانے والی کمی وہ دوسرے طریقے سے پوری کرتا تھا۔ شام کے وقت وہ کچھ دیر ابا کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا اور جب ابا نماز پڑھنے جاتے تو چیزوں میں ہیرا پھیری کرتا تھا۔ یہ چیزیں بعد میں اپنے اساتذہ کے گھر پہنچاتا اور اس کا فائدہ اسے امتحان کے دنوں میں ہوتا۔ اس کے اتنے اچھے نمبر آتے کہ اماں ابا نہال ہو جاتے اور مٹھائیاں بانٹتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کو کبھی پتا نہیں چلا کہ ان کا برخوردار پاس کیسے ہوتا ہے؟ جب میری اسکول جانے کی عمر ہوئی تو اماں ابا نے اس لیے دیر سے داخل کرایا کہ بہ قول ان کے میں غبی تھا۔ حالانکہ میں غبی نہیں تھا۔ بچپن سے توجہ نہ پا کر میں چپ رہنے لگا تھا اور بلا ضرورت بات نہیں کرتا تھا۔ اماں ابا نے میرے بہ مشکل ہی کچھ لاڈ اٹھائے ہوں گے۔ میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس چپ کا نقصان یہ ہوا کہ حق نواز نے اماں ابا کے کان میں مسلسل ڈالنا شروع کر دیا کہ میں غبی ہوں اور کوئی عقل والا کام نہیں کر سکتا اس لیے کوئی مجھ سے توقع بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ تو مجھے اسکول میں بھی داخل نہیں کرا رہے تھے۔ مگر میری خالہ کو پتا چلا تو انہوں نے اماں کو لتھاڑا۔ ''تو شاہ نواز کو اسکول کیوں نہیں بھیج رہی۔''

''آپا اسے عقل ہی کہاں ہے؟''

''عقل تم دونوں میاں بیوی کو نہیں ہے، اچھا بھلا بچہ تو ہے بس آج کل کے بچوں کی طرح بدتمیز اور چلبلا نہیں ہے تو تم سمجھتی ہو عقل نہیں ہے، اسے فوراً اسکول میں داخل کراؤ۔''

اماں خالہ سے ڈرتی تھیں اس لیے انہوں نے ابا سے بات کی اور ابا نے مجھے اسکول میں داخل کرانے کو کہہ دیا۔ سرکاری اسکول گھر سے دور تھا اس لیے طے ہوا کہ نزدیکی پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ مگر جب نواز کو پتا

چلا تو وہ جل بھن کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً مخالفت کی اور نہایت چالاکی سے اماں ابا کو قائل کیا کہ اتنا پیسا ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پرائیویٹ اسکول والوں کے منہ بھی کھلے رہتے ہیں۔ کتابوں اور یونیفارم سمیت ہر شے مہنگی ہوتی ہے اس لیے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرایا جائے جہاں سے وہ پڑھ رہا تھا اور جہاں تک دوری کی بات تھی تو وہ مجھے ساتھ اسکول لاتا لے جاتا۔ اس کے پرانے یونیفارم اور کتابیں میرے کام آتیں۔ اماں ابا تو پہلے ہی اس کے کہے میں آتے تھے فوراً مان گئے۔ اس وقت نواز نویں کلاس میں تھا۔ ایک دو سال بعد میں خود بھی آنے جانے کے قابل ہو جاتا۔

یوں میرا داخلہ سرکاری اسکول میں ہوا اور مجھے نواز کی چھوڑی چیزوں اور اترنوں پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ نواز کو مجھ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میری پیدائش کے بعد اس نے ایک بار بھی مجھے گود میں نہیں لیا تھا۔ باہر لے جانے اور کھلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اماں ابا بھی میرے ساتھ اس کے رویے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ جب اس نے مجھے ساتھ اسکول لانے اور لے جانے کا ذمہ لیا تو وہ یوں اس کے ممنون ہو گئے جیسے وہ کوئی غیر ہو۔ ان کا بیٹا اور میرا بڑا بھائی نہ ہو۔ حالانکہ اس کے ساتھ آنا جانا یوں ہوتا تھا کہ گلی سے نکلتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہو جاتا اور منہ اٹھائے تیز قدموں سے چلتا۔ اسے قطعی پروا نہیں ہوتی تھی کہ میں اس کے پیچھے آ رہا ہوں یا نہیں۔ کہیں رک گیا ہوں یا گر گیا ہوں یا کسی گاڑی کے نیچے آ گیا ہوں۔ میں بھاری بھرکم بیگ اٹھائے اس کے پیچھے بھاگتا تھا اور اس ریس میں میرا حشر نشر ہو جاتا۔

چند ایک بار کے بعد میں نے راستہ یاد کر لیا اور اب میں خود آرام سے جاتا اور آرام سے واپس آتا تھا۔ واپسی میں وہ چالاکی سے کام لیتا اور تیز قدمی سے آنے کے بعد گلی کے کونے پر میرا انتظار کرتا اور پھر یوں میرے ساتھ گھر تک آتا جیسے اس نے سارے راستے میرا بہت ہی خیال رکھا ہو۔ پہلے وہ مجھے نظر انداز کرتا تھا اب اس نے مجھے اپنا خادم سمجھ لیا اور جب تک گھر میں ہوتا مجھ پر حکم چلاتا رہتا تھا۔ میں بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا اور اگر ذرا سا بھی انکار کرتا تو وہ فوراً اماں یا ابا سے شکایت کرتا اور اس کے بعد میری شامت آ جاتی کہ میں بڑے بھائی کا حکم نہیں مان رہا جو میرے لیے اتنا کرتا ہے۔ حالانکہ وہ میرے لیے کیا کرتا تھا یہ تو میں ہی جانتا تھا۔ ورنہ جب وہ گھر سے جاتا تب میں سکون کا سانس لیتا تھا ورنہ تو مجھے ہوم ورک یا ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہوئے بھی اس کے کاموں کے لیے دوڑنا پڑتا تھا۔

تعلیم کے معاملے میں، میں نواز سے بہتر ہی تھا کیونکہ میں روز اسکول جانے والا اور روز کا کام روز کرنے والا طالب علم تھا۔ غبی مشہور ہونے کے باوجود مجھے اپنا سبق یاد کرنے میں کبھی دشواری پیش نہیں آئی اور میں ہر ٹیسٹ اور امتحان میں با آسانی پاس ہو جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے بہت اچھے نمبرز نہیں ملتے تھے کہ میں کلاس میں کوئی پوزیشن لیتا کیونکہ پوزیشن صرف ٹیچرز کے منظور نظر لڑکے لیتے تھے۔ میں خاموش اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا اس لیے ٹیچرز کی نظروں میں نہیں آتا تھا۔ پھر نواز نے اسکول میں بھی میرے بارے میں یہی مشہور کر دیا تھا کہ میں غبی ہوں۔ اس لیے دوسرے لڑکے مجھے چھیڑتے اور میرا مذاق اڑاتے تھے مگر کسی نے مجھے سنجیدہ نہیں لیا۔ پوری اسکول لائف میں میرے چند ایک ہی دوست بنے تھے۔ ان سے بھی دوستی بہت گہری نہیں تھی۔ اسکول کے بعد محلے میں بھی یہی حال تھا۔ بس چند ایک لڑکے تھے جن کے ساتھ میں کھیلتا تھا۔

جب نواز میٹرک میں آیا اور اسے بورڈ کے امتحانات سے واسطہ پڑا تو اسے پتا چلا کہ اب اس کی راشن سپلائی کی پالیسی کام نہیں آئے گی۔ پڑھنے کی اسے عادت نہیں تھی اس لیے اس نے متبادل حکمتِ عملی اپنائی۔ اس نے امتحانات میں پیسے کھلا کر نقل کی اور یوں میٹرک کر لیا۔ اس کے نمبرز زیادہ اچھے نہیں آئے تھے اس لیے اسے عام سے کالج میں داخلہ ملا جہاں پڑھائی کے نام پر صرف چند ایک کلاسز ہی ہوتی تھیں اور زیادہ تر کلاسوں پر تالا پڑا رہتا تھا۔ یوں اسے نہ پڑھنے کا اصلی بہانہ مل گیا اور تین سال تک انٹر میں جھک مارنے کے بعد اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ جب ابا نے اس سے کہا کہ اگر وہ پڑھ نہیں رہا ہے تو اسٹور پر اس کا ہاتھ بٹائے تو اس نے چالاکی سے انکار کر دیا اور ابا سے کہا کہ وہ ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہے۔ ابا اگرچہ راضی نہیں تھے مگر اس کی بات سے کہاں انکار کر سکتے تھے۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ابا سے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ صبح دس سے رات گیارہ بجے تک دکان میں کھڑے رہنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لڑکے ملازم تھے مگر کیش کاؤنٹر پر

چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے ابا کی خواہش تھی کہ اب نواز دکان پر آئے۔ دوسری طرف نواز کا یہ حال تھا کہ اسے بن محنت کے رقم مل رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی دکان پر جا کر محنت کرنے کی۔ کالج سے جان چھوٹی تو اس نے ٹیکنیکل کالج کا بہانہ کرلیا اور ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ الیکٹریکل میں تین سال کا ڈپلومہ تھا۔ جب وہ ڈپلومے کا بہانہ کرر ہا تھا تو ابا نے اس سے کہا تھا۔ ''اب مجھ سے اتنی دیر دکان پر نہیں رہا جاتا ہے۔''

اس نے فوراً اپنی بلا میرے سر ڈال دی۔ ''ابا ایسا کرو کہ شاہنواز کو ساتھ رکھ لو۔''

''وہ تو ابھی پڑھ رہا ہے۔'' ابا کو زندگی میں شاید پہلی بار میرا خیال آیا۔

''کیا کرے گا پڑھ کر۔'' نواز نے بے پروائی سے کہا۔ ''اسے دکان پر لگا دو اچھا ہے کام سیکھ جائے گا۔ بعد میں اس کے کام آئے گا۔''

ابا کو نواز کی یہ بات لگی اور مجھے شام کے وقت دکان پر آنے کا حکم مل گیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ میں زیادہ تر گھر میں ہوتا اور نواز کے کام کرتا تھا تو ابا کی دکان پر کام کرنے میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ بلکہ مجھے تو بچپن سے دکان پر جانا اچھا لگتا تھا۔ یوں میں نے شام کو دکان پر جانا شروع کردیا اور چند مہینے بعد ابا نے میری طرف سے مطمئن ہوکر شام کو گھر جانا شروع کردیا۔ میں نہ صرف دکان میں کام کرتا تھا بلکہ کیش کاؤنٹر بھی دیکھتا تھا۔ جب کہ میری عمر بارہ سال بھی نہیں تھی۔ میں نے یہ سارا کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ ابا حیران رہ گئے تھے کیونکہ انہیں مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں یہ کام اتنی جلدی سیکھ جاؤں گا۔ پہلے ابا نے مجھے سامان دینے پر لگایا۔ میں نے ایک مہینے میں یہ کام سیکھ لیا۔ اس کے بعد کیش کاؤنٹر مجھے دیا گیا۔ ابا سر پر موجود رہتے۔ جب ابا کو اطمینان ہوگیا کہ میں دکان سنبھال سکتا ہوں تو اب وہ تین گھنٹے کے لیے گھر چلے جاتے تھے۔

میں اسکول سے ایک بجے تک آتا اور شام چار سے سات بجے تک میں دکان دیکھتا تھا۔ دوپہر میں آرام کرتا تھا اور دکان سے آنے کے بعد اپنا ہوم ورک کرتا۔ دوسری طرف نواز کا یہ حال تھا کہ صبح دیر سے اٹھتا اور کالج کا بہانہ کرکے گھر سے نکل جاتا۔ دیر سے جانے کے لیے یہ جواز پیش کرتا کہ کلاسز دیر سے ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ہفتے میں دو تین دن ہی کالج جاتا تھا۔ میں نے خود دکان پر آتے جاتے اسے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے یا کسی ہوٹل پر بیٹھے گپ شپ کرتے دیکھا تھا۔ وہ گھر سے جھوٹ بول کر اور اماں سے پیسے اینٹھ کر چلا جاتا تھا۔ اماں اسے کبھی انکار نہیں کرتی تھیں اگر اپنے پاس نہیں ہوتے تو پاس پڑوس سے ادھار کرکے دے دیتی تھیں۔ جب نواز دو تین بار دکان پر بیٹھا تو اس نے خوب چونا لگایا۔ ابا جانتے تھے شاید اس لیے بھی انہوں نے اسے دکان پر بیٹھنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

اس کے برعکس میں نے گلے سے کبھی ایک روپیا نہیں نکالا۔ دکان میں کھانے پینے کی بیشمار چیزیں ہوتی تھیں اور میں نے کبھی ایک سپاری بھی نکال کر نہیں کھائی۔ اس وقت مجھے دو روپے جیب خرچ ملتا تھا جب کہ نواز کو بیس روپے۔ اسے وہ بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ میں دو روپے میں گزارا کرتا تھا اور ابا کو کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ دے دیں۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں گلے سے مار کر اپنا حساب کرلیتا ہوں گا۔ یہ کام ایسا ہے کہ اس میں سو ڈیڑھ سو روپے کا پتا نہیں چلتا ہے اور ابا حساب کرتے تھے۔ جو کماتے گھر لے آتے۔ مزید سامان ڈلوا کر جو بچتا وہ گھر میں خرچ کے لیے دے دیتے اور یہاں سے جو بچتا وہ بینک میں ڈال دیتے۔ سال کے سال میرا جیب خرچ ایک روپے کے حساب سے بڑھتا رہا اور جب میں نویں کلاس میں آیا تو مجھے صرف چھ روپے مل رہے تھے۔ میٹرک میں اماں ابا نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور مجھے دس روپے ملنے لگے۔

نواز کے ڈپلومے کا بھی وہی حشر ہوا تھا جو انٹر کا ہوا تھا یعنی وہ کبھی مکمل نہیں ہوسکا تھا۔ چار سال اور لاکھ روپے سے اوپر ضائع کرکے اس نے اعلان کیا کہ وہ پڑھے گا نہیں بلکہ کاروبار کرے گا۔ اس وقت تک ابا اس سے کچھ فرنٹ ہو چکے تھے مگر نواز اب بھی اپنی بات منوا سکتا تھا۔ اس نے ڈیکوریشن شاپ کا کہا تو ابا نے اسے ڈیکوریشن شاپ کھلوا دی۔ اس میں اچھا خاصا خرچا آیا۔ کوئی لاکھ روپے کا تو سامان ہی پڑا تھا۔ پھر نواز کو دکان بھی اچھی جگہ دلوائی تھی۔ اس میں بھی خاصا خرچ آیا تھا۔ آج سے کوئی سولہ سال پہلے یہ خاصی بڑی رقم ہوتی تھی خاص طور سے متوسط طبقے کے لیے۔ ابا نے برسوں میں جا کر یہ رقم جمع کی تھی جو نواز نے صرف ایک سال میں برباد کردی۔ جی ہاں اس نے ایک سال بعد دکان بند کردی تھی کیونکہ خسارہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ دکان چلانا ممکن نہیں رہا تھا۔

نواز نے کچھ اس انداز میں کاروبار چلایا تھا کہ وہ بارہ

ایک بجے دکان کھولتا تھا اور اس کے فوراً بعد وہاں اس کے آوارہ دوستوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ جن کے لیے دکان کے خرچ پر چائے اور لنچ میں بریانی آ رہی ہوتی تھی۔ سامان کرائے پر جاتا تو اس کی واپسی کی پروا نہیں ہوتی تھی کوئی چیز گم جاتی تو اس کی تلاش کی زحمت نہیں کی جاتی تھی۔ چیزیں ٹوٹ پھوٹ جاتیں تو ان کی مرمت نہیں کرائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دکان ڈیکوریشن کی بجائے کباڑ کی بنتی چلی گئی۔ آمدنی اتنی کم ہوئی کہ کرایہ اور بل ادا کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ چائے اور بریانی بند ہوئی تو نواز کے آوارہ دوست بھی غائب ہو گئے۔ اس وقت اس نے کوشش کی کہ اپنا کام پھر سے جمائے اس نے ابا سے رقم مانگی مگر ابا پہلے ہی سب اسے دے چکے تھے اور اب خالی ہاتھ تھے۔ پھر بھی انہوں نے کہیں سے دس ہزار کر کے اسے دے دیے اور یہ بھی دکان کے ساتھ ڈوب گئے۔ ایک سال سے بھی پہلے دکان بند ہو گئی اور وہ گھر آن بیٹھا تھا۔

دوسری طرف میں نے دکان میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ میٹرک کیا اور بہت اچھے نمبروں سے کیا اب میرا ارادہ آگے پڑھنے کا تھا مگر اس موقع پر نواز نے ہمیشہ کی طرح ٹانگ اڑائی اور اماں ابا سے کہا۔ ''یہ آگے پڑھ کر کیا کرے گا اسے دکان پر لگائے رکھو۔ اب ابا کی آرام کرنے کی عمر ہے۔ یہ جوان ہو گیا ہے پوری دکان سنبھال سکتا ہے۔ کام بھی سیکھ ہی گیا ہے اتنے سالوں میں۔''

میرا خیال تھا کہ اس وقت تو اماں ابا اسے آئینہ دکھائیں گے کہ اس نے کالج میں دو بار پڑھ کر کیا کیا تھا؟ جہاں تک دکان کی بات تھی تو اسے ابا کے بڑھاپے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ سب سے بڑھ کر اسے ابا نے دکان کھلوا کر دی تو اس نے کیا تیر مارا تھا؟ مگر انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کی بجائے ابا نے کہا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ شاہنواز دکان اچھی طرح چلا رہا ہے۔''

مزے کی بات تھی کہ یہ ساری گفتگو میرے سامنے ہو رہی تھی۔ اماں ابا اور نواز میرے بارے میں کوئی بھی بات کرتے ہوئے اس کا قطعی خیال نہیں کرتے تھے کہ میں سامنے موجود ہوں۔ ان کے خیال میں ان کے تبصرے میرے دل پر اثر نہیں کرتے تھے یا انہیں ہر طرح کی بات کہنے کا حق حاصل تھا۔ میرے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے سب کی رائے لی جاتی تھی سوائے میرے۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''تم پڑھنا چاہتے ہو۔'' نواز نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''کیا کر لو گے پڑھ کے تھرڈ ڈویژن میں بی اے کر لو گے اور بہت تیر مارا تو کہیں کلرک لگ جاؤ گے۔ کیا ملے گا دو ڈھائی ہزار روپے۔ اس سے زیادہ تو ابا دکان کے ملازموں کو دے رہا ہے۔''

نواز ٹھیک کہہ رہا تھا اس سے زیادہ دکان کا ایک ملازم لے رہا تھا مگر میں جو نام نہاد مالک تھا اور ایک ایک پیسے کا حساب رکھتا تھا مجھے آج تک ابا نے سو روپے بھی ساتھ نہیں دیئے تھے۔ مجھے بس ضرورت بھر مل جاتا تھا اور میری ضرورت بھی محدود ہوتی تھی۔ آج بھی مجھے نواز کی اترن ملتی تھی۔ وہ جو کپڑے، جوتے اور چیزیں چھوڑ دیتا تھا وہ میرے نام ہو جاتی تھیں۔ خاص میرے لیے کوئی چیز کم ہی آتی تھی۔ میں نے نواز کی مخالفت پر رحم طلب نظروں سے اماں ابا کی طرف دیکھا۔ مگر اماں نے نواز کی تائید کی۔ ''ٹھیک تو کہہ رہا ہے کیا کرے گا پڑھ کر۔''

نواز نے رو پیٹ کر میٹرک میں سی گریڈ لیا تھا اور وہ بھی نقل کر کے میں نے اپنی محنت سے پڑھا تھا اور اے گریڈ لیا تھا۔ میری سیونٹی ٹو پرسینٹیج آئی تھی۔ اماں ابا میرے رزلٹ سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے بہت اعلیٰ درجے کے کالجوں میں تو نہیں مگر کسی اچھے کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ دکان پر کام کرنے کی وجہ سے مجھے از خود حساب کتاب سے رغبت ہو گئی تھی اور میں آگے کامرس پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے یہی چیز ابا کے سامنے رکھ دی۔ ''اگر میں نے آگے پڑھا تو دکان کے کام آئے گا۔''

''تو اب کون سی مشکل ہے۔'' نواز نے پھر ٹانگ اڑائی۔ ''ٹھیک سے تو حساب اب بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لیے آگے پڑھنا ضروری نہیں ہے۔''

''پڑھنا تو اچھی بات ہے آدمی کے کام آتا ہے۔'' میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''میں اسی طرح دکان پر بھی کام کرتا رہوں گا۔''

اماں ابا کا دل ذرا نرم ہوا تو نواز نے پھر وار کیا۔ ''اچھا اگر پڑھنا ہے تو پرائیویٹ پڑھ لے۔ کالج جائے گا تو ابا کو زیادہ کام کرنا پڑے گا۔''

''اس میں بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''نواز ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' ابا نے فیصلہ کر دیا انہیں نہ

خیال اچھا لگا کہ میں صبح سے شام تک دکان سنبھال سکتا تھا۔ ''اب مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا ہے۔''

اس وقت نواز ڈیکوریشن کی دکان ڈبو رہا تھا اور اس کے پاس جینوین بہانہ تھا کہ وہ ابا کی دکان پر نہیں بیٹھ سکتا ہے۔ یوں میں کالج جانے کی بجائے پرائیویٹ پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اب میں صبح دکان جاتا اور ابا صرف دوپہر اور رات کے وقت دو بار دو ڈھائی گھنٹے کے لیے آجاتے تھے جب رش بڑھ جاتا تھا۔ اب سیل کے ساتھ دکان کے لیے سامان کی خریداری بھی میں کرنے لگا تھا۔ ابا سیلز مین سے سامان لیتے تھے میں نے یہ کیا کہ کوشش کر کے ڈسٹری بیوٹر سے رابطہ کرلیا اور ہمارے علاقے میں جس جس کی گاڑیاں آتی تھیں میں ان سے براہِ راست سامان لینے لگا۔ اس میں زیادہ بچت ہوتی تھی۔ بہت سی چیزیں جو غیر ملکوں سے آتی تھیں ان کو میں خود مارکیٹ سے اٹھانے لگا۔ میری کوششوں سے دکان کے نفع میں اضافہ ہوا تھا مگر اس کا فائدہ بھی نواز کو ہوا تھا۔ ابا نہ صرف اس کی دکان کے بل بلکہ اس کی جیب بھی بھر رہے تھے۔ آئے دن وہ ابا سے رقم لینے آجاتا اور کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاتا تھا۔

چند مہینے میں وہ دکان لٹا کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ صرف کھا رہا تھا۔ پہلے اماں ابا سے لیتا تھا تو اب جب اسے رقم کی ضرورت ہوتی براہِ راست دکان آکر گلے سے رقم نکال لیتا تھا۔ مگر بہت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس وقت آتا جب ابا نہیں ہوتے تھے۔ بعد میں جب میں ابا کو حساب دیتا اور بتاتا کہ نواز رقم لے گیا ہے تو ابا کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ مگر وہ نواز کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ ایک دو بار جب میں نے ابا کو بتایا کہ آج نواز اتنی رقم لے گیا ہے تو ابا کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا ہے۔ میں دل میں کڑھ کر رہ گیا تھا۔ ابا کے سامنے میرا کردار بھی تھا اور نواز کا بھی۔ ماں باپ سے زیادہ کون اپنی اولاد کو جانتا ہے۔ اس کے باوجود ابا میرے ساتھ ایسا رویہ رکھ رہے تھے۔ دل برداشتہ ہو کر میں نے سوچا کہ دکان چھوڑ دوں۔ مگر میری ازلی فطرت آڑے آئی جو مجھے کوئی آزادانہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میں نے انٹر کامرس میں پرائیویٹ داخلہ لیا تھا۔ پہلے تو میں اپنے طور پر پڑھتا رہا پھر امتحان سے تین مہینے پہلے میں نے محلے کے ایک لڑکے جاوید سے ٹیوشن کی بات کی۔ وہ بہت اچھا طالب علم تھا اور اس نے دو سال پہلے ہی انٹر کا امتحان پاس کیا تھا۔ مگر وہ فیس اچھی خاصی مانگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے سب کے سامنے بات کی تو نواز لازمی ٹانگ اڑائے گا اس لیے میں نے چپکے سے ابا سے بات کی کہ میں ٹیوشن پڑھنا چاہتا ہوں تو ابا نے آگے سے جواب دیا۔

''تو جو کماتا ہے اس سے فیس دے دے۔''

میں حیران ہوا۔ ''میں کہاں کماتا ہوں ابا؟''

''دکان میں بیٹھتا ہے وہاں سے جو لیتا ہے۔''

مجھے ایک بار پھر شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ''ابا خدا گواہ ہے میں نے دکان کے گلے سے آج تک تمہیں بتائے بغیر ایک روپیا بھی نہیں نکالا ہے۔''

مگر ابا کو میری قسم کا بھی یقین نہیں آیا تھا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تو کچھ لیتا ہی نہیں ہے۔''

میں نے ابا کو اس بات کا عملی جواب دیا اور اگلے دن مارکیٹ میں حاجی صاحب کی اجناس کی ہول سیل کی دکان پر ملازمت کے لیے پہنچ گیا۔ مجھے علم تھا کہ انہیں حساب کتاب کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ جب میں نے ملازمت کا کہا تو وہ حیران ہوئے۔ ''شاہنواز بیٹا تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری تو اپنی دکان ہے۔''

میں نے بہانہ کیا۔ ''حاجی صاحب میں یہاں کام کر کے حساب کتاب سیکھنا چاہتا ہوں۔ ابا سے اجازت لے کر آیا ہوں۔''

حاجی صاحب کو میری بات کا یقین آیا یا نہیں آیا مگر انہوں نے مجھے ملازمت دے دی۔ میں نے جاتے ہوئے ابا سے کہہ دیا تھا کہ آج وہ دکان دیکھ لیں مجھے کچھ کام ہے۔ ابا سمجھے کہ مجھے دکان کے حوالے سے کام ہے۔ مگر جب شام کو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے ملازمت کرلی ہے تو انہیں یقین نہیں آیا۔ ''تو نے ملازمت کرلی ہے مجھے بتائے بغیر، مجھ سے پوچھے بغیر۔''

''ابا جب تمہیں مجھ پر یقین ہی نہیں ہے تو دکان میں کام کرنے کا فائدہ۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''اب تم دیکھ لینا میں کتنی رقم نکالتا تھا۔ دکان کا حساب خود تمہیں بتا دے گا۔''

''مارکیٹ میں جو میری بے عزتی ہوگی۔'' ابا کو غصہ آگیا۔

میں ڈر گیا مگر ہمت کر کے کہا۔ ''ابا تم نے مجبور کیا
ہے۔ تمہارے خیال میں' میں گلے میں ہاتھ مارتا ہوں اور
اپنی ٹیوشن کی فیس خود دے سکتا ہوں مگر ایسا نہیں ہے اور مجھے
فیس دینی ہے اس کے لیے رقم چاہیے۔ اس لیے میں نے
نوکری کرلی۔''

ابا کو اب بھی دکان کی فکر تھی۔ ''دکان کون دیکھے گا؟''

''نواز ہے نا۔'' میں نے یاد دلایا۔ ''وہ گھر بیٹھا ہے۔''

ابا نے اب نواز کو دکان لے جانا شروع کر دیا اور وہ
بلبلا اٹھا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے چار مہینے
حاجی صاحب کی دکان پر کام کیا۔ ٹیوشن پڑھ کر میں نے
پیپرز دیئے اور پھر حاجی صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔
کیونکہ ابا کو اب میری ضرورت تھی۔ نواز چند دن تو ٹھیک
سے جاتا رہا پھر اس نے ناغے شروع کر دیئے۔ کئی بار ایسا
ہوا کہ دکان کا بول کر گیا اور وہاں پہنچا نہیں۔ دکان ملازموں
پر چلتی رہی اور جب ابا گیا تو پتا چلا کہ نواز وہاں پہنچا ہی نہیں
ہے۔ یا اگر جاتا تو کچھ دیر بعد کسی بہانے سے غائب ہو
جاتا۔ آخر میں تو یہ ہوا کہ ابا خود جانے لگا تھا اور پہلے کی طرح
صبح سے شام تک دکان دیکھتا تھا۔ ایک تو عمر کا تقاضہ اور پھر
ابا کو عادت بھی نہیں رہی تھی۔ جب میں دکان دیکھتا تو ابا دو
بار میں کل چار پانچ گھنٹے آتا تھا اور اب ابا کو پھر سے بارہ
سے چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی حالت خراب ہونے
لگی تھی۔ میں دیکھتا تو مجھے رحم آتا مگر ابا نے مجھ سے ایک بار
بھی نہیں کہا کہ میں واپس آجاؤں اور میں خود سے آجاتا تو
مجھے پھر فیس کا مسئلہ ہو جاتا۔ اس لیے دل پر جبر کر کے میں
حاجی صاحب کے پاس کام کرتا رہا۔ پیپرز کے دنوں میں
کام چھوڑ دیا اور جس دن آخری پیپر دے کر آیا۔ سیدھا
دکان پہنچ گیا۔ ابا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''آج باپ کا
خیال آگیا۔''

''جی ابا۔'' میں نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر سے اسی
تنخواہ پر کام شروع کر دیا جس پر آج تک کرتا آیا تھا۔ ابا کو
پھر بھی خیال نہیں آیا تھا۔ ہاں اتنا ہوا کہ جب سیکنڈ ایئر کے
پیپرز کا وقت آیا تو ابا نے خود سے مجھے ٹیوشن کا کہہ دیا اور
دکان کے وقت میں بھی کمی کر دی تھی۔ نواز ان دنوں ایک
ڈبو کلب میں کام کر رہا تھا۔ اسے خود بھی ڈبو کا شوق تھا۔ مگر
وہاں سے جو ملتا تھا اس کا ایک روپیا بھی وہ گھر میں نہیں دیتا
تھا بلکہ الٹا اب تک ابا اماں سے پیسے لے جاتا تھا۔ مجھے اس
سے زیادہ اماں ابا پر غصہ آتا تھا جو اب تک اس کے ہاتھوں
بے وقوف بن رہے تھے۔ اسے ایک لفظ نہیں کہتے تھے بلکہ
اس کی غلطیوں اور مکاریوں کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ دیکھا
جائے تو اسے خراب کرنے میں ان دونوں کا ہاتھ تھا۔ نواز کی
محبت میں وہ اسے ڈبو رہے تھے۔

انہی دنوں اس نے نیا شوشہ چھوڑا کہ اس کی شادی کر
دی جائے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ ابا اس کی بات ماننے کو تیار
نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''تو کوئی ٹھیک سے کام کرے
تو تیری شادی بھی کریں۔''

''ابا کر تو رہا ہوں۔''

''اس سے تجھے کیا ملتا ہے۔ دو ہزار روپے اس میں تو
تیرا اپنا خرچ پورا نہیں ہوتا ہے، بیوی کا کہاں سے پورا
کرے گا؟''

''عورت اپنے نصیب کا خود لاتی ہے۔'' نواز نے
ڈھٹائی سے کہا۔

ابا کے برعکس اماں نے سنا تو نہال ہو گئی اور ابا کے سر
ہو گئی کہ نواز کی شادی کر دی جائے۔ دو طرف سے دباؤ پڑا تو
ابا مان گئے اور اماں نے لڑکی تلاش کرنی شروع کر دی۔ نواز
جہاں دوسرے معاملات میں خوش نصیب تھا۔ وہیں قدرت
نے اسے خوش روئی سے بھی نوازہ تھا۔ سرخ و سفید رنگت اور
مناسب جسامت کے ساتھ خوبرو نقوش تھے۔ اسے خود
لڑکیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی ورنہ اس میں دلچسپی
لینے والیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں میری رنگت
دبی ہوئی تھی اور مناسب نقوش تھے۔ پھر وہ خود کو سجا سنوار کر
بھی رکھتا تھا۔ مہینے میں دو بار کسی اچھے سیلون میں جاتا تھا
جہاں ہیئر کٹ سے لے کر مردانہ فیشل اور دوسرے کام بھی
ہوتے تھے۔ میں نے سادہ کریو کٹ ہیئر اسٹائل رکھا ہوا تھا
اور فیشل جیسی چیز کا تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا
تھا۔ جب شیو کا آغاز ہوا تو میں ہلکی شیو رکھنے لگا تھا۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس نے ہوشیاری سے کام لیتے
ہوئے اپنی سرگرمیاں محلے اور علاقے سے باہر رکھی
تھیں۔ محلے میں اس نے اپنا تاثر ایک شریف لڑکے کا سا
رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی جب اماں نے کوشش شروع کی تو اس
کے لیے کئی اچھے رشتے آگئے۔ میں نے بتایا کہ محلے میں
ہمارا گھرانا کھاتا پیتا شمار ہوتا تھا۔ ہمارا کارنر کا بڑا مکان تھا
اور ابا نے تھوڑا تھوڑا کر کے اوپر والی منزل بنوا لی تھی اور
اسے کرائے پر دیا تھا۔ ابا کا ارادہ تھا کہ نواز کی شادی کے
بعد اسے اوپر والا حصہ دے دیں گے۔ اگرچہ اماں اسے

ساتھ رکھنے کے حق میں تھیں۔ نیچے تین بیڈ رومز تھے جو ہمارے لیے کافی تھے مگر ابا کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد بیٹوں کو الگ کر دینا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ خود الگ ہو جائیں۔ اماں کو گھر سجانے کا شوق تھا اس لیے ہمارے ہاں اچھا فرنیچر اور دوسرا سامان بہترین قسم کا تھا۔ کھانا پینا بھی اچھا تھا اس لیے جب اماں نے رشتوں کی تلاش شروع کی تو محلے میں ہی کئی گھر رشتہ دینے کو تیار ہو گئے۔

ان دنوں میرے بی کام پارٹ ون کے پیپرز ہونے والے تھے۔ میں نے اس بار بھی ٹیوشن کے لیے جاوید سے بات کی تھی۔ ایک تو وہ بہت اچھا پڑھاتا تھا دوسرے وہ یوں تیاری کراتا کہ جو چیز امتحان میں آنی ہوتی تھی وہ مجھے اچھی طرح سکھا پڑھا دیتا۔ میں پڑھنے کے لیے اسی کے گھر جاتا تھا۔ جاوید کی ایک بہن سیما تھی۔ وہ جاوید سے ایک سال بڑی تھی۔ جاوید میرا ہم عمر تھا اس لیے وہ مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ مگر شکل صورت اور اپنے چھریرے جسم کی وجہ سے اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ گوری چٹی اور خوش شکل لڑکی تھی۔ خاص طور سے اس کی ہلکی براؤن آنکھیں دیکھنے والی تھیں۔ صورت اور تاثرات سے تیز مزاج لگتی تھی۔ مگر مجھے اس کی یہ بات بھی اچھی لگتی تھی۔ گھر میں وہ کئی بار میرے سامنے آئی اور ہر بار اسے دیکھنا مجھے اچھا لگا تھا۔ مگر میں نے یہ بات ظاہر ہونے نہیں دی کہ اسے دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے اور جاوید کے لیے چائے بنا لاتی تھی۔ جب گھر میں نواز کی شادی کی بات چل رہی تھی تب مجھے خیال آیا کہ اس کے بعد میری باری ہوگی اور اگر اماں نے مجھ سے پوچھا تو میں سیما کا نام لوں گا۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا کہ مجھ سے پوچھا جاتا لیکن اماں نے کیونکہ نواز سے پوچھا تھا اس لیے مجھے اُمید تھی کہ مجھ سے بھی پوچھا جائے گا۔ سیما مجھ سے ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی مگر یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

مگر چند دن بعد جب اماں نے مسرور لہجے میں ابا کو بتایا کہ انہوں نے نواز کے لیے ہماجی کی بیٹی سیما کو چن لیا ہے تو مجھ پر بجلی سی گری تھی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اماں نواز کے لیے سیما کا انتخاب بھی کر سکتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیما کا گھرانا بہت پڑھا لکھا تھا۔ اس کے والد جنید انکل سول انجینئر تھے اور انہوں نے اپنے سارے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ سیما بی اے کر رہی تھی اور جاوید نے بی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ ان کا ایک بڑا بھائی انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ نواز اور سیما کا کوئی جوڑ ہو سکتا ہے۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ مگر اماں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی یقین دہانی حاصل کر چکی ہیں۔ دو دن بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ جب اماں ابا بات ڈالنے گئے اور واپسی میں خوش خوش آئے تھے کیونکہ سیما کے ماں باپ نے انہیں تقریباً ہاں کر دی تھی۔

میں دنگ تھا کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ نواز کچھ نہیں کرتا تھا۔ میٹرک پاس تھا اور وہ بھی نقل کر کے۔ ڈبو کی دکان پر معمولی سی جاب کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے ہمارا گھر اچھا تھا اور ابا کا اپنا جنرل اسٹور تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صرف یہی چیزیں دیکھ کر لڑکی دے دی جائے۔ لیکن سیما کے ماں باپ نے یہی کیا تھا۔ پھر یہ جان کر مجھے مزید صدمہ ہوا کہ سیما بھی خوش تھی۔ شاید اس لیے کہ نواز خوب صورت تھا۔ کوئی بھی لڑکی اسے ناپسند نہیں کر سکتی تھی۔ شاید سیما نے اس میں بس یہی دیکھا تھا۔ اس کی خوشی کا اندازہ مجھے یوں بھی ہوا کہ جب میں جاوید سے پڑھنے گیا تو وہ خاص اہتمام سے تیار ہوئی اور اس نے میرے لیے بھی اہتمام کیا تھا۔ کیونکہ اب میں اس کا ہونے والا دیور تھا۔ ایک موقع پر جاوید اٹھ کر کہیں گیا تو وہ جلدی سے آئی اور مجھ سے نواز کے بارے میں پوچھنے لگی کہ اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ سچی بات ہے میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ نواز کو کیا پسند ہے۔ اس لیے میں نے چند الٹے سیدھے جواب دے کر جان چھڑالی۔ میرا دل اتنا خراب ہوا تھا کہ میں نے ٹیوشن بھی چھوڑ دی۔ اگرچہ کچھ تیاری باقی تھی مگر میرا دل نہیں چاہا کہ اب میں سیما کے گھر جاؤں۔

اماں ابا اور ان کے ساتھ سیما کے گھر والوں کو بھی اس شادی پر جلدی تھی۔ اس لیے جھٹ رشتہ اور پٹ شادی ٹھہر گئی اور چند مہینے بعد سیما رخصت ہو کر ہمارے گھر آ گئی۔ ابا نے اپنے کہے کے مطابق پہلے ہی مکان کا اوپری حصہ نواز کے لیے خالی کرا لیا تھا اور اسے ری نیو بھی کیا گیا تھا۔ سیما کے گھر والے بھی کھاتے پیتے تھے اس لیے انہوں نے ڈھیروں جہیز دیا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز تھی اس لیے سیما کو نیچے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اور نواز الگ رہیں۔ شادی کے دوسرے دن اس نے نیچے آنا چھوڑ دیا تھا اور اگر آتی بھی تو بس ہوا کے جھونکے کی طرح۔ یعنی کہیں جاتے ہوئے یا کہیں سے

آتے ہوئے۔ اماں ابا اس کی روش پر حیران تھے اور انہوں نے ایک دو بار نواز سے کہا بھی تو اس نے آگے سے ترش جواب دیا۔

"کیا اپنے لیے شادی کر کے لائے ہو جو تمہارے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہے؟"

"جب تو نہیں ہوتا تب تو نیچے آسکتی ہے۔"

"کیا تم نے اوپر نوکر لگا کر دیئے ہیں۔" نواز نے مزید بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ "بے چاری اپنے گھر میں پانی بھی نہیں پیتی تھی اور یہاں اسے سارا کام کرنا پڑتا ہے۔"

ابا نے اماں سے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا کہ اسے الگ کیوں کیا تھا؟"

مگر ابا نے اسے الگ کہاں کیا تھا۔ اب اس کے ساتھ اس کی بیوی کا بوجھ بھی ابا پر آ گیا تھا۔ گھر کا سارا راشن اور سامان اسٹور سے جاتا تھا۔ جب انہیں ضرورت ہوتی نواز آتا اور یوں اٹھا کر لے جاتا جیسے سامان ہمیں فری میں ملا ہو۔ ابا اسے ایک لفظ نہیں کہتے تھے اور دوسری طرف میرے ساتھ وہی رویہ تھا۔ مجھے مہینے میں ڈھائی تین ہزار مل جاتے تھے۔ جب کہ ملازمین اب پانچ ہزار لے رہے تھے۔ دس بارہ ہزار نواز لے جاتا تھا۔ صبح سے رات تک دکان پر میں ہوتا اور وہ آکر جھانکتا بھی نہیں تھا۔ اس کا اور ابا کا رویہ دیکھ کر میں سوائے جلنے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی میرا بی کام مکمل ہوگا میں نوکری کی تلاش شروع کر دوں گا۔ مارکیٹ میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ حاجی صاحب ہی مجھے رکھ لیتے۔ مگر اب میں کوئی باقاعدہ نوکری کرنا چاہتا تھا۔ مگر جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہو نہیں سکا تھا۔

میں فائنل کی تیاری کر رہا تھا کہ ابا کی طبیعت خراب ہوئی۔ بخار ہوا اور انہوں نے شروع میں توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں اسپتال لے گئے وہاں پتا چلا کہ ڈینگی بخار ہے اور بگڑ چکا ہے۔ ابا دو دن اسپتال میں پھر دنیا سے گزر گئے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ ہم سب ششدر رہ گئے تھے۔ ہم سے مراد میں اور اماں ہیں۔ نواز کا موقع پرست ذہن اس موقع پر بھی کام کر رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے مکان کی فائل ابا کی الماری سے نکال لی۔ صرف مکان کی فائل ہی نہیں بلکہ ابا کی چیک بک اور الماری میں موجود نقدی بھی پار کر لی جب کہ ابا کی میت گھر میں پڑی تھی۔ پھر اس نے دکان کا گلہ صاف کرایا کہ ابا کی آخری رسومات ادا کرنی ہیں۔ ابا میرے لیے کیسے ہی سہی، تھے تو باپ اس لیے میرا دکھ کم نہیں ہوا تھا۔ سوم والے دن مجھے خیال آیا کہ آج میرا پہلا پیپر تھا۔ میرا دل نہیں چاہا کہ میں پیپر دوں اور شاید میں دے بھی نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے اس سال پیپرز نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اماں بالکل گم صم ہو گئی تھیں۔ میں ان کی دل جوئی کرتا رہتا۔ ان کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے سوم کے بعد دکان کھولی تب مجھے پتا چلا کہ وہاں سے خاصا سامان بھی کم ہے۔ اجناس کے علاوہ بھی خاصی چیزیں غائب تھیں۔ میں نے نواز سے پوچھا کیونکہ چابیاں اسی کے پاس تھیں تو اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کیا ابا کا سوم نہیں کرنا تھا۔"

"تو اپنے پاس سے خرچ کرتے دکان سے کیوں لیا۔"

"اپنے پاس ہے ہی کیا جو خرچ کرتا۔" اس نے کہا۔

"ابا کے سوم میں صابن اور ڈٹرجنٹ کا کیا کام؟" میں نے پوچھا مگر مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کی بجائے نواز مجھ پر غرّانے لگا تھا۔ ہمارے پاس بھی کچھ نہیں تھا میں نے اماں سے نقدی کا پوچھا تو اماں نے بس اتنا کہا۔

"دو دن پہلے تیرے ابا نے الماری میں پچیس ہزار روپے رکھے تھے۔"

مگر الماری سے ایک روپیا بھی نہیں نکلا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ نواز کا کام ہے۔ اسے کہنا بیکار تھا وہ الٹا مجھ پر الزام لگا دیتا۔ دکان میں بھی کیش نہیں تھا اور کچھ پارٹیوں کو رقم دینا تھی۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ ابا اس مقصد کے لیے چیک سائن کر کے رکھتے تھے۔ میں نے اماں سے چیک بک کا پوچھا۔ تب پتا چلا کہ الماری میں چیک بک بھی نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے نواز سے پوچھنا پڑا اور وہ پھر ڈھٹائی سے مکر گیا۔ "مجھے کیا معلوم...... ہو سکتا ہے میت میں آنے والے کسی فرد نے ہاتھ دکھا دیا ہو۔"

الماری کی تلاشی کے دوران میں مجھے مکان کی فائل کی گم شدگی کا بھی پتا چل گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "لیکن گھر میں آنے والے کو مکان کی فائل سے تو دل چسپی نہیں ہو سکتی ہے۔"

"وہ میرے پاس ہے۔" نواز نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ابا نے میرے پاس رکھوائی تھی۔"

"کچھ پارٹیوں کو ادائیگی کرنی ہے، اب بینک جانا ہو

گا۔“

بینک والے مجھے جانتے تھے کیونکہ اکثر میں رقم جمع کرانے بھی جاتا تھا۔ میں مینیجر سے ملا اور اسے ابا کے انتقال کا بتا کر ان کے اکاؤنٹ کے بارے میں پوچھا۔ مینیجر نے اکاؤنٹنٹ سے ابا کے اکاؤنٹ کا معلوم کرایا تو اس نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اکاؤنٹ میں موجود تقریباً پونے دو لاکھ روپے دو چیکوں کی مدد سے ایک دن کے وقفے سے نکلوالیے گئے ہیں۔ میں دنگ رہ گیا۔ میں نے مینیجر کو بتایا کہ ابا کی چیک بک میت والے گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ مینیجر نے دونوں چیک منگوالیے۔ ان پر سو فیصد ابا کے سائن تھے۔ یہ ان ہی چیکوں میں سے تھے جو ابا سائن کر کے رکھتے تھے کہ کوئی ناگہانی ہو جائے تو ہم رقم نکلوا سکیں۔ مگر یہ کام کوئی اور کر گیا تھا اور مجھے اس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ نواز ہی تھا۔ ابھی ابا کے انتقال کو دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس نے اپنی پرانی بائیک بیچ کر نئی زیرو میٹر بائیک لے لی تھی۔ دونوں میاں بیوی بن ٹھن کر شام کو نکل جاتے تھے۔ ان کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی سوگ ہوا ہے۔

میں نے اماں کو بتایا مگر وہ حسبِ معمول چپ رہیں۔ وہ پہلے ہی نواز کو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ میں ابا کے بعد ان صدموں سے دوچار تھا مگر پھر بھی دکان سنبھالنے میں لگ گیا۔ کیونکہ دکان چلانی تھی اور پیٹ بھی بھرنا تھا۔ ایک مہینے بعد میں نے نواز سے کہا۔ ”تم دکان پر کیوں نہیں آتے؟“

”یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”پہلے ابا تھے۔ اب صرف میں ہوں دکان چلانا اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ میں اکیلے دکان نہیں چلا سکوں گا دوسرے اسے میں ابا کی طرح رقم نہیں دوں گا۔ بلکہ دکان کی آمدنی آدھی ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ مان گیا اور مجھے پہلے مہینے ہی پتا چل گیا کہ اس کے آنے سے دکان چل نہیں سکتی تھی صرف لٹ سکتی تھی۔ سامان تو جاتا ہی تھا اب اس نے گلے پر بھی یوں ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا جیسے ڈاکو بینک لوٹتے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے بس اتنی رقم ملی کہ میں اماں کے ہاتھ پر گھر چلانے جتنی رقم رکھ سکا تھا۔ میں نے دوسرے مہینے ہاتھ جوڑ کر نواز سے کہا۔ ”میں دکان چلالوں گا تم آرام کیا کرو۔ اگر دکان اسی طرح چلی تو ایک مہینے بعد ہم دونوں ہی گھر بیٹھے ہوں گے۔“

غالباً نواز بھی یہی چاہتا تھا۔ مگر اس نے واضح کر دیا کہ اسے ہر مہینے پچیس ہزار چاہییں۔ ورنہ وہ دکان بیچ دے گا۔ پچیس ہزار خاصی بڑی رقم تھی کیونکہ دکان مہینے میں پچاس ہزار سے زیادہ نہیں کماتی تھی۔ دکان کرائے کی تھی اور مالک ہر سال باقاعدہ کرایہ بڑھاتا تھا۔ بجلی کے ریٹ بھی خاصے بڑھ گئے تھے۔ سب کٹ کٹا کر مشکل سے مہینے کا پچیس ہزار بچتا تھا۔ میں نے نواز سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں آمدنی میں سے نصف دوں گا مگر اب تم دکان سے کچھ نہیں لو گے۔“

اس وقت تو نواز خاموش رہا مگر اب وہ یہ کرتا تھا کہ جب میں اسے پچیس ہزار دے دیتا تو وہ آنے بہانوں سے دکان سے سامان لے جاتا۔ ادائیگی کا کہتا مگر اس نے کبھی ایک روپیا بھی نہیں دیا اور جب مہینے کی رقم لینے کا وقت آتا تو آنکھیں ماتھے پر رکھ کر آجاتا۔ میں بدمزگی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا۔ وہ اس چیز کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ میں صبح سے رات تک دکان پر ہوتا تھا۔ اماں بے چاری گھر پر اکیلی ہوتی مگر سیما یا نواز کو توفیق نہیں ہوتی تھی کہ کچھ دیر ان کے پاس آ کر بیٹھ جائیں۔ ابا کا صدمہ، اکیلا پن اور پھر دل کی بیماری اماں کو اندر ہی اندر کھا گیا تھا۔ اچانک انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ نیچے اکیلی تھیں۔ جب میں رات کے وقت گھر آیا تو اماں دنیا سے گزر چکی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اماں کا مردہ جسم اسپتال بھی لے گیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا ہاں یہ معلوم ہوا کہ اگر اماں کو بروقت طبی امداد مل جاتی تو وہ بچ سکتی تھیں مگر ان کا وقت آ گیا تھا میں کسی کو کیا کہتا۔ بس رو دھو کر رہ گیا۔

اماں کے بعد کچھ عرصے تو نواز اور سیما مجھ پر مہربان رہے۔ میں بھی خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ انہیں میرا خیال آ گیا ہے۔ مگر یہ دھوکا تھا اور ان کا مقصد مکان کا نچلا پورشن خالی کرانا تھا۔ پہلے انہوں نے اصرار کر کے مجھے اوپر منتقل کرایا کہ نیچے میں اکیلا رہتا ہوں۔ حالانکہ میں صبح نو بجے جاتا اور رات گیارہ بجے واپس آتا تھا۔ تینوں وقت کا کھانا میں باہر کھاتا تھا اور رات کو جب بستر پر لیٹتا تو منٹ میں سو جاتا تھا مجھے تو تنہائی محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ البتہ نواز اور سیما نے میری تنہائی محسوس کر لی تھی۔ جیسے نیچے تین بیڈ روم تھے اسی طرح اوپر بھی تین بیڈ روم تھے۔ جب میں اوپر آ گیا تو نواز نے اپنے اصل منصوبے پر عمل شروع کیا۔ اس نے نیچے کلر کرانے کے بہانے سارا پرانا سامان فروخت کر

دیا اور کچھ سامان اوپر لے آیا۔ پھر اس نے خاموشی سے نیچے کا پورشن کرائے پر دے دیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میری تنہائی دور کرنے کے پیچھے اصل مقصد کیا تھا؟

جیسے ہی ان کا مقصد پورا ہوا۔ ان کا رویہ بدل گیا۔ اب خیال کی جگہ بددلی آ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی سیما کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ کھانا پانی اس نے پہلے بھی نہیں پوچھا تھا۔ مجھے اپنے لیے چائے بھی خود بنانی پڑتی تھی۔ مگر اب میں چائے بھی بناتا تو وہ برا مناتی تھی۔ اس کی وجہ سے میں نے کچن میں جانا چھوڑ دیا۔ رات کو آتا اور اپنے کمرے میں گھس کر سو جاتا اور وہاں سے پھر صبح نکلتا اور سیدھا سیڑھیاں اتر کر باہر چلا جاتا تھا۔ صرف جمعے کے دن دوپہر تک گھر میں رہتا تھا کیونکہ مارکیٹ اور میری دکان بھی جمعے کے بعد کھلتی تھی۔ مگر جمعے کے دن بھی میں کمرے میں رہتا تھا۔ نواز اور سیما کا رویہ دیکھتے ہوئے میں نے بلاوجہ کمرے سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ میرے خلاف کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ ایک دن نواز اچانک دکان پر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بندوبست کر لو۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

جب نواز نے مکان کا نچلا حصہ کرائے پر دیا تو اس نے نہ تو مجھ سے پوچھا اور نہ ہی کبھی کرائے میں سے کچھ دیا۔ وہ سب اس کی جیب میں جاتا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ہم بٹوارہ کر لیں۔''

''وہ کیسے؟''

''میں مکان لے لیتا ہوں اور تم دکان لے لو۔''

مکان کی مالیت اس وقت بھی کوئی تیس لاکھ روپے تھی جب کہ دکان بے شک مہینے کے ساٹھ ستر ہزار دے رہی تھی مگر اس کی مالیت گڈول سمیت دس لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے یہ بات کی تو وہ بولا۔ ''مکان تو ابا نے پہلے ہی مجھے دینے کی بات کی تھی اس لیے وہ میرا ہے۔ شکر کرو کہ میں دکان میں اپنا حصہ نہیں مانگ رہا ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں سوچ کر بتاؤں گا اور تم نے بندوبست کی بات کیوں کی؟''

''دیکھو تم جوان آدمی ہو۔ سیما کو تمہارے ساتھ رہتے ہوئے الجھن ہوتی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اب تم اپنی رہائش کا خود بندوبست کر لو۔''

یہی بات ہے کہ مجھے خود ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے الجھن ہوتی تھی۔ مگر سیما کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ ''میں نے بھی غیر ضروری اس کے سامنے آنے کی بھی کوشش نہیں کی پھر اسے کیا مسئلہ ہے۔ میں اپنے کمرے تک محدود رہتا ہوں۔''

''میں یہ سب نہیں جانتا۔'' نواز نے رکھائی سے کہا۔ ''بس تم جلد از جلد اپنا کہیں اور بندوبست کر لو۔''

میں نے بیٹھ کر سکون سے سوچا تو مجھے مناسب لگا کہ میں دکان لے لوں اور مکان نواز کے حوالے کر دوں۔ مکان لے کر میں کیا کرتا جب کہ دکان مجھے ساٹھ ستر ہزار مہینے کے دے رہی تھی میں چند سال میں اپنا گھر بنا لیتا اور مجھے روزگار کے چکر میں بھٹکنا بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے میں نے نواز سے کہا۔ ''مجھے منظور ہے لیکن ساری کارروائی پکی ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ تم بعد میں دکان پر بھی دعویٰ لے کر آ جاؤ۔''

نواز کو امید نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے مان جاؤں گا وہ بھی سمجھتا تھا کہ مکان دکان سے تین گنا زیادہ مالیت کا ہے اس لیے اس کی خوشی دیکھنے والی تھی اور وہ فوراً مان گیا۔ ہمارا مکان لیز تھا اور اسی طرح ابا نے جنرل اسٹور کے کاغذات بھی بنوائے تھے اور اس کی قانونی حیثیت تھی۔ نواز نے نہایت پھرتی دکھائی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں میں انکار نہ کر دوں اس صورت میں اسے مکان میں سے بھی مجھے نصف حصہ دینا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر دکان کا بٹوارہ ہوا تو میں ہی اسے لوں گا کیونکہ میں ہی اسے چلا سکتا ہوں۔ نواز میں اتنی اہلیت اور ہمت نہیں تھی کہ جنرل اسٹور چلا سکتا۔ مکان بک جاتا تو اسے اس قیمت میں اتنا بڑا مکان اور کہاں ملتا اور سب سے بڑھ کر اس کا گزارہ کیسے ہوتا۔ اس نے دو دن میں ایک وکیل سے کاغذات بنوا لیے اور ابتدائی کارروائی شروع کی۔ میں نے بھی ایک وکیل سے بات کی اور اس کی مدد سے کاغذات چیک کیے۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے مکان سے اور نواز نے دکان اور اس کے کاروبار سے دست برداری کے کاغذات پر سائن کر دیے۔

کارروائی ایک مہینے میں مکمل ہوئی تھی۔ مگر اصل بٹوارہ اس سے پہلے ہی ہو گیا۔ یعنی میں گھر سے نکل گیا تھا اور دکان کے نفع سے نواز کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ میں نے مارکیٹ کے پاس ہی ایک کمرا کرائے پر لے لیا اور وہاں رہنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ نواز نے عجلت میں یہ فیصلہ کر لیا تھا مگر اب وہ پچھتائے گا کیونکہ اسے کمانا نہیں صرف لٹانا آتا

تھا۔ اسے بیوی بھی ایسی ملی تھی۔ صرف مکان کے کرائے سے ان میاں بیوی کی عیاشی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کے بارے میں ان کے رویے کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ سیما دو بار اُمید سے ہوئی تھی مگر انہوں نے بات ختم کرادی تاکہ بچے کے جھنجٹ سے بچ کر زندگی کو پوری طرح انجوائے کر سکیں۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے اس قسم کی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ مجھے افسوس ہوا تھا مگر میں نواز سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ایک مہینے میں نواز اور سیما کے دماغ ٹھکانے آ گئے تھے۔ کہاں تو وہ مکان کے کرائے کے ساتھ مجھ سے بھی تیس بتیس ہزار لے رہے تھے اور کہاں اب ان کے پاس صرف کرائے کے بارہ ہزار آ رہے تھے۔ اس میں گزارہ کہاں ہو سکتا تھا۔ مکان کے لالچ میں انہوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی اور مجھے بلاوجہ کی غلامی سے آزاد کر دیا تھا۔ جب سے بٹوارہ ہوا تھا نہ تو میں نواز کے پاس گیا تھا اور نہ ہی وہ میرے پاس آیا تھا اس لیے جب اسے دکان پر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اسے ضرورت کھینچ لائی ہے ورنہ مجھ سے دل چسپی یا محبت اسے کبھی نہیں تھی۔ اتفاق سے اس وقت گاہک بھی نہیں تھا اور ملازموں کو میں نے سامان ترتیب سے رکھنے پر لگایا ہوا تھا۔ نواز نے کہا۔ ”تم سے بات کرنی ہے۔“

”کرو۔“

”وہ مجھے کچھ رقم ادھار چاہیے۔“

”جو تم واپس نہیں کرو گے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”شاہنواز یقین کرو......“

”خدا کے لیے تم بچپن سے مجھے بدھو سمجھتے اور بناتے آئے ہو اب تو میری جان چھوڑ دو۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو اس کے تیور بدل گئے۔

”اتنی آسانی سے نہیں، ٹھیک ہے دکان اب تمہاری ہے لیکن گیارہ سال سے تم دکان چلا رہے ہو۔ اس کا حساب دو۔“

”میں صرف ایک سال سے دکان چلا رہا ہوں۔ کہو تو اس کا حساب دوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے تمہیں ہی دینا پڑ جائے۔“

اس نے دوبارہ تیور بدلے اور عاجزی سے بولا۔

”شاہنواز اس وقت میں بہت مشکل میں ہوں سیما کی طبیعت خراب ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا سکوں۔“

سیما نے اگرچہ کبھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ جب میں اسے پسند کرتا تھا تب بھی وہ مجھ سے بے نیاز رہی۔ پھر اس سے رشتے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب وہ میرے بھائی کی بیوی تھی اس لیے میں نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر نواز نے اس کی طبیعت خرابی کا بتایا تو میرے اندر بے اختیار خیال آیا اور میرا دل چاہا کہ نواز کو کچھ رقم دے دوں۔ مگر ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے۔ اس خیال کے باوجود میں خود کو روک نہیں سکا تھا اور میں نے اسے دو ہزار دیئے۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو کم ہے......“

”تمہیں یہی مل رہا ہے اس پر خدا کا شکر کرو اور دوبارہ میرے پاس کچھ مانگنے مت آنا۔ وراثت میں تمہیں مجھ سے تین گنا زیادہ ملا ہے۔“

”اس مکان کو لے کر کھاؤں کیا؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے تم جلد ایسا ہی کرو گے۔“

نواز چلا گیا مگر اس کے چالاک ذہن نے محسوس کر لیا کہ وہ سیما کا نام لے کر مجھ سے رقم کھینچ سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ ہر دوسرے ہفتے چکر لگاتا اور کسی نہ کسی بہانے مجھ سے رقم لے جاتا۔ بہانے میں سیما لازمی شامل ہوتی تھی۔ پھر مجھ میں مروت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں اسے رقم دے دیتا تھا۔ ورنہ اب مجھے اس کی صورت دیکھتے ہی بیزاری ہوتی تھی۔ نواز نے کہیں جاب کر لی تھی۔ اس کے باوجود اس کے خرچے پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس کا اثر گھر پر پڑا اور اب اس کے اور سیما کے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے تھے اس کا پتا مجھے یوں چلا کہ ایک دن جاوید میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ”شاہنواز یار تم سے بات کرنی ہے۔“

میں اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا میں ملازموں سے دکان دیکھنے کا کہہ کر اسے نزدیکی ہوٹل لے آیا۔ ”ہاں کہو۔“

”یار نواز بھائی نے باجی کو بہت تنگ کیا ہوا ہے۔“

”تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا اب نواز اور اس کی بیوی سے نام نہاد

تعلق رہ گیا ہے۔''

''پھر بھی تم نواز بھائی کے بھائی ہو انہیں سمجھاؤ کہ معاملے کو اس حد تک خراب نہ کریں۔ سیما باجی دو دن سے گھر میں ہیں کیونکہ ان کے گھر فاقے ہو رہے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے لیکن تمہاری باجی نے مجھے اس گھر سے بے دخل کرایا کیونکہ میرے رہنے سے اسے الجھن ہوتی تھی۔ دوسرے نواز سمجھنے والا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے دنیا میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ سیما ہے اب اسے ہی اس سے شکایت ہوگئی ہے تو نواز کو پھر کون سمجھا سکتا ہے؟''

جاوید بھی یہ بات سمجھتا تھا۔ وہ مجبوراً میرے پاس آیا تھا اور اس نے بالآخر اصل بات اگل دی۔ ''مجھے سیما باجی نے بھیجا ہے وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟''

''تم اس کے دیور بھی ہو اگر وہ تم سے ملنا چاہتی ہے تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں رات دکان بند کرنے کے بعد ہی آسکوں گا۔'' میں نے کہا۔ ان دنوں بی کام فائنل کے پھر پیپرز ہو رہے تھے اور میں نے امتحانی فارم بھی جمع کرایا تھا مگر میں پیپرز نہیں دے رہا تھا کیونکہ میری تیاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ صبح سے رات تک میں دکان میں لگا رہتا تھا تو پیپر کی تیاری کہاں سے کرتا؟ میں عام طور سے رات گیارہ بجے تک دکان بند کرتا تھا مگر اس رات میں نے دس بجے ہی دکان بند کر دی تھی۔ ویسے بھی دس بجے کے بعد فروخت بہت کم ہو جاتی تھی۔ میں سیما کے ماں باپ کے گھر پہنچا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ جاوید نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا مگر جب سیما آئی تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے ماں باپ بھی نہیں آئے تھے۔ سیما نے اٹھ کر دروازہ بند کیا تو میں کسی قدر حیران ہوا تھا۔

''تم نے دروازہ کیوں بند کیا ہے؟''

''میں چاہتی ہوں یہاں ہونے والی گفتگو ہمارے درمیان رہے۔'' اس نے کہا اور دوپٹا جو پہلے اچھی طرح لیا ہوا تھا اب شانوں پر ڈال لیا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ باقاعدہ تیار ہوئی تھی اور اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ شادی کے دو سال بعد بھی وہ تقریباً پہلے جیسی ہی تھی۔ پھر نواز نے اسے بھی عیش و آرام سے رکھا تھا۔ بچہ نہیں تھا۔ وہ دیکھنے میں لڑکی جیسی لگ رہی تھی۔ وہ بڑے صوفے پر میرے پاس ہی آبیٹھی۔ سچی بات ہے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی اگرچہ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''تم گھر کیوں چھوڑ کر آئی ہو؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''اسی پر تو بات کرنے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔''

''تمہارا اور نواز کا جھگڑا ہوا ہے؟''

''بات اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔'' وہ بے چینی سے بولی۔ وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ پھر اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''نواز نے مجھے طلاق دے دی ہے۔''

میں دنگ رہ گیا تھا پھر میں نے بہ مشکل کہا۔ ''طلاق دے دی ہے مگر کیوں؟''

''بس وہ پاگل ہوگیا تھا۔'' اب سیما آنسو بہانے لگی۔ ''اس کے منہ سے نکل گیا اور پھر وہ پچھتایا۔''

''حالانکہ وہ پچھتانے والا شخص نہیں ہے۔''

''نہیں وہ بہت رویا تھا خودکشی کرنے جا رہا تھا میں نے بڑی مشکل سے روکا۔ اب میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اس لیے یہاں آگئی لیکن میں نے گھر والوں کو طلاق کا نہیں بتایا ہے بس یہی کہا ہے کہ میں نواز سے جھگڑا کر کے آئی ہوں۔''

مجھے اس کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا کہ نواز جیسا شخص جذباتی ہو کر اپنی زندگی ختم کرنے کی کر سکتا ہے۔ مگر سیما کے آنسو اور سسکیاں میرا دل پگھلا رہی تھیں۔ میں نے التجا کی۔ ''پلیز رومت۔''

''نواز نے تو خودکشی نہیں کی لیکن میں ضرور کرلوں گی۔ میں یوں ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔'' وہ جذباتی ہو کر بولی۔ ''دنیا والوں کو تو کیا اگر میرے گھر والوں کو بھی پتا چل جائے تو میں ایک لمحے کو اس دنیا میں نہ رہوں۔''

''تم ایسی کوئی حماقت نہیں کروگی۔'' میں نے دہل کر کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ طلاق یافتہ کہلانے سے بہتر ہے میں اس دنیا میں نہ رہوں۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ تم اس مسئلے کا کوئی حل نکالو۔''

''میں نکالوں۔'' میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''تمہیں تو میرے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے الجھن ہوتی......''

''خدا کے لیے میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ ہم نے تمہارے ساتھ جو کیا خدا نے شاید اسی کی سزا دی

ہے۔''اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔''خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔''

''پلیز ایسا مت کرو۔'' میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھام لیے۔''تم میری بھابی ہو۔اس لحاظ سے میرے لیے محترم ہو۔تم فکرمت کرو میں کسی مفتی یا عالم سے پوچھتا ہوں کہ اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا ہے۔''

''میں تمہاری شکرگزار رہوں گی۔''اس نے کہا۔

میں سیما کے گھر سے نکلا اور نواز کے پاس آیا۔وہ گھر میں تھا اور صورت وحلیے سے اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔اس نے پوچھا۔''کیا تم میری بربادی کا تماشا دیکھنے آئے ہو؟''

''اگر میں تمہاری جیسی فطرت رکھتا تو ایسا ہی کرتا لیکن میں تمہاری فطرت سے محروم ہوں۔'' میں نے کہا۔''ابھی سیما کے پاس سے آرہا ہوں اس نے کہا ہے اس مسئلے کا کوئی حل نکالوں۔''

نواز نے مایوسی سے نفی میں سرہلایا۔''تمہارا کیا خیال ہے میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ان چند دنوں میں کتنے ہی عالموں اور مفتیوں سے پوچھ چکا ہوں سب کا ایک ہی جواب ہے۔''

''کیا جواب ہے؟''

''یہی کہ واحد حل حلالہ ہے۔''

''یعنی سیما عدت پوری کرنے کے بعد کسی شخص سے شادی کرے اور اس کے ساتھ رہے پھر وہ اسے طلاق دے تو سیما دوبارہ تم سے شادی کرسکتی ہے۔''

''بالکل لیکن ایسا شخص کہاں سے ملے گا جو خاموشی سے سیما سے شادی کرلے اور ملے گا بھی تو یہ شادی چھپی نہیں رہے گی۔کم سے کم سیما کے گھر والے فوراً جان جائیں گے۔''

''یہ تو ہے۔''

''لیکن ایک صورت ہوسکتی ہے۔'' نواز نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کس صورت کی بات کررہا ہے۔میں نے نفی میں سرہلایا۔

''میں اس آزمائش سے نہیں گزرسکتا۔''

''شاہنواز اللہ کے لیے میرا گھر اجڑنے سے بچالے۔''نواز نے بھی میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔''تو میرا بھائی ہے اس گھر میں آکر رہے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔سب خاموشی سے ہوجائے گا۔''

''اگر میں تمہاری مدد پر راضی ہوجاؤں تب بھی حلالہ

اس طرح نہیں ہوتا ہے جہاں تک میں نے جانا ہے ہمارے ہاں حلالہ کے نام پر جو ہوتا ہے وہ دین سے مذاق کے مترادف ہے کہ لوگ اللہ کے بنائے ایک راستے کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ میں کسی غلط کام میں شامل نہیں ہوسکتا۔"

"تب میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا ہے۔" نواز نے مایوسی سے کہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نواز خودکشی نہیں کرسکتا ہے مگر مجھے سیما کی فکر تھی۔ وہ عورت تھی اور اس صورتِ حال میں وہی سب سے زیادہ متاثر تھی۔ اس لیے میں نے نواز سے کہا۔

"جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے میں معلوم کرتا ہوں۔"

"لیکن میں نے جہاں جہاں سے معلوم کیا یہی بات سامنے آئی کہ حلالہ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے اور حلالہ بھی شرعی طریقے سے ہونا چاہیے۔ اس طرح نہیں جیسا کہ آج کل رواج پا گیا ہے۔ یعنی عدت کے بعد مطالقہ کی شادی ہوئی اور شوہر سے ایک بار قربت کے بعد اسے پھر طلاق دے دی اور وہ دوبارہ عدت گزار کر اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں آ گئی۔ میں نے صورتِ حال نواز کے سامنے رکھ دی۔" اس نے پوچھا۔ "اب کیا ہوسکتا ہے؟"

"اگر میں اس طرح طلاق دوں گا تو نہ میرا ضمیر مطمئن ہوگا اور نہ ہی یہ ٹھیک ہوگا۔ اس کا گناہ ہم تینوں کے سر جائے گا۔"

"تم کیا کہتے ہو؟"

"اگر میں سیما سے شادی کرتا ہوں تب بھی میں فوری طلاق نہیں دوں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ بگڑ کر بولا۔ "تم سیما پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔"

"لاحول ولا......" میں نے کہا۔ "ایسا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی بار میرے سر نہ رہ جائے۔ دوسرے میں تمہارے پاس نہیں آیا ہوں تم میرے پاس آئے ہو۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو تم آزاد ہو اپنی مرضی کا بندہ تلاش کرلو۔"

مگر اپنی مرضی کا بندہ انہیں تا قیامت نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے مجبوراً انہیں مجھ پر ہی راضی ہونا پڑا۔ طے یہ پایا کہ مکان کے سب سے اوپری حصے میں ایک الگ کمرا تعمیر کیا جائے گا اور وہ بہ ظاہر میرے لیے ہوگا مگر درحقیقت اس میں نواز رہے گا اور میں سیما کے ساتھ نیچے رہوں گا۔ مگر جب تک وہ عدت میں ہوگی ہم دونوں ہی اوپر رہیں گے۔ طلاق کو ایک مہینا گزر گیا تھا۔ مزید ایک مہینے بعد نواز نے اوپر کمرا اور واش روم بنوالیا اور ظاہر ہے یہاں میں نے ہی خرچ کیا تھا بلکہ اب میں پہلے کی طرح گھر کا سارا خرچ بھی اٹھا رہا تھا۔ سیما واپس آ گئی تھی مگر اب وہ سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ دنیا والوں کو بس یہ معلوم تھا کہ بالآخر بھائی کے خون نے جوش مارا اور وہ بٹوارے کے باوجود مجھے دوبارہ گھر میں لے آیا۔ سب نواز کی تعریف کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کیونکہ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ نواز کتنا اچھا تھا۔

سیما نیچے رہتی تھی۔ میں اور نواز صبح دکان پر چلے جاتے اور پھر شام کو آتے تو خاموشی سے اوپری کمرے میں چلے جاتے۔ سیما پورے فلور پر اکیلی رہتی تھی۔ ہاں کوئی باہر سے آجاتا تو نواز شوہر کی طرح نیچے چلا جاتا۔ یہ ڈراما کامیابی سے چلتا رہا۔ حتیٰ کہ سیما کی عدت ختم ہوگئی۔ نواز نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ نکاح گھر میں نہیں ہوگا۔ ان دنوں میں نے گاڑی لے لی تھی۔ ہم گاڑی میں ایک دور دراز کے نکاح خواں کے پاس پہنچے اور میں نے سیما کو طلاق یافتہ ظاہر کیا۔ نواز کا پکے کاغذ پر طلاق نامہ موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور سیما با آسانی میری بیوی بن گئی۔ ہم جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس آ گئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب میں اور سیما میاں بیوی تھے اور نواز سیما کا جیٹھ بن گیا تھا جیسے پہلے میں اس کا دیور تھا۔

پہلی شب ہم دونوں ہی شرمندہ سے اور ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے مگر اس کے بعد حالات نارمل ہوتے چلے گئے۔ بلکہ چند دن بعد مجھے لگا کہ سیما نے مجھے شوہر کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ وہ اچھے انداز میں پیش آتی۔ خدمت گزاری بھی کرتی تھی۔ جب میں پیش قدمی کرتا تو اس نے کبھی انکار نہیں کیا۔ نواز اب مستقل اوپر رہتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ دکان جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور ہمہ وقت کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی شیو بڑھ گئی تھی اور حلیے سے بے پروائی کی وجہ سے وہ جوگی لگنے لگا تھا۔ میرے دل میں پہلی بار خواہش جاگی کہ کاش وہ یہاں سے چلا جائے۔ بس میں اور سیما ہوں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے اندر خوف بڑھ رہا تھا کہ مجھے بالآخر سیما کو طلاق دینا پڑے گی

اوراب میں یہ نہیں چاہتا تھا۔اس لیے ایک مہینے بعد نواز نے مطالبہ کیا۔ ''اب سیما کو طلاق دے دو۔''

''تم یہ مطالبہ نہیں کر سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''میں سیما کو کیوں طلاق دوں وہ میری بیوی ہے۔''

''دھوکے باز۔'' نواز نے دانت پیسے۔

''میں نے کوئی دھوکا نہیں کیا میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی مرضی سے طلاق دوں گا اور ابھی میری مرضی نہیں ہے اس لیے میں طلاق نہیں دوں گا۔''

''تم سیما پر قبضہ جمارہے ہو۔''

''وہ کوئی دکان یا مکان نہیں ہے جس پر میں قبضہ جما رہا ہوں وہ جیتی جاگتی عورت ہے اور اس نے مجھے بہ طور شوہر قبول کیا ہے۔''

''وہ اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''یہ بات وہی کہے تو میں کچھ سوچوں گا، تمہارے کہنے پر تو ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔''

نواز نچلے فلور پر ہی تھا۔اس نے سیما کو آواز دی تو وہ آگئی اور نواز نے اس سے پوچھا۔ ''تم شاہنواز سے طلاق چاہتی ہو؟''

''ہاں میں اس سے طلاق چاہتی ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں حیران رہ گیا۔

''لیکن تم نے مجھ سے تو کبھی نہیں کہا۔''

''تو اب کہہ دیا ہے۔'' وہ بولی۔

''لیکن میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تب میں خلع لے لوں گی۔''

''اس کے لیے تمہیں عدالت جانا ہوگا اور عدالت گئیں تو سب کھل جائے گا۔''

''کھل جائے اب میں مزید تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' سیما نے یوں کہا کہ میں ششدر رہ گیا اور نواز مسکرا رہا تھا۔

''اگر تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو اب تک کیا اداکاری کرتی آئی تھیں؟''

''تم جو چاہے سمجھو۔'' سیما نے بے باکی سے کہا۔ ''اب تم میرے شوہر نہیں اور تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔''

مجھے غصہ آنے لگا۔ ''تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔''

''دیکھو مسئلہ غصے سے حل نہیں ہوگا۔'' نواز نے کہا۔ ''اگر بات کھلی تو صرف ہماری نہیں تمہاری بدنامی بھی ہوگی۔ہم یہ مکان بیچ کر یہاں سے چلے جائیں گے مگر تم دکان بیچ کر نہیں جا سکتے تمہیں یہیں رہنا ہے۔اب سوچ لو کہ طلاق دو گے یا نہیں۔''

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نواز ساری عمر میرے ساتھ غلط سلوک کرتا آیا تھا وہی سلوک سیما نے کیا تھا۔وہ بھی مجھے استعمال کرتا تھا اور سیما نے بھی استعمال کیا ہے۔میں نے کہا۔ ''میں طلاق نہیں دوں گا۔''

''تب اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔'' نواز نے حکم دیا۔ ''مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہے کہ تم ساری دنیا کو بتا دو گے۔میں سیما کو بھی اس کے گھر بھیج دوں گا۔لیکن اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میری ہی چھت کے نیچے میری بیوی کے شوہر بن کر رہو۔''

''یہ میری بیوی ہے۔''

''جلد تم یہ بات نہیں کہہ سکو گے۔''

جب میں نواز کے پاس آیا تب بھی میں نے احتیاطاً وہ کمرا نہیں چھوڑا تھا جہاں میں کرائے پر رہ رہا تھا اور یہ احتیاط میرے کام آئی۔نواز کسی صورت میں رکنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا اور جب وہ مرنے مارنے پر اتر آیا تو مجبوراً مجھے وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔میں نے اپنا سامان لیا تھا اس وقت ان کو خیال نہیں آیا کہ سیما کا طلاق نامہ اور مجھ سے نکاح نامہ میرے ہی پاس تھا۔اگلے دن نواز صبح سویرے مکان پر آیا اور اس نے مجھ سے ان دو چیزوں کا مطالبہ کیا۔میں نے جواب دیا۔ ''انہیں بھول جاؤ اب عدالت میں ملاقات ہوگی۔سیما سے کہنا جلد کیس کر دے تاکہ میں اسے دنیا کے سامنے ذلیل کر سکوں۔''

نواز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دے حالانکہ یہ کام مجھے کرنا چاہیے تھا۔نواز کے جانے کے بعد مجھے شدت سے خیال آیا کہ مجھے نواز کو قتل کر دینا چاہیے مگر ساتھ ہی میں جانتا تھا کہ میں ایسا کر نہیں سکتا تھا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔اصل میں تو سیما ہی میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔نواز کے قتل کا ارادہ تھا۔سیما کا ارادہ جاننے کے باوجود میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کو کوئی ایسی سزا دوں جو ان کے لیے سوہان روح بن جائے مگر فی الحال ایسی کوئی سزا ذہن میں نہیں آرہی تھی۔جہاں تک طلاق نہ دینے کا تعلق تھا تو وہ خلع لے سکتی تھی اور یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔اس کے بعد وہ پھر نواز

سے شادی کر لیتی اور جہاں تک دنیا کی بات ہے تو اس کی پروا نہیں پہلے بھی نہیں تھی۔ صرف سیما کے گھر والوں کا کچھ مسئلہ تھا تو وہ بھی کبھی حل ہو ہی جاتا۔

ان چند مہینوں میں، میں نے اپنی خاصی رقم سیما پر لٹائی تھی اسے ایک سے بڑھ ایک لباس اور چیزیں دی تھیں۔ مہنگائی کے اس دور میں جب لوگ گولڈ بیچ رہے ہیں میں نے اسے سیٹ بنا کر دیا۔ گھر کا بہت سا سامان لے کر دیا اور وہ سب میرا خسارہ بن گیا تھا۔ اس میں سے اب مجھے کچھ واپس نہیں ملتا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ جب سیما میری زندگی میں آئی تو مجھے لگا کہ میری بھی کوئی زندگی ہے۔ میں نے بھرپور کوشش کی سیما کو خوش رکھوں۔ میں اس کی ہر بات مانتا تھا۔ وہ جتنا مانگتی اس سے زیادہ دیتا تھا۔ وہ بھی یوں بنی رہی جیسے مجھ سے خوش ہو مگر جب نواز نے طلاق کے لیے کہا تو وہ اس کی ہمنوا بن گئی۔ گویا وہ شروع سے نواز کے ساتھ رہنا چاہتی تھی تب اس نے مجھے کیوں دھوکے میں رکھا۔ میرے اندر خوش فہمی پیدا کی اور میں اسے اپنا سمجھنے لگا تھا۔

اب میں ان دونوں کو سزا دینا چاہتا تھا۔ کئی دن تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ پھر ایک دن مجھے اچانک خیال آیا۔ میں نے اس پر غور کیا تو میں اچھل پڑا تھا۔ پھر میں نے کچھ عالموں سے اس بارے میں مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میرے خیال کی تصدیق کی۔ میں نے اگلے دن ہی خاموشی سے مارکیٹ میں دکان سیل کرنے کی بات پھیلا دی۔ یعنی ان لوگوں تک پہنچا دی جو مارکیٹ میں بیٹھے تھے اور یہی کام کر رہے تھے۔ دو تین آفرز آئیں مگر وہ میرے خیال کی نہیں تھیں اس لیے میں صبر سے انتظار کرتا رہا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ بس میں چاہتا تھا کہ دکان کی فروخت کی شہرت نہ ہو۔ اگر نواز اور سیما کے علم میں آجاتا تب بھی کوئی فرق تو نہیں پڑتا مگر جیسا میں چاہتا تھا پھر شاید ویسا نہ ہوتا۔

اس دوران میں سیما کی طرف سے مجھ پر خلع کا کیس کر دیا گیا اور میں اسے بھی دیکھنے لگا۔ میں نے اچھا وکیل کیا تھا جو چکر بازیوں کا ماہر تھا اور وہ کیس کو طول دینے لگا۔ دو مہینے بعد مجھے مطلوبہ آفر مل گئی اور میں نے دکان فروخت کرنے کی کارروائی شروع کر دی۔ میری پوری کوشش تھی کہ نواز کو اس کا علم نہ ہو اس لیے میں نے جس سے سودا کیا اس سے بھی بات خفیہ رکھنے کو کہا۔ مارکیٹ میں میری جان پہچان زیادہ تھی لیکن نواز کے جاننے والے بھی کم نہیں تھے اور مجھے اصل خطرہ ان کی طرف سے تھا۔ ایک مہینے بعد کارروائی مکمل ہو گئی اور رقم مجھے مل گئی۔ مجھے رقم ملی اور میں اس کے اگلے دن روانہ ہو گیا۔ میں نے شہر ہی چھوڑ دیا اور شہر چھوڑنے سے پہلے نواز کو ایک خط کوریئر سے بھیجا جسے میں نے کمپیوٹر پر ٹائپ کروا کے اس کا پرنٹ نکالا تھا۔ اس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''نواز میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ سمجھ لو کہ گم شدہ ہو رہا ہوں اور اب سیما کس سے خلع لے گی۔ سات سال سے پہلے وہ عدالت سے بھی خلع نہیں لے سکتی اس لیے تم لوگ سات سال تک تو انتظار کرو۔ یاد رکھنا اگر تم دونوں نے ساتھ رہنے کی کوشش کی یا کوئی چکر بازی کی تو میں تم سے بے خبر نہیں ہوں دونوں حدود کے تحت جیل جاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔ ہاں خاموشی سے گناہ کی زندگی بسر کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔''

فقط تمہارا بھائی۔

نوٹ: لازمی نہیں ہے میں سات سال بعد آؤں تو طلاق یا خلع دے دوں میں اپنی جھلک عدالت میں دکھا کر پھر غائب ہو سکتا ہوں اور سیما پر مزید سات سال کا انتظار لازمی ہو جائے گا۔''

میں نے خط کی دو کاپیاں کرا کے انہیں نواز اور سیما کے ماں باپ کے گھر بھیجا۔ تاکہ وہ ان سے بات چھپا نہ سکیں۔ میرا واپس آنے اور ان کی نگرانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر دھمکی دینے میں کیا حرج تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ ملائیشیا آکر میں نے چند مہینے حالات دیکھے لوگوں کے انداز اور رسم و رواج جانے۔ مقامی زبان سیکھی۔ پھر ایک عام مارکیٹ میں ایک جنرل اسٹور پر سیلز مین کی جاب کی۔ ایک سال بعد میں نے جمع پونجی سے اپنی دکان کھول لی اور دو سال بعد میں نے اپنا مکان لے لیا تھا۔ پھر ایک مقامی مسلمان لڑکی سے شادی کی اور اللہ نے مجھے اچھی بیوی کے ساتھ اولاد بھی دی۔ آج اس بات کو سات سال پورے ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نواز اور سیما نے پھر کیا کیا۔ ممکن ہے نواز نے دوسری شادی کر لی ہو مگر سیما یہ نہیں کر سکتی تھی۔ جس وقت میں یہ سچ بیانی لکھ رہا ہوں سیما کے لیے طلاق نامہ میرے سامنے پڑا ہے اور میں بعد میں فیصلہ کروں گا کہ اس پر سائن کر کے اسے بھیجوں یا نہ بھیجوں۔

برے پھنسے

محترم ایڈیٹر سرگزشت کراچی
السلام علیکم
یہ واقعہ ایک عام بلکہ روز مرہ میں شامل ہے۔ اسے پاکستانی پولیس کا معمول سمجھ لیں کیوں کہ یہ مجھ پر ہی نہیں ہر ایک پرگزرتی ہے۔ انھی حالات سے پچاسوں لوگ گزرے ہوں گے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں کہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔

نعمان بدر
(ملتان)

ہوسکتا ہے کہ آپ میری اس کہانی کو مذاق سمجھیں یا جھوٹ سمجھیں لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتائیں کہ کیا ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر یہ کہانی جھوٹ نہیں ہے۔ یہ ایک سوفی صد سچی کہانی ہے۔

میں اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ بچے اس لیے نہیں تھے کہ بیوی نہیں تھی اور بیوی اس لیے نہیں تھا کہ شادی نہیں ہوئی تھی۔

میں اس رات ایک بہت رومانٹک سا خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی جیسی دستک پولیس والے ہی دیا کرتے ہیں۔ بوکھلا کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر اندھیرا تھا۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کون لوگ آگئے ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے میرے چہرے پر کسی طاقت ور ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ میری تو آنکھیں ہی چندھیا کر رہ گئی تھیں۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''اوئے تیرا نام نعمان بدر ہے نا؟'' کسی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! میں نعمان بدر ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بات کیا ہے؟''

''بات تو تھانے چل کر بتائیں گے۔ اوئے اس کو ڈالو موبائل میں۔''

اس وقت پتا چلا کہ آنے والے پولیس کے لوگ تھے۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے فلیٹ کے نیچے اتار کر لے آئے۔

ارد گرد کے فلیٹوں کی کھڑکیاں روشن ہونے لگی تھیں۔

لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر طرح طرح کے تبصرے کیے جا رہے تھے۔

"توبہ ہے۔ دیکھنے میں کتنا شریف آدمی لگتا تھا۔"

"ارے میں تو اس کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی اونچی چیز ہے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں بھائیو۔" میں نے یہ آواز پہچان لی۔ یہ ان مولوی صاحب کی آواز تھی جو کنڈا ڈال کر اپنے گھر کو روشن رکھتے تھے۔

میں اس وقت بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میری ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ سوال کیا کہ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کے جواب میں ایسی کرارہ قسم کی گالیاں سننے کو ملیں کہ طبیعت ہی صاف ہو گئی۔

پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خاموش ہی رہوں۔ شاید تھانے جا کر صورت حال واضح ہو جائے۔ مجھے اٹھانے والوں نے اتنی بے دردی سے اٹھا کر موبائل میں پھینک دیا جیسے آٹے کی بوری پھینکتے ہیں۔

ان لوگوں نے مجھے سیٹ پر بھی بیٹھنے کو نہیں کہا۔ میں سیٹوں کے درمیان پڑا رہا۔ جب کہ دونوں سیٹوں پر پولیس کے جوان بیٹھ گئے تھے۔

موبائل ابھی چلی ہی تھی کہ ایک پولیس والے نے میری گردن پر ہاتھ جما دیا۔ میں بلبلا کر رہ گیا تھا۔

"ارے بھائی کیوں مار رہے ہو مجھے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"اوئے چپ کر شریف دا پتر۔ یہ تو موبائل میں بیٹھنے والوں کی پہلی سلامی ہے۔"

میں بھنّا کر رہ گیا۔ ایسی ذلت تو میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی ہوگی۔

بہرحال کچھ دیر کے سفر کے بعد موبائل تھانے کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔

"اوئے اتر۔" ایک نے کہا۔ "تیرا سفر ختم ہوا۔"

"بھائی صاحب آپ لوگ کسی غلط فہمی میں مجھے اٹھا کر لائے ہیں۔" میں نے کہا۔

ایس ایچ او ایک خون خوار صورت پولیس والا تھا۔

"سر جی یہ نعمان بدر ہے۔" مجھے ساتھ لانے والوں میں سے ایک نے بتایا۔ "بڑی مشکلوں سے ہاتھ آیا ہے۔ فلیٹ کی دیوار پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔"

"ارے خدا کا خوف کرو تم لوگ۔" میں بلبلا کر بولا۔ "تم لوگ مجھے سوتے میں پکڑ کر لائے ہو اور کہہ رہے ہو میں دیوار پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔"

"خاموش۔" ایس ایچ او نے مجھے جھڑک دیا۔ "ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ اب بتاؤ اتنے دنوں سے کہاں چھپے ہوئے تھے۔"

"جناب! میں کیوں چھپنے لگا۔" میں نے کہا۔ "میں تو سب کے سامنے ہوں۔"

"سر جی یہ بہت ہی ڈھیٹ قسم کا مجرم ہے۔" ایک پولیس والا غصے سے بولا۔ "اس کو ڈرائنگ روم بھیج دیں سر جی خود ٹھیک ہو جائے گا۔"

"دیکھو بھائیو، تم لوگ چاہے مجھے کسی بھی روم میں بھیج دو لیکن پہلے بتا تو دو کہ میں نے کیا جرم کیا ہے۔"

"تم نے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"بینک میں ڈاکا؟" میرے تو ہوش اڑ گئے۔ "ایس ایچ او صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میں آپ کو بینک میں ڈاکا مارنے والا لگ رہا ہوں۔"

"تمہارا نام نعمان بدر ہے نا؟"

"جی ہاں! وہ تو ہے اس سے میں نے کب انکار کیا ہے۔"

"اور تم پیراڈائز اپارٹمنٹ میں رہتے ہو؟"

"جی ہاں، میں وہیں رہتا ہوں۔"

"تو بس۔ پتا چل گیا نا کہ تم ہی نے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔"

"ارے صاحب اس سے کیسے پتا چلا؟ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔"

ایک ہاتھ میری گدی پر پڑا۔ "اوئے ہمارے صاحب کو خدا کا خوف کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔"

"دیکھ ہمیں اس طرح پتا چلا، ہمارے مخبروں نے ہمیں خبر دی ہے کہ بینک میں ڈاکا ڈالنے کا کام نعمان بدر نے کیا ہے اور وہ پیراڈائز اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ تو ان دونوں نشانیوں پر پورا اترتا ہے اس لیے تو نے ہی ڈاکا ڈالا ہے۔"

"ایس ایچ او صاحب! آپ یقین کریں میں ایک شریف اور بے گناہ انسان ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ ایسی کوئی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑی فرم میں ایک اچھے عہدے پر ہوں۔ معاشرے میں میری عزت ہے۔ مجھ جیسا آدمی کسی بینک میں ڈاکا کیسے ڈال سکتا ہے۔"

اسی وقت ایک پولیس والا بول پڑا۔ "سر جی یہ وہ بندہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"ہاں سر جی! میں اس نعمان بدر کو جانتا ہوں۔ وہ کوئی اور ہے یہ بے چارہ تو خواہ مخواہ مارا گیا ہے۔"

"تو یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔" ایس ایچ او غرایا۔

"سر جی میں تو تھانے میں بیٹھا تھا۔ جو لوگ گئے تھے وہی اٹھا کر لائے ہیں اس بے چارے کو۔ میں نے تو ابھی اس کی شکل دیکھی ہے۔"

خدا بھلا کرے اس پولیس والے کا اس کے لیے دل سے دعا نکل رہی تھی۔

"سوری جناب۔" ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔ "میرے بندے کسی اور کے دھوکے میں آپ کو پکڑ کے لے آئے ہیں۔"

"آپ نے تو سوری کر دیا۔ لیکن اتنی دیر میں میری جو بے عزتی ہوئی ہے۔ جتنی ٹھکائی ہوئی ہے اس کا کیا ہوگا۔"

"اب اس کا تو کچھ نہیں ہو سکتا۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"سر جی میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ آدمی کسی بینک میں ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔" یہ وہ پولیس والا بول رہا تھا جس نے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے موبائل میں پھینکا تھا۔

"لیکن سر جی ایک بات اور بھی ہے۔" ایک دوسرے پولیس والے نے کہا۔

"اب کون سی بات ہے۔"

"وہ جو اصل نعمان بدر ہے۔ وہ رہتا تو اسی بلڈنگ میں ہے۔ لیکن اس کا فلیٹ نمبر کچھ اور ہے۔ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی۔"

"معلوم تھی تو اس شریف آدمی کے گھر کیوں چلے گئے تھے؟"

"سر جی۔ وہ نعمان بدر، مستقیم صاحب کا بہنوئی ہے۔" پولیس والے نے بتایا۔

"کون! وہ اپنے مستقیم صاحب۔"

"جی صاحب۔ وہی وہ ان کا سگا بہنوئی ہے۔"

"او ہو پھر تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ مستقیم صاحب کا دماغ تو آج کل ویسے ہی خراب رہتا ہے۔"

"سر جی ایک مشورہ دیتا ہوں جب تک معاملہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اس بندے کو لاک اپ میں رکھیں۔ کچھ دنوں بعد چھوڑ دیں گے۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" ایس ایچ او۔ نے گردن ہلائی۔

"واہ، یہ کیا مذاق ہے۔" میں بھڑک اٹھا۔ "تم لوگ یوں ہی کسی کو لاک اپ میں کیسے رکھ لو گے۔ کوئی مذاق ہے۔ بھائی اس نعمان بدر کو پکڑو جس نے یہ جرم کیا ہے۔ اگر وہ کسی مستقیم کا بہنوئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"بات یہ ہے بھائی کہ ہم ابھی اس بندے پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ بعد میں اس کو رگڑ دیں گے۔"

"اور اس وقت تک میری جو رگڑ ہوتی رہے گی اس کا کون ذمے دار ہوگا؟"

"ہم مجبور ہیں تم کو دس پندرہ دنوں کے لیے لاک اپ میں رکھنا ضروری ہے ورنہ ہماری نوکریاں ختم ہو جائیں گی۔" ایس ایچ او نے کہا۔ پھر ایک پولیس والے کو حکم دیا۔

"بھائی اسے لاک اپ میں ڈال دو۔"

پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس وقت ایک دوسرا پولیس والا بول پڑا۔ "سر جی! آپ کو یاد نہیں رہا جس بندے نعمان بدر کی بات ہو رہی ہے وہ پہلے بھی تو اس چکر

میں پکڑا جا چکا ہے۔"
"کس چکر میں؟"
"اس نے اپنے آپ کو مستقیم صاحب کا بہنوئی شو کیا تھا صاحب جی۔" پولیس والے نے بتایا۔ "وہ بندہ تو بہت بڑا فراڈیا ہے۔ مستقیم صاحب کے نام کو بدنام کرتا پھر رہا ہے۔"
"اب تو میں جا سکتا ہوں نا؟" میں نے غصے سے پوچھا۔
"کیوں نہیں جناب۔ آپ بالکل جا سکتے ہیں۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن آپ ہماری بھی مجبوریاں دیکھیں۔"
"ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں آپ لوگوں کی مجبوریاں۔"
"آپ یقین کریں۔ جب آپ جیسا کوئی شریف آدمی ہمارے تھانے میں آتا ہے تو ہمیں خود شرمندگی ہوتی ہے۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "اب آپ چائے پیے بغیر نہیں جائیں گے۔"
"سر جی۔" ایک دوسرا پولیس والا بول پڑا۔ "آپ تو بالکل بھولے ہیں سر جی۔ آپ کو تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔"
"کیوں اب کیا ہو گیا؟"
"آپ کو یاد نہیں ہے سر جی۔ اس بندے نعمان بدر کی مستقیم صاحب سے ناراضگی چل رہی تھی۔ اس لیے صاحب نے اسے اپنا بہنوئی ماننے سے انکار کر دیا تھا گھریلو جھگڑا تھا سر جی۔"
"اوہو، یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔"
"تو پھر کیا کیا جائے سر جی؟"
"کرنا کیا ہے۔ اس بندے کو لاک اپ میں ڈال دو۔ بہت شریف بنا پھر رہا ہے۔ ہم صاحب سے تو جھگڑا نہیں لے سکتے نا۔"
"ہاں سر جی۔"
"تو پھر ڈالو اسے لاک اپ میں۔ دس پندرہ دنوں کے بعد دیکھا جائے گا۔"
"آخر یہ کیا مذاق ہے۔" میں غصے سے دھاڑنے لگا تھا۔ "تم لوگوں نے یہ کیا لگا رکھا ہے۔ جب تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں ایک بے گناہ انسان ہوں تو پھر یہ تماشا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ۔"
"یہ مجبوری ہے ہماری۔" ایس ایچ او نے کہا۔
"اچھی مجبوری ہے۔" میں بھناتے جا رہا تھا۔ "تمہاری مجبوری تو میرے لیے موت ہو رہی ہے۔"
"سر جی ہم خواہ مخواہ اس شریف بندے کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔" ایک پولیس والے نے مداخلت کی۔ "آپ یاد کریں سر جی مستقیم صاحب تو اس بندے سے خود اتنے پریشان ہیں کہ دوبارا سے بند کروا چکے ہیں۔"
"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یعنی وہ بندہ ہے اسی قابل۔"
"وہی تو میں بتا رہا ہوں سر جی۔ ہم خواہ مخواہ ایک شریف بندے کی بد دعائیں لے رہے ہیں۔"
"جائیں بھائی آپ چلے جائیں۔" ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔ "اور ہمیں معاف کر دیں کہ ہم نے آپ کو پریشان کیا ہے۔"
"خدا حافظ۔" میں جلدی سے دروازے کی طرف لپکا اور اسی وقت ایک پولیس والے نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "دو منٹ تو رک جاؤ بادشاہو۔"
"اب کیا ہو گیا؟" ایس ایچ او نے غصے سے پوچھا۔
"سر جی کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ مستقیم صاحب ہر وقت اپنے بہنوئی سے ناراض ہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "اگر انہیں پتا چل گیا کہ ہم نے ان کے بہنوئی کو پکڑ لیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ناراض ہو جائیں انسان کے دماغ کو بدلتے ہوئے کہاں دیر لگتی ہے۔"
"یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "چلو ڈال دو اس کو لاک اپ میں۔"
اور اس بار میں نے وہ حرکت کی جو مجھے پہلے کر لینی چاہیے تھی۔ میں لاک اپ میں ڈال دو یا اسے جانے دو کے چکر سے نکل کر ایک کنارے ہو گیا۔
یعنی میں اب چھ مہینے سے جیل میں ہوں کیوں کہ میں نے ایک پولیس والے کا سر پھاڑ دیا تھا۔ جی ہاں میں نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے اٹھا کر ایس ایچ او کے سر پر دے مارا تھا۔
اس کے نتیجے میں مستقیم صاحب سے بھی جان چھوٹ گئی تھی اور مجھے باقاعدہ گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے چھ مہینے کی سزا سنا دی گئی۔
اور اب میں جیل میں رہ کر یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔
ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری یہ کہانی غلط معلوم ہو۔ کیوں کہ یہ ہے ہی غلط لیکن آپ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان سے بتائیں کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا؟

اسرار

جناب معراج رسول
السلام علیکم
اس بار میں ایک انوکھی مخلوق کی درندگی کا قصہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ یقین کریں یہ مبالغہ نہیں اس مخلوق کی حشر سامانی کی داستان جھمپیر اور جنگ شاہی کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ان دنوں اخبارات میں بھی یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ آئی تھی۔
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
(جیکب آباد)

xxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxx

طوفانی بارشوں کا سلسلہ تھم چکا تھا۔ بستی والوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کیوں کہ اگر یہ سلسلہ مزید ایک روز جاری رہتا تو بستی کی مشرقی سمت بہنے والے دریا میں زبردست طغیانی آجاتی اور پورا علاقہ زیرِ آب آجاتا۔ یہاں آس پاس دو تین بستیاں تھیں۔ ایک تو دریا کے دوسرے کنارے آباد تھی جو مچھیروں کی بستی کہلاتی تھی۔
گزشتہ دنوں ہونے والی طوفانی بارشوں کے باعث اس دریا کی جنوب مشرقی سمت سے نکلنے والی ایک شاخ

(کینال) پر آٹھ ستونوں والا جو ریلوے پل بنا ہوا تھا اس کے چار ستون بہہ گئے تھے پل ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں ہنگامی بنیادوں پر مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ یہ کینال دریائے سندھ سے پھوٹتی تھی اور جنگ شاہی اور جھمپیر کے درمیان سے گزرتی تھی۔

اوورسیئر کمال احمد اپنے بارہ ورکروں کی ٹیم کے ساتھ وہاں خیمہ زن تھا۔ ٹوٹتے ہوئے پل کے قریب چار خیمے نصب کیے گئے تھے۔ یہ ٹیکنیکل عملہ تھا جن کے ذمے آہنی برج اور پٹریوں کی مرمت کا کام تھا جب کہ اینٹوں اور سیمنٹ کے ستونوں کا کام تقریباً چالیس مزدوروں اور پانچ راج مستریوں کے سپرد تھا۔

یوں ان دونوں ٹیموں کو ''اے'' اور ''بی'' سیکشن میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ''اے'' ٹیم اوورسیئر کمال احمد کی تھی۔ ''بی'' سیکشن کی ٹیم نے بھی الگ تھلگ مقام پر اپنی جھونپڑیاں ڈال لی تھیں اور یوں بنجر ویران علاقے میں باقاعدہ ایک کالونی بن گئی تھی۔

کام ہنگامی بنیادوں پر جاری تھا کیوں کہ ایک بڑے شہر کا رابطہ دیگر شہروں سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ پہلے متبادل راستہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اوورسیئر کمال احمد ایک پینتیس سالہ شخص تھا۔ وہ خود دن رات کام کی نگرانی کرتا تھا۔ بارشوں کا سلسلہ ابھی پوری طرح ختم تو نہیں ہوا تھا تاہم اس میں خاصی حد تک کمی ضرور واقع ہو گئی تھی۔

اوورسیئر سارے عوامل پر سوچ بچار کرنے کا عادی تھا۔ وہ مزدور پارٹی کے ٹھیکیدار راجا شفیق کو بھی کام کے سلسلے میں مفید مشورے دیا کرتا تھا۔

ایک روز صبح چھ بجے حسب معمول دونوں ٹیموں نے بیداری کے بعد کام سنبھالا تو ایک لرزہ خیز واقعے کا انکشاف ہوا۔ تین افراد کی لاشیں کینال کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑی تھیں۔ ان تینوں بدنصیبوں میں سے دو مزدور تھے اور تیسرا اے ٹیم کا ورکر تھا۔

کام روک دیا گیا۔ پورے عملے میں خوف اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اوورسیئر کمال احمد اور ٹھیکیدار راجا شفیق جائے مقام پر پہنچے۔ تینوں لاشوں کو الگ الگ تین چارپائیوں پر ڈال دیا گیا تھا۔

لاشوں کی حالت بہت بری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی خونخوار درندے نے انہیں چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ اکثریت کا خیال تھا کہ یہ کام جنگلی کتوں اور خونخوار بھیڑیوں کا ہے۔

اس علاقے میں جھمپیر تھانے کی حد لگتی تھی۔ چنانچہ فوری طور پر چند افراد کو ایک جیپ میں روانہ کر دیا گیا۔ پولیس پارٹی آئی تو اس نے لوگوں کے بیان قلمبند کیے۔ لاشوں کا جائزہ لیا اور وہی ہوا یعنی اس حادثے کو جنگلی کتوں اور بھیڑیوں کا شاخسانہ قرار دے کر ضابطے کی کارروائی نمٹا دی گئی۔ لاشیں شہر بھجوا دی گئیں کیوں کہ ان کے ورثا وہیں رہتے تھے۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ صبح کے واقعے کی وجہ سے عملے نے دو گھنٹے پہلے کام روک دیا تھا۔ وجہ معقول تھی۔ اس لیے اوورسیئر کمال احمد اپنے خیمے میں آ گیا۔ یہاں پیٹرومیکس کا ایک لیمپ روشن تھا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ اس کا ملازم بختیار علی کھانا لے آیا مگر کمال کو بھوک نہ تھی۔ اسے ان بدنصیب مزدوروں کی عبرت ناک موت کا رنج تھا۔ بختیار بھی آزردہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک پکی عمر کا آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ''صاحب'' نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو اس کا بھی کھانے کو جی نہیں کیا تھا۔

''یار مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔'' کمال نے کہا۔

''ابھی لایا صاحب!'' وہ یہ کہہ کر خیمے سے باہر چلا گیا۔ وہیں گیس کا اسٹور رکھا تھا۔ ہلکی پھلکی چائے، کافی یا دودھ وہیں گرم کیا جاتا تھا۔ اس کے ملازم بختیار کو گئے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی کے کھنکھارنے کی آواز ابھری۔

''کون؟'' کمال احمد نے پوچھا۔

''میں ہوں جناب! ٹھیکیدار شفیق۔'' باہر سے آواز آئی۔

''آجاؤ... آجاؤ...'' کمال احمد نے فوراً کہا۔

ٹھگنے قد اور سانولی رنگت کا درمیانی عمر والا شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص کے اوپر واسکٹ پہن رکھی تھی۔

''آؤ بیٹھو مگر پہلے ذرا بختیار علی سے کہہ دو کہ ایک کپ چائے کا پانی اور...''

''وہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔'' راجا شفیق نے مسکرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر اس کے سامنے دھری ایک چھوٹی سی فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

دونوں سائیٹ پر ہونے کی وجہ سے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔

''کیا بات ہے اب تک سوئے نہیں آپ؟'' اس نے کمال احمد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں یار! آج والے واقعے کی وجہ سے دل بڑا خراب ہے، نیند ہی نہیں آرہی۔'' کمال احمد نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''دکھ تو واقعی مجھے بھی بہت ہوا کمال صاحب! بے چارے محنت مزدوری کرنے والے ان تین بدقسمت آدمیوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا مگر کمال صاحب میرے حلق سے ایک بات نہیں اتری ہے اب تک......؟'' راجا شفیق نے چونکانے والے انداز میں کہا۔

''اگر ان تینوں مزدوروں کو کتوں اور بھیڑیوں نے چیر پھاڑ ڈالا تھا تو کم از کم چیخنے چلّانے کا شور تو آنا چاہئے تھا؟''

''یار شفیق! ہم سب لوگ سارے دن کے تھکے ہارے سوتے ہیں۔ بستروں پر پڑتے ہی بے سدھ ہو جاتے ہیں پھر صبح تڑکے ہی آنکھ کھلتی ہے۔ بھلا شور کی آواز کون سنتا۔'' کمال احمد نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''پھر بھی کمال صاحب! تیس چالیس افراد پر مشتمل عملے کے لوگوں میں کسی ایک کو بھی خبر نہ ہو سکی۔'' راجا شفیق کے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔

بختار علی چائے کی ٹرے اٹھائے آگیا۔ دونوں کو چائے کا ایک ایک کپ تھمانے کے بعد خود بھی ایک قریب دھرے اسٹول پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ ایک مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''میرے ذہن میں تو کوئی اور بات ہے۔'' کمال احمد نے چائے کی چسکی لے کر پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''کیسی بات؟'' راجا شفیق نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جس مقام پر وہ تینوں مزدوروں کی لاشیں پائی گئی تھیں وہاں آس پاس زمین پر کسی جانور کے قدموں کے نشانات نہیں ملے تھے ماسوائے انسانوں کے پیروں کے۔'' کمال احمد نے کہا۔

راجا شفیق بولا۔ ''ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے نشانات معدوم ہو گئے ہوں۔ برسات بھی تو دیکھو ناں۔ جیسے جھڑات کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ بالکل معمولی ہلکی ہلکی اور کبھی ایک دم تیز......''

''ہوں یہ بات تو ہے مگر راجا! پھر بھی جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا ہے کہ اتنی بڑی واردات یوں چپ چاپ ہو گئی۔'' کمال احمد اس بار الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ راجا شفیق خاموش رہا۔

تینوں اب خاموشی سے چائے پینے لگے۔ باہر رات کا تاریک سناٹا پھیل چکا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھ تیز ہوا کے جھونکے بھی چل رہے تھے۔

''مرمتی کالونی'' سے ذرا دور ایک بستی کی آبادی میں جس کے ایک طرف کھجوروں کا بڑا سا باغ تھا۔ وہاں ایک پکی اور سرخ اینٹوں کا مکان بنا ہوا تھا۔ مکان باغ کے مالک رحمت اللہ کا تھا۔ بستی کی معتبر شخصیت بھی یہی تھی۔

آج سے کئی سال پہلے جب رحمت اللہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا اس کے دادا نے یہاں ایک کھجور کا درخت لگایا تھا اور آج اس کی دوسری نسل تقریباً چالیس درختوں پر مشتمل ایک باغ کی شکل میں اس کا پھل کھا رہی تھی۔ رحمت اللہ کی بیوی امیر زادی ایک خوش اطوار خوش جمال خاتون تھی۔ شادی کے سات آٹھ سالوں بعد بڑی منتوں اور مرادوں سے ایک بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ اب دس بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ رحمت اللہ اب اس چھوٹے سے گوٹھ میں زمیندار کہلاتا تھا...... باعزت زمیندار۔

یہ تینوں الگ الگ چارپائیوں پر کھلے صحن کے ایک کونے میں بڑے سے چھپر نما سائبان تلے گہری نیند سو رہے تھے۔ درمیان میں ان کے بیٹے شاہ رخ کی چھوٹی چارپائی تھی۔ اس بڑے مکان کی کل کائنات یہ تین افراد ہی تھے۔

باہر ہو کا عالم تھا۔ تاریک رات اپنے بھرپور جوبن پر تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اچانک باہر کسی گیدڑ کے زور سے رونے کی آواز ابھری۔ یہ آوارہ گیدڑ شاید دروازے کے قریب پہنچ کر اپنی منحوس آواز میں رو دیا تھا۔ مگر رحمت اللہ اور شاہ رخ کی آنکھ نہیں کھلی تھی البتہ امیر زادی ضرور جاگ گئی تھی۔ باہر گیدڑ دوبارہ چلّایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ امیر زادی نے اس آوارہ گیدڑ کو کوسا دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کی نیند ہی ایسی تھی کہ ایک بار آنکھ کھل جانے کے بعد دوبارہ نہیں آتی تھی یا پھر بہت دیر سے آتی۔ بہر طور...... وہ کافی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی پھر اچانک ہی وہ ایک آواز پر

چونک پڑی۔

آواز بڑی عجیب سی تھی۔ صحن کا دروازہ قریب ہی تھا اور یہ عجیب اور نامعلوم سی آواز دروازے کے باہر سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ معاً ہولے سے دروازے کے دونوں پٹ آواز کے ساتھ ہلے۔ امیرزادی دروازے کو تکنے لگی۔ چھپر نما سائبان کے ایک بدنما بانس سے جھولتی ہوئی لالٹین کی دھیمی یرقان زدہ روشنی میں اس نے بدستور اپنی نظریں جمائے رکھی تھیں۔ آواز دوبارہ نہیں ابھری۔ امیرزادی سمجھی کہ دروازہ ہوا سے ہی ہلا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ جیسے ہی دوبارہ لیٹنے کی کوشش کرنے لگی تو اچانک دروازے کے باہر سے ایک خراٹے دار حیوانی آواز ابھری۔

اب تو امیرزادی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ایک بہادر عورت تھی تاہم پھر بھی یہی سمجھی کہ باہر کوئی آوارہ جانور یا جنگلی سور ہوگا کیوں کہ کھجوروں کا باغ قریب ہی تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔

دفعتاً باہر ہولے ہولے خرخرانے کی آوازیں بتدریج ابھرنے لگیں۔ آس پاس کا علاقہ جنگل تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ کوئی آوارہ جانور ہے لیکن اب متواتر خرخرانے کی آواز کے ساتھ ہولے ہولے دروازے کے کھٹکنے پر امیرزادی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے باورچی خانے میں جاکر مسالا پیسنے والا ڈنڈا اٹھایا اور دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھی۔

''اسے اب بھگانا ہی پڑے گا۔'' وہ ڈنڈا تھامے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دانت پیس کر بڑبڑائی۔

قریب پہنچ کر اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دروازے کی کنڈی کھول دی پھر فوراً دروازے کا ایک پٹ وا کردیا۔ اسے تاریکی میں ایک انسانی ہیولا دور جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس انسانی ہیولے کو دیکھ کر چونکی بھی تھی اور حیران بھی ہوئی تھی۔ وہ ہیولا فوراً ہی غائب ہوگیا تھا۔ امیرزادی کو حیرت اس بات پر تھی کہ وہ کسی جانور کی توقع کررہی تھی پھر یہ انسانی ہیولا کہاں سے آگیا؟

آخر کون تھا یہ؟ پھر اس نے سر جھٹک کر دروازہ بند کردیا۔ کنڈی چڑھائی اور مسالے کا ڈنڈا واپس باورچی خانے میں رکھنے کے بعد وہ اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔ باہر اب گہرا سکوت چھاگیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش بھی رک گئی تھی۔

اگلے روز سب بیدار ہوئے۔ امیرزادی ناشتا وغیرہ بنانے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد رحمت اللہ اور اس کا بیٹا شاہ رخ غسل وغیرہ کرکے چارپائی پر بیٹھ گئے تب تک امیرزادی نے چارپائی پر ناشتا لگا دیا اور خود بھی شوہر اور بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔

''بابا! آج میں بھی آپ کے ساتھ باہر جاؤں گا۔'' شاہ رخ نے اپنے باپ سے کہا۔

رحمت اللہ نے شفقت بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ اس کی کوئی بات رد نہیں کرتا تھا۔ آخر کو اکلوتا اور لاڈلا تھا لہٰذا پیار سے بولا۔ ''ہاں بیٹا چلنا میرے ساتھ۔''

''تم اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا ہاتھ پکڑ کر، نوکروں کے حوالے نہ کردینا میرے چاند کو۔'' امیرزادی نے اپنے بیٹے کی پیشانی چوم کر شوہر کو تنبیہہ کی۔

''میں بھلا اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور کیوں کروں گا تو فکر نہ کر۔'' رحمت اللہ نے بیوی سے کہا۔

امیرزادی نے اچانک اس سے پوچھا۔ ''شاہ رخ کے پیو! یہ آج پڑوسن مجھے بتارہی تھی کہ مرمتی کالونی کے تین مزدوروں کو جنگلی کتوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہے؟''

بیوی کی بات سن کر رحمت اللہ بولا۔ ''ہاں، بستی کے لوگ وہاں گئے تھے۔ پولیس بھی آئی تھی لیکن حیرت ہے ہمیں یہاں رہتے ہوئے برسوں بیت چکے ہیں۔ پہلے تو کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔''

''اب جنگلی جانوروں کا کیا بھروسا، بھوک کی وجہ سے کب خونخواری پر اتر آئیں۔ تم شام ہونے سے پہلے لوٹ آیا کرو۔'' امیرزادی نے کہا۔ اس کے لہجے سے تشویش مترشح تھی۔

رحمت اللہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اری نیک بخت! مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ڈبل بیرل بندوق ہے اور پھر یہ جانور بے چارے مجھے کیا کہیں گے۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ امیرزادی نے اپنے بیٹے شاہ رخ کی بلائیں لیں پھر اسے دعائیں دیتے ہوئے چہرے پر پھونک ماری، اس کے بعد رحمت اللہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا باہر کچھ لوگوں پر نظر پڑی جن میں چند افراد زمین پر جھک جھک کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے جیسے کچھ تلاش کررہے ہوں۔ یہ لوگ چونک گئے۔ امیرزادی نے فوراً سر پر چادر رکھ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

''کیا بات ہے بھائیو! کیا چور آیا تھا؟ کسی کا کھورا

تلاش کر رہے ہو؟'' رحمت اللہ نے وہیں کھڑے کھڑے با آواز بلند ان سے پوچھا۔ لوگ کافی تعداد میں تھے اور ان کے چہروں پر خوف اور پریشانی کے تاثرات مترشح تھے۔ وہ اب قریب آ گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے رحمت اللہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ''سائیں! آپ کے گھر میں تو خیریت ہے نا؟''

''اللہ کا کرم ہے۔ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا؟'' رحمت اللہ نے پوچھا۔

''خیریت کہاں...... سائیں!'' ایک دوسرا دیہاتی بولا۔

''کل رات ایک عجیب و غریب اور خونخوار جانور نے خدا بخش کے گھر کا دروازہ توڑ کر اس کے سارے خاندان کو پھاڑ ڈالا ہے۔ پورے چار افراد تھے۔ ماں، باپ اور بہو بیٹا۔''

''کیا......! یہ...... یہ...... تو بڑی ہی افسوس ناک اور بری خبر سنائی تم نے؟'' رحمت اللہ نے پریشان ہو کر کہا۔

دروازے کے عقب میں کھڑی امیر زادی بھی یہ سن کر دھک سے رہ گئی تھی۔

''سائیں! اس سے بھی بری خبر ہمارے پاس ہے۔'' ایک تیسرے شخص نے کہا۔ یہ ان دونوں افراد میں سے ایک تھا جو جھکے جھکے زمین پر کسی کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ یہ کھوجی تھے۔

''وہ کوئی دو پیروں والا جانور ہے۔ یہ دیکھو سائیں کتنے واضح نشانات ہیں اس کے قدموں کے۔'' انہوں نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ ''لگتا ہے وہ یہاں تک پہنچ کر واپس لوٹ گیا تھا۔''

اب رحمت اللہ کے ساتھ امیر زادی کا بھی ماتھا ٹھنکا اسے فوراً رات والا وہ پُراسرار انسانی ہیولا یاد آ گیا تھا۔ امیر زادی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر متوحش ذہن سے سوچا کہ اس نے رات میں جس پُراسرار ہیولے کو دیکھا تھا کہیں وہ ہی تو نہیں جن کی یہ لوگ باتیں کر رہے ہیں تھے مگر وہ تو بالکل انسان جیسا دکھائی پڑتا تھا۔ وہ دہل گئی۔ اس نے فوراً ذرا ہاتھ بڑھا کر اپنے بیٹے شاہ رخ کو اندر کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رحمت اللہ نے اپنی بیوی کو دروازہ بند کرنے کا کہا اور پھر خود ابھی آنے کا کہہ کر ان لوگوں کے ساتھ چلتا بنا۔

☆......☆

اس پورے علاقے میں یہ دوسری لرزہ خیز واردات تھی۔ بستی میں یہ افواہیں تیزی سے گردش کرنے لگیں کہ یہاں کوئی خونی بلا گھس آئی ہے۔ جو دن میں تو کہیں چھپی رہتی ہے مگر رات ہوتے ہی شکار کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔

کھوجیوں کے مطابق یہ درندہ عجیب و غریب تھا جس کے بھاری بھرکم پنجوں کے نشانات چار کی بجائے دو تھے۔ وہ ریچھ ہی کی طرح کا کوئی خونخوار جانور ہے جو دو پیروں پر انسانوں کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔

ادھر اوورسیئر کمال احمد اور ٹھیکیدار راجا شفیق کو تلے اوپر ہونے والی ان دو وارداتوں نے خاصا پریشان کر ڈالا تھا۔ کیوں کہ مزدوروں اور درکروں میں کام کے معاملے میں وہ پہلے جیسی تیزی اور تندہی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ کام بھی متاثر ہو رہا تھا۔ صورتِ حال کو دیکھ کر کمال احمد اور راجا شفیق سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''سر جی! اس طرح تو ہمارے کام کو مہینے لگ جائیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔'' راجا شفیق نے متفکر لہجے میں کہا۔

راجا شفیق کی بات سن کر اوورسیئر کمال احمد نے بھی گہرے تفکر کے ساتھ کہا۔ ''تم صحیح کہتے ہو۔ میرا خیال ہے اب اس کی رپورٹ حکامِ بالا تک پہنچانا ہوگی۔''

''جی جناب! نہ صرف یہ بلکہ مدد کی بھی درخواست لکھ دیں اور صاف صاف واضح کر دیں کہ اگر اس کا فوری طور پر سدباب نہ کیا گیا تو کام کا بہت حرج ہوگا۔''

یہ دونوں حسبِ معمول رات کو سر جوڑے بیٹھے تھے۔ باہر بختیار اسٹوو پر چائے کا پانی چڑھائے ہوئے تھا۔ ہر سو تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔

اچانک انہیں باہر بختیار کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ کمال احمد اور راجا شفیق خیمے سے باہر آ گئے۔

کمال احمد کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جب کہ راجا شفیق نے پیٹرومیکس اٹھا لیا تھا۔ ان کی جو سامنے نظر پڑی تو بری طرح لرز اٹھے۔

چائے کا اسٹوو الٹا ہوا تھا اور قریب ہی خون میں لت پت ان کا ملازم بختیار بری طرح تڑپ رہا تھا۔ کمال احمد فوراً اس کی طرف لپکا جب کہ راجا شفیق متوحش نظروں سے تاریکی میں آس پاس گھورنے لگا مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔

"ب..... بختیار..... کک..... کیا ہوا؟ کس نے تمہاری یہ حالت.....!" فرطِ غم سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر پایا۔ بختیار کا پیٹ اور سینہ بری طرح چاک تھا گردن بھی آدھی ادھیڑ دی گئی تھی۔ چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ وہ اپنے لب وا کر کے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔

"و..... و..... وہ..... بج..... جانور..... نن..... نہیں....."

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ کمال احمد کو اپنے ملازم کی دردناک موت پر بہت دکھ تھا۔ وہ یوں تو مضبوط دل گردے کا آدمی تھا مگر مرتے وقت اپنے ملازم بختیار کے ان الفاظ نے اسے بھی ایک عجیب قسم کے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ بختیار نے مرتے وقت اس خونی عفریت کے بارے میں بتانے کی جس طرح کوشش کی تھی اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کوئی درندہ یا جانور نہیں تھا۔

"تو پھر کون تھا وہ.....؟" کمال احمد سوچنے لگا۔

ادھر راجا شفیق ذرا کمزور دل واقع ہوا تھا۔ اس نے کمال احمد سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ اندر آجائیں کمال صاحب! کہیں وہ خونخوار جانور قریب ہی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو، ہمارے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔"

"شفیق! ہم اس کی لاش کو بے گور و کفن کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟" کمال احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک اور لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ یہ ذرا قریب بنے مزدوروں کے خیموں کی سمت سے آئی تھی۔

راجا شفیق اپنا دل تھام کر خیمے کے اندر دوڑ گیا جب کہ کمال احمد اپنی ٹارچ سنبھالے فوراً آواز کی سمت بڑھا۔

مزدوروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کمال احمد آواز کے مخرج والے مقام تک پہنچا تو اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی وہ بجھ گئی تھی مگر کمال احمد نے اٹھنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی اسے اپنے بالکل قریب ایک خیمے کے باہر کسی انسان کی گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ خونخوار غراہٹوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے دھبے نما ہیولے نظر آ رہے تھے۔

تب اچانک ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح انسانی خرخراہٹ ابھری اور ساتھ ہی دھپ کی آواز سے کوئی گرا۔

اس وقت کمال احمد کو ایک بھاری بھرکم دھبا نما کوئی شے اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی زور زور سے خرخراہٹ کی آوازیں ابھریں۔ خطرہ محسوس کر کے کمال احمد نے الٹے قدموں بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی اور اندھیرے میں اندھا دھند اپنے خیمے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اسے تھوڑی دور تک کسی کو اپنے تعاقب میں آتی ہوئی بھد بھد کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ معدوم ہو گئیں۔ کمال احمد نے اپنے خیمے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

☆.....☆

ایسے پے در پے ہونے والی پُراسرار خونی واقعات کا تبادلہ بستی سے لے کر مرمتی کالونی تک ہونے لگا تھا۔ گویا خوف و ہراس دونوں طرف تھا۔

بستی میں ایک باقاعدہ کچہری قائم کر دی گئی۔ رحمت اللہ نے بستی کے چند لوگوں کے ساتھ اپنے ڈیرے پر ایک نشست لگائی۔ سب لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رائے دینے لگے۔

اکثریت کی رائے یہی تھی کہ یہ خونی حرکت کسی خونخوار جانور کی ہے تاہم ان لوگوں میں ایک شخص ویسا تھا جس کی رائے پر اور کوئی تو متفق نہ ہوا تھا مگر رحمت اللہ کو اس کی بات دل کو لگی تھی۔ اس شخص کا نام خوشی محمد تھا۔ اس نے سب سے آخر میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا۔

"تم سب لوگ ایک اہم بات کو فراموش کر رہے ہو۔" اس کی بات سن کر سارے لوگ اس کا چہرہ تکنے لگے۔

خوشی محمد ایک پکی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ بولا۔ "تم لوگ وزیر خان کو کیوں بھول رہے ہو۔"

"وزیر خان.....؟" اس کی بات سن کر کئی لوگ زیرِ لب بڑبڑائے۔

"ہاں! وزیر خان! کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ وہ ایک پرانا شکاری ہے؟" خوشی محمد گویا انہیں یاد دلاتے ہوئے بولا۔ تو ایک نے جیسے اپنے تئیں اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے لقمہ دیا۔

"بہت خوب، اب ہم سمجھے تمہارا مطلب..... چونکہ وہ ایک شکاری ہے اس لیے ہمیں اس خون خوار جانور کو ہلاک کرنے کے لیے اس کی مدد لینی چاہیے۔"

"تم لوگ اب بھی میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔"

خوشی محمد نے اسرار بھرے لہجے میں کہا تو اس بار تقریباً سب ہی چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

خوشی محمد ہولے سے کھنکھار کر بولا۔ ''وزیر خان کے ڈیرے میں بھانت بھانت کے جانور ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے ڈیرے کا کوئی جانور کسی وجہ سے پاگل ہو کر درندگی پر اتر آیا ہے اور اپنی درندگی کی پیاس بجھا کر واپس وہیں لوٹ جاتا ہے۔''

اس کی بات سن کر پہلے پہل تو سب کو جیسے یکلخت سانپ سونگھ گیا۔ اس کے بعد سارے ہی لوگوں نے نفی میں سر ہلا دیے اور یہ خدشہ رد کر دیا۔

مگر رحمت اللہ وہ واحد شخص تھا جسے خوشی محمد کی بات سے خاصی حد تک اتفاق تو تھا لیکن چونکہ اکثریتی رائے نے خوشی محمد کے اس خیال کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بھی خاموش ہی رہا۔ پھر متفقہ رائے کے مطابق یہ طے پایا کہ دس بارہ افراد رات میں باری باری پہرہ دیں گے جن کے پاس اپنے ذاتی ہتھیار ہیں۔ وہ ہتھیار اٹھا سکتے ہیں ورنہ ڈنڈے، سونٹے اور لاٹھیاں تو سب کے پاس موجود ہی ہونی چاہئیں۔ نیز یہ لوگ پورے ٹولے کے ساتھ پوری بستی کا ساری رات گشت لگاتے رہیں گے اور اس خون خوار جانور کو گھیر کر ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس کے بعد نشست برخاست ہوئی اور لوگ اٹھ کر جانے لگے تو رحمت اللہ نے خوشی محمد کو وہیں روک لیا پھر جب سب لوگ چلے گئے تو رحمت اللہ نے اسے مخاطب کیا۔

''بھائی خوشی محمد، میں نے وزیر خان کا نام تو سنا ہے اور یہ بھی کہ وہ ایک شکاری ہے لیکن کیا تم مجھے اس کے بارے میں ذرا تفصیل بتا سکتے ہو؟''

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔'' وہ جھٹ بولا۔ پھر بتانے لگا۔

''وزیر خان ایک قریبی بستی میں رہتا ہے جو پرانی جھیل کے قریب واقع ہے۔ مجھے ایک بار اس کے ڈیرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح کھجوروں کا بیوپاری ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ میاں بیوی تنہا ہی رہتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی چل رہی ہے۔ صولت خان نامی ایک زمیندار ہے اور وہ بھی وہیں رہتا ہے۔''

رحمت اللہ نے ایک ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ''خیر ہمیں بھلا ان دونوں کی دشمنیوں سے کیا لینا دینا۔ تم یہ بتاؤ کہ اس نے اپنے جنگل ڈیرے پر کس قسم کے جانور پال رکھے ہیں؟''

''زیادہ تر تو میں نے چھوٹے موٹے جانور ہی دیکھے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''ان میں صرف بارہ سنگھا، آئی بیکس اور جنکارہ کے علاوہ دیگر چھوٹے موٹے چرند پرند ہیں مگر بڑے بڑے پنجرے جن کے نیچے چار پہیے لگے ہوئے ہیں اور دروازہ سلاخ دار ہے میں چند بڑے جانور بھی ہیں مگر انہیں الگ تھلگ رکھا گیا ہے جنہیں باقاعدگی کے ساتھ خود وزیر خان خوراک کھلاتا اور انہیں کبھی کبھی باہر بھی نکالتا ہے۔'' اتنا بتا کر وہ رکا اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر رحمت اللہ کی طرف جھکتے ہوئے اسرار بھری سرگوشی میں بولا۔ ''میں نے تو یہاں تک بھی سنا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا اونٹ بھی ہے جو گوشت خور ہے۔ یہی نہیں بعضوں کے مطابق وزیر خان نے ایک ''مم'' بھی پال رکھی ہے جسے اس نے کشمیر کے بنجر ویرانوں سے پکڑا تھا، لوگ کہتے ہیں یہ وہ کوہ کیر کے گنجان پہاڑی سلسلوں گورکوہل سے شکار کیا۔ اللہ جانے سائیں! سچ کیا ہے؟''

''ان خطرناک درندوں کے بارے میں تمہیں کبھی کوئی ٹھوس شواہد ملے؟'' رحمت اللہ نے پوچھا۔

''اسے کچھ لوگوں نے غصے میں آ کر یہ کہتے سنا تھا کہ میں ایک روز اپنے دشمن کو قتل کر کے اپنے اس اونٹ کے آگے ڈال دوں گا۔ پھر اس کی لاش کا بھی کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

''دفع کرو۔ یہ سنی سنائی باتیں ہیں تم ایسا کرو کبھی میرے ساتھ وزیر خان کے جنگل ڈیرے تک چلنا۔ ذرا میں بھی وہاں کا جائزہ لوں گا۔''

اس کی بات پر خوشی محمد نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆......☆

راجا شفیق ڈرا سہما چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کمال احمد کو ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوتے دیکھ وہ فوراً چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کک...... کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟''

''خیریت نہیں ہے! اس درندے نے ایک اور مزدور کا خون کر دیا ہے۔'' کمال احمد نے ہانپتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ ''اور...... اور درندے نے میرا بھی پیچھا کیا تھا مگر میں نکل بھاگا۔''

اس کی پوری بات سن کر راجا شفیق کا چہرہ فق ہو گیا اور

لکنت زدہ لہجے میں اس سے بولا۔
''ک ک...... کہیں...... ایسا تت...... تو نہیں کہ......
وہ...... یہاں بھی آن دھمکے؟''
ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک راجا شفیق کی آنکھیں خوف و دہشت کے مارے پھیل گئیں۔ کمال احمد نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنے عقب میں دیکھا تو پیٹرومیکس کی روشنی میں خیمے کی دیوار پر ایک بدہیئت ہیولے کا سایا ابھرا اور ساتھ ہی غراہٹ ابھری۔
راجا شفیق نے مارے خوف کے ایک زوردار چیخ ماری اور بدحواس ہو کر خیمے سے باہر دوڑ گیا۔
خیموں میں شور مچ چکا تھا مگر کسی کو باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اگلے روز ہی مزدور باہر نکلے۔ ان کے خیموں سے کچھ دور راجا شفیق کی لاش کھلے آسمان تلے پڑی تھی۔

☆......☆

ریلوے پل کی مرمت کا کام اب مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ مزدوروں اور ورکروں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی تھی۔ بلکہ کچھ تو اب واپس شہر اپنے گھروں کی طرف لوٹنے کے لیے پر تولنے لگے تھے کیونکہ سب ہی کو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس انتہائی مخدوش صورتِ حال نے اوورسیئر کمال احمد کو بری طرح پریشانی سے دوچار کر دیا تھا۔
اپنے ملازم بختیار اور ٹھیکیدار راجا شفیق کے عبرت ناک انجام پر اسے بے حد دکھ تھا۔ اس جگر خراش واقعے کے بعد مزدوروں نے شور مچانا شروع کر دیا اور وہ سب کمال احمد کے خلاف نعرے لگانے لگے کہ اس نے پہلے واقعے کے بعد حکامِ بالا سے مدد لینے پر جان بوجھ کر تامل سے کام کیوں لیا تھا۔
اپنے انجینئر کو مشتعل مزدوروں کے بپھرے مجمع سے بچانے کی خاطر کئی ورکر بھی زخمی ہو گئے۔ مشتعل مزدوروں نے جیپ کو بھی آگ لگادی اور یوں ریلوے پل کی تعمیر کا پورا عملہ تتر بتر ہو گیا جس کو جدھر راستہ ملا۔ منہ اٹھائے دوڑ پڑا۔ اس شور شرابے پر بستی کے لوگوں نے بڑی مشکلوں سے مشتعل مزدوروں کے ہجوم پر قابو پایا۔

☆......☆

متعلقہ محکمے کے دو آدمیوں کے ساتھ تین سپاہیوں اور ایک انسپکٹر پر مشتمل تفتیشی ٹیم بھی زیرِ مرمت ریلوے پل کی مرمتی کالونی آ پہنچی تھی۔ انہوں نے کمال احمد اور چند مزدوروں کا تفصیلی بیان لیا۔ یہ لوگ پولیس کی ایک موبائل ڈاٹسن گاڑی میں آئے تھے۔
متعلقہ محکمے کے دونوں افسروں کا نام زبیر درانی اور شمشاد بیگ تھا جب کہ انسپکٹر غلام علی تھے۔
''حالات بہت خراب ہو گئے ہیں جناب! ٹھیکیدار راجا شفیق کی ہلاکت کے بعد تو مزدوروں اور ورکروں نے احتجاجاً کام بھی بند کر دیا ہے۔'' کمال احمد نے تفتیشی ٹیم کو یہاں کے مخدوش حالات سے آگاہ کرتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ''اگر اس صورتِ حال پر جلد قابو نہ پایا گیا تو مین لائن کا کام شدید متاثر ہو سکتا ہے۔''
افسر شمشاد بیگ نے پوچھا۔ ''کیا کسی نے اس خون خوار درندے کو دیکھا ہے؟''
''نہیں سر! بس ہلکی سی جھلک ہی دیکھی ہے۔ میں نے بھی اس کا ہیولا دیکھا تھا مجھے تو وہ دو پیروں والا کوئی گوریلا ٹائپ جانور لگا تھا۔''
''حیرت کی بات ہے کیا وہ خون خوار جانور اتنا چالاک اور پھرتیلا ہے کہ خاموشی کے ساتھ یہ کارروائی کر کے فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے؟'' دوسرے افسر زبیر درانی نے خاصے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔
''جی ہاں جناب! کچھ ایسی ہی بات ہے۔''
''یہاں تو آس پاس بستیاں بھی ہیں، کیا وہاں کے لوگوں نے اپنے طور پر کچھ نہیں کیا ابھی تک؟'' انسپکٹر غلام علی بولا۔
جواباً کمال احمد بولا۔ ''ہو سکتا ہے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ تدارک کر رہے ہوں۔''
''کیا یہ خونیں وارداتیں ایک ہی بستی تک محدود ہیں؟''
''جی سر! وہ سامنے والی بستی، کھجوروں کے باغ والی۔'' کمال نے سامنے اشارہ کیا۔ یہ لوگ چھولداریوں کے باہر بچھی فولڈنگ چیئرز پر بیٹھے تھے۔ کمال احمد نے مزید بتایا۔ ''مگر ہم بھی اس درندے کی بربریت کا نشانہ بنے ہیں۔''
''انسپکٹر صاحب! مجھے تو لگتا ہے یہ کسی پُراسرار درندے کا کام نہیں ہے بلکہ یونہی کسی نے دانستہ دہشت پھیلا رکھی ہے۔ آج کل دشمنیاں نکالنے کا بھی ڈھنگ رائج ہے۔ کیا آپ آج سے کچھ سال پہلے ہتھوڑا گروپ کی ایسی لرزہ خیز اور پُراسرار کارروائیاں بھول گئے۔ کسی نے اپنے

دشمن کا سر پھاڑ کر ہلاک کر دیا تو ایسی وارداتیں پے در پے ہونے لگیں اور ہر کوئی اپنی دشمنیاں نکالنے لگا اور جرم ہتھوڑا گروپ کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔'' زبیر درانی نے کہا۔

اس کی بات سب کو معقول لگی تھی۔

''میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔'' انسپکٹر غلام علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں بستی جاکر لوگوں کے بیانات قلمبند کروں گا پھر متعلقہ تھانے کی پولیس سے ملوں گا۔ اس کے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔''

اس کی بات سن کر کمال احمد نے اپنے افسر شمشاد بیگ سے کہا۔ ''سر! آپ ذرا ورکروں اور مزدوروں کو مطمئن کردیں تاکہ وہ کام تو شروع کردیں اور میرا خیال ہے اب یہاں سیکیورٹی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔''

شمشاد بیگ اور زبیر درانی نے ورکروں اور مزدوروں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے انہیں تسلی تشفی دیتے ہوئے اس بات کا یقین دلایا کہ انہیں اب گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس کو ان کی حفاظت کے لیے متعین کردیا جائے گا۔ ساتھ ہی انہوں نے مزدوروں سے کام شروع کرنے کی بھی درخواست کی۔

متعلقہ محکمے کے افسروں اور اسپیشل پولیس ٹیم کی آمد سے مزدوروں اور ورکروں میں کچھ حوصلہ ہوا اور رکا ہوا کام پھر سے شروع کردیا گیا۔ اس کے بعد یہ تفتیشی ٹیم باقی کا کام نمٹانے کے لیے پولیس موبائل میں بیٹھ کر بستی کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆......☆

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کچے راستے پر بیل گاڑی چلی آرہی تھی۔ بیل گاڑی کے چوبی تختے کے نیچے لالٹین جھول رہی تھی اور اس میں چار افراد موجود تھے۔ ایک بوڑھا شخص تھا باقی دو میاں بیوی تھے۔ بوڑھے کا بیٹا اور اس کی بیوی جب کہ چوتھا ان کا سات سالہ لڑکا تھا جو اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ ایک حکیم کے گھر سے دوا لے کر واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

کھیتوں کے درمیان بل کھاتے کچے راستے پر بیل گاڑی دھیمی رفتار سے چلی جارہی تھی۔ بیل گاڑی جوان شخص چلارہا تھا جب کہ چوبی تختے پر پھونس بچھی رلی پر اس کا بوڑھا باپ اور بیوی بیٹھے تھے۔ نوعمر بیمار لڑکا ماں کی گود میں سر رکھے سو رہا تھا۔ اس کے اوپر ایک رلی ڈالی ہوئی تھی۔

اچانک بیلوں نے چلنا بند کردیا اور وہ بے چینی سے ڈکرانے لگے۔ جوان شخص جس کا نام روشن خان تھا وہ بیلوں کو کھدیڑنے کے لیے ان پر چابک مارنے لگا۔

''نا پت! نا! اتنے چابک نہ مار، یہ بے زبان ہیں پیار سے انہیں کھدیڑ۔'' اس کے بوڑھے باپ نے بیٹے سے کہا۔

بیٹا غصیلے مزاج کا تھا۔ جھلا کر بولا۔ ''بابا! پتا نہیں کیا ہوگیا ہے ان کو آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔''

''چل تو اِدھر ہو روشو! میں سنبھالتا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا اور بیٹے کی جگہ سنبھال لی۔

روشن علی اپنی بیوی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے باگ سنبھال کر بیلوں کو ٹٹکارا۔ مگر بے سود۔ انہوں نے تو جیسے آگے نہ بڑھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر الجھن سی طاری ہوگئی۔ وہ نیچے اترا اور بیلوں کے قریب جا کر اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر بہ غور ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے تجربے نے فوراً بتا دیا کہ یہ معصوم سے جانور کسی نادیدہ شے سے خوف زدہ تھے۔ اس نے بیل گاڑی کے تختے کے نیچے جھولتی ہوئی لالٹین اتاری اور اسے ہاتھ میں لے کر ذرا آگے بڑھا اور زمین پر روشنی کر کے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں بیل کسی سانپ کو دیکھ کر رکے ہیں۔

اچانک بوڑھے کو اپنے دائیں جانب کی خود رو جھاڑیوں سے ایک تیز خراٹے دار آواز سنائی دی۔ وہ لالٹین اٹھائے اس طرف مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار غراہٹ کے ساتھ اسے ایک بھاری بھرکم ہیولا جھپٹا نظر آیا۔ اس ہیولے نے اپنے ہاتھ کے نوکیلے ناخنوں والا پنجہ اس کی گردن پر اس زور سے رسید کیا کہ بے چارے بوڑھے کی نصف گردن ادھڑ کر رہ گئی۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے جوان بیٹے نے باپ کی دلدوز چیخ سنی۔ وہ فوراً کلہاڑی سنبھالے بیل گاڑی سے کودا، لالٹین زمین پر گری ہوئی تھی۔ وہ ابھی بجھی نہیں تھی مگر اس کی لو ڈوب رہی تھی۔ دھیمی روشنی میں روشن علی نے اپنے باپ کو بے سدھ زمین پر پڑے پایا۔ اس کی گردن سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔ روشن علی کو اپنے سامنے صرف پندرہ سولہ گز کے فاصلے پر وہ ہیولا نظر آگیا۔ روشن علی ایک بہادر نوجوان تھا۔ اس نے سب سے پہلے لالٹین اٹھانا چاہی مگر اس ہیولے نے زوردار غراہٹ کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ روشن علی نے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی تھام کر اس درندے پر وار کرنا چاہا مگر درندے نے اسے پہلے ہی چھاپ لیا۔ روشن علی کو اپنے نتھنوں میں سخت بدبو کا بھبکا گھستا ہوا محسوس ہوا۔

ہیولے نے اسے اپنے طاقت ور ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ بیل گاڑی میں موجود عورت نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت آسمان پر بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ ابھری اور ساتھ ہی بڑے زور سے بجلی چمکی۔

بیلوں نے جھرا کر دوڑ لگا دی۔ عورت نے اس چمکتی ہوئی آسمانی بجلی میں بھیانک منظر دیکھا۔

دوڑتی ہوئی بیل گاڑی میں بیٹھی اس عورت نے قریب سے گزرتے ہوئے آسمانی بجلی کی لمحاتی چمک میں وہ بھیانک منظر دیکھا۔ اسے کوئی بھاری بھرکم عجیب وغریب وجود نظر آیا تھا۔

خوف اور بدحواسی کے باعث اس قلیل سی پلک جھپکتی روشنی میں وہ صرف اتنا ہی دیکھ پائی تھی۔ عورت نے اپنے شوہر کا انجام بھی اپنی دہشت کے مارے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ جسے وہ دو پیروں والی عجیب الخلقت بلا اپنے لمبے چوڑے بازوؤں میں دبوچے مسل رہی تھی۔ اس کے بعد بیل گاڑی دور تک دوڑتی چلی گئی۔

اس بھیانک واقعے نے اس بستی کے لوگوں کو بھی لرزا کر رکھ دیا۔ صبح پو پھٹتے ہی لوگوں نے بدنصیب عورت کے ساتھ جا کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیا اور عورت سے بھی پوچھا۔ اس بدنصیب عورت نے وہی کچھ بتایا جو وہ بتا چکی تھی۔ وہاں دونوں باپ بیٹوں کی ادھڑی ہوئی لاشیں پڑی ملی تھیں۔

کھوجیوں نے پیروں کے نشانوں سے اس خون خوار درندے کے متعلق وہی اندازہ قائم کیا تھا جو کھجوروں والی بستی کے کھوجیوں نے ان عجیب وغریب بدوضع پیروں کے نشانات کو دیکھ کر لگایا تھا کہ یہ کسی ایسے عجیب وضع کے خون خوار درندے کے پاؤں تھے جو دو پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا مگر عورت کے بیان کے مطابق یہ جانور چوپایا نہیں تھا۔ لوگوں میں ایک ہراس سا پھیل گیا تھا کہ جانے یہ کیسی بلا تھی۔ اس کا تعلق بہرحال جانوروں اور درندوں کے قبیل سے محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح دوسری اور پھر تیسری واردات بھی اس بستی میں رونما ہوئی۔ عام طور پر یہاں کی بستی کے لوگوں میں بھی خوف وہراس کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

جب اس دوسری اور تیسری وارداتوں کی اطلاع رحمت اللہ تک پہنچی تو اسے پورا یقین ہو گیا کہ ہو نا ہو اس پُراسرار بلا کا تعلق وزیر خان سے ہے۔ اب وہ اپنے اس پالتو درندے کے ذریعے پہلے اپنے دشمن کی بستی میں دو تین عام سی وارداتیں کروائے گا اور پھر اس کے بعد یہ حملہ صولت علی یا اس کے خاندان کے کسی فرد پر بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اسی وقت مذکورہ بستی پہنچا اور وہاں کے امیر زمیندار صولت علی سے اوطاق پر جا کر ملاقات کی۔

☆......☆

رحمت اللہ کو یہ شخص وزیر خان کے برعکس ملنسار اور

خوش اخلاق محسوس ہوا۔ صولت ایک تندرست اور جوان سا شخص تھا۔ وہ اس وقت کڑکڑاتی کلف لگی شلوار، قمیص میں ملبوس تھا۔ رحمت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پہلے اسے یہی بتایا کہ اس پُراسرار درندے کی خونی وارداتوں کی ابتداء اس کی بستی سے ہوئی تھی۔ رحمت نے ابھی اپنے مطلب کی بات کو محفوظ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''سائیں! ہم سب لوگوں کا یہی خیال ہے کہ وزیر خان نے اپنے ذاتی جنگل ڈیرے میں جو پالتو جانور رکھے ہوئے ہیں ان میں چند خون خوار درندے بھی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں کوئی درندہ پاگل ہو کر بھاگ نکلا ہو اور اب وہ خون آشامی پر اتر آیا ہو؟''

صولت علی نے بہ غور رحمت کی بات سنی اور چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔ ''ممکن ہے..... مگر ہم جب تک اس درندے کو پکڑیں گے نہیں، ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟''

تب رحمت نے اس کی تائید پا کر کہا۔ ''سائیں! میں نے سنا ہے کہ آپ کی وزیر خان سے کوئی پرانی دشمنی بھی چلی آرہی ہے؟''

اس کی بات سن کر صولت کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے اور وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! ہماری اس سے دشمنی کی وجہ بھی یہی تھی کہ سب سے پہلے ہم نے ہی اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے پالتو جانوروں میں بالخصوص درندوں کو نہ رکھے۔ اس سے پہلے اس کے جنگل ڈیرے کی حدود ہماری جاگیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری مخالفت کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جب اس کے جنگل ڈیرے سے ایک ہاتھی پاگل ہو کر ہمارے کھیتوں میں گھس آیا تھا اور ہماری ساری فصل نہ صرف تباہ کر ڈالی تھی بلکہ ہمارے کسانوں کو بھی بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ ہم نے فوراً اس پاگل ہاتھی کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد اس کے جنگل ڈیرے سے ایک چیتا بھاگ نکلا تھا۔ تب سے ہم نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی اور انتظامیہ کو اس کے خلاف رپورٹ کر دی۔ اس کے بعد وزیر خان نے ہمیں قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کیوں کہ انتظامیہ نے اس کے خلاف سخت ایکشن لیا تھا اور اسے مجبوراً جنگل ڈیرے کی نصف حدود کو خالی کرنا پڑا تھا۔''

وہ تفصیل بیان کرنے کے بعد خاموش ہوا تو رحمت نے فوراً اصل بات کہہ ڈالی۔ ''سائیں! میرے دل میں اس لیے یہ شک ابھرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنے جنگل ڈیرے کے کسی درندے کو جان بوجھ کر ان خون آشام وارداتوں پر لگا دیا ہو اور اس کی آڑ میں وہ کوئی اپنا دیرینہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو؟''

صولت علی پھر بھی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا اور بولا۔ ''کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بات کرو۔''

''سائیں! آپ برا مت مانیے گا۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ دو ہاتھیوں کی اس سرد جنگ میں ہم بے گناہ لوگ مارے جارہے ہیں۔'' رحمت نے اتنا کہا اور لحہ بھر متوقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ''شاید آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق ہو کہ مجھے لگتا ہے وزیر خان آپ سے اپنی دشمنی کو بھولا نہیں ہے۔ وہ آپ سے خفیہ اور گھناؤنے طریقے سے دشمنی نکالنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ اپنے اس خون خوار درندے سے چند خونی وارداتیں کروانے کے بعد آپ کو بھی اس پُراسرار درندے کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت اس طرح بھی ملتی ہے کہ اب پچھلے چند روز سے آپ کی جاگیر میں ایسی دو تین لرزہ خیز وارداتیں ہوئی ہیں اور اب آیندہ اس درندے کا کون نشانہ بن سکتا ہے اس کا آپ خود اندازہ کر لیں۔'' رحمت اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا مگر اس کی بھانپتی ہوئی نظریں صولت علی کے چہرے پر مرکوز تھیں جہاں تیزی سے تاثرات تبدیل ہونے لگے تھے۔ پھر اس نے دیکھا ان تاثرات میں غیظ کا تاثر غالب نظر آنے لگا۔ وہ اس لہجے میں رحمت اللہ سے بولا۔

''اگر یہ بات ہوئی تو میں وزیر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

رحمت اللہ فوراً بولا۔ ''سائیں! میرا مقصد آپ دونوں کو لڑوانا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ معاملے کا کھوج لگایا جائے اس کے بعد اگر وزیر خان مجرم ثابت ہوا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔''

''شاید یہی طریقہ بہتر رہے گا۔'' بالآخر صولت علی نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

رحمت اللہ کو اس کی افہام و تفہیم والی طبیعت پسند آئی۔

''رحمت اللہ! اب تم ہی بتاؤ کہ اس درندے کا کس طرح کھوج لگایا جائے؟'' صولت علی نے چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ خونی درندہ ایسی خوف ناک وارداتیں کرنے کے بعد واپس وزیر خان کے جنگل ڈیرے میں پناہ لیتا ہوگا۔ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف

خوش اخلاق محسوس ہوا۔ صولت ایک تندرست اور جوان سا شخص تھا۔ وہ اس وقت کڑکڑاتی کلف لگی شلوار، قمیص میں ملبوس تھا۔ رحمت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پہلے اسے یہی بتایا کہ اس پُراسرار درندے کی خونی وارداتوں کی ابتداء اس کی بستی سے ہوئی تھی۔ رحمت نے ابھی اپنے مطلب کی بات کو محفوظ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''سائیں! ہم سب لوگوں کا یہی خیال ہے کہ وزیر خان نے اپنے ذاتی جنگل ڈیرے میں جو پالتو جانور رکھے ہوئے ہیں ان میں چند خون خوار درندے بھی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں کوئی درندہ پاگل ہو کر بھاگ نکلا ہو اور اب وہ خون آشامی پر اتر آیا ہو؟''

صولت علی نے بہ غور رحمت کی بات سنی اور چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔ ''ممکن ہے..... مگر ہم جب تک اس درندے کو پکڑیں گے نہیں، ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟''

تب رحمت نے اس کی تائید پا کر کہا۔ ''سائیں! میں نے سنا ہے کہ آپ کی وزیر خان سے کوئی پرانی دشمنی بھی چلی آرہی ہے؟''

اس کی بات سن کر صولت کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے اور وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! ہماری اس سے دشمنی کی وجہ بھی یہی تھی کہ سب سے پہلے ہم نے ہی اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے پالتو جانوروں میں بالخصوص درندوں کو نہ رکھے۔ اس سے پہلے اس کے جنگل ڈیرے کی حدود ہماری جاگیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری مخالفت کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جب اس کے جنگل ڈیرے سے ایک ہاتھی پاگل ہو کر ہمارے کھیتوں میں گھس آیا تھا اور ہماری ساری فصل نہ صرف تباہ کر ڈالی تھی بلکہ ہمارے کسانوں کو بھی بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ ہم نے فوراً اس پاگل ہاتھی کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد اس کے جنگل ڈیرے سے ایک چیتا بھاگ نکلا تھا۔ تب سے ہم نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی اور انتظامیہ کو اس کے خلاف رپورٹ کر دی۔ اس کے بعد وزیر خان نے ہمیں قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کیوں کہ انتظامیہ نے اس کے خلاف سخت ایکشن لیا تھا اور اسے مجبوراً جنگل ڈیرے کی نصف حدود کو خالی کرنا پڑا تھا۔''

وہ تفصیل بیان کرنے کے بعد خاموش ہوا تو رحمت نے فوراً اصل بات کہہ ڈالی۔ ''سائیں! میرے دل میں اس لیے یہ شک ابھرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنے جنگل ڈیرے کے کسی درندے کو جان بوجھ کر ان خون آشام وارداتوں پر لگا دیا ہو اور اس کی آڑ میں وہ کوئی اپنا دیرینہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو؟''

صولت علی پھر بھی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا اور بولا۔ ''کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بات کرو۔''

''سائیں! آپ برا مت مانیے گا۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ دو ہاتھیوں کی اس سرد جنگ میں ہم بے گناہ لوگ مارے جا رہے ہیں۔'' رحمت نے اتنا کہا اور لحہ بھر متوقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ''شاید آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق ہو کہ مجھے لگتا ہے وزیر خان آپ سے اپنی دشمنی کو بھولا نہیں ہے۔ وہ آپ سے خفیہ اور گھناؤنے طریقے سے دشمنی نکالنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ اپنے اس خون خوار درندے سے چند خونی وارداتیں کروانے کے بعد آپ کو بھی اس پُراسرار درندے کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت اس طرح بھی ملتی ہے کہ اب پچھلے چند روز سے آپ کی جاگیر میں ایسی دو تین لرزہ خیز وارداتیں ہوئی ہیں اور اب آئندہ اس درندے کا کون نشانہ بن سکتا ہے اس کا آپ خود اندازہ کر لیں۔'' رحمت اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا مگر اس کی بھانپتی ہوئی نظریں صولت علی کے چہرے پر مرکوز تھیں جہاں تیزی سے تاثرات تبدیل ہونے لگے تھے۔ پھر اس نے دیکھا ان تاثرات میں غیظ کا تاثر غالب نظر آنے لگا۔ وہ اس لہجے میں رحمت اللہ سے بولا۔

''اگر یہ بات ہوئی تو میں وزیر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

رحمت اللہ فوراً بولا۔ ''سائیں! میرا مقصد آپ دونوں کو لڑوانا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ معاملے کا کھوج لگایا جائے اس کے بعد اگر وزیر خان مجرم ثابت ہوا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔''

''شاید یہی طریقہ بہتر رہے گا۔'' بالآخر صولت علی نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

رحمت اللہ کو اس کی افہام و تفہیم والی طبیعت پسند آئی۔

''رحمت اللہ! اب تم ہی بتاؤ کہ اس درندے کا کس طرح کھوج لگایا جائے؟'' صولت علی نے چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ خونی درندہ ایسی خوف ناک وارداتیں کرنے کے بعد واپس وزیر خان کے جنگل ڈیرے میں پناہ لیتا ہوگا۔ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف

محتاط رہیں اور بستی والوں کی حفاظت کے اقدامات پر توجہ دیں باقی میں دیکھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت چاہی۔

صولت علی نے گرم جوشی کے ساتھ اسے رخصت کیا اور ساتھ ہی ہر ممکن تعاون کا بھی اسے یقین دلایا۔

☆......☆

رحمت نے اپنی بیوی امیر زادی کو اپنی اس خطرناک مہم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس پر وہ آج شام عمل کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا تاہم اپنی غیر موجودگی کے سلسلے میں اسے اپنی بیوی کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔

رحمت کا ارادہ سرِ شام وزیر خان کے جنگل ڈیرہ کی طرف نکلنے کا تھا۔ رحمت کو چونکہ اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ خونی درندہ اس کی بستی کا رخ نہیں کرے گا تاہم پھر بھی جب شام کے آثار نمودار ہونے لگے تو اس نے اپنی بیوی امیر زادی کو گھر میں محتاط ہو کر رہنے کی تاکید کی اور اسے کسی دوست کے ہاں ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکل پڑا۔

اس نے اپنے ساتھ ایک عدد ٹارچ رکھ لی تھی چنانچہ وہ اپنی گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر اللہ کا نام لے کر نکل پڑا۔ جنگل ڈیرے کی حدود میں پہنچ گیا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر گھر سے نکلتے وقت اس نے ایک عدد ریوالور بھی رکھ لیا تھا جس کے چیمبر میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک عدد کلہاڑی بھی اس نے ساتھ رکھ لی تھی۔

جنگل ڈیرے کے آس پاس کیکر کا جنگل اور قد آدم خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ جنگل ڈیرے کے قریب پہنچ کر گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں رک گیا۔ آسمان صاف تھا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے جنگل ڈیرے کے بڑے سے چوبی گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں وہی گن بردار چوکیدار قریب ہی ایک چارپائی پر نیم دراز ریڈیو کان سے لگائے موسیقی سن رہا تھا۔

دروازہ بند تھا مگر اس پر قفل نظر نہیں آ رہا تھا۔ رحمت چند ثانیے وہاں چھپا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس کے بعد انہی جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔

اپنی گھوڑا گاڑی اس نے تھوڑے فاصلے پر کھڑی کر کے گھوڑے کے منہ پر چارے کا ''توبڑا'' لگا دیا تھا۔ تاکہ وہ زور سے ہنہنائے نہیں اور اندر ہی چارہ چکھنے میں مصروف رہے۔

بہرطور......! وہ گیٹ سے کافی دور آ گیا تھا۔ یہاں اب خاردار باڑھ نظر آ رہی تھی۔ خاردار باڑھ کی یہ دیواریں دس بارہ فٹ بلند تھیں۔ آہنی باڑھ کو اس طرح جالی دار بنا کر لپیٹا گیا تھا کہ کوئی اس میں داخل نہ ہو سکے۔

مگر رحمت نے کسی بھی طرح اندر داخل ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک خطرناک کام کر رہا تھا کیوں کہ اگر وہ وزیر خان کے کسی آدمی کی نظروں میں آ گیا تو مصیبت میں پڑ سکتا تھا لہٰذا اس نے ہر لحاظ سے خود کو محتاط رکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔

جنگل ڈیرے کا رقبہ بہت طویل تھا۔ رحمت چلتے چلتے تھک کر رک گیا مگر اسے اندر داخل ہونے کی کوئی چور جگہ یا گوشا نظر نہیں آیا۔ وہ چند ثانیے وہاں ہونٹ بھینچے کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد وہ واپس پھاٹک کی جانب پلٹا تو اچانک اسے ایک گھرگھراتی آواز سنائی دی۔

وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ گیٹ سے ابھی خاصا دور تھا لیکن اس نے جب اس گھرگھراتی آواز کی سمت دیکھا تو اسے سامنے کسی گاڑی کی تیز روشنی دکھائی دی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رکا اور اس طرح تیز تیز قدموں سے جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا پھر جب وہ گیٹ کے تھوڑا نزدیک پہنچ کر رکا تو اس نے دیکھا وہ وزیر خان کی جیپ تھی جو اب گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

رحمت بہ غور آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ اسے وزیر خان کی جھلک نظر آئی تھی۔ جیپ اندر داخل ہوئی تو رحمت نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی وہ ذرا اور آگے بڑھا پھر اس نے چھپ کر جھاڑیوں کی اوٹ سے گیٹ کی طرف دیکھا جس کے دونوں دیوہیکل پٹ کھلے ہوئے تھے۔ جیپ اندر جا چکی تھی جب کہ وہ گن بردار چوکیدار تن کر کھڑا تھا۔ اس کا چھوٹا سا ریڈیو اب چارپائی پر سرہانے کے قریب رکھا نظر آ رہا تھا۔

رحمت اللہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہیں چھپا کھڑا رہا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔

ذرا دیر بعد اسے دوبارہ جیپ کی آواز سنائی دی۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ وزیر خان شاید اپنی جیپ میں واپس آ رہا تھا۔ رحمت نے دیکھا جیپ گیٹ سے جیسے ہی نمودار ہوئی اسے کسی خون خوار جانور کے غرانے اور وقفے وقفے سے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ جیپ باہر آ کر موڑ کاٹتے

ہی رک گئی تو رحمت اللہ نے دیکھا جیپ کے پیچھے وہی جانوروں کی آمدورفت والا ٹرالر بھی تھا اور اس کے اندر سے ایک شیر نظر آیا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب رحمت نے جیپ کو آتے دیکھا تو اس کے عقب میں ٹرالر نہیں تھا۔ کسی خیال کے تحت اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تاہم اب وہ بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑے ٹرالر کے اندر اس غراتے دھاڑتے شیر کو تکے جارہا تھا جو انتہائی غضب ناک نظر آرہا تھا۔

رحمت اللہ جیپ ٹرالر سے کم و بیش پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ جیپ ابھی تک رکی ہوئی تھی اس کے بعد رحمت اللہ نے وزیر خان کو جیپ سے اترتے دیکھا۔

وہ ٹرالر پر رکھے آہنی پنجرے میں غضب ناک انداز میں شیر کو اِدھر اُدھر ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وزیر خان چند ثانیے اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس کے بعد جیپ آگے روانہ ہو گئی۔

رحمت اللہ سمجھ گیا کہ یہی وہ خون خوار اور پاگل درندہ تھا جس نے پورے علاقے میں دہشت مچا رکھی تھی مگر باوجود اس کے وہ پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ اس کے ذہن میں جس خون خوار پُراسرار درندے کا خاکہ تیار تھا اس پر یہ پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ سوچ میں گم اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گیا۔

رحمت اللہ کی مقدور بھر کوشش یہی تھی کہ وہ کم از کم جیپ کی سمت کا تعین تو ضرور کرلے کہ وہ کس طرف مڑتی ہے جیپ بھاری بھرکم ٹرالر کی وجہ سے دھیمی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ رحمت کو اُمید تھی کہ وہ جیپ کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ پھر اچانک اسے جیپ ٹرالر سمیت دائیں جانب ایک چٹیل میدان کی طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ یہاں چھدری چھدری جھاڑیاں کہیں کہیں نظر آرہی تھیں۔ تب پھر اس نے اچانک جیپ کو رکتے دیکھا تو وہ بھی ذرا دور جاکر رک گیا۔ گھوڑا گاڑی ایک طرف روک کر وہ نیچے اتر آیا۔ اب وہ زمین پر چھدری چھدری جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے قریب چھپ کر بیٹھ گیا۔

اس نے دیکھا وزیر خان جیپ سے اترا تو اس کے دو خدمت گار ساتھی بھی نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں انتہائی طاقت ور رائفلیں تھیں۔ وزیر خان کے ہاتھ میں بھی رائفل نظر آرہی تھی۔

رحمت اللہ اپنی جگہ دم سادھے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ وزیر خان اور اس کے دونوں ساتھی ٹرالر کی چھت پر چڑھ گئے اور پھر ایک نے اوپر سے سلاخ دار دروازہ اوپر اٹھا لیا۔ شیر غضب ناک غراہٹ کے ساتھ باہر کودا۔

رحمت اللہ کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یہ ڈر ہوا کہ کہیں وہ شیر دھاڑتا غراتا ہوا اس کی بُو سونگھتا یہاں نہ آجائے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ وہ شیر ٹرالر پر رکھے پنجرے سے کود کر ایک طرف بھاگا۔ چھت پر موجود وزیر خان نے اپنی رائفل سے اس کا نشانہ باندھا اور گولی چلادی۔ کان پھاڑ دھماکا ہوا۔ جس سے آس پاس کا علاقہ گونج اٹھا۔

گولی شیر کے کسی ایسے نازک مقام پر لگی تھی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وزیر خان نے احتیاطاً ایک اور گولی داغ دی۔ شیر کے تنِ مردہ میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی تو وہ تینوں چھت سے نیچے اتر آئے۔

اس کے بعد وزیر خان کے دونوں ساتھیوں نے مردہ شیر کے وجود کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور واپس ٹرالر پر رکھے بڑے سے آہنی پنجرے کے اندر پھینک دیا اور دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔ اب جیپ واپس جنگل ڈیرہ کی طرف جارہی تھی۔ رحمت اللہ کو سمجھ میں یہ سب نہ آسکا تھا۔ اس کے چہرے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی الجھن آمیز تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔

بہرطور واپس پلٹا۔ اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔

شام اب رفتہ رفتہ رات کی تاریکی میں بدلنے لگی تھی۔ شکر تھا کہ آسمان صاف تھا اور چاند کی روشنی سے اطراف کا علاقہ مقدور بھر روشن تھا۔ رحمت اللہ گھوڑا گاڑی کو مناسب رفتار سے دوڑائے جارہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی جانب تھا۔ اس کا دل و دماغ نہ جانے کیوں عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ انجانا خوف تھا جو اسے جکڑے ہوئے تھا۔ وہ شاید اس خونی درندے سے خوف زدہ ہورہا تھا پھر ابھی وہ اپنے گھر سے ذرا دوری پر تھا کہ اسے کچھ لوگوں کا مشعل بردار ہجوم نظر آیا۔ وہ دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ گھوڑا گاڑی اس نے ایک قریبی درخت سے باندھ دی تھی۔ اس پر یہ لرزہ خیز انکشاف ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ خونی درندہ ایک شخص کو ہلاک کر کے بھاگا تھا۔

رحمت اللہ نے ان سب کو اس کا تعاقب کرنے کو کہا۔ ان سب کے ہاتھوں میں بڑے بڑے لٹھ، سونٹے اور

کلہاڑیاں تھیں۔ رحمت اللہ نے بھی اپنی کلہاڑی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

یہ لوگ سب ایک جلوس کی صورت میں دوڑے چلے جارہے تھے۔ ان کی تعداد پندرہ سولہ سے زیادہ تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو رات کو جاگ کر باری باری پہرہ دیتے تھے۔ مرنے والا شخص بھی انہی میں سے ایک تھا۔ غم و غصے کے باعث ان لوگوں کے چہروں سے غیظ مترشح تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج ان لوگوں نے اس خونی درندے کو ہلاک کرنے کی قسم کھارکھی ہے۔

مگر کافی تلاش بسیار کے بعد وہ درندہ انہیں کہیں نظر نہ آیا تو رحمت اللہ نے ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے چار چار افراد کی ٹولیاں بنا کر اس خونی درندے کے تعاقب میں جانے کا حکم دیا۔ لوگوں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ درندہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

یوں یہ سب لوگ چار چار افراد کی ٹولیوں میں بٹ کر چار مختلف سمتوں کی طرف بڑھ گئے۔ رحمت اللہ بھی اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ چوتھی سمت کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ انہیں ایک تیز لرزہ خیز انسانی چیخ سنائی دی۔ چیخ کی آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی ان چاروں نے چیخ والی سمت کی طرف دوڑ لگادی۔

دفعتاً انہیں ایک دوسری چیخ بھی سنائی دی۔ اس بار چیخ کی سمت ...... دائیں جانب سے سنائی دی تھی۔ یہ لوگ رکے بغیر دوڑتے رہے۔ اچانک انہیں سامنے سے گرتا پڑتا دوڑتا ہوا ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں یہ لوگ اسے اپنے آدمی کی حیثیت سے پہچان گئے تھے۔ وہ بری طرح حواس باختہ اور خوف زدہ تھا۔

یہ چاروں ٹھٹک کر رکے تب انہوں نے ایک جگر خراش منظر دیکھا۔ دوڑتے ہوئے آدمی کے عقب میں انہیں بدہیئت سا انسانی ہیولا بھی نظر آیا جس نے چشم زدن میں اس دہشت زدہ شخص کو دبوچ لیا۔ چاند کی روشنی میں انہیں ایک ایسا انسان نما جانور نظر آیا جو انہوں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس خوف ناک جانور کی ہیئت اس قدر کریہہ انگیز اور ناقابلِ یقین تھی کہ ان چاروں کو سکتہ ہوگیا۔

ایک ہیبت تھی جو ان پر اس بری طرح طاری تھی کہ وہ اپنے بدنصیب ساتھی کو بھی اس ہیبت ناک درندے سے بچانا بھول گئے جو اس کے خونی پنجوں میں بری طرح تڑپ رہا تھا۔ تب پھر رحمت نے ہی حرکت کی اور اپنی جیب سے بتیس بور کا پستول نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ دھماکے کی آواز سے اس خونی درندے نے اپنے شکار کو چھوڑا اور ان کی طرف متوجہ ہوا۔ رحمت کے تینوں ساتھی اس عجیب الخلقت درندے کو دیکھ کر بری طرح سے دہشت زدہ ہوگئے تھے کہ ان میں آگے بڑھنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی۔

اس درندے کا پورا جسم انسان کی طرح تھا اور چہرہ..... مگرمچھ کی طرح۔ دونوں ہاتھوں کے پنجے بھی بڑے بڑے نوکیلے ناخنوں والے تھے۔ اس کے جسم کی کھال بھی مگرمچھ کی طرح کھردری اور موٹی تھی۔ اس کے کاندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔ وہ ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ رحمت اللہ کی طرف لپکا۔

رحمت اللہ نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا اور پے در پے ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ گولیوں کے دھماکے ہوئے۔ کئی گولیاں اس مگرمچھ نما انسان کی موٹی کھال والے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ اس کے حلق سے ایک زوردار غراہٹ ابھری۔

وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر رکا نہیں اور چشم زدن میں رحمت اللہ کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ریوالور کی گولیاں ختم ہوگئی تھیں۔ اس نے پستول پھینک کر اپنی کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں پکڑلی وہ چاہتا تھا کہ اس مگرمچھ والے تھوتھنے پر وار کرے مگر اس سے پہلے ہی اس عجیب الخلقت خونی درندے نے اپنے نوکیلے ناخنوں والا پنجہ اس کے چہرے پر مارا۔

رحمت کا چہرہ زخمی ہوگیا۔ وہ چیخ مار کر گرا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اس اثناء میں اس کے ساتھیوں کی غیرت جاگی اور انہوں نے اس درندے پر کلہاڑیوں اور لٹھوں سے حملہ کردیا۔

اس دوران شور شرابے کی آواز پر ان کے دیگر ساتھی بھی وہاں آپہنچے۔ بس پھر کیا تھا سب نے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے اس درندے کو چاروں طرف سے گھیر کر اس پر حملہ کردیا۔

دو ساتھیوں نے زخمی رحمت اللہ کو گھسیٹ کر ایک طرف کردیا۔

اس عجیب وغریب خونی درندے کی لاش بیچ میدان میں رکھی تھی اور بستی کے لوگ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے علاقوں سے بھی جوق در جوق لوگ آکر حیرت و خوف بھری نظروں سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔